مجددّ الف ثانیؒ

کی

تحریکِ احیائے اسلام

اور

سلاطینِ مُغلیہ

○

مُصنفہ:

پروفیسر ابصار عالم

○

حرا پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور

مصنف ——— پروفیسر ابصار عالم

نام کتاب ——— مجدد الف ثانیؒ کی تحریکِ احیائے اسلام اور سلاطینِ دہلی

طبع اوّل ——— ایک ہزار

ناشر ——— شفیق الاسلام فاروقی

مطبع ——— ندیم یونس پرنٹرز لاہور

قیمت ——— ۸۱ روپے

فہرست مضامین

پہلا حصہ

نمبر شمار	عنوانات	نمبر صفحہ
	عرضِ ناشر	۸
	کچھ مصنف کے بارے میں	۹
	پیش لفظ	۱۲
۱	اسلامی اور غیر اسلامی تحریک کی نوعیت	۲۲
۲	اسلامی عقائد و روایات پر حملے اور ان کا تمسخر	۲۴
۳	مخلوط مذہب اور مشترک کلچر کا فتنہ	۲۸
۴	علمائے سوء اور اسلام دشمن عناصر کا رول	۲۹
۵	دین جدید کی ضرورت اور اکبر کا معناً نبوت سے انکار کرنا	۳۰
۶	دین جدید کے قیام کے لیے اقدامات	۳۱
۷	دین جدید میں اکبر کا مقام اور توحید الٰہی کا اعلان۔	۳۲
۸	مشرکانہ عبادات۔	۳۳
۹	شرک کے چند خد و خال۔	۳۴
۱۰	مصلحت ملکی کے نام سے غیر اسلامی احکام اور شعائر اسلام کی بے حرمتی۔	۳۶
۱۱	مزید برآں۔	۳۹
۱۲	کیا اس کا نام رواداری اور صلح کل پالیسی ہے؟	۴۱
۱۳	تعلیمی پالیسی اور اسلامی اقدار	۴۳

نمبر شمار	عنوانات	نمبر صفحہ
۱۴	غیر مسلموں کے عقائد اور نظریات کی ترویج و اشاعت۔	۴۵
۱۵	درباری علماء اور اسلام۔	۴۷
۱۶	نازک اور مشکل ترین دور۔	۵۰
۱۷	روشنی کی ایک کرن۔	۵۳
۱۸	حضرت مجدد الف ثانی رح کے ابتدائی حالات	۵۸
۱۹	حضرت مجدد الف ثانی رح کی تشخیص۔	۶۰
۲۰	حکومت کی پالیسی میں تبدیلی کی ضرورت۔	۶۲
۲۱	شہنشاہ جہانگیر کی نمائندگی کیوں؟	۶۴
۲۲	شیخ فرید کی حمایت۔	۶۹
۲۳	شیخ فرید اور حضرت مجدد رح کے تعلقات	۷۱
۲۴	باطل کا غلبہ ختم کرنے کے لیے مختلف طریق کار۔	۷۲
۲۵	حضرت مجدد رح کا طریق کار۔	۷۵
۲۶	احیاء اسلام کے لیے جد و جہد کا آغاز۔	۷۶
۲۷	ہوس اقتدار کا طعنہ۔	۸۲
۲۸	مسلم رائے عامہ کی تنظیم۔	۸۳

نمبر شمار	عنوانات	نمبر صفحہ
۲۹	غیر مسلموں کے عزائم بے نقاب کیے۔	۸۵
۳۰	ترغیب جہاد۔	۸۶
۳۱	اسلام اسلام است کفر کفر است۔	۸۸
۳۲	نفاذ شریعت اور بادشاہ کے اصلاح کی تاکید۔	۹۱
۳۳	علمائے سوء سے اجتناب کی تاکید۔	۹۳
۳۴	علماء کے انتخاب کے لیے ہدایات۔	۹۵
۳۵	عقل کی بیچارگی اور نبوت کی اہمیت و ضرورت۔	۹۷
۳۶	تاکید اتباعِ شریعت۔	۹۹
۳۷	بدعت حسنہ کوئی شئے نہیں۔	۱۰۱
۳۸	نظریہ وحدۃ الوجود اور عقیدہ حلول کی تردید۔	۱۰۳
۳۹	تصوف کو شریعت کے تابع کرنا۔	۱۰۵
۴۰	شریعت طریقت پر فوقیت رکھتی ہے۔	۱۰۶
۴۱	گمراہ کن اور باطل عقائد کی تردید۔	۱۰۷
۴۲	حضرت عائشہ صدیقہ رض کی عظمت۔	۱۱۰
۴۳	حضرت طلحہ رض اور حضرت زبیر رض کی عظمت	۱۱۱
۴۴	حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل سنت والجماعت۔	۱۱۴

نمبر شمار	عنوانات	نمبر صفحہ
۴۵	رفض کیا ہے؟	۱۱۵
۴۶	ابطال عقیدہ تقیہ۔	۱۱۶
۴۷	مکتوبات کا ایک عمومی جائزہ۔	۱۲۰
۴۸	مخالفت کا آغاز اور الزامات۔	۱۲۳
۴۹	دربار میں حضرت مجدد رح کی طلبی اور جہانگیر کی دشنام طرازی۔	۱۲۸
۵۰	جہانگیر کی تحریر کا تجزیہ۔	۱۳۰
۵۱	جہانگیر کے الزامات و اتہام۔	۱۳۱
۵۲	الزامات کا ناقدانہ جائزہ۔	۱۳۲
۵۳	صحیح یا غلط، مگر ایک الزام۔	۱۳۵
۵۴	مکتوب یازدہم اور اس کی تاریخ تحریر کا تعین۔	۱۳۵
۵۵	مکتوب یازدہم کی اصل حقیقت۔	۱۳۸
۵۶	محض اس پر اکتفا نہ کی۔	۱۴۰
۵۷	احترام صحابہ سے متعلق مزید شواہد۔	۱۴۱
۵۸	اصل وجہ سیاسی تھی۔	۱۴۲
۵۹	حکومت میں شیعوں کا غلبہ و اقتدار۔	۱۴۴
۶۰	دربار میں طلبی گھٹیا سازش کا نتیجہ تھی۔	۱۵۱
۶۱	ردِ عمل۔	۱۵۲
۶۲	الزامات کی صفائی میں بیان۔	۱۵۴
۶۳	اشتعال انگیزی۔	۱۵۵
۶۴	جہانگیر کا غیض و غضب	۱۵۷

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
۶۵	سجدہ سے انکار کی اہمیت۔	۱۵۹	۸۱	شاہ جہان کے خلاف سیاسی محاذ۔	۲۱۱
۶۶	دوسرا نیلا۔	۱۶۰	۸۲	شاہ جہان اور حضرت مجدد رح۔	۲۱۴
۶۷	روحانی انبساط اور سکون قلب		۸۳	ترک شراب کا واقعہ۔	۲۱۵
	کا اظہار۔	۱۶۲	۸۴	جہانگیر کی نئی بساط سیاست	۲۱۷
۶۸	ایک اور مکتوب۔	۱۶۴		(سلطان پرویز)۔	
۶۹	صبر و رضا کی تلقین۔	۱۶۶	۸۵	مہابت خان۔	۲۲۰
۷۰	رہائی سے ناکامی پر اطمینان و سکون	۱۶۷	۸۶	داور بخش۔	۲۲۱
۷۱	راہ حق کا مجاہد۔	۱۷۰	۸۷	شہریار۔	۲۲۴
۷۲	زندان میں تبلیغ حق۔	۱۷۲	۸۸	نور جہاں۔	۲۲۷
۷۳	رہائی اور اس کے اسباب۔	۱۷۳	۸۹	شاہ جہان کی مخالفت کیوں؟	۲۳۰
۷۴	ایک طرح کی نظر بندی۔	۱۷۴	۹۰	شاہ جہان کے خلاف ناراضگی	
۷۵	جہاد عشق۔	۱۷۹		کا اظہار۔	۲۳۵
۷۶	علماء کرام اور حضرت مجدد رح		۹۱	شاہ جہان اور جہانگیر میں جنگ۔	۲۳۶
	کی دربار میں طلبی۔	۱۸۲	۹۲	نور جہاں کے عزائم۔	۲۳۹
۷۷	قلعہ گوالیار سے رہائی کا ایک	۱۸۶	۹۳	شیخ احمد سرہندی رح کی رہائی	۲۴۰
	اور نقطہ نظر۔			(حضرت مجدد الف ثانی رح)۔	
۷۸	جہانگیر اور ترویج شریعت۔	۱۸۹	۹۴	جہانگیر اور نقشبندی سلسلہ۔	۲۴۲
۷۹	جہانگیر اور اسلام۔	۱۹۶	۹۵	شریعت اور جہانگیر کا آخری دور حکومت	۲۴۶
۸۰	شاہ جہان اور جہانگیر	۲۰۳	۹۶	اسلام میں عظمت کا تصور۔	۲۵۴

دوسرا حصہ!

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
۹۷	فتح یاب	۲۷۲
۹۸	شاہ جہاں کی تخت نشینی انقلابی تبدیلی	۲۷۳
۹۹	سجدہ تعظیمی کی ممانعت	۲۸۱
۱۰۰	سن ہجری کا رواج	۲۸۲
۱۰۱	مسلم تہواروں کی سرپرستی	۲۸۳
۱۰۲	رمضان المبارک	۲۸۴
۱۰۳	عید الفطر	۲۸۵
۱۰۴	رمضان کے روزے ترک کرنا	۲۸۶
۱۰۵	عید الاضحیٰ	۲۸۶
۱۰۶	تعمیراتِ مساجد	۲۸۷
۱۰۷	اسلام کے نام سے کفر کی تبلیغ کرنیوالے گروہ کا خاتمہ	۲۹۱
۱۰۸	عمّال کی تقرری اور شریعت	۲۹۲
۱۰۹	احکام شریعت	۲۹۳
۱۱۰	رعایا کے فلاح و بہبود کے لیے احکام	۲۹۴
۱۱۱	کفر و الحاد کے مراکز کو تباہ کرنا	۲۹۶
۱۱۲	مسلمانوں پر مظالم کا خاتمہ	۲۰۳
۱۱۳	اسلام قبول کرنے کی ترغیب دینا	۲۰۵
۱۱۴	ہندو شہزادیوں کو مسلمان کر کے شادی کرنا	۳۰۶
۱۱۵	کافرانہ اور مشرکانہ رسوم کو ختم کرنا	۳۰۸
۱۱۶	خلفاء راشدہ کا احترام	۳۰۹

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
۱۱۷	حضرت علی کرم اللہ وجہہ	۳۱۲
۱۱۸	سکندرِ اعظم	۳۱۴
۱۱۹	قحط اور نمازِ استسقاء	۳۱۵
۱۲۰	دن رات کی گھڑیوں کے تعین کا نیا آئین	۳۱۶
۱۲۱	عورت اور قرآن پاک	۳۱۶
۱۲۲	بچوں کی تعلیم و تربیت	۳۱۷
۱۲۳	حج پر سے پرتگالیوں کی مزاحمت ختم کرنا	۳۲۰
۱۲۴	شریف مکّہ اور شاہ جہاں	۳۲۵
۱۲۵	حرمین شریفین کے لوگوں کی امداد	۳۲۵
۱۲۶	سرکارِ دوعالم کے لیے قندیل روانہ کرنا	۳۲۶
۱۲۷	اقلیت و اکثریت کا فلسفہ	۳۲۷
۱۲۸	اتحادِ اسلامی	۳۲۹
۱۲۹	پہلا سفیر برائے ترکیہ	۳۳۲
۱۳۰	ترکی سفیر شاہ جہاں کے دربار میں	۳۳۳
۱۳۱	سلطان ترکی کا دوسرا سفیر	۳۳۴
۱۳۲	شاہ جہاں کا ترکی کو دوسری بار سفیر روانہ کرنا	۳۳۵
۱۳۳	سلطانِ ترکی کا سفیر ذوالفقار آغا	۳۳۶
۱۳۴	شاہ جہاں کا ترکی کے لیے تیسری بار سفیر روانہ کرنا	۳۳۹

تیسرا حصہ

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
۱۳۵	تبادل شریعت کی تلاش	۳۳۱
۱۳۶	اکبر اور جہانگیر کے دورِ حکومت میں	۳۴۸
۱۳۷	خواب کی معرفت تبادل شریعت کا جواز	۳۵۴
۱۳۸	تبادل شریعت کا طریقِ کار	۳۶۲
۱۳۹	شریعتِ نبوی سے انحراف	۳۶۴
۱۴۰	اسلامی تصوف اور ویدانت میں کوئی فرق نہیں۔	۳۶۶
۱۴۱	ہندویت کو اسلام پر فوقیت	۳۶۸
۱۴۲	دارا شکوہ اور رام چندر جی صدقِ طلب میں بھائی ہیں۔	۳۷۱
۱۴۳	دارا شکوہ کے وضع کردہ اسلام کی دانشوروں کی طرف سے حمایت	۳۷۳
۱۴۴	دارا شکوہ کو شاہِ بلند اقبال کا خطاب ملنا	۳۷۷
۱۴۵	دارا شکوہ کی ساٹھ ہزاری منصب پر تقرری	۳۷۹
۱۴۶	دارا شکوہ کا حکومت پر غاصبانہ قبضہ	۳۸۱
۱۴۷	حضرت میاں میرؒ کا سوانح نگار	۳۸۵
۱۴۸	ملا شاہ تحریک طریقت بے شریعت	۳۸۸
۱۴۹	ملا شاہ بدخشی اور شاہ جہاں کی مملکت کی پالیسی	۳۹۲
۱۵۰	ملا شاہ بدخشی سے شاہ جہان کی ملاقات	۳۹۴
۱۵۱	ملا شاہ بدخشی کی جشن شاہ جہاں میں شرکت	۳۹۹
۱۵۲	ملا شاہ بدخشی کے بھائی کو انعام دینا	۴۰۰
۱۵۳	ملا شاہ بدخشی اور شاہ جہاں کی تعظیم	۴۰۱
۱۵۴	ملا شاہ بدخشی اور جہاں آرا بیگم	۴۰۳
۱۵۵	ملا شاہ بدخشی اور شہزادہ دارا شکوہ	۴۰۸
۱۵۶	شیخ احمد سرہندیؒ (مجدد الف ثانی) کے پیروکار	۴۱۵
۱۵۷	شریعت اور اورنگ زیب	۴۲۲
۱۵۸	حق و باطل کی جنگ	۴۲۸
۱۵۹	عالمگیر کا لقب	۴۴۲
۱۶۰	شاہ جہاں کی قید اور اسلام	۴۴۳
۱۶۱	دارا شکوہ کا تعاقب اور مراد بخش کی گرفتاری	۴۴۶
۱۶۲	عالمگیر کی تخت نشینی اور شریعت کی حاکمیت کا اعلان	۴۴۷
۱۶۳	دارا شکوہ اور شجاع کا تعاقب	۴۴۹
۱۶۴	عالمگیر کی اسلامی حکومت کے خلاف مہاراجہ جسونت سنگھ کی سازش اور غداری	۴۵۱
۱۶۵	عالمگیر اور شجاع کی جنگ اور عالمگیر کا نمازِ شکرانہ ادا کرنا	۴۵۵
۱۶۶	دارا شکوہ سے آخری جنگ، عالمگیر کی کامیابی	۴۵۸

عرضِ ناشر

حرا پبلی کیشنز کو "مجدد الف ثانی رح کی تحریک احیائے اسلام" شائع کرنے میں جس عمل سے گزرنا پڑا ہے اس کا بیان کیا جانا غیر ضروری ہے لیکن اس کی افادیت اور اہمیت اتنی بسیط ہے کہ زبان اور گرامر کی خامیوں کے باوجود اس کے شائع کیے جانے میں مزید تاخیر دعوت و عزیمت کے عمل کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔

اس کتاب کے مصنف پروفیسر الصار عالم ہیں جن کا انتقال ۵۵ سال کی عمر میں ۱۹۸۱ء میں ہوا۔ کتاب کا مسودہ اس کا متقاضی تھا کہ مصنف اس پر نظر ثانی کر کے اسے قابل اشاعت بناتے۔ لیکن اچانک دل کا دورہ پڑا اور انتقال فرما گئے اور اس طرح نظر ثانی کی نوبت نہ آئی۔ جن صاحب نے بعد ازاں اس کی اشاعت کا ذمہ لیا انہوں نے اس بات کی ضرورت محسوس نہ کی کہ کسی صاحب قلم سے اسے ایڈٹ کرا کر واقعات کی تکرار اور زبان و گرامر کی خامیوں سے پاک کیا جائے اور اس عمل کے بعد اس کی کتابت کرائی جائے۔ اگر وہ صاحب اس طرف توجہ فرماتے تو یہ کتاب ہر لحاظ سے بے حد گرانمایہ ہوتی۔ لیکن انہوں نے اس عمل کے بغیر مسودہ کتابت کرادی لیکن اشاعت کا عمل پانچ سال سے زائد سرد خانہ میں ڈالے رکھا۔

یہ امر بے حد خوشی کا باعث ہے کہ ان صاحب نے میری خواہش کا احترام کرتے ہوئے مسودہ کی کتابت حرا پبلی کیشنز کے سپرد کر دی۔ اور اس طرح یہ کتاب قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ زبان اور گرامر کی خامیوں سے حتی الوسع پاک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف نے متعدد جگہوں پر ماضی کے لیے حال کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ متعدد واقعات کی تکرار اگرچہ قاری کے ذہن پر گراں گزرنے والی ہے لیکن مصنف نے اپنے طور اس تکرار کو غالباً دعوت کو موثر بنانے کا انداز اختیار کیا ہے۔ مصنف کے سامنے در اصل ایک عظیم مقصد تھا کہ حضرت مجدد الف ثانی رح کی تحریک احیائے اسلام کو اس دور کے صاحب فہم و شعور طبقہ سے پوری شرح و بسط کے ساتھ متعارف کرایا جائے کہ آج کا دور شہنشاہ اکبر و جہانگیر کے دور سے مختلف نہیں ہے۔ آج بھی ہم اگر حضرت مجدد الف ثانی رح کی تحریک اور ان کے فکر و عمل سے رہنمائی حاصل کریں تو اکبر و جہانگیر کے موجودہ پیرو کاروں پر ہم فتح و کامرانی حاصل کر پائیں گے۔

خاکسار

شفیق الاسلام فاروقی

کچھ مصنفؒ کے بارے میں

شفیق الاسلام فاروقی

میرے فاضل دوست جناب محمد ادریس صاحب نے اس عظیم کاوش کا جن حسین الفاظ میں اپنے پیش لفظ میں تعارف کرایا ہے، وہ اس کتاب کے مصنف جناب ابصار عالم مرحوم کے بلند علمی ذوق اور جذبۂ تحقیق کو خراجِ تحسین ہے۔

جناب ابصار عالم ۲ جولائی ۱۹۲۶ء کو ضلع الہ آباد (انڈیا) کے قصبہ منڈارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء میں بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ ہائی سکول یونائیٹڈ پراونسز الہ آباد کے تحت میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پورے بورڈ میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۴۹ء میں انٹرمیڈیٹ میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی۔

آپ پاکستان کے معروف دانشور ظفر اسحاق انصاری کے ہم وطن ہونے کے علاوہ بچپن سے ایک دوسرے کے نظریاتی دوست بھی تھے۔ چنانچہ دونوں اصحاب نے ۱۹۴۶ء سے قیام پاکستان تک یو پی کے دیہاتوں میں تحریک پاکستان کی کامیابی کے لیے خوب کام کیا۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد انصاری صاحب تو جلد ہی پاکستان چلے آئے لیکن ابصار عالم انڈیا میں ہی مقیم رہے۔ انصاری صاحب کی دلی خواہش تھی کہ وہ پاکستان آجائیں چنانچہ باہمی خط و کتابت کے ذریعہ انصاری صاحب کے بار بار اصرار پر آپ دسمبر ۱۹۴۹ء میں کراچی آگئے اور ایک عرصہ انہیں کے ساتھ مرحوم کا قیام رہا۔

پاکستان آنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں اردو کالج کراچی بی اے آنرز (جنرل ہسٹری) میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۲ء میں یہ امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۶ء میں جنرل ہسٹری کے مضمون میں ایم اے کیا۔ پھر ۱۹۵۸ء میں اسی یونیورسٹی سے اسلامی تاریخ میں ایم اے کیا۔ اسی دوران

آپ اردو کالج میں تاریخ کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ بعد ازاں ۱۹۶۱ء سے ۱۹۸۱ء تک سندھ یونیورسٹی (جام شورو) میں ہسٹری کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے چیئرمین بھی رہے۔

آپ اسلامی نظریہ کے حامل ایک باصلاحیت صاحبِ کردار شخص تھے۔ جب تحریک پاکستان عروج پر تھی تو آپ الٰہ آباد میں سکول کے طالب علم تھے۔ یہ سکول کانگریس سے متاثر افراد نے قائم کیا تھا۔ جہاں وقتاً فوقتاً سکول انتظامیہ سے مسلمان طلبہ کے اختلافات ہوتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ مقامی کانگریس نے پنڈت نہرو کو ایک جلسہ کی صدارت کے لیے بلایا اور طالب علموں سے کہا گیا کہ وہ پنڈت جی کو ہاتھ جوڑ کر نمستے (سلام) کریں۔ جس پر آپ فوراً بول اٹھے کہ مسلمانوں کے ہاں ہاتھ جوڑ کر سلام کرنے کا طریقہ نہیں ہے۔ اس پر ہیڈ ماسٹر ناراض ہوئے اور آپ کو جرمانہ کر دیا گیا۔

سکول میں صبح کی عبادت کے نام سے پرارتھنا ہوتی تھی جس میں سب لڑکے ہندوانہ طرز کے مطابق ہاتھ جوڑ کر شریک ہوتے تھے۔ اسی طرح مسلمان لڑکوں کو جمعہ کی نماز کے لیے چھٹی نہیں ملتی تھی۔ آپ کی کوشش سے صبح کی عبادت میں ہاتھ جوڑنے کی پابندی ختم ہوئی اور مسلمان لڑکوں کو جمعہ کی نماز کے لیے باقاعدہ چھٹی ہونے لگی۔

قیام پاکستان کے بعد کراچی آنے پر آپ اسلامی جمعیتہ الطلباء میں شامل ہو گئے۔ اور اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے ۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۸ء تک جمعیت کے ناظمِ اعلیٰ رہے۔ اس دوران جمعیت نے آپ کی زیرِ قیادت ذیل کے ملکی اور خارجی محاذوں پر کام کیا۔

(۱) ۱۹۵۶ء کے دستور میں اسلامی دفعات کے شامل کرانے اور ملک کو "اسلامی جمہوریہ پاکستان" قرار دینا۔

(۲) مسئلہ کشمیر کے معاملے میں حکومت پاکستان کے مؤقف کی بھرپور حمایت اور بھارت کے رویہ کی مذمت۔

بالخصوص جب روس نے اس مسئلہ پر سلامتی کونسل میں بھارت کے حق میں ویٹو استعمال کیا تو اس پر جمعیت نے جگہ بہ جگہ احتجاجی جلسے منعقد کر کے پاکستان میں روس کے ذریعہ پاکستانی نوجوانوں کے جذبات حکومتِ روس کو پہنچائے ۔

(۳) بین الاقوامی معاملات میں الجزائر میں فرانس کی جارحیت اور ستمبر ۱۹۵۶ء میں نہر سویز پر برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کے مشترکہ حملے کی مذمت میں احتجاجی جلسے ۔

مرحوم نے اپنی مختصر زندگی میں کئی کتابیں تصنیف کیں ۔ جن میں چند ایک یہ ہیں ۔

۱ ۔ پاکستان : تاریخ کے پس منظر میں ۔

۲ ۔ مسلمانوں کی جد و جہد آزادی ۔

۳ ۔ فرائضی تحریک

۴ ۔ شاہ ولی اللہ کا عہد اور پاک و ہند کے سیاسی حالات ۔

۵ ۔ ۱۸۵۷ء کے اثرات ۔

حضرت مجدد الف ثانی رح کی تحریک احیائے اسلام مرحوم کی آخری کاوش ہے ۔ جس کے شائع کئے جانے کی سعادت مرحوم کے انتقال کے آٹھ سال بعد حرا پبلی کیشنز کو حاصل ہو رہی ہے ۔ آپ ۱۲ ، نومبر ۱۹۸۱ء کو دل کی تکلیف کے باعث اچانک اللہ کو پیارے ہو گئے ۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰاجِعُوْن ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبوت ورسالت کا سلسلہ اپنے محبوب پیغمبر سید الانبیاء و امام الرسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم فرمادیا۔ آپؐ کے بعد نہ کوئی نبی دنیا میں آئے گا نہ کوئی رسول۔ رشد وہدایت قرآن وسنت کی صورت میں تایئد ربانی سے محفوظ ہوچکی ہے۔ البتہ تاریخ کے مختلف ادوار میں انسان اپنی کم عقلی اور مادہ پرست تہذیبوں کی یلغار کے سبب راستہ گم کرتا رہا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جب کبھی ایسی صورت پیدا ہوتی تھی تو اللہ تعالیٰ کسی نبی کو بھیج دیتا تھا۔ لیکن اب چونکہ رسالت کا سلسلہ بند ہو چکا ہے۔ اس لیے رشد وہدایت کی ذمہ داری امت محمدیہؐ کے اہل علم وبصیرت افراد پر ڈالی گئی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے جس میں آپؐ نے ارشاد فرمایا "ہر صدی کے سر پر اس امت کے لیے ایسے لوگ اٹھاتا رہے گا جو اس کے لیے اس کے دین کی تجدید کرتے رہیں گے۔ (ابوداؤد عن ابوہریرہؓ)

تجدید کا یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ مجددین اپنی طرف سے کوئی نئی چیز دین میں داخل نہیں کرتے بلکہ وہ دین کو اس کی اصلی صورت میں نکھار کر لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ اس امت میں پیدا ہونے والے مجددین کی بڑی لمبی فہرست ہے۔ ان میں سے بعض وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین کے کسی خاص پہلو پر تجدید واحیا کا فریضہ سرانجام دیا اور بعض وہ حضرات ہیں جن کی جہود جامع تھیں۔ ہماری تاریخ کے

نمایاں ترین مجددین میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، آئمہ اربعہؒ، امام بخاری و مسلمؒ، امام غزالیؒ، امام ابن تیمیہ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ، سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہید رحمہم اللہ علیہم اجمعین کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

ان تمام بزرگوں کے تجدیدی کارناموں اور جدوجہد پر اہلِ قلم نے بہت کچھ لکھا ہے۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کی کتاب تجدید و احیائے دین اختصار کے باوجود اس موضوع پر بڑی جامع اور مفید دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کے دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں اور ہر جگہ تشنگانِ علم نے اس قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ برِ صغیر پاک و ہند کے معروف ترین مجدد تھے انہیں اس خطے میں مجددین کے درمیان متقدم اور پیش رو ہونے کا شرف بھی حاصل ہے حضرت صاحبِ تصنیف بھی تھے اور صاحبِ حال بھی۔ آپ نے ملوکیت کے جبری نظام میں نعرہ حق بلند کیا اور آزمائشیں جھیلنے کے باوجود اپنی دعوت سے کبھی روگردانی نہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسی قبولیت اور ہر دلعزیزی عطا فرمائی کہ امام احمد بن حنبلؒ کی طرح زندگی ہی میں لوگوں کی عقیدت و محبت کا مرکز و محور بن گئے۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے منظوم ہدیہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

حاضر ہوا میں شیخِ مجددؒ کی لحد پر — وہ خاک ہے کہ زیرِ فلک مطلعِ انوار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے — اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے — جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایہ ملّت کا نگہبان — اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار
کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو — آنکھیں مری بینا ہیں، ولیکن نہیں بیدار

آئی یہ صدا سلسلۂ فقر ہوا بند | ہیں اہلِ نظر کشورِ پنجاب سے بیزار
عارف کا ٹھکانا نہیں وہ خطہ کہ جس میں | پیدا کلہ فقر سے ہو طرّۂ دستار
باقی کلہِ فقر سے تھا ولولہ حق | طرّوں نے چڑھایا نشہ خدمتِ سرکار

حضرتِ مجدد کا نام نامی احمد بن شیخ عبد الاحدؒ تھا آپ کا سلسلہ نسب اڑتالیس پشتوں کے بعد امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضؓ سے جا ملتا ہے ۔ اسی وجہ سے آپ کو فاروقی بھی کہا جاتا ہے ۔ آپ کی پیدائش ہند کے معروف قصبے سرہند شریف میں ہوئی اور وہیں آپ مدفون ہیں ۔ اپنے مولد و مسکن کی وجہ سے آپ کو سرہندی بھی کہا جاتا ہے ۔ یہ بات بھی قارئین کے لیے باعثِ دلچسپی ہو گی کہ قصبہ سرہند آپ کے جدِّ امجد شیخ رفیع الدین عرف امام نماز نے سلطان فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں بادشاہ کے مشورے سے آباد کیا تھا ۔ حضرت کی ولادت بعض مؤرخین کے مطابق ۹۷۱ ھ بمطابق ۱۵۵۹ء بیان کی گئی ہے جبکہ مولانا مودودیؒ کی تحقیق کے مطابق آپ کا سنِ پیدائش ۹۷۵ ھ بمطابق ۱۵۶۳ء ہے ۔

آپ کے آباؤ اجداد میں بہت سے علماء اور صوفیاء کے نام ملتے ہیں ۔ اس کے علاوہ والیٔ کابل سلطان شہاب الدین علی الملقب بہ فرخ شاہ بھی آپ کے اجداد میں شامل ہیں ۔ یہ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے ہندوستان پر کئی حملے کیے ۔ فتح و کامرانی کے پھریرے لہرائے ۔ بعد میں انھوں نے بھی تصوّف کی زندگی اختیار کر لی تھی ۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے بچپن میں قرآنِ مجید حفظ کیا پھر اپنے والدگرامی شیخ عبد الاحد اور دیگر اساتذہ سے علومِ دینی کی تحصیل میں مصروف ہو گئے ۔ تحصیلِ علم کے سلسلہ میں مختلف شہروں کا سفر کیا ۔ آپ سیالکوٹ میں بھی کچھ عرصہ رہے ۔ جہاں شیخ محقق کمال کاشمیری سے بعض کتابیں پڑھیں ۔ آپ کی شخصیت پر سب سے زیادہ اثر حضرت خواجہ باقی باللہ کی ذاتِ والا صفات نے ڈالا ۔ حضرت باقی باللہ اپنے دور میں تصوف و طریقت کے سب سے بڑے مرجع اور صاحب عرفان بزرگ تھے ۔ حضرت مجددؒ

بارہا حضرتِ خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور روحانی مدارج اور تزکیہ نفس کے مراتب حاصل کیے ۔ حضرتِ خواجہ نے آپ کو اپنا خلیفہ بنا کر واپس سرہند بھیجا جہاں آپ نے اسلام کی روشنی پھیلانے کا سلسلہ جاری رکھا ۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کو آپ پر بڑا اعتماد تھا انہوں نے حضرتِ مجددؒ کے بارے میں ان کی پہلی حاضری کے چند دن بعد ان خیالات کا اظہار فرمایا ۔

"حال میں سرہند سے ایک شخص شیخ احمد نامی آیا ہے ۔ نہایت ذی علم ہے ۔ بڑی عملی طاقت رکھتا ہے ۔ چند دن فقیر کے ساتھ ہی اس کی نشست و برخاست ہوئی ہے ۔ اس دوران میں اس کے حالات کا جو مشاہدہ ہوا ان کی بنا پر توقع ہے یہ ایک چراغ ہوگا جو دنیا کو روشن کردے گا ۔" (تجدید و احیائے دین صفحہ ۸۶ ، ۸۷)

مغل شہنشاہ اکبر نے برسرِ اقتدار آنے کے کچھ عرصے بعد ہندوؤں کے زیرِ اثر اسلام کے خلاف سرکاری سرپرستی میں ایک زبردست مہم چلائی ۔ اکبر کے دینِ الٰہی کے بارے میں آج شاید ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اسلام کے خلاف وہ کتنی بڑی سازش تھی ۔ اسلامی شعائر کا مذاق اڑایا جاتا اور قرآن اور صاحبِ قرآن علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توہین کی جاتی ۔ اکبر نے اسلام کے خلاف جو زہریلا بیج لویا تھا اس کے زہریلے برگ و بار میں سے یہ شیطانی نظریہ بھی تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت صرف ایک ہزار سال کے لیے تھی ۔ اب چونکہ ہزار سال پورے ہو گئے ہیں اس لیے وہ دین اور شریعت منسوخ ہو چکی ہے ۔ سرکاری سرپرستی اور زوردار مہم کے ذریعے یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ اب نیا دور شروع ہو گیا ہے جس کے لیے ایک نئے دین کی ضرورت ہے ۔ اس فتنے کا مقابلہ کرنے کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ کی مشیت نے ایک نہایت قابل ، بہادر اور صاحبِ بصیرت و حکمت مجدد پیدا فرمایا ۔ حضرت شیخ احمد سرہندی کو مجدد الف ثانیؒ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اکبر کے اس باطل نظریے کے مقابلے پر آپ نے یہ ثابت کر دیا کہ اسلام اور شریعت محمدیہ ہزار سال کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے ہے ۔

امت نے آپ کی خدمات کی وجہ سے آپ کو ایک صدی کا مجدد کہنے کی بجائے ہزار سال کا

مجدد تسلیم کیا۔ اکبر کے پیدا کیے ہوئے فتنے کے سامنے علمائے سُو خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے تھے۔ ان میں سے بہت سے اکبر کے ہم نوا بن کر دنیا کماتے رہے۔ سرکاری خزانے اور فوج کے بل بوتے پر دینِ الٰہی کا بے پناہ پرچار کیا گیا۔ درباری ادیبوں اور شاعروں نے دینِ الٰہی کی ترویج میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر پھونکوں سے نورِ حق کب بجھ سکتا ہے؟ اکبر کا پرپوتا محی الدین اورنگ زیب عالمگیر دینِ الٰہی پر تبصرہ کرتے ہوئے پکار اٹھا تھا: "جدِ من اکبر نہ بود اکفر بود"۔ یہ حضرت مجددؒ کے تجدیدی کارنامے کی ایک جھلک تھی جس نے شاہی خاندان کا رُخ دینِ الٰہی سے دوبارہ دینِ اسلام کی طرف پھیر دیا تھا۔

اکبر کے دینِ الٰہی اور اس سے پیدا ہونے والی فتنہ انگیزیوں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ یہاں تفصیلات کی نہ گنجائش ہے نہ موقع۔ مختصراً میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سرزمینِ ہند میں مختلف مقامات پر اس پر آشوب دور میں بعض نیک دل بزرگانِ دین شمعِ اسلام کو فروزاں کیے رہے مگر ان کا کام بہت محدود اور ابھرتے ہوئے اس طاقت ور فتنے کے مقابلے پر تقریباً غیر موثر تھا۔ جس شخصیت کو اللہ تعالیٰ نے اس فتنے کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائی وہ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ تھے۔ اس عظیم جدوجہد کے دوران حضرت مجددؒ پر دورِ ابتلا و آزمائش بھی آیا مگر وہ ہر آزمائش پر پورے اترے۔ گوالیار کے قلعے میں آپ نے جس استقامت و پامردی کا مظاہرہ کیا اس نے آپ کو مخالفین کی نظروں میں بلند مقام عطا کیا۔ ایک مصلح کے حیثیت سے آپ نے شاہی دربار میں بھی بلا خوف و خطر کلمۂ حق بلند کیا اور قلعے کی چار دیواری کے اندر قید کے دوران میں بھی سنتِ یوسفی کو زندہ کیا۔ آپ نے بیک وقت کئی محاذوں پر جنگ لڑی اور میرے نزدیک یہ ان کی سب سے بڑی کرامت ہے کہ تنِ تنہا اس مشکل کام کا بیڑا اٹھانے کے بعد ان کے قدم کبھی پیچھے نہیں ہٹے بلکہ مسلسل پیش قدمی کرتے رہے۔ مطلق العنان بادشاہت میں ایسی تحریک چلانا کس قدر مشکل ہوتا ہے محتاجِ بیاں نہیں۔ آپ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل تھا کہ آپ سے شہزادے اور جرنیل بھی متاثر ہوئے اور سپاہی و مزدور بھی۔ غیر مسلموں کو

آپ نے اسلام میں داخل کیا اور پیدائشی مسلمانوں کو باعمل و باکردار مسلمان بنایا۔

ایک دور میں شہنشاہ جہانگیر بھی آپ کی مخالفت کرتا رہا اور آپ کو دبانے کے لیے شاہی قوت کا بھرپور استعمال کیا مگر آپ کا سر نہ جھکا سکا بالآخر آپ کے کردار سے متاثر ہو کر حلقہ بگوشِ عقیدت ہوا اور اپنے بیٹے شہزادہ خرم کو آپ کی بیعت میں دے دیا۔ یہی شہزادہ خرم بعد میں شاہجہان کے نام سے ہندوستان کا حکمران بنا۔ مغلیہ خاندان میں سب سے زیادہ متقی حکمران اورنگ زیب تھا۔ اورنگ زیب اگرچہ حضرت مجددؒ کی وفات کے بعد پیدا ہوا مگر اس کی شخصیت حضرت کی تجدیدی کاوشوں سے متاثر و مزین تھی۔ یہ بھی میرے نزدیک شیخ سرہندی کا کارنامہ تھا۔ کہ ہندوستان کو اورنگ زیب جیسا زاہد و عابد، درویش منش، علم دوست اور مجاہد حکمران نصیب ہوا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے الفاظ میں "وہ شیخ ہی کے پھیلائے ہوئے اصلاحی اثرات تھے۔ جس کی بدولت تیموری خاندان کے اس شہزادے کو وہ علمی اور اخلاقی تربیت ملی تھی۔ کہ اکبر جیسے ہادمِ شریعت کا پرپوتا خادمِ شریعت ہوا۔"

(تجدید و احیائے دین صفحہ ۸۷، ۸۸)

حضرت مجددؒ نے چومکھی لڑائی لڑی۔ ایک جانب دینِ الٰہی کو چیلنج کیا اور مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے اسے بیخ بن سے اکھاڑ پھینکا دوسری جانب عام مسلمانوں میں پھیلی ہوئی بدعات، رسومِ جاہلیہ اور شرک کے مقابلے پر قرآن و سنّت کی روشنی میں توحید پر مبنی دینِ اسلام پیش کیا۔ تیسری جانب تصوف کی دنیا میں غلو اور افراط و تفریط کو محسوس کیا اور اس کی اصلاح کی کامیاب کوشش کی۔ تصوف کے مختلف طرق کے مشائخ سے روابط قائم کیے اور نہایت حکمت تدبر اور محبت کے ساتھ ان کی اصلاح کی سبیل نکالی۔ مکتوبات میں کئی مقامات پر آپ نے تصوف و طریقت کے لطائف بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تصوف میں در آنے والے غیر مطلوب رجحانات کی نشاندہی کی ہے اور کہیں کہیں ان پر تنقید بھی فرمائی ہے۔ شیخ چتری کے نام اپنے خط میں بیان کرتے ہیں "مدتِ دراز تک علم و معرفت حال و وجد کی موسلا

دھار بارش مجھ پر ہوتی رہی ہے۔ راہِ سلوک و تصوف میں جو کچھ بھی ملا خداوندِ پاک کے فضل و کرم سے ملا۔ اب میری حالت یہ ہے کہ سوائے اس کے کوئی آرزو باقی نہیں رہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی کسی مردہ سنّت کو زندہ کردوں۔ رہا حال و وجد کا معاملہ تو میں نے اس سے بے نیاز ہو کر اسے اربابِ ذوق کے لیے چھوڑ دیا ہے۔" خواجہ جہاں کے نام اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ "کامیابی کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ حضور اکرمؐ اور خلفائے راشدین کی مکمل اتباع کی جائے۔" اسی طرح شیخ تھانیسری کے نام اپنے طویل مکتوب میں لکھتے ہیں "فرائض کی ادائیگی نوافل پر مقدم ہے۔ فرائض سے غفلت برت کر نوافل کے ذریعے کبھی مقصود حاصل نہیں ہو سکتا۔" اس کے بعد مؤطا امام مالک کی ایک حدیث نقل کی ہے جس میں امیر المؤمنین عمر فاروق رضؓ اور سلیمان بن ابی حشیمہ کا تذکرہ ہے۔ حدیث بڑی ہی ایمان افروز ہے۔

حضرت مجددؒ اس عملی جہاد کے ساتھ درس و تدریس اور تالیف و تصنیف کا کام بھی کرتے رہے۔ آپ کی تصانیف بڑی وقیع اور بلند پایہ ہیں۔ آپ کی جملہ تصانیف میں علمی و روحانی رنگ پایا جاتا ہے۔ آپ بیک وقت دل کو بھی مخاطب کرتے ہیں۔ اور دماغ کو بھی۔ روافض کے رد میں آپ نے ایک رسالہ تحریر فرمایا۔ جس کا نام تھا رسالہ "تہلیلیہ"۔ اس کے علاوہ "اثبات النبوت"، "مبداؤ معاد"، مکاشفات غیبیہ"، آداب المریدین"، رسالہ ردِ شیعہ"، آپ کی مشہور مؤلفات ہیں۔ کوچۂ تصوف میں آپ نے کافی رہ نوردی کی اور اپنے ذاتی تجربات اور سلوک و منزل کے احوال بڑی تفصیل کے ساتھ ایک رسالے میں تحریر فرمائے ہیں۔ اس رسالے کا نام ہے "معارف الدنیہ"۔ شیخ شہاب الدین سہروردی کی مشہور زمانہ کتاب جو صوفیا کے بعض طرق میں بطور نصاب شامل رہی ہے۔ اور جس کا نام "عوارف المعارف" ہے حضرت مجددؒ کی خصوصی توجہ کی مستحق ٹھہری۔ آپ نے اس کتاب کی شرح بھی لکھی اور اس کے بعض مقامات پر تعلیق و تبصرے بھی تحریر فرمائے۔ اس شرح کا نام "تعلیقات عوارف" ہے۔

آپ کی تالیفات میں سب سے زیادہ شہرت آپ کے مکتوبات کو نصیب ہوئی۔

آپ کے مکتوبات تین ضخیم جلدوں میں مختلف مقامات سے بارہا چھپ چکے ہیں۔ آپ مجدد اور مجتہد تھے اس لیے آپ کا ہر مکتوب اپنی جگہ ایک مستقل رسالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اختصار ملحوظ ہے ورنہ جی چاہتا ہے کہ بعض مکتوبات سے کچھ اقتباسات نقل کیے جاتے۔ تین چار صدیاں گزر جانے کے باوجود یہ مکتوبات آج بھی تر و تازہ اور مفید ہیں۔

حضرت مجدد رح کی شخصیت اور تجدیدی کارنامے پر ہمارے محترم بھائی جناب الصار عالم مرحوم نے ایک بڑی معرکۃ الآرا کتاب تصنیف فرمائی تھی۔ یہ کتاب ان کی زندگی میں طبع نہ ہوسکی اب ان کی وفات کے چند سال بعد حرا پبلیکیشنز نے اسے شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ یہ ارادہ نہایت مبارک ہے اور مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ طالبانِ علم اور شیخ مجدد سے عقیدت رکھنے والے قارئین کرام اسے نہایت مفید اور معلومات افزا پائیں گے۔

فاضل مصنف مرحوم دسمبر ۱۹۵۶ء تا اکتوبر ۱۹۵۷ء اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظمِ اعلیٰ رہے تھے۔ طبعاً نہایت شریف النفس اور مرنجاں مرنج قسم کے انسان تھے۔ جامعہ کراچی سے ایم اے جنرل تاریخ اور ایم اے اسلامی تاریخ کرنے کے بعد تدریس کے شعبے میں داخل ہوئے۔ ۱۲، نومبر ۱۹۸۱ء میں پچپن سال کی عمر میں دل کا دورہ پڑنے سے اچانک انتقال کر گئے۔ وفات کے وقت سندھ یونیورسٹی جامشورو میں تاریخ کے پروفیسر تھے۔ مصنف مرحوم سے میری دو مرتبہ ملاقات ہوئی۔ ایک مرتبہ حیدرآباد سے کراچی اکٹھے بس میں سفر کیا اور دوسری مرتبہ کراچی میں ایک تقریب میں باہمی نشست رہی۔ میں نے انہیں نہایت ملنسار اور خلیق انسان پایا۔ آپ حد درجہ منکسر المزاج اور درویش منش استاد تھے۔ کئی علمی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کا مختصر تعارف اس کتاب میں "کچھ مصنف کے بارے میں" کے زیرِ عنوان الگ بھی دیا جا رہا ہے۔

اپنی زیرِ نظر کتاب "مجدد الف ثانی رح کی تحریک احیائے اسلام" میں مرحوم نے حضرت شیخ احمد سرہندی رح کے تجدیدی کارناموں کو بڑی شرح و بسط اور تحقیق کے ساتھ مدون کیا ہے۔ جس ماحول اور معاشرے میں حضرت مجدد رح نے آنکھ کھولی اس کی نقشہ کشی بھی کی گئی ہے۔

مغلیہ دور تھا اور شہنشاہِ اکبر اور اس کے اسلام دشمن حواریوں کے ہاتھوں اسلام کے بنیادی عقائد و تصورات کو مسخ کرنے کی مذموم مہم جاری تھی۔ مغلیہ سلطنت میں ہر دور میں جنگ تخت نشینی عجیب و غریب قسم کے گل کھلاتی رہی۔ اکبر نے اپنے بیٹے شہزادہ سلیم کی جگہ سلیم کے بیٹے اور اپنے پوتے شہزادہ خسرو کو جانشین بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بظاہر یہ ایک سیاسی تنازعہ تھا جس سے اہلِ دین کو کوئی سروکار نہ ہو سکتا تھا مگر حضرت مجدد الف ثانیؒ کی دور رس نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ اس جنگ تخت نشینی میں اگر خسرو کامیاب ہوا تو راجہ مان سنگھ اور مرزا عزیز بیگ کوکہ (خان اعظم) دین الٰہی سے بھی معاملہ آگے لے جائیں گے۔ سکھوں کے گرو ارجن سنگھ بھی خسرو کے طرفدار تھے۔

شہزادہ سلیم (جو جہانگیر کے لقب سے ہندوستان کا بادشاہ بنا) اپنے باپ اور اپنے بیٹے کے مقابلے پر تختِ دہلی کے حصول کی جنگ میں کمزور تھا۔ اعیان سلطنت اس کی بجائے اکبر کے ساتھ تھے۔ سلیم کا اپنا کردار بھی کچھ اچھا نہ تھا۔ مگر حضرتِ مجددؒ کی خداداد صلاحیتوں اور دور رس نگاہوں نے ان پر یہ حقیقت آشکار کر دی تھی کہ سلیم کی کامیابی کی صورت میں "دینِ الٰہی" کا فتنہ ختم کیا جا سکتا ہے۔ نیز سلیم بدعمل ضرور ہے بدنیت نہیں اس لیے اس کی اصلاح بھی ممکن ہے۔ چنانچہ حضرت مجددؒ نے شہزادہ سلیم کی حمایت کی اور اس کے لیے اعیانِ سلطنت میں سے اپنے ایک معتمد اور عقیدت مند شیخ فرید کو آمادہ کیا کہ وہ سلیم کا ساتھ دیں۔ انہوں نے سلیم کی حمایت میں بڑی شجاعت کا مظاہرہ کیا اور فتوحات کے ذریعے اس کی تختِ دہلی تک رسائی کا راستہ کھول دیا۔ مصنف مرحوم نے اس اہم موضوع پر اپنی کتاب میں بہت اچھے انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

مغلیہ دور کے دیگر بادشاہوں کے احوال اور جنگوں کے تذکرے بھی کتاب میں شامل ہیں۔ جو دلچسپ اور مستند تاریخی حوالوں سے مزین کیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر اردو ادب میں ایک نہایت مفید علمی اضافہ ہے۔ مغلیہ سلطنت کے عروج و زوال پر بہت

سے لوگوں نے قلم اٹھایا ہے مگر مغلیہ سلطنت کے دور میں اٹھنے والی اس تحریک نے کس طرح حالات کا مقابلہ کیا اور تاریخ کا دھارا موڑا اس کی جھلکیاں جس طرح البصار عالم صاحب نے پیش کی ہیں وہ بہت کم مل سکتی ہیں۔

کتاب کے مصنف تو اپنا سفر مکمل کر کے عالم فانی سے دنیائے جاودانی کو جا چکے ہیں۔ میں نے کتاب کے جستہ جستہ حصے دیکھے ہیں میری رائے میں بعض مقامات پر کچھ تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ اس وقت چونکہ ناشر کتاب کو جلد شائع کرنا چاہتے ہیں اس وجہ سے کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ طبع اوّل کے بعد اہل ذوق و ارباب نظر کتاب کا مطالعہ کر کے ممکن ہے کچھ تجاویز پیش کریں۔ دوسرے ایڈیشن میں انہیں ملحوظ رکھا جا سکتا ہے۔

آخر میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مصنف مرحوم ہم سب کے تشکر یئے اور دعائے مغفرت کے مستحق ہیں کہ ایک نہایت اہم تاریخی گوشہ بڑی کاوش اور محنت سے مرتب کر گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس نیکی کو دیگر حسنات کے ساتھ قبول فرمائے اور ان کے درجات کی بلندی کا موجب بنا دے۔

والسلام

حافظ محمد ادریس (منصورہ)

۱۷ ستمبر ۱۹۸۹ء مطابق ۱۶ صفر ۱۴۱۰ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجددؒ الف ثانی کی تحریک احیاء اسلام

اسلامی اور غیر اسلامی تحریک کی نوعیت:-

مغربی تہذیب و تمدن کے غلبہ و اقتدار اور اسلامی شعائر اور اقدار کی روز بروز گرفت کمزور ہونے سے عام لوگوں میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اب مغربیت اور مادیت کے اس دور میں غلبہ انہیں غیر اسلامی اقدار کا رہے گا اور اسلام کے حق ہونے پر ایمان اور اعتقاد کے باوجود عملاً اس کا برپا ہونا ممکن نہیں اور کوشش کرنا محض ایک لاحاصل فرض کی ادائیگی ہے۔ یہ تصور اور احساس دنیا کی دوسری تہذیبوں اور تمدن کے متعلق تو تاریخی حیثیت سے درست ہو سکتا ہے اس لیے کہ جو تہذیب و تمدن ایک بار مغلوب ہو گئی پھر کبھی اس کو زندہ کرنے کے لیے لوگوں میں حوصلہ نہ ہوا۔ لیکن اسلام کے متعلق یہ بات بالکل غلط ثابت ہوتی ہے۔ اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن کی تاریخ پر اگر ایک نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ اسلام کے خلاف ہمیشہ سے غیر اسلامی طاقتیں نبرد آزما رہی ہیں اور اس کو مغلوب کرنے کی کوشش کی ہے اور بسا اوقات اپنی اس کوشش میں بظاہر کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ لیکن انہیں کبھی دیرپا قیام، غلبہ اور پائیداری اسلام کے مقابلے میں حاصل نہیں ہو سکی۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی غیر اسلامی طاقتیں اسلام پر غالب آئیں تو وہ اپنے حسن، خوبی اور افادیت یا مقبول عام کی وجہ سے نہیں بلکہ کچھ تو مسلمانوں کی خود اپنی کوتاہیوں، غفلت، کوتاہ اندیشی اور جاہلانہ حرکتوں اور مشرکانہ رسوم کی وجہ سے، دوسرے اس

صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بعض ناعاقبت اندیش، متکبر، خود پسند، مطلق العنان مسلم حکمرانوں نے جبر و تشدد اور قوت و اقتدار کے بل بوتے پر عامۃ المسلمین کی مرضی و منشاء کے علی الرغم ان کے سروں پر غیر اسلامی نظریات و تصورات کو زمانے کی ضرورت اور تقاضے قرار دے کر اور اسے عین اسلام ثابت کر کے مسلط کرنے کی سعی کی ہے۔ اور پھر اس کو دوام بخشنے کے لیے ایک طرف تو احیاء اسلام کی جدوجہد کرنے والوں کے خلاف تشدد کا رویہ اختیار کیا گیا۔ اور دوسری طرف مصلحین امت پر اتہام، دشنام طرازی اور انہیں دشمن اسلام اور سالوس اور مکار کا خطاب دے کر عوام الناس کو گمراہ کرنے کی کوششیں و تدبیریں کی گئیں اور ساتھ ہی کمزور، پست حوصلہ اور اقتدار پرست علماء سو کی خدمات حاصل کی گئیں جو ان کے اقتدار کے تحفظ کے لیے ان کی مدح سرائی کرتے تھے اور انہیں اسلام کا علمبردار، نقیب، امام عادل اور خلیفۃ الارض ثابت کرتے تھے۔ ایسے علماءِ سو کے لیے حکومت کے خزانے مملکت کے اعلیٰ عہدے، مناصب اور خطابات کے دروازے کھول دیے جاتے لیکن ان تمام ہتھکنڈوں کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ کے ہر دور میں ایسے روشن ضمیر، باہمت، بلند حوصلہ، بالغ نظر، مصلح امت اٹھتے رہے ہیں۔ جنہوں نے وقت کے ساتھ چلنے کے بجائے زمانے کی غیر اسلامی روش عام کو چیلنج کیا، اُسے دعوت مبارزت دی اور ہر خطرے اور مشکل کا مقابلہ کر کے تاریخ کے دھارے کو یکسر موڑ دیا۔ جس کی بظاہر کوئی سبیل نظر نہ آتی تھی۔ یہ مصلحین امت زمانے کے ساتھ چلنے کے فلسفہ کی بجائے "با زمانہ ستیز" "بساز" کے فلسفہ پر عمل کرتے رہے ہیں۔ ان کے واقعات اور حالات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلم قوم کی فطرت اور اجتماعی نفسیات کچھ ایسی ہے کہ عامۃ المسلمین کا سواد اعظم کبھی غیر اسلامی طاقت کے سامنے جھکنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا وہ وقتی یا سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر غیر اسلامی تصورات اور اقتدار کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور احیاء اسلام کی جدوجہد کے لیے جان و مال کا خوف و خطرہ کبھی اسے ایثار اور قربانی سے باز نہیں رکھتا۔ اسلام کا یہ ایک زبردست معجزہ ہے کہ تاریک سے تاریک دور میں، ناسازگار سے ناسازگار حالات میں بھی جبر و استبداد

کے زیر سایہ بھی جب کہ مطلق العنان شہنشاہیت کا ہی دور دورہ تھا۔ اسلام نے اپنے معتقدین میں ان غیر اسلامی عناصر کے خلاف ہمت، استقامت پیدا کی ہے اور انہیں آمادہ عمل کیا ہے کہ وہ مایوس ہونے کے بجائے کفر و شرک اور غیر اسلامی طاقتوں کے خلاف اعلان جنگ کریں۔ چنانچہ متعدد ایسی مثالیں مسلمانوں کی تاریخ سے ملتی ہیں۔ جہاں اللہ کا ایک بندہ عزم صمیم لے کر، جو غیر اسلامی طاقتوں کے مقابلے میں وسائل و ذرائع کے لحاظ سے کسی حیثیت کا مالک نہیں ہوتا وہ ان طاغوتی عناصر کے خلاف اعلان جہاد کرتا ہے اور الحاد و طغیان کی قوت کو زیر کرکے تاریخ کے رخ کو اسلام کی سمت موڑ دیتا ہے وہ اس کے لیے جبر و استبداد کا رویہ یا لوگوں کے ضمیر و ایمان کی خرید و فروخت نہیں کرتا اور نہ اپنے مخالفین پر اتہام و دشنام طرازی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس اسلام کی دعوت و تبلیغ، لوگوں کے ذہن و فکر کی تطہیر، ان کے دل و دماغ کی بیماریوں کی اصلاح سے ان کے تزکیہ نفس، خوف خدا اور فکر آخرت کی اسپرٹ بیدار کرکے ان میں خود ایسی تڑپ و پیاس پیدا کر دیتا ہے کہ وہ از خود اسلام و احیاء اسلام کا ایک پرجوش مبلغ اور ایک سرگرم سپاہی ہو جاتا ہے۔

اسلامی عقائد و روایات پر حملے اور ان کا تمسخر :۔

تاریخ پاک و ہند میں مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک احیاء اسلام اس سلسلے کی ایک درخشندہ مثال ہے۔ ان کے عہد میں اسلام اور عامۃ المسلمین پر وہ کونسی ایسی بلا تھی جو نازل نہ ہوئی ہو، کفر و شرک کا غلبہ تھا۔ شعائر اسلام کی علانیہ بے حرمتی ہوتی تھی بلکہ ان کا مذاق اڑایا اور تمسخر کیا جاتا تھا۔ ہندوؤں کی سازش، مکر و فریب اور نفاق کیشوں کے غلبہ و اقتدار اور شہنشاہ اکبر کی لایعنی اور احمقانہ جدت طرازیوں سے اسلامی معاشرت کا نقشہ ہی الٹ گیا تھا۔ اکبر کی مجلسوں میں :۔

"دین کے ہر مسئلہ اور ہر عقیدے پر شبہات وارد کیے جانے، خواہ وہ اصول سے متعلق ہوں یا فرع سے، مثلاً نبوت، کلام، رویت، انسان کا مکلف

ہونا اور تکوین حشر ونشر وغیرہ اور ہر ایک کا تمسخر و استہزاء کیا جاتا[1]۔ اس نے دھڑلے سے عقائد و مسائل میں نئی نئی اختراعات شروع کر دیں۔ چنانچہ قرآن کو مخلوق قرار دیا۔ وحی کو امر محال کہا۔ نبوّت و امامت کے بارے میں شکوک پیدا کیے۔ فرشتے اور دوسرے تمام امور غیبی معجزوں اور کرامتوں کا انکار کیا۔ قرآن کے تواتر اور اس کے کلام الٰہی ہونے پر اعتراضات وارد کیے۔ مرنے کے بعد بقائے ارواح اور عذاب و ثواب کو صرف تناسخ پر منحصر کر دیا[2]۔ اسلام جاہلوں اور عرب کے بدّوؤں کا مذہب قرار پایا اس لیے وہ کسی مہذب، شائستہ قوم کے لیے موزوں مذہب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ عرب کے بدّو سب کے سب مفسد، بٹ مار اور رہزن تھے۔ اس کے لیے شاہنامہ فردوسی کے ذیل کے شعر کو بطور سند پیش کرتا تھا[3]۔ ع

ز شیر شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائے رسیدہ است کار

"معراج نبوی کا بھی انکار کیا جاتا اور کبھی کبھی بھرے دربار میں بیٹھے بیٹھے یکایک ایک ٹانگ پر کھڑا ہو جانا اور اس کے بعد یہ تقریر کرتا کہ آخر اس بات کو عقل کس طرح مان سکتی ہے کہ ایک شخص بھاری جسم رکھنے کے باوجود یکایک نیند سے بیدار ہو کر آسمانوں پر چلا جاتا ہے اور نوے ہزار .... بات ۹ خدا سے کرتا ہے۔ لیکن اس کا بستر اس وقت تک گرم ہی رہتا ہے اور لوگ اس دعوے کو مان لیتے ہیں۔ اور اسی طرح شق القمر وغیرہ جیسی باتوں کو بھی مان لیتے ہیں۔ پھر اپنی اٹھی ہوئی ٹانگ کی طرف حاضرین کو مخاطب کر کے سوال کرتا۔ ناممکن ہے کہ جب تک دوسرا پاؤں زمین سے ٹکا نہ ہو کھڑا نہیں رہ سکتا۔ آخر یہ کیا قصے

---

[1] ملا عبدالقادر بدایونی۔ منتخب التواریخ ص٥٠٠ مطبع۔ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور۔

[2] ملا عبدالقادر بدایونی۔ منتخب التواریخ ص٢٧٩ مطبع۔ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور۔

[3] منظور احمد نعمانی (مرتبہ) تذکرہ مجدد الف ثانی رح ص٣٧ و بدایونی ص٥٠٠

ہیں۔[۵۴] گویا معراج کا واقعہ خلاف عادت اپنی اٹھی ہوئی ٹانگ سے ثابت کیا جاتا۔ یہیں تک معاملہ نہ تھا بلکہ ذات نبوی پر اعتراض کیا جاتا۔ خصوصاً ہجرت کے آغاز میں قریش کے قافلہ کو لوٹ لینے کے متعلق، حضورؐ کے چودہ نکاح کرنے اور آپ کی رحلت کے بعد دوسروں پر آپ کی بیویوں کے حرام ہونے کے سلسلے میں بڑے اعتراض اٹھائے گئے اور لایعنی بحثیں نکالی گئیں۔[۵۵] اکبرؔ کی محفلوں میں جب سیرت کی کتابیں پڑھی جاتیں تو یہ لوگ ایسی بے ادبانہ باتیں کرتے۔

خاص طور سے خلفائے ثلاثہ کی خلافت، قضیۂ، فدک و جنگ صفین کے سلسلے میں ان کی زبانیں اس بے باکی سے چلتی تھیں کہ انہیں بیان کرنے سے قلم قاصر ہے۔[۵۶]

معاملات یہیں ختم نہیں ہوتے بلکہ احمدؐ، محمدؐ اور مصطفےٰؐ نام بیرونی کافروں اور حرم کی کافرزادیوں کی خاطر اس شخص (اکبرؔ بادشاہ) پر گراں گزرنے لگے۔ آخر کچھ دن بعد اپنے چند خاص لوگوں کے نام اس نے بدل بھی ڈالے۔ مثلاً یار محمد اور محمد خاں کو وہ رحمت خاں ہی کے نام سے پکارتا بھی تھا اور لکھنے کے وقت بھی ان کو اسی نام سے موسوم کرتا۔[۵۷] اکبرؔ کی انہیں بداعتقادیوں کو دیکھ کر مخالفین اسلام کی جرأتیں بڑھنے لگیں اور اسلامی عقائد اور فروعی مسائل کا علانیہ مذاق اڑانے لگے۔ بدبخت ہندو اور ہندو مزاج مسلمان نبوت کے بارے میں زبان درازیاں کرنے لگے۔ علماء سو نے دینی کتابوں میں نعت کے بجائے تبرّا شروع کر دیا۔ توحید کے ذکر کے بعد وہ حسب قاعدہ نعت کے بجائے بادشاہی القاب لکھنے لگے۔[۵۸] حالات روز بروز خراب ہونے لگے

---

۵۴ بدایونی۔ ص۵۰۶۔

۵۵ بدآیونی ص۵۰۰۔

۵۶ بدآیونی ص۵۰۱۔

۵۷ بدآیونی ص۵۰۵۔

۵۸ بدآیونی ص۴۷۷۔

پھر یہاں تک عیسائیوں کی جسارت اتنی بڑھ گئی کہ انھوں نے دجّال ملعون کے اوصاف اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف میں مشابہت پیدا کرنے تک سے دریغ نہیں کیا (اللہ معاف کرے اللہ پناہ دے)[۹] ان واقعات و حالات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اکبر کے اعتقادات اور تصورات کس حد تک بگڑ چکے تھے اس کی اسی بے حمیتی اور کج فہمی سے اعدائے اسلام کی ہمتیں بڑھیں اور انھوں نے ایسی لغو اور احمقانہ باتیں اسلام اور پیغمبر اسلام کے ساتھ منسوب کیں کہ ان تمام بیہودہ باتوں کو سن کر اس کی پیشانی پر شکن تک نہ پڑتی تھی اور جب اس کے خیالات اور فکر کا یہ عالم ہو گیا ہو تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی شعائر اور ارکان اسلام کے ساتھ اس کا رویہ کیا رہا ہوگا۔ ایک زمانہ تھا کہ "محل" میں پانچ وقت جماعت کے ساتھ نماز بھی ہوتی تھی اور اذان بھی دی جاتی تھی لیکن اب جماعت، نماز اور اذان سب کچھ موقوف کر دی گئی۔ نماز، روزہ اور دوسرے تمام مسائل کا نام اس نے تقلیدات رکھا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ ساری باتیں غیر معقول ہیں اور پھر نقل کے بجائے عقل پہ دین کو منحصر سمجھ لیا گیا۔ اسی زمانے میں فرنگیوں کی آمد و رفت بھی ہونے لگی اور ان کے بعض عقلی اعتقادات کو بھی قبول کیا[۱۰] ملا مبارک کے ایک بیٹے نے اسلامی عبادات کے متعلق اعتراض اور مسخرگی کے پیرایہ میں چند رسالے تصنیف کیے۔ شاہی جناب میں اس کے ان رسالوں نے بڑی مقبولیت حاصل کی اور اس کی سرپرستی کا ذریعہ یہی رسالے بن گئے[۱۱] اور خود ابوالفضل نے نماز، روزہ، حج اور دوسرے شعائر پر سخت اعتراضات کیے اور ان کا مذاق اڑایا۔ شعراء نے ان شعائر کی ہجو لکھی جو عوام کی زبانوں تک پہنچی۔

---

۹ بدآیونی۔ ص ۲۷۱۔

۱۰ بدآیونی۔ ص ۴۴۔

۱۱ منظور نعمانی۔ تذکرہ مجدد الف ثانی ص ۲۴۔

مخلوط مذہب اور مشترک کلچر کا فتنہ:۔

مجدّد الف ثانی رح کو اکبرؔ کی پھیلائی ہوئی ان گمراہیوں اور بد اعتقادیوں کا ہی مقابلہ نہیں کرنا پڑا بلکہ اکبرؔ کے اس دین کے استیصال کے لیے بھی سینہ سپر ہونا پڑا جو اس نے اپنی سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر گھڑا تھا اور یوں ایک خطرناک فتنہ "مخلوط مذہب" اور "مشترک کلچر" کا کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اپنی مصلحتوں کے پیش نظر ہندو مسلم کی تفریق ختم کرکے ایک ایسا مسلک جاری کرنا چاہتا تھا جس میں اس کو مرکزیت حاصل ہو اور مسلمان اسلام کی اساس پر سوچنا چھوڑ دیں۔ چنانچہ ایک خیال اس کے ذہن میں پتھر کی لکیر بن گیا تھا کہ اصحاب علم و دانش تمام مذاہب میں موجود ہیں اور ہر قوم و ملت میں عبادت گزار، صاحبان کشف و کرامات کی کمی نہیں رہی ہے اس لیے حق ہر مذہب اور قوم میں یکساں طور پر موجود ہے اور حق کو ایک ایسی ملت میں محدود و منحصر کر دینا ضروری نہیں ہے جو نسبتاً نیا اور نو پیدا شدہ ہے اور اس کے نزول پر ابھی ایک ہزار سال بھی نہیں گزرے ہیں۔ اس صورت میں ایک دین کا انکار اور دوسرے کا اقرار اور بغیر کسی سبب کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا کسی طرح بھی معقول و مناسب نہیں ہو سکتا۔

اکبرؔ کے اس خیال کو دربار کے خوشامدی لوگ اور ہندو برہمن جو اسلام کی انفرادیت اور وحدت کو ختم کرکے اسے ہندو مت کے انجذابی فلسفہ میں جذب کرنا چاہتے تھے۔ وہ حسب موقع بادشاہ کے اس خیال اور تصور کی تائید کرکے اسے پختہ اور اٹل بنانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ وہ بڑی خوبی اور مہارت کے ساتھ اپنے مذاہب اور نظریات کو عقلی اور نقلی استدلال کرکے دوسروں کی تکذیب کرتے رہتے تھے ان لوگوں نے بادشاہ کی خام خیالیوں کو راسخ اعتقادات کی شکل دے دی اور ان نظریات کو اس طرح بدیہات بنا کر پیش کیا کہ ان سے پھر جانا اکبرؔ کے لیے ممکن نہ رہا۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اکبرؔ کے نزدیک حشر و نشر

اور دوسرے دینی اصول و معتقدات جن کا ماخذ حکمت نبوی ہے۔ ناقابلِ قبول ہوا[۱۲]۔

علماءِ سوء اور اسلام دشمن عناصر کا رول:۔

اکبرؔ کی ان خام خیالیوں اور کج فہمیوں کو ہوا دینے اور اس کی ہاں میں ہاں ملانے میں علماء سو پیش پیش تھے۔ جو درحقیقت جاہل محض تھے۔ من گھڑت دلیلیں دے کر بادشاہ کو یہ باور کراتے کہ اس عہد کے ”صاحب زماں“ خود حضور والا ہیں۔ آپ کا ظہور مسلمانوں اور ہندوؤں کے بہتر ۷۲ فرقوں کے اختلاف کو ختم کرنے کے لیے ہوا ہے[۱۳]۔ اس معاملہ میں ہندو برہمن بھی پیچھے نہ رہے انہیں تو بادشاہ کی اس ضعیف الاعتقادی سے اپنی منہ مانگی مراد پوری ہوتی ہوئی نظر آرہی تھی اس لیے انہوں نے تو ”اکبرؔ کے ایک ہزار ایک (۱۰۰۱) نام ترتیب دے کر اس کے کان میں یہ پھونکا کہ رامؔ اور کرشنؔ کی طرح آپ بھی اوتار ہیں اور پرمیشور نے آپ کی صورت میں حلول کیا ہے۔ اکبرؔ نے یہ بھی باور کر لیا۔ وہ لوگ ثبوت کے طور پر قدیم پنڈتوں کے ہندی دوہے نقل کرکے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتے تھے جس کا مضمون یہ ہوتا تھا کہ جہاں کا فتح کرنے والا ایک بادشاہ ہندوستان میں پیدا ہوگا۔ جو برہمنوں کی بڑی عزت کرے گا۔ گائے کی حفاظت کرے گا اور ساری دنیا پہ عدل و انصاف سے حکومت کرے گا[۱۴]۔ دربار کے خوشامدی لوگ اور ہندو برہمن تو بادشاہ کے ان خیالات کی تائید کرہی چکے تھے لیکن اس کی مقصد برآری کے لیے محض ان کی تائید کافی نہ تھی۔ مذہبی پیشواؤں کی بھی تائید ضروری تھی۔ چنانچہ جاہ و اقتدار کے بھوکے علماء سو نے بھی اکبرؔ کو ”مہدی“، ”صاحب زماں“ اور ”امام مجتہد“ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ شیخ تاجؔ الدین ولد شیخ زکریاؔ اجودھنی دہلوی نے (جن کو اکثر صوفیا ”تاج العارفین“ کہتے ہیں)، ”انسانِ کامل“

---

[۱۲] بدایونی۔ ص ۷۶۴۔ [۱۳] بدایونی۔ ص ۷۸۴۔

[۱۴] بدایونی۔ ص ۵۱۲۔

اور "خلیفہ وقت" سے تعبیر کر کے خود اکبر کو اس کا مصداق قرار دیا۔ بادشاہ کے ادب و احترام کو اتنا بڑھایا کہ اسے فرض عین اور چہرہ شاہی کو "کعبہ مرادت"، "قبلہ حاجات"، قرار دے دیا۔[۱۵]
حاجی ابراہیم سرہندی نے اکبر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے پرانی کرم خوردہ کتاب میں غیر معروف خط میں شیخ ابن عربی سے منسوب کر کے ایک جعلی عبارت لکھی تھی کہ:۔
"صاحب زماں" بہت سی عورتوں سے نکاح کرے گا۔ داڑھی منڈا ہو گا اور ایسی ہی چند علامتیں جو اکبر میں پائی جاتی تھیں درج کر دی تھیں۔ یہ رسالہ اکبر کو بہت پسند آیا اور حاجی تاج الدین مقربوں میں شامل کر لیے گئے[۱۶] اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اکبر کی ذہنی و فکری کج روی سے سوچنے اور سمجھنے کے انداز میں کیا کیا تبدیلی آرہی تھی۔

دین جدید کی ضرورت اور اکبر کا معناً نبوت کا انکار کرنا:۔

مخالفین اسلام اور حامیان دین جدید اکبری نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اکبر کو یہ بھی باور کرا دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی مدت کل ایک ہزار سال تھی جو پوری ہو گئی۔ ہجرت پر ابھی پورے ہزار سال نہیں ہوئے تھے مگر بادشاہ نے اپنے طور پر یہ طے کر لیا کہ ہجرت نہ سہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو تو پورے ہزار سال ہو چکے ہیں۔ اس لیے اب پیغمبر اسلام کے لائے ہوئے دین کی مدت ختم ہو چکی ہے اس لیے وہ وقت آگیا ہے کہ ایک نئے دین کے آغاز کا اعلان کیا جائے۔[۱۷] اکبر کے اس فاسد مفسدہ خیال اور نظریہ کو تقویت دینے کے لیے شریف نے محمود سنجرائی کے رسالوں سے یہ شہادت بھی نکال دکھائی کہ اس نے صراحتاً کہا ہے کہ ۹۹۰ھ میں باطل کو ختم کرنے والے ایک شخص کا ظہور ہو گا۔ پھر اس نے بتایا کہ "تحقیقِ دین حق" کے کلمہ کے

---

۱۵ بدایونی۔ ص ۲۶۹۔ ۱۶ بدایونی۔ ص ۲۸۲
۱۷ بدایونی ص ۲۹۶۔

"جمل" کے حساب سے ۹۹۰ عدد ہوتے ہیں۔ اور اس کے مصداق حضور والا ہی ہیں۔ اس سلسلہ میں خواجہ مولانا شیرازی صاحب مکہ معظمہ کے معززین کی طرف سے ایک رسالہ لے کر آئے جس میں درج تھا۔ کہ حدیث صحیح کے بموجب دنیا کی مدت سات ہزار سال پوری ہو چکی ہے۔ اور اب ظہور مہدی موعود کا وقت آگیا ہے۔ خود اس نے بھی اس موضوع پر اپنا رسالہ مرتب کیا تھا۔ اس تحریک کی تائید میں صرف سنّی علماء اور افراد ہی شریک نہیں تھے بلکہ شیعہ علماء کے بھی افراد پیش پیش تھے۔ چنانچہ ایسی ہی خرافات شیعوں نے امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منسوب کر کے پیش کی تھیں۔

ان سب باتوں سے اکبر کے دماغ میں نبوت کا شوق لگا اور اس نے اگرچہ صراحتاً لفظاً نہیں لیکن معناً نبوت کا دعویٰ کر ایا[۱۸]

دین جدید کے قیام کے لیے اقدامات:۔

اکبر کے ان فاسد اور گمراہ کن خیالات کی تائید تو ہو ہی رہی تھی اور اتفاق سے اس زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلام کی عمر ہزار سال ہو رہی تھی اس لیے اس کو ایک ایسا واقعہ بنا لیا گیا کہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلام کی عمر پوری ہو گئی۔ اس لیے ایک نئے دین کی ضرورت ہے جو زمانے کے تقاضے کو پورا کرے اور جس میں ہر مذہب و ملت کے لوگوں کی چیزیں شامل کر کے تمام لوگوں کے لیے ایک مشترک و مخلوط مذہب قائم کیا جائے۔ اس نظریہ کو رائج کرنے اور لوگوں کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے پہلا حکم جو دیا گیا وہ یہ کہ اب سے سکہ پر الفی تاریخ (ہزار سن) ثبت کیا جائے اور یہ ہزار سن ہجرت سے نہیں بلکہ بعثت نبوی سے موسوم کیا جائے[۱۹] اس سے دراصل یہ اشارہ کرنا مقصود تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین مبین کی عمر جو ہزار سال تھی وہ پوری ہو گئی۔ اس تصور کو سکہ کی معرفت وسیع پیمانہ پر خاص و عام تک پہنچایا گیا۔ اس دور میں سکہ نشر و اشاعت

۱۸؎ بدایونی۔ ص ۴۸۷ - ۴۸۸۔

۱۹؎ بدایونی۔ ص ۴۹۶۔

کا سب سے موثر اور قوی ذریعہ تھا جس کی رسائی ہر کس و ناکس تک ضرور ہوتی تھی۔ اکبر نے صرف اسی پہ اکتفا نہیں کیا بلکہ حکم دیا کہ "چونکہ ہجرت کے ہزار سال ختم ہو چکے ہیں اور اب تک سب لوگ ہجری تاریخ ہی لکھتے رہے ہیں۔ اب ایک تاریخ مرتب ہونی چاہیئے جس میں آج تک کے تمام بادشاہوں کے واقعات مندرج ہوں جس کے دوسرے معنی یہ تھے کہ ایسی تاریخ لکھوائی جائے جو دوسری تاریخوں کی ناسخ ہو اس کا نام بادشاہ نے۔ "تاریخ الفی" رکھا اور یہ بھی حکم دیا کہ سنوں کے ذکر میں بجائے ہجرت کے رحلت کا ذکر کیا جائے[۲۰] اس کا مطلب یہ تھا کہ بعد کے لوگ بھی اکبر کے اس نظریہ کو قبول کریں۔

دین جدید میں اکبر کا مقام اور توحید الٰہی کا اعلان:۔

اکبر نے جب یہ فضا تیار کر لی اور اس کو خوشامدی درباریوں اور علماء سو نے باور کرا دیا کہ وہ "انسان کامل" اور "خلیفۃ الزمان" ہونے کی حیثیت سے خدا کا عکس ہے اور حسن و صداقت تمام مذاہب میں یکساں موجود ہے تو سب مذاہب میں جو باتیں حق ہیں انہیں لے کر ایک جامع طریقہ بنانا چاہیئے اور اس کی طرف لوگوں کو دعوتِ عام دینی چاہیئے تاکہ ملتوں کی تفریق ختم ہو جائے اور تمام لوگ ایک مسلک اور طریق پر جمع ہو جائیں۔ بادشاہ نے اپنے اس مسلک کا نام توحید الٰہی رکھا[۲۱] اس طریق پہ چلنے والوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اب بادشاہ کا خاص کلمہ لا الہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ علانیہ پڑھا کریں[۲۲] اور اس میں شامل ہونے والوں میں سے بعض نے یہ اقرار نامے بھی لکھے ہیں کہ "میں فلاں ابن فلاں اپنی خوشی اور اپنی مرضی سے مجازی اور تقلیدی دین اسلام سے انکار کرتا ہوں جسے میں اپنے باپ دادا سے دیکھتا اور سنتا چلا آیا ہوں اور میں دین الٰہی اکبر شاہی میں داخل ہو گیا ہوں اور اخلاص کے مراتب چہار گانہ یعنی ترک مال۔

۲۰؎ بدایونی۔ ص ۵۰۷۔ ۲۱؎ بدایونی۔ ص ۵۱۱۔

۲۲؎ بدایونی۔ ص ۸۰۴۔

ترک جان۔ ترک ناموس و عزت اور ترک دین کو قبول کرتا ہوں۔ یہ اقرار نامے اس نئے دین کے مجتہدین کو سپرد کر دیے جاتے تھے اور بادشاہ اقرار کرنے والوں کے ساتھ بڑی مہربانی کا سلوک کرتا تھا[۲۳] اپنے مریدوں کو جوگیوں کی اصطلاح میں "چیلہ" کا نام دیا۔ یہ لوگ اپنے خطوط کے سرناموں میں اللہ اکبر لکھا کرتے تھے اور مرید جب باہم ملتے جلتے تو ان میں ایک اللہ اکبر اور دوسرا جل جلالہ کہتا تھا۔ یہ یاد رہے کہ خود بادشاہ کا نام جلال الدین اور لقب اکبر تھا۔ مریدین کو اکبر شجرہ کے بجائے اپنی تصویر اخلاص اور رشد و ہدایت کی علامت کے طور پر عطا کرتا تھا ایک مرصع جواہر نگار غلاف میں اس تصویر کو رکھ کر یہ لوگ اپنی اپنی دستاروں پر لگاتے تھے[۲۴]

مشرکانہ عبادات:۔

اس مسلک میں مریدوں کے لیے خود "بادشاہ" کی عبادت بھی ایک اہم رکن کی حیثیت سے اختیار کی گئی۔ ہر صبح کو سورج پوجا کے وقت جھروکہ کے سامنے جاکر کھڑے ہو جاتے اور جب تک بادشاہ کا دیدار نہ کر لیتے ان پر مسواک اور کھانا پینا حرام رہتا تھا۔ بادشاہ کے تقدس کا رفتہ رفتہ یہ رنگ جما کہ ہر رات ہندو، مسلمان عورتیں اور مرد تندرست و بیمار اپنی اپنی حاجتیں پوری کرانے نیازمندانہ حضور میں حاضر ہوتے تھے۔ اس وقت ہر ایک کو حاضری کی عام اجازت ہوتی تھی۔ لوگوں کا بہت بڑا ہجوم جمع ہو جاتا تھا۔ اور جیسے ہی بادشاہ آفتاب کا ایک ہزار ایک نام کا ورد کر کے پردہ کے نیچے سے نمودار ہوتا تو یہ لوگ سجدے میں گر پڑتے[۲۵] بعض صوفیا حضرات نے بھی بادشاہ کے لیے سجدہ کو جائز قرار دیا۔ اس کا نام زمین بوس رکھا گیا تھا اور بادشاہ کے ادب کا خیال فرض ٹھہرایا

۲۳؎ بدایونی۔ ص ۲۸۰۔

۲۴؎ محمد منظور نعمانی۔ تذکرہ مجدد الف ثانی ص ۶۸۔

۲۵؎ بدایونی۔ ص ۱۲-۵۱۱۔

گیا تھا۔ اور بادشاہ کو مقاصد اور مرادوں کا کعبہ اور اس کے چہرہ کو قبلہ حاجات قرار دیا گیا اور بعض کمزور روایتوں اور ہندوستان کے بعض صوفیوں کے طرز عمل سے اس دعوے کو ثابت کیا جاتا[۲۶]

مذکورہ بالا ان تصریحات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اکبر بادشاہ نے اپنے ذاتی فعل اور قول دونوں سے نہ صرف اسلامی عقائد و عبادات کا مذاق اڑایا بلکہ بتدریج ایجابی طور پر اسلام کے بجائے ایک نئے مسلک اور دین کی داغ بیل بھی ڈالی اور اپنی دولت، جاہ و حشمت اور قوت کے بل بوتے پر اسے نافذ کرنے کی سعی کی۔

شرک کے چند خدوخال:۔

اکبر نے عبادات میں توحید خالص کے بجائے "آفتاب پرستی" اختیار کی۔ جو سراسر شرک اور مشرکانہ فعل ہے۔ اس نے ہر روز چار مرتبہ صبح، دوپہر، شام اور نصف شب آفتاب پرستی شروع کی۔ آفتاب کے ایک ہزار ایک (۱۰۰۱) ہندی ناموں کا وظیفہ پڑھنے لگا۔ یہ وظیفہ بڑے خشوع و خضوع سے دوپہر میں پڑھا جاتا تھا۔ اس وظیفہ کے وقت دونوں کان پکڑ کر گھوما کرتا اور کانوں پر دونوں ہاتھ توبہ کی طرح مارتا تھا[۲۷] اس کے علاوہ آگ، پانی، پتھر، درخت، اور تمام مظاہر فطرت یہاں تک کہ گائے اور اس کے

---

۲۶ محمد منظور نعمانی۔ تذکرہ مجدد الف ثانی رح۔ ص ۶۹۔

۲۷ بدایونی۔ ص ۵۰۹۔ ابو الفضل۔ آئین اکبری جلد دوم (اردو ترجمہ)۔

مولوی محمد فدا علی صاحب طالب ۱۳۵۷ ھج بمطابق ۱۹۳۹ء جامعہ عثمانیہ "ہندو آفتاب کے ہزار نام بیان کرتے ہیں۔ قبلہ عالم کو یہ تمام نام یاد ہیں اور ان کے ذریعہ سے دعا فرماتے ہیں۔ ص ۱۵۲۔ ایک دوسری جگہ حکمت آمیز اقوال نمبر ۱۰۶ جلد دوم ص ۵۶۳ "فرماتے ہیں کہ آفتاب کی سلاطین کے حال پر ایک خاص عنایت ہے اس وجہ سے اس کی عبادت خدا کی عبادت خیال کی جاتی ہے لیکن کوتاہ بین شخص بدگمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

گو بہ تک کے تقدس کا قائل ہو گیا۔ قشقہ اور زنار سے اپنے بدن کو آراستہ کرتا اور آفتاب کو مسخر کرنے کی دعا کرتا جس کی تعلیم ہندوؤں نے دی تھی ورد کے طور پہ آدھی رات کو اور طلوع آفتاب کے وقت پڑھا کرتا تھا۔[۲۸] خوشامدی صاقتدار پرست اور بے ضمیر درباریوں نے بھی اکبر کی ان احمقانہ اور طفلانہ حرکتوں کی تصدیق کی اور یقین دلایا کہ آفتاب نیر اعظم، عطیہ بخش"، "ہمہ عالم" و "مربی بادشاہاں" ہے۔[۲۹] ملا شیری نے بادشاہ کی خوشامد میں "ہزار شعاع" کے عنوان سے آفتاب کی تعریف و توصیف میں ایک نظم پیش کی جو ہزار قطعات پہ مشتمل تھی۔ اور بادشاہ کو بہت پسند آئی۔[۳۰] ملا تقی شیری نے جو اپنے آپ کو اعلم العلماء سمجھتا تھا، اپنی تحریروں میں جہاں بھی آفتاب کا نام آتا ہے وہ اس کے ساتھ جلت عظمت و عز شانہ' (بڑی عظمت اور بڑی شان والا) ضرور لکھتا تھے۔[۳۱]

آفتاب کے اس تقدس و عظمت کے پیش نظر اکبر آفتاب اور آگ کو علانیہ سجدہ کیا کرتا تھا۔ مصاحبین بھی چراغ جلنے کے وقت قیام کا احترام کرتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ اسلام کے عقیدہ توحید کا عملاً انکار کیا گیا اور اس کی جگہ کھلے اور اعلانیہ شرک کے رویّہ کو پروان چڑھایا گیا۔ روزمرہ کے معمولات میں بھی اکبر نے ہندوؤں کی بہت سی رسموں اور طریقوں کو پابندی سے اختیار کیا۔ چنانچہ ہندوؤں کی طرح پیشانی پہ قشقہ لگاکر دولت خانہ میں برآمد ہوتا اور جواہرات سے پروئی ہوئی ایک ڈوری برہمنوں سے اپنے ہاتھ میں بندھواتا۔[۳۲] اکبر کی ان ضعیف الاعتقادیوں سے زرتشتوں نے بھی فائدہ اٹھایا جو آگ کی تعظیم کو سب سے بڑی عبادت باور کرتے ہیں۔ چنانچہ اکبر نے اس عقیدہ کی بنا پہ شاہی محل میں شب و روز آگ جلتے رہنے کا حکم دیا کیونکہ آگ بھی خدائی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور اس کے نور کا پرتو ہے۔[۳۳] غرضیکہ اسلام کے خلاف دوسرے

---

[۲۸] بدایونی۔ ص ۱۷۴۔
[۲۹] بدایونی۔ ص ۱۷۴۔
[۳۰] بدایونی۔ ص ۵۱۷۔
[۳۱] بدایونی۔ ص ۵۵۸۔
[۳۲] بدایونی۔ ص ۱۷۴۔
[۳۳] بدایونی۔ ص ۱۷۴۔

مذاہب والے جو حکم اور رسم بھی بیان کرتے۔ اکبر اس کو نص قاطع سمجھتا اور امت مسلمہ کے تمام احکام اس کی نظر میں خلاف عقل تھے جن کو عرب کے سر پھروں اور رہزنوں نے وضع کیا تھا اور ان کے ماننے والے سارے مسلمان بادشاہ کی نظر میں حقیر و ذلیل تھے[۳۴]۔

مصلحت ملکی کے نام سے غیر اسلامی احکام اور شعائر اسلام کی بے حرمتی

اکبر نے یہی نہیں کیا بلکہ اب تو بہت سی نئی نئی اختراعات مصلحت ملکی کے عنوان سے حکماً عمل میں لائی گئیں اور ایسی ایسی بدعتوں اور خرافات کے احکام دیے گئے کہ انہیں دیکھ کر عقل حیران ہو جاتی ہے۔ اب یہ ہوا کہ زمین بوس کے نام سے بادشاہ کے لیے سجدہ کرنا لازم و جائز ہے۔ شراب جسمانی صحت کی خاطر پی جائے اور اس کے پینے سے خلل و فساد نہ پیدا ہو تو وہ جائز ہوگی[۳۵]۔ حسب الحکم دربار کے دروازے پر شراب فروش کی ایک دکان بھی قائم کی گئی جس کی منتظم دربان کی بیوی تھی۔ بادشاہ نے خود شراب کا نرخ مقرر کیا۔ اس طرح شاہی سرپرستی میں نشہ بازوں اور متوالوں کے لیے باقاعدہ سرکاری دکان کھولی گئی۔ طوائفوں اور فاحشہ عورتوں کی باقاعدہ ایک علیحدہ بستی "شیطان پورہ" کے نام سے

۳۴؎ بدایونی۔ ص ۱۷۴۔

۳۵؎ بدایونی۔ ص ۷۹۴۔

نوٹ:۔ اکبر کی شراب نوشی کی سرپرستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے لڑکے بہت ہی کثرت سے شراب پیتے تھے۔ جہانگیر اپنی شراب نوشی کا تذکرہ بڑے مزے سے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں کرتا ہے اور اکبر کے دو لڑکے مراد اور دانیال کثرت شراب نوشی کی وجہ سے اکبر کی زندگی ہی میں عین شباب میں انتقال کرتے ہیں۔ تزک جہانگیری ص ۶۳ و ۴۶۔

قائم کی گئی جہاں باضابطہ زنا کاری کی تنظیم کی گئی۔[۳۶] ہندو عورتوں کی دلجوئی کے لیے اکبر گائے کا گوشت، لہسن، پیاز کھانے سے احتراز کرنے لگا۔ گائے کی عظمت کا قائل ہوا تو گائے کا گوشت کھانا کیوں حرام نہ ہوتا، گاؤکشی کی سزا میں اچھے اچھے آدمیوں کو قتل کر دیا گیا۔ یہ صورت حال طبیبوں کو نوازشِ خسروانہ حاصل کرنے کے لیے غنیمت نظر آئی۔ چنانچہ انہوں نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا اور بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے گائے کے گوشت کو علم طب کی رو سے بعض بیماریوں کا سبب قرار دیا۔ حرام کو حلال اور حلال کو حرام کرنے کے بعد ایک اور اسلامی شعائر داڑھی کی باری آئی چنانچہ ریش تراشی پر زور دیا گیا۔ ڈاڑھی منڈانے کا عام رواج ہو گیا اس کے متعلق بڑی عجیب و غریب دلیلیں گھڑی گئیں۔ کہا گیا کہ اصل میں داڑھی کا تعلق مرد کے خُصیوں سے ہے اس لیے اس کے رکھنے یا نہ رکھنے میں ثواب و عذاب کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔[۳۷]

اس اجتہاد کی تصدیق و تائید کے لیے میاں امان پانی پتی کے بھتیجے ملا ابو سعید کی کتابوں میں سے ایک پرانا رسالہ فراہم کیا گیا جس میں ایک موضوع حدیث درج تھی کہ ایک صحابی کا لڑکا داڑھی منڈوا کر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا تو آپؐ نے فرمایا کہ اہل جنت کی ایسی ہی وضع ہو گی۔[۳۸] پھر کیا تھا ڈاڑھی منڈوانے کا جواز نکل آیا اور بہتوں نے بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے ڈاڑھی منڈوا دی اس کی تاریخ "موتراش چند" نکلتی ہے[۳۹]۔ احکام اسلام ۱۰۰۴ھ

---

۳۶ بدایونی۔ ص ۲۹۷۔ ۳۷ بدایونی۔ ص ۳۰۷، ۳۰۸،۳۰۴۔۵۴۔

۳۸ بدایونی۔ ص ۳۰۸۔

نوٹ:۔ ابو الفضل آئین اکبری حصہ اول میں آئین کوتوال کے تحت لکھتا ہے کہ:۔ بیل۔ بھینسا۔ گھوڑا۔ اور اونٹ ذبح نہ کیے جائیں۔ یکم فروردین سے انیس ماہ مذکور تک اور آبان کے تمام ماہ میں اور ہر شمسی ماہ کی پہلی اور سولہویں تاریخ الٰہی۔ تہواروں کے دن اور چاند، سورج گرہن کے دنوں میں نیز ہر اتوار کو جانور ذبح نہ ہونے دے۔

۳۹ بدایونی۔ ص ۳۸۲، ۳۹۸، ۵۸۔

کی مخالفت میں سور اور کتے کو پاک قرار دیا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ ان ناپاک اور نجس جانوروں کو محل میں رکھا گیا۔ بادشاہ ہر صبح ان کے دیدار کو عبادت سمجھتا تھا۔ کیونکہ ہندؤں نے یہ ذہن نشین کرا دیا تھا کہ سور ان دس مظاہر میں سے ایک مظہر ہے جن میں بھگوان نے حلول کیا ہے۔ نئے دین کی شریعت میں غسل جنابت کی فرضیت بھی مکمل طور پر منسوخ کر دی گئی دلیل یہ دی گئی کہ انسان کی اصل نطفہ سے ہے جو نیک اور پاک لوگوں کی آفرینش کا سبب ہے اس لیے مناسب یہ ہے کہ پہلے غسل کریں اور بعد میں جماع [۱۴۰] شیر، جنگلی سور کا گوشت اس بنا پر حلال کر دیا گیا کہ اس سے آدمی میں بہادروں کی صفت پیدا ہوتی ہے [۱۴۱] قریبی رشتہ داروں کی لڑکیوں سے نکاح حرام کیا گیا۔ نکاح کے لیے عمر مقرر کی گئی۔ مرد کے لیے سولہ [16] سال کی عمر سے پہلے اور لڑکیوں کے لیے چودہ [14] سال کی عمر سے پہلے نکاح ممنوع قرار دیا گیا [۱۴۲] بارہ سال سے پہلے بچوں کا ختنہ نہ کیا جائے۔ بارہ سال کی عمر کے بعد اگر لڑکا چاہے تو ختنہ کرائے ورنہ نہیں [۱۴۳]

---

[۱۴۰] بدایونی۔ ص ۴۹۹۔ [۱۴۱] بدایونی ص ۴۹۹۔

نوٹ:۔ ابو الفضل۔ آئین اکبری جلد دوم (اردو ترجمہ) حکمت آمیز اقوال نمبر ۱۴۳۔ "فرماتے ہیں کہ اگر سور کی حرمت کا باعث اس کی بے غیرتی ہے تو لازم ہے کہ شیر یا مثل اس کے دوسرے جانور حلال ہوں۔ ص ۳۶۱۔

[۱۴۲] بدایونی۔ ص ۴۹۹۔ مزید ملاحظہ ہو ابو الفضل آئین اکبری۔ حکمت آمیز اقوال نمبر ۱۹۳۔ فرماتے ہیں کہ "کم عمر کی شادی کرنا خدا کی ناخوشنودی کا باعث ہے۔ کیونکہ جو مفاد اس کارروائی میں خیال کیا جاتا ہے وہ بہت دور ہے اور نقصانات بیحد نزدیک اور یہ قانون کہ عورت دوسرا شوہر نہ کرے بہت دشوار ہے۔ ص ۳۶۸۔ مزید ملاحظہ ہو آئین کتخدائی۔

[۱۴۳] بدایونی ص ۵۰۴۔ مزید ملاحظہ ہو آئین اکبری باب آئین کوتوال۔ بارہ سال سے کم عمر لڑکوں کا ختنہ نہ کیا جائے۔ آئین اکبری جلد دوم ص ۵۷۹۔ مزید حکمت آمیز اقوال نمبر ۱۴۴ "فرماتے ہیں کہ مجھے انسان کے اس فعل پر سخت تعجب ہوتا ہے کہ خرد سال لڑکوں سے جو فرائض کے بارے میں سبکدوش ہوتے ہیں ختنہ کی سنت کو لازمی جانتے ہیں ص ۳۶۱۔

نیز یہ حکم نافذ کیا گیا کہ لوگ ایک سے زیادہ نکاح نہ کریں بجز اس کے کہ عورت بانجھ نکلے کیونکہ خدا ایک ہے اس لیے بیوی بھی ایک ہی ہونی چاہیئے[۴۴] ایک حکم مزید یہ دیا گیا کہ مردہ کو دفناتے وقت اس کا سر مشرق کی طرف اور پیر مغرب کی طرف رکھے جائیں سونے کے لیے بھی یہی طریقہ اختیار کیا جائے[۴۵] سلطان خواجہ جو اکبر کے مریدانِ خاص میں شامل تھا اس کو ایک خاص وضع کی قبر میں دفن کیا گیا۔ جس میں ایک جالی لگائی گئی تھی کہ ہر صبح کو سورج کی روشنی اس کے چہرے پر پڑتی رہے۔ کیونکہ سورج گناہوں کو پاک کرنے والا ہے۔[۴۶] آفتاب کی تعظیم کے لیے قبرستان کا دروازہ مشرق کی جانب رکھا جائے اگر کوئی درشنی مرید مر جائے تو خواہ مرد ہو یا عورت کچا اناج اور چند پکی اینٹیں اس کی گردن میں باندھ کر دریا میں بہا دیں۔ جہاں پانی نہ ہو وہاں اس کی میت جلا دی جائے یا جینیوں (JAINS) کی طرح کسی درخت پر اسے باندھ دیں[۴۷] اگر کوئی ہندو عورت کسی مسلمان پر فریفتہ ہو کر مسلمان ہو جائے تو اسے زبردستی اس کے آدمیوں کے سپرد کر دیا جائے[۴۸]

مزید برآں ــــــ ان خلاف اسلام احکام اور قوانین کے علاوہ اکبر نے جدت اور اجتہاد کے ترنگ میں یا اسلام کی ضد میں ایسے قوانین بھی نافذ کیے جو اسلام کے ممنوعہ اور حرام کردہ افعال کو جائز اور جائز کو حرام کرنے کے لیے تھے۔ مثلاً سونا اور ریشم کا

---

[۴۴] بدایونی۔ ص ۵۲۸۔ مزید آئینِ اکبری جلد دوم حکمت آمیز اقوال نمبر ۱۹۹۔ "فرماتے ہیں کہ ایک عورت سے زیادہ کی خواہش کرنا اپنے خون میں حدت پیدا کرنا ہے۔ اگر عورت عقیمہ ہو یا اس کے اولاد نہ ہوتی ہو۔ تب البتہ اس امر کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ ص ۳۶۹۔

[۴۵] بدایونی۔ ص ۵۲۹۔

[۴۶] بدایونی۔ ص ۵۲۰۔

[۴۷] بدایونی۔ ص ۵۵۱۔

[۴۸] بدایونی۔ ص ۵۵۲۔

پہننا فرض عین قرار دیا گیا۔ ۴۹؎ جوا اور سود حلال کر دیے گئے۔ جوا اور سود کی حرمت کے بند کو توڑنے کے بعد جوئے اور سود کو قربِ شاہی کی کشش کا ذریعہ بنایا گیا۔ یعنی اکبر نے دربار میں ایک جوا خانہ بنوایا اور جواریوں کو شاہی خزانے سے سود پر روپیہ قرض دیا جاتا۔ ۵۰؎ گائے۔ بھینس۔ گھوڑے اور اونٹ کا گوشت حرام کرایا گیا۔ ۵۱؎ ایسے شخص کے ساتھ جس کا پیشہ جانوروں کو ذبح کرنے کا ہو اگر کوئی کھانا کھائے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے اگر اس کے گھر والے اس کے ساتھ کھائیں تو ان کی صرف انگلیاں کاٹی جائیں۔ ۵۲؎

مزید حکم نافذ کیا گیا کہ نکاح سے پہلے دولہا اور دولہن کو کوتوالی میں لاکر جب تک کوتوالی کے گماشتوں سے ان کی عمروں کی تحقیق نہ کرلی جائے اس وقت تک ان کا نکاح نہ کیا جائے۔ ۵۳؎ یہ اور اسی طرح کی دوسری بہت سی نصوص شرعیہ کو حکماً فرمان شاہی سے

۴۹؎ بدایونی۔ ص ۴۹۹۔ ۵۰؎ بدایونی۔ ص ۵۱۸۔

۵۱؎ بدایونی۔ ص ۵۰۴۔ مزید ملاحظہ ہو ابو الفضل آئین اکبری جلد دوم باب آئین کوتوال ص ۵۷۹ "بیل، بھینسا، گھوڑا اور اونٹ ذبح نہ کیے جائیں۔

۵۲؎ بدایونی۔ ص ۵۰۴۔ مزید ملاحظہ ہو ابو الفضل کی آئین اکبری جلد دوم باب آئین کوتوال ص ۵۷۹ تا ۵۸۰ "قصاب، جولاہے، غسال اور مہتروں کو علیحدہ محلوں میں بسائے اور دوسروں کو ان تنگ دل اشخاص سے میل جول نہ رکھنے دے جو شخص جلاد کے ساتھ برتن میں پانی پیئے اور کھانا کھائے اس کی ایک انگلی کاٹ دی جائے۔ ص ۵۷۹۔

اسی سلسلے میں ابو الفضل "حکمت آمیز اقوال" نمبر ۱۸۴ میں لکھتا ہے کہ فرماتے ہیں کہ قصاب اور ماہی گیر اور مثل ان کے دیگر اشخاص جن کا پیشہ جان شکنی ہے ان کی جماعت کو عام آبادی سے علیحدہ کر دیا جائے اور ان سے ملنے والوں سے تاوان وصول کیا جائے آئین اکبری جلد دوم ص ۳۶۶۔

۵۳؎ بدایونی۔ ص ۵۵۱۔

تبدیل کیا گیا۔

یہ ہیں اکبر کی چند جدّت طرازیاں و اختراعات جنہیں اجتہاد، وقت کے تقاضے اور سیاسی ملکی مصلحتوں کا نام دے کر مسلم معاشرے میں بجبر ٹھونسنے کی کوششیں کی گئیں۔ لطف یہ کہ ان سب کو عین اسلام قرار دیا گیا اور " این است ماہ و پیرویں " کی ذہنیّت رکھنے والے اقتدار پرست علماء سو، جاہل صوفیاء اور بے ضمیر، خوشامدی امراء مملکت کی زبانیں اکبرؔ کو" امام عادل " " مجتہد العصر " " صاحب زماں " کہنے سے نہیں تھکتی تھیں۔ اکبرؔ نے محض حکومت اور طاقت کے بل بوتے پر یہ لایعنی ضابطے اور احکامات نافذ کیے تھے۔ اس لیے اس پالیسی کا اثر مسلم معاشرہ اور اسلامی تہذیب و تمدن کے ارتقاء میں بہت ہی نقصان دہ ثابت ہوا مسلم معاشرہ اندرونی کشمکش سے دوچار ہوا۔ اس کی وحدت ختم ہوئی۔ اور بہت سی غیر اسلامی رسم و رواج کو اسلام کے نام پر پروان چڑھایا گیا جس سے اسلامی تہذیب و تمدن اور ثقافت پر ضرب کاری لگی۔

کیا اس کا نام رواداری اور صلح کل پالیسی ہے؟

اکبرؔ کے انہی واضح غیر اسلامی بلکہ معاند اسلام احکام اور ضابطوں کی وجہ سے عہد جدید کا ایک طبقہ اسے " روادار "، " روشن خیال "، " صلح کل "، اور " وسیع المشرب " سمجھتا ہے۔ اور اس کی دلیل میں اس کے یہی مندرجہ بالا احکام اور قوانین پیش نظر رکھے جاتے ہیں۔ مگر اکبرؔ کی یہ رواداری صرف دوسرے مذاہب کے ساتھ تو ہے۔ اسلام اور اسلامی شعائر اور اقدار تو اس معاملہ میں اکبرؔ اور اس کے درباریوں کی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو اس سے ضد اور چڑھ تھی۔ مسلمانوں کے سوا جس شخص کی جو بات پسند آجاتی تھی اس کا انتخاب کر لیتا تھا۔ اسلام کی ضد اور اس کے توڑ پر ہر وہ حکم جو کسی دوسرے مذہب کا ہوتا اس کو بادشاہ " نص قاطع " اور قطعی دلیل خیال کرتا تھا۔ اور اسلامی ملّت کی ساری باتیں " مہمل "، " نامعقول "، " نو پیدا " اور عرب کے مفسدوں کی گھڑی ہوئی چیزیں

خیال کی جاتی تھیں [۵۴]۔ علماء اسلام اگر اسلام کی طرف سے کوئی بات کہتے یا کسی گمراہی کی مخالفت کرتے تو انہیں "فقیہہ" [ع] کے نام سے موسوم کیا جاتا جس کے معنی ان کی اصطلاح خاص میں "احمق"، "بدھو" اور ناقابل التفات آدمی کے ہو گئے تھے۔ [۵۵] یا اگر کسی بحث و مباحثہ کے دوران آئمۂ مجتہدین کی بات پیش کی جاتی تو ابو الفضل اس کے جواب میں نہایت جسارت سے کہتا کہ فلاں حلوائی، فلاں موچی اور فلاں چرم فروش کا قول ہمارے لیے حجت نہیں۔ [۵۶]

اکبر نے اپنی پسند کے چالیس عقلمندوں پر مشتمل ایک مجلس چہل گانہ مذاہب کی تحقیق کے لیے مقرر کی تھی جس میں مذاہب کا مطالعہ بڑی رواداری اور عقیدتمندی سے کیا جاتا تھا مگر اسلام کا نام آتے ہی طرح طرح کے شکوک و شبہات، ہنسی مذاق کی شکل میں کیے جاتے تھے۔ اگر کوئی کسی دینی مسئلہ کے متعلق سوال اٹھاتا تو اس سے کہا جاتا کہ ایسی باتیں ملاؤں سے پوچھی جائیں اور جو مسائل عقل و حکمت پر مبنی ہوں وہ میرے سامنے لائے جائیں۔ اور کسی شخص نے جواب دینے کا ارادہ کیا تو اس کو جواب دینے سے روک دیا جاتا۔ [۵۷] یہ تھی اکبر اعظم

---

[۵۴] محمد منظور نعمانی۔ تذکرہ مجدد الف ثانی رح ص ۵۷۔

[۵۵] مولانا ابو الاعلیٰ مودودی۔ تجدید و احیاء دین ص

[۵۶] بدایونی۔ ص ۴۳۴۔ [۵۷] بدایونی۔ ص ۵۸۱

[ع] ابو الفضل نے آئین اکبری میں "حکمت آمیز اقوال" کے عنوان سے اکبر کے اقوال تحریر کیے ہیں جن میں متعدد جگہ اکبر نے "کیش احمدی" کا لفظ استعمال کر کے فقہ اسلامی کا مذاق اڑایا ہے۔ مزید جشن نوروز کے موقع پر ملک الشعرا فیضی شراب یہ کہہ کر پیتا کہ "ہم یہ پیالہ فقیہوں اور عالموں کے اندھے پن کے نام پر پیتے ہیں۔ بدایونی۔ ص ۵۰۲۔

مزید ملاحظہ ہو کہ "اکبر جس شخص کو اپنا معتقد نہیں پاتا تھا اس کو لائق قتل "مردود" "نابکار"، اور "فقیہ"، اور "دشمن سلطنت" کا نام دیتا تھا۔

بدایونی۔ ص ۵۱۸۔

کی "رواداری"، "روشن خیالی"، "صلح کل"، "وسیع المشربی" اور "وسیع النظری" جو اس نے عملاً اسلام اور اسلامی تعلیمات اور عقائد کے سلسلے میں اختیار کر رکھی تھی۔ اسلام کے سوا دیگر ادیان اور مذاہب کے عناصر کا انتخاب کیا جاتا اور اس کے ذریعہ ایک ایسے نئے مذہب یا طریقے کو فروغ دینے کا کام ہونے لگا جس کا مقصد موجودہ اصطلاح میں "متحدہ قومیت" یا "مشترک کلچر" کی تشکیل تھی جس میں اسلام کے تمام عقائد و نظریات اور شعائر کو باطل قرار دے کر اسلام اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی انفرادیت کو ہندویت میں جذب کرنے کی سعی کی گئی تھی اس کے علاوہ اکبر نے ہندوؤں، پارسیوں، جینیوں (JAINS) اور عیسائیوں کی بہت سی رسومات اور طور طریقوں کو اختیار کر کے ان کو دربار کی نشست و برخاست، سرکاری تقریبات اور شاہی جشن میں بڑے اہتمام سے ہمت افزائی کی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلامی اقدار اور شعائر کا نام و نشان دربار سے غائب ہو گیا۔

تعلیمی پالیسی اور اسلامی اقدار:۔

اکبر نے ان اختراعات اور غیر اسلامی احکامات اور ضابطوں کے نفاذ پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے جو تعلیمی پالیسی وضع کر کے جن علوم و ادب کی اپنی حکومت کی جانب سے سرپرستی کی وہ سراسر اسلام کی مخالفت پر مبنی تھی۔ اس نے حکم دیا کہ لوگ علوم عربیہ کو پڑھنا ترک کر دیں اور نجوم، حساب، طب اور فلسفہ کے علاوہ کچھ اور نہ پڑھا جائے۔ چنانچہ عربی پڑھنا عیب ہو گیا۔ فقہ، حدیث اور تفسیر پڑھنے والے مطعون کیے جانے لگے۔ نجوم، حکمت، طب، ریاضی، شعر، تاریخ اور افسانہ کی تحصیل فرض ہو گئی عربی کے خاص حروف جیسے ث، خ، ع، ص، ض، ط اور ظ کو لغت سے نکال دیا گیا۔ اور عبداللہ کو ابداللہ، احدی کو اہدی کہا اور لکھا جاتا[۵۸]۔ ناموں کے رکھنے میں ہندی اور فارسی ترکیبوں کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ مثلاً انوپ تلاو، نتھ پول

۵۸و۵۹۔ بدایونی ص۔ ۵۰۰۔ و منظور نعمانی۔ ص ۸۱ (باقی بر صفحہ آئندہ)

جیتن نگر، بیر پرشاد، ہاتھیوں کے نام تھے اور خود اس کے پوتوں کے نام، خسرو، پرویز خرم اور شہریار تھے۔ یہ تمام نام اس کے رجحانات اور پسند کا پتہ دیتے ہیں ۵۹۔

مزید یہ حکم دیا کہ عربی کے سن ہجری کو موقوف کیا جائے اور اس کی جگہ تاریخ کو جلوس کے سن سے شروع کیا جائے۔ نئی تقویم میں سال اور مہینوں کو سن الٰہی اور ماہ الٰہی لکھا

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) تزک جہانگیری ص ۲۹۔

نوٹ:- اکبر کے عہد میں اسلامی علوم سے یہ بے اعتنائی اور عربی زبان کی طرف سے لاپرواہی بظاہر ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ہم اپنے دور میں ترکی اور ایران وغیرہ میں دیکھتے ہیں کہ حکومت کی سرپرستی میں عربی الفاظ کا ترکی اور فارسی سے اخراج کیا گیا ہے، اور خود پاکستان و ہندوستان میں عہد غلامی میں تو عربی اور فارسی زبانوں کو انگریز اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود ختم نہ کر سکے لیکن آزادی کے بعد پاکستان میں حکومت کی پالیسی عربی اور فارسی کی طرف کچھ ایسی رہی کہ آج یہ دونوں زبانیں پاکستان میں دم توڑ رہی ہے جبکہ اسلامی علوم کا بہت ہی قیمتی سرمایہ اور مسلمان عالموں کا صدیوں کا علمی خزانہ ان زبانوں میں آج بھی محفوظ ہے لیکن آج اس سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ مزید آج عربی محض اسلامی علوم و ثقافت کے نقطہ نگاہ سے ہی نہیں بلکہ سیاسی۔ اقتصادی نقطۂ نگاہ سے بھی اتنی زبردست افادیت رکھتی ہے لیکن اس کے باوجود پاکستان میں اس کی حیثیت روز بروز رو بہ زوال ہے۔ ایسا کیوں ؟ اس کی وجہ محض حکومت کی پالیسی اور تعلیمی نظام کا نقص ہے۔ اور عربی کی صحیح اہمیت اور قدر و قیمت کو تسلیم نہ کرنا ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان میں محض سیاسی اور اقتصادی بنیاد پر یونیورسٹیوں میں عربی کی تعلیم کا نظام ہے جب کہ پاکستان میں سندھ میں جہاں کے مسلمانوں کا بہت قیمتی سرمایہ عربی اور فارسی میں موجود ہے۔ آج بھی عربی اور فارسی کے بہترین اہل علم بھی موجود ہیں۔ لیکن یونیورسٹی میں یہ شعبہ عملاً ختم ہو گیا ہے۔

جائے۔ سکہ اور مہر پر تاریخ الف ثبت کرائی گئی (یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ایک ہزار سال پر دینِ محمدی کی مدت ختم ہو چکی ہے)[۵۶۰]۔

اکبر کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسوں اور مسجدوں پر ویرانی چھانے لگی اور اکثر اہلِ علم جلاوطن ہو گئے۔ عالموں کی اولادیں مفلسی کی وجہ سے آوارہ ہو گئیں اسلامی علوم کی بربادی کا ایک سامان تو یہ تھا۔ دوسرے اس کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ اس دور میں علماء اور مشائخ، آئمہ اور خطباء کے تمام جو جاگیریں صدیوں سے مدد معاش کے نام سے چلی آتی تھیں ان کی اکثر زمینیں ضبط کر لی گئیں یا کٹ کٹا کر بہت تھوڑی اراضی ان کے پاس رہ گئیں[۵۶۱]۔ عالموں سے ایسا سلوک کیا گیا کہ اہل علم کے لیے ان کا علم بھی وبال بن گیا۔ آئے دن ان بچاروں کو طرح طرح کی سرکاری کارروائیوں کا ساتھ دینا ہوتا تھا۔ درباری آئین کے مطابق تعظیم و تسلیم بجا لانا پڑتا تھا[۵۶۲]۔ مختصر یہ کہ ایک طرف تو اکبر نے اسلامی علوم، شعائرِ اسلامی اور اہل علم کے ساتھ یہ ناروا سلوک کیا۔ دوسری طرف اسلامی علوم کی طرف سے حکومت کی عدم توجہی اور غفلت ہی نہیں بلکہ معاندانہ پالیسی سے اسلامی شعائر کو زبردست نقصان پہنچایا اور اس کے برعکس ہندی علوم و فنون کی ہمت افزائی کی اور ان کی سرپرستی کی وجہ سے کفر و شرک اور غیر اسلامی طاقتوں کو تقویت اور نفوذ حاصل ہوا۔

غیر مسلموں کے عقائد اور نظریات کی ترویج و اشاعت:۔

اکبر پر جب غیر اسلامی نظریات اور افکار کا غلبہ ہو گیا تو اسے یہ خیال آیا کہ ہندوؤں کی کتابیں جنہیں عبادت گذار دانشوروں نے لکھا ہے وہ سب کی سب چونکہ حقیقی نص قاطع ہیں اور ہندوؤں کی عبادتوں، اعتقاد اور مذہب کا سرچشمہ ہیں اس لیے ہندی

۵۶۰۔ بدایونی۔ ص ۵۰۰۔ ۵۶۱۔ بدایونی ص ۴۸۰۔

۵۶۲۔ بدایونی۔ ص ۴۸۲۔

سے فارسی میں تراجم کرا کے کیوں نہ اپنے نام سے منسوب کر دیا جائے۔ یہ واقعات فارسی میں اب تک بیان نہیں کیے گئے ہیں۔ اس لیے دلچسپ اور نئے رہیں گے اس کے علاوہ جیسا کہ ان کتابوں کے مقدمہ میں درج ہے اس کی اشاعت دینی اور دنیاوی سعادت کا موجب اور شان و شوکت کی بقا، اولاد اور اموال کی کثرت کا باعث بھی ہو گی[۵۶۳] اس مقصد کی تکمیل کے لیے باقاعدہ ایک دفتر قائم کیا گیا اور ہندوؤں کی متعدد کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا گیا۔ مثلاً مہابھارت، راماین، سنگھاسن، بتیسی (اس کا نام خرد افزا رکھا گیا) اتھروید (ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتاب) لیلاوتی (ہندوؤں کی فن ریاضی کی مشہور کتاب) تاجک (علوم نجوم کی کتاب) ہربنس (کرشن جی کے حالات) کلیلہ و دمنہ (سنسکرت میں قدیم قصہ کہانی کی کتاب) نل و دمن، بحرالاسماء (ہندی افسانہ کی کتاب) وغیرہ وغیرہ[۵۶۴]

اکبر کی زیر سرپرستی ان کتابوں کی تراجم اور اشاعت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس سے ہندوؤں کے خیالات اور فکر کی کس قدر اشاعت اور ہمت افزائی ہوئی ہو گی۔ اس کے برخلاف اسلامی علوم کے ساتھ سرد مہری اور ہمت افزائی نہ ہونے سے اس کے ارتقاء کو کس قدر ٹھیس پہنچی ہو گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرہ میں غیر اسلامی تصورات و عقائد کو فروغ حاصل ہوا اور " اسلام کی غربت و بے بسی یہاں تک پہنچ گئی کہ کفار کھلم کھلا اسلام پر طعن اور مسلمانوں کی مذمت کرتے تھے اور ہر کوچہ و بازار میں بے دھڑک کفر کے احکام جاری ہونے لگے اور اہل کفر کی تعریف ہوتے لگی لیکن مسلمان اسلام کے احکام جاری کرنے سے رکے ہوئے تھے۔ اور اہل اسلام شرائع دینی کے بجالانے سے مذموم اور مطعون ہوتے تھے،،[۵۶۵] بلکہ اعدائے دین مسلمانوں کے شہروں میں صرف کفر کے احکام ہی جاری کرنے پر راضی نہیں ہوتے بلکہ چاہتے تھے کہ اسلامی احکام بالکل مٹ جائیں اور اسلام اور اہل اسلام

۵۶۳۔ بدایونی۔ ص ۵۰۸۔

۵۶۴ سید صباح الدین عبدالرحمن ۔ بزم تیموریہ ص ۶۳ تا ۶۶ و بدایونی ص ۵۰۱۔

۵۶۵ مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب ۶۵ ص ۱۴۴۔

کا کچھ اثر نہ رہے اور اس حد تک نوبت پہنچ چکی تھی کہ اگر کوئی مسلمان شعائر اسلامی پر اصرار کرتا ہے تو قتل کیا جانا تھا۔[۵۶۶]

درباری علماء اور اسلام :۔

اکبرؔ کی پالیسیوں اور احمقانہ اجتہاد کی بدولت مسلمان اور اسلام ہندوستان میں غربت اور کمزوری کے شکار ہو گئے۔ اسلامی شعائر اور تہذیب و تمدن مغلوب ہو گئے اور کافر اور کافرانہ، مشرکانہ طور طریق غالب آگیا۔ اس صورت حال سے مسلمان بہت ہی منتوحش اور پریشان تھے۔ وہ اس کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے لیکن وہ بے بس تھے اس لیے کہ اسلام اور عامۃ المسلمین کے لیے اکبرؔ کی الحاد اور اس کی بے دینی ہی ایک فتنہ نہ تھی بلکہ علماء سو اور جاہ و اقتدار کے بھوکے مذہبی قائدین و پیشوا اور صوفیاء خام بھی اس صورت حال کے بہت کچھ ذمہ دار تھے۔ ان کی آپس کی حریفانہ چشمک اور ایک دوسرے کو ذلیل کرنے اور گرانے کی ذہنیت نے بھی اسلام اور مسلمانوں کو زبردست صدمہ پہنچایا۔ اس سلسلے میں خصوصیت سے اکبرؔی دور کے دو علماء کا کردار اور ان کی آپس کی حریفانہ کشمکش نے نہ صرف انہیں نقصان پہنچایا اور وہ ذلیل و رسوا ہوئے بلکہ ان کی بازاری اور عامیانہ حرکتوں سے مخالفین اسلام کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ ان میں سے ایک کا نام ملّا عبداللہ سلطانپوری تھا اور دوسرے کا شیخ عبدالنبیؔ تھا جو صدرالصدور کے عہدے پر فائز تھے۔ یہ دونوں حضرات ایک طرف تو مذہبی عالم اور مذہبی پیشوا تھے دوسری طرف اکبر کے ابتدائی عہد حکومت میں شرع اسلامی کی نفاذ کی عہدہ جلیلہ پر بھی فائز تھے اس حیثیت سے انہیں دینی اور دنیاوی دونوں اعتبار سے ایک بہت ہی بلند مقام اور منصب حاصل تھا۔ لیکن ان حضرات کا کردار بہت ہی پست اور گھناؤنا تھا۔ یہ حضرات شرع اسلامی کے نفاذ کے منصب جلیلہ پر فائز تھے لیکن خود حیلہ شرعی کا

---

۵۶۶ مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب ۸۱ ص ۹۷ او مکتوب ۴۷ ص ۱۱۷۔

سہارا لے کر شرع اسلامی کی روح کو مسخ کر کے خود اپنا اور دین اسلام کا مذاق اڑواتے تھے۔ ملا عبداللہ سلطانپوری نے فریضہ حج کے اسقاط کا فتویٰ دے دیا اور زکوٰۃ سے بچنے کے لیے یہ حیلہ کرتا تھا کہ سال ختم ہونے سے پہلے وہ اپنی تمام دولت اور مال و متاع اپنی بیوی کے نام ہبہ کر دیتا اور اسی طرح سال ختم ہونے سے پہلے بیوی تمام دولت اور مال و متاع اس کے نام ہبہ کر دیتی۔ اس طرح چونکہ سال بھر تک کسی ایک کے پاس دولت نہیں رہتی تھی اس لیے بقول ان کے ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی تھی۔ یہ حیلہ شرعی یا شرعی عذر جو عدم ادائیگی زکوٰۃ کے لیے اختیار کیا گیا تھا، سراسر روح اسلام کے خلاف ہے۔ لیکن اس سے جو چیز ظاہر ہوتی ہے وہ یہ کہ دین و شریعت کا کس کس طرح استخفاف کرنے والے اکبرؒ کے دربار میں اعلیٰ ترین منصب پر فائز تھے۔ انہیں تو صرف ہوس دولت تھی اس کے لیے شریعت کے مزاج کو بگاڑنے اور اس کے حلیہ کو مسخ کرنے سے بھی نہ ہچکچائے۔ چنانچہ اس کے پاس بے انتہا دولت جمع ہو گئی تھی جو اس نے میتوں کے بہانے خاندانی قبرستان میں دفن کروا دی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد جب لاہور میں قبرستان کی چھان بین ہوئی تو قبروں سے سونے کی اینٹیں اور بے شمار دولت و خزانہ برآمد ہوا۔[۵۶۷] دوسرا ممتاز عالم شیخ عبدالنبی تھا جو اپنے عہد کا سب سے بڑا محدث خیال کیا جاتا تھا اور اکبرؒ نے اسے صدرالصدور کے ممتاز ترین عہدے پر مقرر کیا تھا۔ اسی ہی کی اکبر نے عہد جوانی میں جوتیاں سیدھی کی تھیں اور کبھی کبھی حدیث سننے کے لیے خود ان کے گھر پر چلا جاتا تھا۔ بڑے شہزادے کو تعلیم کے لیے بھی ان کے پاس بھیجا تھا۔ بادشاہ نے تمام آئمہ، خطباء وغیرہ کی تقرری وغیرہ کے اختیار ان کو دیے تھے لیکن ان کی علمیت کا یہ عالم تھا کہ "الحزم سوئے ظن" کی حدیث ہمیشہ غلط پڑھا کرتا تھا۔ اور تکبر، خود پسندی، نخوت اور غرور کا یہ عالم تھا کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا اور لوگوں کو ذلیل و رسوا کرتا تھا۔ اس کے محکمہ میں سفارش و

۵۶۷۔ بدایونی۔ ص ۳۵۴، ۵۰۲، ۵۰۳۔
منظور نعمانی۔ تذکرہ مجدد الف ثانی رح ص ۸۷۔

رشوت کا دور دورہ ہو گیا۔ نہ صرف اس کو بلکہ شیخ کے ملازموں یعنی فراشوں، دربانوں، سائیسوں اور حلال خوروں تک کو لوگ بھاری بھاری رشوتیں دے کر اپنا کام کرواتے اور جو غریب یہ نہ کر سکتے۔ وہ دربانوں کے ڈنڈے کھاتے اور بہت سے بدنصیب گرمی کی تاب نہ لا کر ہجوم میں جان بحق ہو جاتے تھے[۶۸]

شیخ جس وقت کرسی صدارت پر متمکن ہوتے اس وقت ان کے تیور دیکھنے کے لائق ہوتے وہ اہلِ علم کی تعظیم و تکریم نہ کرتے بلکہ ہر ایک کو بُرا بھلا کہتے اور ڈانٹتے ڈپٹتے رہتے تھے اور بڑے بڑے عالموں کو سو بیگھ کے لگ بھگ اراضی منظور کرتے اور بہتوں کی جاگیریں ضبط کر لیتے اور جاہل، کمینوں، خوشامدیوں اور ہندوؤں کو اچھی زمینیں خود عطا کرتے۔ اس طرح اس کے ہاتھوں علم اور عالموں کی قدر و قیمت روز بروز گھٹتی چلی گئی۔ اس میں شائستگی و شرافت بھی نہ تھی۔ جس وقت وہ وضو کر رہا ہوتا تو پانی کے قطرے اس طرح گرتا جو بڑے بڑے امیروں اور خاص خاص مصاحبوں کے کپڑوں پر گر رہے ہوتے لیکن اسے اس کا ذرہ برابر احساس نہ ہوتا تھا۔ لیکن لوگ کام نکالنے کے لیے طرح طرح کی ذلت، رسوائی برداشت کرتے تھے[۶۹]

یہ دونوں حضرات اکبر کے دربار میں بلند ترین منصب پر فائز تھے اور دونوں کا مقصد نفاذ شریعت اور اسلامی مفادات کا تحفظ اور ترویج تھا لیکن دونوں میں کوئی تعاون اور مقصد میں ہم آہنگی نہ تھی بلکہ ان کی ساری ذہانت اور تگ و دو ایک دوسرے کو گھٹانے اور ذلیل کرنے پر صرف ہوتی تھی۔ مولانا عبداللہ سلطانپوری نے شیخ عبدالنبی کی مخالفت میں ایک رسالہ لکھ مارا جس میں یہ ثابت کیا کہ اس کے پیچھے نماز نہیں ہو سکتی۔ پھر کیا تھا شیخ عبدالنبی بھی خاموش نہ رہے اور انہوں نے بھی ایک رسالہ لکھ مارا جس میں عبداللہ سلطانپوری کی جہالت اور گمراہی کو ثابت کیا گیا۔ یہ دونوں حضرات جو ایک دوسرے کو گمراہ، خبطی، اسلام دشمن ثابت کرنے پر اپنی توانائیاں صرف کر رہے تھے تو اس سے نہ صرف یہ ذلیل و رسوا

۶۸، ۶۹ بدایونی ص ۳۶، ۲۰۴، ۲۷، ۲۰۳، ۵۰۳۔

ہوئے بلکہ اس کے اثرات اسلام اور مسلمانوں کے خلاف رونما ہوئے اور مخالفین اسلام اُن کو آڑ بنا کر اسلام ہی کے خلاف محاذ بنا لیا اور عام مسلمان :۔

"چو کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی" کے مصداق ہو گئے۔

یہ تھا اسلام کے نمائندوں کا کردار جو اکبرؔ کے معتمد اور اس کی حکومت میں بلند ترین عہدے اور منصب پر فائز تھے۔ جب ان کی سیرت و کردار اور علمیت کا یہ حال تھا تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس قسم کے لوگوں کو اسلامی مفادات کے تحفظ و ترویج کا کام سونپا گیا ہو گا۔ ایسی صورت میں اسلام کی جو درگت بنی اس پر حضرت مجددؒ اپنے مکتوبات میں تفصیل سے تذکرہ کرتے ہیں۔

نازک اور مشکل ترین دور :۔

یہ تھے وہ صبر آزما، ہمت شکن اور مایوس کن حالات اور ذہنی و فکری فضا جو اکبرؔ ایسے مطلق العنان، آمر مطلق، خود پسند اور متکبر حکمران کے عہد حکومت میں اس کی عاقبت نا اندیش پالیسی سے پیدا ہوئی۔ اس صورت حال اور ذہنی فکری فضا سے دین اسلام کے معاملہ میں عام لوگوں میں مایوسی پیدا ہوئی۔ اکبرؔ کی حکومت بہت ہی مستحکم اور طاقتور تھی صحیح معنوں وہی مغلیہ حکومت کا بانی تھا۔ اس نے خود اپنے زور بازو سے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کی تھی۔ اس کے گرد بہت ہی با صلاحیت آزمودہ منظم اہل کار جمع ہو گئے تھے جن کی وفاداری کا محور اکبرؔ ہی کی ذات تھی۔ انہیں کی مدد و تعاون سے اکبر نے ایک مستحکم و پائیدار حکومت قائم کی جو نصف صدی تک قائم رہی اس نے جس معاشرہ اور ثقافت کو فروغ دینے کی کوشش کی وہ سراسر اسلام کی مخالفت اور عناد پر مبنی تھی۔ اس نے اپنے من مانے اسلام کی تعبیر و تشریح کی جس کا اسلام اور مسلمانوں کے اساسی نظریات اور عقائد سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لیے اس پالیسی کا لازمی اور قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ اس اثناء میں غیر اسلامی نظریات اور تصورات کو فروغ حاصل ہوا۔ ہندوؤں کو سیاسی عظمت و برتری حاصل ہوئی اب وہ حکومت کے بہی خواہ اور ہمدرد بن کر حکومت کی پالیسی اور رویہ کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوئے

چنانچہ حکومت کے ذرائع و وسائل سے ان کے عقائد اور تصورات کی ترویج و اشاعت ہوئی کافرانہ اور مشرکانہ طور طریق کو روزمرہ کے معاملات میں غلبہ حاصل ہوا اور اس کے برعکس اسلامی نظریات اور تصورات کی ہمت شکنی ہوئی اور سرکاری طور پر اسلامی شعائر اور اقدار کو نظر انداز کیا گیا اس لیے یہ قدریں معاشرے میں کمزور ہوئی اور اس کی گرفت بھی معاشرے پر ڈھیلی ہونی شروع ہوئی اور اس کی جگہ غیر اسلامی قدریں لے رہی تھیں۔

دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرے میں بے کردار، خوشامدی، ابن الوقت، ضمیر فروش اور دین کے معاملہ میں مداہنت رکھنے والوں کو عروج حاصل ہوا۔ وہی بادشاہ کے مقرب، مصاحب قرار پائے اور حکومت کے اعلیٰ عہدوں اور مناصب پر فائز ہوئے جو حکومت کی تمام پالیسیوں کو من و عن نافذ کرنے کے لیے تیار تھے اور اس کے برعکس وہ تمام لوگ جنہیں اکبر کی مذہبی پالیسی سے اختلاف تھا۔ انہیں ہر طرح سے ختم کیا گیا۔ ان پر ظلم و تشدد کے دروازے کھول دیئے گئے، انہیں مدد معاش سے محروم کیا گیا۔ بعضوں کو بلا کسی مقدمے یا داد فریاد کے دریا میں غرق کروا دیا گیا، ہزاروں کو جلاوطن کیا گیا یا بیرون ملک غلام بنا کر فروخت کرا کے ان کے عوض گھوڑے منگوائے گئے۔ بہتوں کو برسرِ عام ذلیل و رسوا کیا گیا، طرح طرح سے مذاق اڑایا گیا تاکہ ان کی ہمتیں اور حوصلے پست ہو جائیں اور مایوس ہو کر بیٹھ جائیں اور مذہبی دائرہ میں ہر قسم کی مخالفت ختم ہو جائے۔

مزید مذہبی معاملات میں اپنی پوزیشن اور حیثیت کو مستحکم کرنے کے لیے ایسے علماء اور صوفیاء کو ابھارا گیا جو محض جاہ و اقتدار کے بھوکے اور حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے پر ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ چنانچہ انہیں علماء کی مدد سے دنیاوی اقتدار کے ساتھ ساتھ دینی سیادت پر بھی قبضہ جما لیا۔ ملا مبارک (علامہ ابوالفضل اور فیضی ملک الشعراء کے والد) نے اکبر کی دینی سیادت کو تسلیم کرانے کے لیے ایک محضر نامہ تیار کیا جس میں مجتہد شرع پر امام عادل کی فضیلت ثابت کی گئی اور امام عادل (حکمران وقت) کو اس بات کا حق دیا گیا تھا کہ وہ اختلافی مسائل میں کسی روایت کو دوسری روایتوں پر ترجیح دے سکتا ہے اور اس کے مطابق تجویز و فیصلہ کر سکتا ہے۔ اس محضر پر مخدوم الملک شیخ عبدالنبی صدر الصدور

قاضی جلال الدین ملتانی، قاضی القضاۃ، صدر جہاں مفتی اعظم، مشہور عالم شیخ مبارک اور غازی خاں بدخشی نے جو معقولات کا بہت بڑا عالم تھا اپنے دستخط کیے تھے اور اس پر ان کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔

اس محضر کا منشایہ تھا کہ بادشاہ جو بھی تجویز و حکم دیں خواہ امور مملکت ہوں یا مسائل شرع اس سے انحراف و اختلاف کی کسی شخص کو مجال نہ رہے۔ اور جو ایسا کرے وہ اس محضر کی رو سے خود ہی ملزم بن جائے[۵۷]

اس محضر نامے سے اکبرؔ کو افتا کے کلی اختیارات مل گئے بس پھر کیا تھا جلد ہی اجتہاد کا دروازہ کھل گیا اور کسی کو کسی قسم کی مخالفت کی مجال نہیں رہی۔ تحلیل و تحریم کا جھگڑا مٹ گیا اور شریعت کے مقابلے میں امام کی رائے کو فوقیت حاصل ہو گئی۔ بادشاہ نے کھلم کھلا اسلام کو تقلید کا نام دے کر پس پشت ڈال دیا۔

مفاد پرست اور جاہ اقتدار کے بھوکے علماء اور صوفیوں کی بدولت اکبرؔ کو مذہبی اقتدار بھی حاصل ہو گیا اس لیے اس کے پچاس سالہ دور حکومت میں وہ کونسی ایسی غیر اسلامی طاقت تھی جسے ابھرنے کا موقع نہ ملا ہو؟ اور معاشرے اور مسلمانوں پر بجبر مسلط نہ کی گئی ہو؟ اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا کونسا ایسا گوشہ تھا جہاں کفر کی طاقتوں کو غالب کرنے کی کوشش نہ کی گئی ہو؟ یا معاشرے کا کونسا ایسا گروہ تھا جو ان مذموم اثرات سے محفوظ رہا ہو یا کونسی ایسی صورت باقی رہ گئی تھی جس کی معرفت اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت کو باقی رہنے دیا گیا ہو؟ یا کونسے ایسے وسائل اور ذرائع تھے جنہیں اسلام اور اسلام کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے باقی رکھا گیا ہو؟ معاشرے پر مکمل اور ہمہ گیر تسلط قائم کرنے کی تمام تدابیر اور کوششیں کی گئیں تاکہ کسی قسم کی مخالفت نہ ہو سکے۔ جبر و تشدد سے خوف و ہراس پیدا کر کے اور حکومت کے اعلیٰ عہدے، مناصب اور خطابات و انعام کی لالچ دے کر معاشرے میں خوف و طمع کی فضا پیدا کرائی

---

[۵۷] بدایونی ص ۲۷۰، ۲۷۸۔

گئی تاکہ کسی کے دل میں بھی اکبر کی پالیسیوں کے خلاف کسی قسم کا خیال بھی پیدا نہ ہو۔ ان حالات میں مسلمانوں میں مایوسی کا پیدا ہو جانا کوئی غیر فطری بات نہ ہوتی کہ اس لیے کہ وہ چہار طرف نہ صرف کفر و شرک کی فضا میں گھرے ہوئے تھے بلکہ ان پہ ایک جابر و قاہر اور اسلام سے عناد رکھنے والا شخص بھی اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ مسلط تھا۔

اکبر نے جو سیاسی نظام، معاشرت اور تہذیب و تمدن مسلط کرنے کی کوشش کی تھی وہ اس میں تنہا نہ تھا۔ اس کی پشت پر عہدِ اکبری کی تمام اسلام دشمن قوتیں تھیں اور ہندوؤں کی عظیم الشان اکثریت کی تائید و حمایت حاصل تھی بلکہ یہ حالات ان کی دیرینہ آرزوؤں اور کوششوں کے نتیجہ میں پیدا ہوئی تھی اور اس کی معرفت ان کی تہذیب و تمدن کو غلبہ حاصل ہو رہا تھا اس لیے وہ ہر حال میں ایسی حکومت کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ اس بنا پر بظاہر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ان نامساعد اور ناگفتہ بہ حالات میں اسلام کا احیاء کس طرح ممکن تھا؟ یا اسلامی نظریات و اعتقادات و اقدار کو دوبارہ کیونکر ان مسموم ماحول و فضا میں فروغ حاصل ہوگا کیونکہ اس کے لیے ہر ممکن راستے کو نہ صرف بند کیا گیا تھا بلکہ قوم اور ملت کو ایک دوسری ہی سمت میں پوری قوت سے بچانے کی کوشش کی گئی۔ اس کے لیے جبر و تشدد تحریص و ترغیب کے تمام ہتھکنڈے استعمال کیے گئے۔

روشنی کی ایک کرن:۔

لیکن ان تمام دشواریوں، مشکلات اور بظاہر ناممکنات کے باوجود دوبارہ اسلامی قوتیں، نظریات اور عقائد پوری آن بان کے ساتھ غالب آتی ہیں۔ یہ اسلام کا ایک معجزہ ہے کہ حالات جس قدر نامساعد اور فضا مکدر رہے گی اسی نسبت سے لوگوں میں اسلام کی پیاس و تڑپ ہوگی اور اسلام کی تاریخ تو اس کی ایک بیّن ثبوت ہے۔ اسلام کی ابتدا، نشو و نما اور ارتقاء ایک تاریک فضا اور ماحول ہی میں ہوا ہے اس لیے وقتی طور پہ اکبر کی ان پیدا کردہ مشکلات اور موانع جو نظر آ رہے تھے اس سے عام لوگوں میں مایوسی اور ہمت شکنی کی فضا ضرور پیدا ہوئی ہے۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ آخر کار احیاء اسلام کی

تحریک اس تاریک فضا میں تمام مخالفتوں کے باوجود کامیاب ہو کر رہی۔

اکبر نے جن نظریات، طور طریقوں اور عقائد کو اجتہاد کا نام دے کر مسلمانوں پر قوت کے زور سے ٹھونسنے کی کوشش کی تھی اس کو مسلمانوں نے برضا و رغبت قبول نہیں کیا تھا بلکہ مسلمانوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ اس کی پاداش میں بہتوں کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا، بہتوں کو قید و بند کی صعوبت برداشت کرنی پڑی جائیداد اور ذریعۂ معاش سے محروم ہوئے۔ جلاوطن کیے گئے اور طرح طرح کی مشکلات و مصائب میں گرفتار ہوئے۔ لیکن تمام مشکلات، خطرات سے نہ مسلمانوں نے ہمت ہاری اور نہ ہی خاموش بیٹھے بلکہ اپنی تگ ودو جاری رکھی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی نفسیات کچھ اس قسم کی ہے کہ وہ اسلام کے خلاف کسی طاقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ان میں عام بے چینی و اضطراب تھا۔ وہ اپنے دل میں اسلام کے لیے ایک جذبہ اور تڑپ رکھتے تھے اور یہی جذبہ اور خواہش احیاء اسلام کے لیے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور روز بروز عامۃ المسلمین میں احیاء اسلام اور غلبہ شریعت کا جذبہ قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے۔

چنانچہ اکبر کے لڑکے جہانگیر جو ہندو راجپوتنی کے بطن سے تھا اور ہندوانہ و مشرکانہ ماحول میں جس کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی بیرونِ دربار کی سیاسی فضا سے مجبور ہو کر اکبر کی اسلام بیزاری اور ہندو نوازانہ پالیسی ترک کرنا پڑی۔ اس کی حکومت کی پالیسی اسلام کے خلاف نہ تھی بلکہ اس معاملے میں تقریباً غیر جانبدار رہی۔ اس لیے اس کے عہد حکومت میں احیاء اسلام کی تحریک کو مزید تقویت اور اثر و نفوذ حاصل ہوا۔ تبلیغ و ہدایت کا سلسلہ وسیع پیمانہ پر کیا گیا۔ لوگوں کے ذہن و فکر کی تطہیر کی گئی اور عام لوگوں میں اسلام کے خلاف جو شکوک و شبہات پیدا ہو گئے تھے ان کو دور کیا گیا۔ اور شریعت کی اہمیت اور تقاضے پر لوگوں کے اعتماد کو بحال کیا گیا۔ مثبت طور پر کھل کر کافرانہ اور مشرکانہ طرز زندگی اور فکر کی گمراہیوں کو واضح کر کے ترویج شریعت اور غلبہ اسلام کی تحریک کو سربلند کیا گیا۔ روز بروز یہ تحریک عامۃ المسلمین میں جڑ پکڑ رہی تھی نتیجہ

یہ ہوا کہ جہانگیر کا لڑکا شاہ جہان بھی جو ایک راجپوتنی کے بطن سے تھا۔ اور اس میں جہانگیر کے مقابلے میں ہندوئیت کا خون زیادہ تھا۔ لیکن وہ مذہبی معاملات میں جہانگیر سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ اسلام کے معاملہ میں غیر جانبدار نہ تھا بلکہ اس کی ہمدردیاں اسلام کے لیے تھیں اس نے ہندوئیت کے غلبہ اور اثر و نفوذ کو کم کرنے کے لیے کچھ اقدامات بھی کیے۔ اس کی اپنی روزمرہ کی زندگی بھی جہانگیر کے مقابلے میں اسلام سے زیادہ قریب تھی خود جہانگیر یہ تحریر کرتا ہے کہ "کئی بیویوں کا شوہر اور متعدد بچوں کا باپ ہو چکنے کے باوجود اس نے شراب چکھی تک نہ تھی"[۱۷] اس لیے قدرے فضل کے سازگار ہونے کی وجہ سے احیاء اسلام کی تحریک روز بروز قوت پکڑتی گئی اور مسلمانوں میں احیاء اسلام کا شعور پیدا ہوتا گیا۔ ترویج شریعت کی خواہش ایک تحریک کی حیثیت اختیار کر گئی۔ چنانچہ شاہ جہان کے بیٹے عالمگیر[۱۸ب] نے احیاء اسلام کی تحریک کو غالب کیا اور مخالفین اسلام کو زبردست شکست ہوئی۔ عالمگیر کی کامیابی سے پاک و ہند میں اسلام کو دوبارہ عروج حاصل ہوا۔ مملکت کی پالیسی اسلام کے مطابق بنانے کی کوشش کی گئی۔ دربار کی نشست و برخاست، پسند و ناپسند کا معیار اور مملکت کے قوانین کا ماخذ شریعت قرار پائی اور غیر اسلامی نظریات اور تصورات کو ترک کیا گیا۔ چنانچہ اسلامی شعائر اور اقدار کو دوبارہ غلبہ حاصل ہوا۔

۱۷۔ تزک جہانگیری۔ ص۔ ۲۲۵۔ محمد ہاشم کشمی کی زبدۃ المقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں شہزادگی کے زمانے ہی سے حضرت مجدد الف ثانی رض کا معتقد ہو گیا تھا۔

نوٹ:۔ یہ خیال رہے کہ جہانگیر کے دو بھائی۔ مراد اور دانیال عین شباب میں کثرت شراب نوشی سے مر گئے تھے۔ خود جہانگیر اپنی شراب نوشی کا تذکرہ نہایت ہی ذوق و شوق سے اپنی خود نوشت سوانحیات میں کرتا ہے۔ اور اس کے فوائد بتاتا ہے۔ یہاں تک کہ روزانہ بیس[۲۰] پیالے دو آتشہ شراب استعمال کیا کرتا تھا۔ یہ مقدار چھ سیر کے برابر تھی۔ تزک جہانگیری۔ ص ۳۲۶۔ نمبر ۱۸ب۔ اور عالمگیر اورنگزیب کو حضرت مجدد کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم رح سے عقیدت تھی۔

ایک اہم سوال :-

لیکن ایک نہایت اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اکبر نے جس غیر اسلامی فضاء اور ماحول کو جنم دیا تھا اور اس کو مستحکم اور پائیدار بنانے کے لیے طرح طرح کے انتظامی اقدامات کیے تھے اس کو آخر کار کیونکر ناکامی ہوئی ؟ اور اسلامی نظریات اور قوت کو کیونکر دوبارہ فروغ حاصل ہوا ؟ آخر وہ کون سے عوامل و اسباب تھے جس کی وجہ سے اکبرؔ کے بعد جو دوسرے حکمران تخت نشین ہوئے وہ اسلام کے زیر اثر آتے گئے ؟ کیا مسلمان محض تائید غیبی پر ایمان کر کے بیٹھ گئے تھے کہ خود بخود اللہ تعالیٰ اسلام و شریعت کا دوبارہ بول بالا کر دے گا ؟ یا "مردے از غیب بیروں آید و کارے کند" کے مقولے پر کسی مرد غیب کا انتظار کرنے لگے تھے ؟ یا گوشہ نشین ہو کر اور زندگی کی کشمکش اور کارزار حیات سے کنارہ کش ہو کر محض وعظ و تلقین اور اوراد، وظائف اور مراقبے کے بل بوتے پر یہ اعتماد کر لیا تھا کہ اس کے سہارے دوبارہ اسلام کو غلبہ حاصل ہو جائے گا ؟ یا اس غیر اسلامی اور کافرانہ و مشرکانہ ماحول کی کشمکش سے الگ تھلگ ہو کر اس بات کی کوشش کی کہ پہلے ایک معتد بہ تعداد صالحین و پاکیزہ افراد کی پیدا ہو جائے یا معاشرے کی اصلاح کی جائے تاکہ خود بخود اس طرح حکومت کی اصلاح ہو جائے۔ اور ساری خرابی ختم ہو جائے گی۔ یا خرابی کی اصل جڑ معلوم کر کے "فتنہ و فساد" کے تمام محاذ پر حملہ کیا گیا اور ہر محاذ پر جنگ کر کے اصل محاذ یا قلعہ پر قبضہ کیا جائے تاکہ غیر اسلامی طاقت کی قوت مدافعت اور جارحیت کو ختم کر کے اصل سرچشمہ جو بیک وقت "فتنہ و فساد" اور "خیر و شر" کا چشمہ ہو سکتا ہے اس کو اسلام اور احیاء اسلام کی قوتوں کی آبیاری کے لیے استعمال کیا جائے - ؟

یہ سوالات بہت ہی اہم ہیں اور تفصیلی جواب چاہتے ہیں لیکن یہاں ہم مختصراً حضرت مجدد الف ثانی رحؒ کی برپا کی ہوئی تحریک احیاء اسلام کا مطالعہ کریں گے۔ جنھوں نے اکبری الحاد و فتنہ و فساد کا قلع قمع کرنے کے لیے ایک نہایت ہی جامع اور

ہمہ گیر تحریک شروع کی تھی جو بہت ہی منظم، فعال، باشعور، جرأت مند، بلند حوصلہ، بااصول افراد پر مشتمل تھی۔ وہ حالات کی نزاکت اور احیاء اسلام کی راہ میں جو مشکلات کے پہاڑ حائل تھے ان سے بخوبی واقف تھے۔ اکبرؔ کی پھیلائی ہوئی بے دینی و الحاد سے معاشرے میں جن فتنوں اور فساد نے جنم لیا تھا ان کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ لیکن حضرت مجددؔ نے عزم و حوصلہ کی راہ اختیار کی۔ ترویجِ شریعت اور احیاء اسلام کے راستے میں تمام خطرات اور مشکلات کے باوجود آپ نے اپنی جدوجہد کا مقصد اسی کو قرار دیا اور روزِ اول ہی سے عملاً مخالف اسلام قوتوں سے آپ کی مخاصمت اور کشمکش شروع ہو گئی۔

مجدد الف ثانی رح کے ابتدائی حالات

حضرت مجدد الف ثانی رح کا نام شیخ احمد ہے۔ آپ سرہند میں ۹۷۱ھ بمطابق ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ یہ اکبر کے ابتدائی حکومت کا دور تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ تھوڑے سے ہی دنوں میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ بعد ازاں سیالکوٹ تشریف لے گئے۔ یہاں مولانا کمال الدین کشمیری سے معقولات کی بعض کتابیں پڑھیں۔ مولانا اپنے عہد کے صاحب تحقیق و صاحب ورع و تقویٰ تھے۔ حدیث میں آپ کے استاد مولانا یعقوب کشمیری تھے جن کا شمار اپنے عہد کے مشہور محدثین میں ہوتا ہے۔ حصول تعلیم کے بعد آپ اکبر آباد تشریف لے گئے۔ یہاں آپ کی ملاقات اکبری عہد کے نامور علماء و فضلاء سے ہوئی۔ اکبر آباد اکبر بادشاہ کا پایہ تخت اور دارالحکومت تھا اس لیے یہاں ہر خیال اور مکتبۂ فکر کے علماء و فضلا موجود تھے اس لیے آپ کی نہ صرف ان لوگوں سے ملاقات ہوئی بلکہ آپ کے علم و فضل کی شہرت ہوئی اور لوگ آپ کے درس میں شریک ہوتے۔ جس سے آپ کی شہرت خاص و عام تک پہنچی۔

یہیں آپ کی ملاقات خصوصیت سے علامہ ابوالفضل اور ملک الشعراء فیضی سے بھی ہوئی۔ یہ دونوں بھائی اکبر بادشاہ کے منظور نظر تھے اور اپنی علمیت و ذہانت سے بادشاہ کے ذہن و فکر پر چھائے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے جب آپ کی علمیت اور درس و تدریس کی شہرت سنی تو ملنے کا اشتیاق ہوا چنانچہ ان حضرات سے آپ کی ملاقات ہوئی اور اکثر ان کے یہاں آپ آتے جاتے۔ اس ملاقات اور میل جول سے آپ کو ان کے نکتۂ نظر اور ذہن و فکر کو براہ راست جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ یہ لوگ اسلام کو عقل، فلسفہ اور ملکی مصالح کی روشنی میں دیکھتے تھے و نیز اکبر کی ذہنی بے راہ روی یا کج روی اور بے دینی والحاد کو انہوں نے

ہی ہوا دی تھی۔ یہ لوگ آپ کی علمیت کے قائل اور بڑی قدر کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار جب فیضیؔ اپنی بے نقط تفسیر "سواطع الالہام" کی ایک عبارت لکھنے کے لیے کسی مشکل میں گرفتار تھا تو اتفاق سے آپ ملنے آئے ہوئے تھے۔ آپ نے فوراً اس کی مشکل کو حل کر دیا اور مقام کے مناسب تفسیر نہایت فصیح و بلیغ عبارت میں تحریر کر دی[۵۷۲]۔

انہیں دنوں کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ عید کے چاند میں اختلاف ہوا۔ شرعی ثبوت سے پہلے ہی اکبرؔ نے عید کا اعلان کر کے لوگوں کے روزے افطار کروا دیے۔ اتفاق سے اس دن حضرت مجددؒ ابو الفضلؔ سے ملنے آئے، پوچھنے پر ابو الفضل کو معلوم ہوا کہ آپ روزے سے ہیں تو اس نے وجہ دریافت کی۔ آپ نے فرمایا کہ چاند کے متعلق اب تک شرعی شہادت فراہم نہیں ہوئی ہے۔ ابو الفضل نے کہا کہ بادشاہ نے حکم دے دیا ہے اب کیا عذر ہے؟ بے ساختہ آپ کے منہ سے یہ جملہ نکلا کہ "بادشاہ بے دین است اعتبارے ندارد"[۵۷۳] ابو الفضلؔ یہ سن کر خفیف سا ہو کر رہ گیا۔

حضرت مجددؒ کا عہد شباب دارالخلافہ اکبر آباد میں گزرا۔ اکبر آباد عہد اکبری میں تمام علمی، ادبی، سیاسی اور مذہبی اور الحاد و بے دینی کی تحریکوں کا مرکز رہا تھا اس لیے یہاں کے قیام میں آپ کو ان تمام تحریکوں سے واقف ہونے کا موقع ملا پھر چونکہ آپ کا امراء و اعیان مملکت سے بھی ربط و ضبط تھا۔ اس لیے آپ کو حکومت کے اندرونی حالات سے بھی واقفیت ہوئی۔ بعض امراء کو آپ نے اپنے علم و شخصیت سے اس طرح متاثر کیا کہ وہ آپ کے ہمنوا اور رفیق بن گئے۔ اسی موقع پر اکبرؔ کے کافرانہ و مشرکانہ اقتدار اور اسلام اور مسلمانوں کی زبوں حالی سے آپ کے دل میں یہ جذبہ اور ولولہ پیدا کیا کہ اس صورت حال کے خلاف جہاد کیا جائے۔ مشکلات و خطرات اور معاشرے کی زبوں حالی کے پیش نظر اصلاح کی بظاہر توقع نظر نہ آتی تھی لیکن اس کے باوجود آپ نے "زمانہ سازی" یا

---

۵۷۲ منظور نعمانی۔ تذکرہ مجدد الف ثانی رح۔ ص ۹۴۔

۵۷۳ منظور نعمانی ص ۹۴۔

مصلحت گیری اور حالات کے تقاضوں کا سہارا تلاش کرنے کے بجائے عین اسلامی تعلیمات اور سنّت نبوی کے مطابق ۔ "گر تو نمی سازد زمانہ بسازد" کا فیصلہ کیا اور حالات اور تاریخ کے دھارے کو بدلنے کی جدوجہد شروع کر دی ۔

حضرت مجدّد الف ثانی رح کی تشخیص :۔

حضرت مجدّد الف ثانی رح اپنے گردوپیش اور معاشرے کی ذہنی و فکری اور اعتقادی امراض کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ان تمام امراض اور خراب صورت حال کی اصل وجہ حکومت کی اسلام سے معاندانہ پالیسی ہے اس وقت جو کچھ صورت حال اور معاشرے میں جو ذہنی، فکری اور اعتقادی ژولیدگی پیدا ہوئی ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حکومت کا سربراہ ایک ایسا شخص ہے جو اسلام سے عناد رکھتا ہے، عملاً اس کا ایمان و اعتقاد بے دینی اور الحاد پر ہے اس لیے اس کے ہمنوا اور مصاحب ایسے لوگ بن گئے ہیں جو اسلام کے خلاف معاندانہ رویہ رکھتے ہیں اور غیر اسلامی اقتدار کے غلبے کے خواہش مند ہیں اس لیے اگر حکومت کی بنیادی پالیسی، طرز فکر اور تصور حکومت کو تبدیل کر دیا جائے تو ایک طرف "فتنہ و فساد" کی نشوونما نہ ہو سکے گی اور دوسری طرف اصلاح معاشرہ، ترویج شریعت اور افراد کی ذہنی و فکری تطہیر کا راستہ نسبتاً آسان ہو جائے گا ۔

اُس دور میں حکومت کی پالیسی وضع کرنے میں حکمران یعنی "بادشاہ" کو اولیں اہمیت اور مرکزیت حاصل تھی ۔ وہی مملکت کے سیاہ و سفید کے مالک ہوتے تھے ۔ اس کے پیش نظر آپ حکومت وقت کے ایک معزز اور اعلیٰ رکن مملکت شیخ فرید کو مخاطب کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں :۔

> "بادشاہ کی نسبت جہان کے ساتھ ایسی ہے جیسے دل کی نسبت بدن کے ساتھ اگر دل اچھا ہے ۔ تو بدن بھی اچھا ہے ۔ اگر دل بگڑ جائے تو بدن بھی بگڑ جاتا ہے ۔ ایسے ہی جہاں کی بہتری بادشاہ کی بہتری پر منحصر ہے اور اس کے بگڑ جانے سے جہاں کا بگڑنا وابستہ

ہے"۵۷۴

اسی سلسلے میں حکومت کے ایک دوسرے اعلیٰ عہدیدار خان جہاں کو ایک طویل خط میں متعدد اعتقادی مسائل پر بحث و تمحیص کے بعد یوں متوجہ کرتے ہیں کہ:۔

"آپ کو معلوم ہے کہ بادشاہ روح کی مانند ہے اور تمام انسان جسد یعنی جسم کی طرح اگر روح درست ہے تو بدن بھی درست ہے۔ اگر روح بگڑ جائے تو بدن بھی بگڑ جاتا ہے۔ پس بادشاہ کی بہتری میں کوشش کرنا گویا تمام بنی آدم کی اصلاح میں کوشش کرنا ہے اور بادشاہ کی اصلاح اس امر میں ہے کہ بلحاظ وقت جس طرح ہو، کلمۂ اسلام کا اظہار کیا جائے کلمۂ اسلام کے بعد اہلِ سنت و جماعت کے معتقدات بھی کبھی کبھی بادشاہ کے کانوں تک پہنچا دیے جائیں اور مذہب مخالف کی تردید کرنی چاہیئے اگر یہ دولت میسر ہو جائے تو گویا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی وراثت عظمیٰ ہاتھ آگئی۔ آپ کو یہ دولت مفت حاصل ہے۔ اس کی قدر رکھنی چاہیئے۔ زیادہ کیا مبالغہ کیا جائے حالانکہ جس قدر مبالغہ کیا جائے اسی قدر بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق دینے والا ہے"۵۷۵

حضرت مجدد کی ان تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بادشاہ کی اصلاح اور اس کی اہمیت کو کس شدت سے محسوس کرتے تھے کیونکہ اس عہد میں بادشاہ ہی حکومت کی تمام سیاسی اور ثقافتی سرگرمیوں کا محور ہوتا تھا۔ اسی کی ذات پر تمام مملکت کی پالیسیوں کا دارومدار تھا اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ترویج شریعت اور احیاء اسلام کے سلسلے میں بنیادی اہمیت حکومت وقت کی پالیسی میں تبدیلی کو قرار دیا اور بادشاہ کی اصلاح کو اولین اہمیت دی۔

---

۵۷۴ مکتوبات امام ربانی۔ ج اول مکتوب ۴۷ ص ۱۱۷۔

۵۷۵ مکتوبات امام ربانی ج دوم مکتوب ۶۷ ص ۲۲۵۔

حکومت کی پالیسی میں تبدیلی کی ضرورت :-

حضرت مجدد الف ثانی رحؒ کی تحریک کا ایک مقصد عامۃ المسلمین میں یہ شعور پیدا کرنا تھا کہ احیاءِ اسلام کی تحریک کی کامیابی کے لیے حکومت کی باگ ڈور اسلام کے ہاتھ میں دینا ضروری ہے۔ عامۃ المسلمین کے سامنے یہ نصب العین ہونا چاہیئے کہ کفر کے غلبہ و اقتدار کو ختم کرنا اور شریعتِ اسلامی کا نفاذ کرنا ہے لیکن اس کا حصول قوت اور طاقت کے اصل سرچشمہ یعنی حکومت کو اسلام کے زیر اثر لائے بغیر ناممکن ہے۔ غالباً اسی مقصد کے پیش نظر آپ نے اپنے دور حکومت کے متعدد اعلیٰ امراء مملکت سے ذاتی روابط اور تعلقات قائم کیے اور ان کو مسلسل خطوط لکھتے رہے۔ ان خطوط میں ایک ہی واضح مقصد نظر آتا ہے کہ احیاء اسلام اور ترویج شریعت کی اسپرٹ کو بیدار کیا جائے۔ کبھی ان کی ہمت افزائی کرتے ہیں تو کبھی غیرت دلاتے ہیں۔ کبھی ایسے مختلف فیہ مسائل پر کلام کرتے ہیں جو اس وقت لوگوں کے ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا کر رہے تھے۔ احیاء اسلام اور نفاذ شریعت کی راہ میں جو رکاوٹیں تھیں ایک ایک کر کے گناتے ہیں اور متعدد خطوط میں ان پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔ آپ نے اپنی تحریک احیاء اسلام سے عام و خاص کو متعارف کرانے کے لیے خطوط کا ذریعہ اختیار کیا۔ یہ خطوط مختلف افراد کے نام لکھے گئے ہیں۔ ان کا انداز بیان بہت ہی دلکش اور دل آویز ہے۔ نہایت ہی وضاحت اور آسان پیرایہ میں مشکل سے مشکل مسائل پر اظہار خیال کیا ہے جو قاری کے دل و دماغ کو اپیل کرتا ہے۔ آپ کے تمام مکتوبات میں ایک واضح مقصدیت و مرکزیت، جوش، ولولہ اور عزم نظر آتا ہے۔ ہر لفظ سے اسلام اور غلبہ اسلام کے مدعا کا اظہار ہوتا ہے۔ کافرانہ اور مشرکانہ طرز فکر اور غیر اسلامی اعتقادات اور نظریات پر زبردست تنقید اور اسلامی نظریات و عقائد اور تصورات کی بہت ہی دلنشیں انداز میں تشریح اور توجیہہ کر کے مسلمانوں کے ایمان میں تازگی، حرارت اور جوش و ولولہ پیدا کرتے ہیں علاوہ ازیں ہندوؤں کے غلبہ اور نفاق کیشوں کے عقائد کی ترویج و اشاعت سے جو مختلف اعتقادی گمراہیاں پیدا ہو گئی تھیں آپ نے اس کے خطرات اور عواقب کو محسوس کرتے ہوئے

اس کے خلاف بہت ہی سخت اور واضح رویہ اختیار کیا۔ آپ کا یہ سخت اور دو ٹوک واضح رویہ بظاہر عہد جدید کے اصول رواداری اور وسیع المشربی کے خلاف نظر آتا ہے لیکن آپ اگر اتنا شدید اور دو ٹوک واضح رویہ ان خطرات کے خلاف اختیار نہ کرتے تو اسلام اور مسلمانوں کی انفرادیت اور وحدت پارہ پارہ ہو جاتی بلکہ اسلام اور مسلمان دونوں ہندویت کے انجذابی فلسفہ کے شکار ہو چکے ہوتے اور مسلمانوں کی علیحدہ ملت کا وجود باقی نہ رہتا اس لیے آپ کا یہ رویہ بالکل فطری اور عین حالات کے مطابق تھا۔ جب کہ ہر وہ تہذیب جو اپنے غلبہ و اقتدار کی جدوجہد کرتی ہے اسلام اور مسلمانوں سے کہیں زیادہ شدید رویہ اپنے مخالف کے ساتھ روا رکھتی ہے۔

حضرت مجدد نے معاشرہ میں بادشاہ کی اہمیت اور مرکزیت کے پیش نظر اول روز ہی سے اپنی توجہ اس طرف مبذول کی کہ اسلام اور احیاء اسلام کی راہ میں اقتدار اور حکومت کے ذریعہ جو مشکلات اور رکاوٹیں ہیں ان کو دور کیا جائے اس لیے حکومت کے اعلیٰ کارکنوں اور حکام سے میل جول پیدا کیا۔ آپ نے ان کو خطوط کے ذریعہ اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی اور انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ احیاء شریعت کے لیے اپنی جدوجہد اور کوششیں تیز کر دیں۔ حکومت کی کرسی پر جو متمکن ہو وہ اسلام کا مخالف اور دشمن نہ ہو۔ لالہ بیگ کو جو حکومت کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے ان کو لکھتے ہیں کہ:

"سلطنت کی ابتدا ہی میں اگر مسلمانی نے رواج پایا اور مسلمانوں نے اعتبار کر لیا تو بہتر ورنہ نعوذ باللہ اگر توقف ہو گیا تو مسلمانوں پر کام بہت مشکل ہو جائے گا الغیاث، الغیاث ثم الغیاث! دیکھیں کون صاحب دولت اس سعادت کو حاصل کرتا ہے۔ اور کون بہادر اس دولت کو چھین لے جاتا ہے[۷۶]

چنانچہ جوں ہی حکومت کی تبدیلی میں آثار پیدا ہوئے آپ نے اپنی تمام توجہ حکومت کی تبدیلی میں اپنے موافق صورت حال پیدا کرنے میں صرف کر دی اس لیے کہ اگر ابتدا ہی میں حکومت

---

[۷۶] مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب ۸۲ ص ۱۷۹۔

کی پالیسی کو وضع کرنے میں شریک ہو سکے یا حکمران کو اپنے زیر اثر لا سکے تو مستقبل میں کام بہت آسان ہو جائے گا اور اگر ذرا سی غفلت یا چوک ہو جائے گی تو پھر شدید مشکلات اور دشواریوں کا سامنا ہو گا اس لیے بلا کسی جھجک کے اس میدان میں کود پڑے اور دوسروں کو بھی ترغیب دی اور کہا کہ یہ ایک سعادت ہے دیکھیں کون اسے حاصل کرتا ہے۔ ابتداء ہی میں موقع ملتے ہی مقصد حکومت اور نصب العین کے متعین کرنے میں جدوجہد کرنے کو ایک سعادت قرار دیا۔

جہانگیر کی تائید کیوں :۔

بظاہر آپ کی یہ پالیسی خلاف مصلحت اور بعید از حکمت معلوم ہوتی ہے کیونکہ اکبرؔ کے دور حکومت کا آخری زمانہ تھا اور اس کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں اور ضلالتوں کو دور کرنے کے لیے کوئی منظم کوشش بھی نہیں ہوئی تھی اور معاشرے میں انہی لوگوں کو پوزیشن و اہمیت حاصل تھی جو اکبر کی پالیسیوں کے حامی اور روح رواں تھے اور ہر جگہ کلیدی آسامیوں پہ چھائے ہوئے تھے۔ لیکن اکبرؔ کے آخری زمانے میں تخت حکومت کی جانشینی کے مسئلہ پر امراء دو واضح اور نمایاں گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور اکبرؔ کی جانشینی کے لیے بھی دو دعویدار اپنی اپنی سی کوشش میں مصروف تھے۔ ایک طرف تو اکبرؔ کا لڑکا جہانگیر تھا اور دوسرا اکبرؔ کا پوتا اور جہانگیر کا بیٹا خسروؔ تھا۔ جہانگیر اپنے باپ کے یا ر اور معتمد علیہ امراء سے ناخوش تھا انہیں وہ اپنے مقاصد اور عزائم میں رکاوٹ تصور کرتا تھا۔ چنانچہ اکبرؔ کے معتمد علیہ اور مشیر خاص علامہ ابوالفضل کو قتل کرانے کا مرتکب ہوا[۱۷۷] اور اکبرؔ کے آخری دنوں میں تو باپ بیٹے کے تعلقات میں بڑی تلخی پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ باپ کے حکم کی نافرمانی بھی کرتا ہے اور بغاوت کر کے حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش بھی[۱۷۸] جہانگیر کی ان حرکتوں

---

۱۷۷ تزک جہانگیری ص ۵۵۔

سے اکبرؔ کو بھی بہت دکھ ہوتا ہے۔ اس لیے اس نے اپنے پوتے خسروؔ کو اپنا جانشین بنانے پر آمادگی کا اظہار بھی کیا۔ اس وجہ سے اکبرؔ کی آنکھیں بند کرنے سے پہلے ہی یہ دونوں دعویداران مملکت اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کی فکر میں لگے ہوتے ہیں اور اپنے حلقہ اثر اور طاقت میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح جانشین کے تبدیل ہونے کے مواقع پیدا ہو گئے تھے اور یہ یقین ہو گیا تھا کہ اکبرؔ کی آنکھ بند ہوتے ہی جہانگیرؔ یا خسروؔ میں سے کوئی ایک حکمراں ہوگا۔

ان دونوں دعویداران مملکت میں سے کوئی بھی اسلام کے معیار مطلوب پہ پورا نہ اترتا تھا۔ جہانگیر کا یہ عالم تھا کہ وہ شراب کا شیدائی۔[۷۹] افیون کا عادی اور عیش و عشرت کا دلدادہ تھا۔ اس کے حرم میں متعدد راجپوت شہزادیاں اور ۳۰۰ کی تعداد میں داشتائیں موجود تھیں[۸۰]۔ اس کے مذہبی عقائد و تصورات واضح نہ تھے۔ روزمرہ کے مشاغل اور دلچسپیوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کی خود نوشت سوانح حیات تزک جہانگیری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر اللہ تعالیٰ کا نام تو لیتا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ نہیں کرتا۔ اگر وہ شب برات، عیدؔ کے مسلم تیوہار مناتا ہے تو ساتھ ہی بڑے ذوق و شوق سے ہندوؤں کی دیوالی، دوسہرہ، رکھشا بندھن اور شیواتری کے تہوار بھی مناتا ہے اور پارسیوں کا نوروز تو بڑے ہی اہتمام کے ساتھ منانے کا تذکرہ کرتا ہے اس لیے

۷۹؎ تزک جہانگیری ۔ ص ۴۱، ۴۴، ۴۶، ۷۷، ۱۲۳، ۲۵۸، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۳۰، ۴۴۷، ۴۷۴، ۴۳۵، ۴۵۱، ۴۵۹، ۴۷۰، ۴۷۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۸، ۵۰۷، ۵۱۶، ۵۲۶، ۵۵۷، ۸۳۳، ۸۳۸ وغیرہ وغیرہ۔

۸۰؎

جہانگیر کی بیس بیویوں میں سے اٹھارہ کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں جس میں سے گیارہ مسلمان اور سات راجپوت شہزادیاں تھیں۔ اس کے علاوہ حرم میں ۳۰۰ عورتیں بطور کنیز تھیں۔

اس سے یہ توقع کرنا کہ وہ حکمران ہونے کے بعد اسلام کے مطابق حکمرانی کرے گا بعید از قیاس تھا اس کے برعکس دوسرا دعویدار مملکت جہانگیر کا لڑکا خسرو، اکبر کا پوتا تھا۔ خسرو اس وقت ایک سترہ سالہ خوبرو نوجوان تھا۔ اس کے عادات و اطوار و خصائل پسندیدہ تھے۔ مورخین نے اس کے متعلق کوئی ایسی بات تحریر نہیں کی جس سے اس کے کردار پر حرف آتا ہو۔ اکبر نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں جہانگیر کی نافرمانیوں اور دل آزار حرکتوں سے ناخوش ہو کر خسرو کو جانشین مملکت بنانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اس لیے اکبر کے معتمد علیہ امراء اور خصوصیت سے راجہ مان سنگھ اور مرزا عزیز کوکہ (خان اعظم) خسرو کو تخت نشین کرانے کی کوشش کرتے ہیں اور باقاعدہ ایک سازش کے ذریعہ جہانگیر کے مقابلہ میں خسرو کو نامزد کرانے اور جہانگیر کو قید کرانے کا پلان بنایا کرتے ہیں[۵۸۱]۔ اس طرح دو دعویدار مملکت تھے۔ ایک یعنی جہانگیر اپنی عادات، خصائل اور روزمرہ کی زندگی اور مشاغل کے لحاظ سے اسلامی حکومت کے معیار پر پورا نہ اترتا تھا۔ وہ لاابالی، عیش پسند تھا لیکن مذہبی معاملات میں ایک غیر جانبدار شخص تھا۔ وہ اکبر کی طرح مذہبی جدت طرازیوں اور اختراعات کے معاملات سے دلچسپی نہ رکھتا تھا وہ تو محض حکومت کا خواہاں تھا اس کے خود کوئی نظریات، عقائد اور تصورات نہ تھے جس کو وہ حکومت کے معرفت نافذ کرنے کی سعی کرتا وہ تو اپنی بادشاہت اور حکومت چاہتا تھا اس لیے اس کے حکمراں ہونے سے یہ یقین تھا کہ وہ اکبر کی پالیسیوں کو من وعن نافذ نہیں کرے گا۔ دوسرے وہ چونکہ اکبر کے معتمد علیہ امراء سے ناخوش تھا اور وہ لوگ اس سے ناخوش تھے اس لیے یہ بھی گمان تھا کہ اس کی پالیسیوں پر اکبر کے وفادار اور جاں نثار قسم کے امراء کا اثر نہیں رہے گا بلکہ وہ اپنی پالیسی خود وضع کرے گا اس لیے اس کے حکمراں ہونے میں اکبر کی پالیسی ضرور تبدیل ہو گی یا اگر تبدیل نہ

---

۵۸۱ محمد صالح کنبوہ عمل صالح المعروف شاہجہان نامہ اردو ترجمہ ڈاکٹر ناظر حسن زیدی ص ٤٦ ۔

ہو گی تو وہ شدت نہیں رہے گی جو اکبرؔ کے زمانے میں تھی۔ اس کے برعکس خسروؔ باوجود اس کے کہ وہ بے داغ کردار کا مالک تھا۔ بظاہر اس کی زندگی اسلام کے خلاف نہ تھی لیکن اس کے دعویٰ کی تائید میں راجہ مان سنگھ اور مرزا عزیز کوکہ پیش پیش تھے۔ (یہ خیال رہے کہ خسروؔ راجہ مان سنگھ کا حقیقی بھانجہ اور مرزا عزیز کوکہ (خان اعظم کا) داماد تھا۔ ۵۸۲
راجہ مان سنگھ اکبرؔ کے عہد کا ایک بہت ہی باثر اور طاقتور امیر تھا۔ اکبر کے عہد میں گجرات، میواڑ، افغانستان وغیرہ میں کارہائے نمایاں انجام دیے تھے اور بنگال میں اکبر کے خلاف بغاوت کو اس نے ناکام بنایا تھا۔ اس نے اکبرؔ سے مکمل وفاداری کے عہد کو پورا کیا تھا اور ہمیشہ اکبرؔ کے لیے سب کچھ قربان کرنے کو تیار رہتا تھا اور اکبرؔ نے بھی مرنے سے ایک سال قبل یعنی ۱۶۰۴ء میں اس کی وفاداری اور اعلیٰ خدمات کے صلے میں سات ہزاری کے اعلیٰ ترین منصب پر سرفراز کیا تھا۔ ۵۸۳ اس لیے خسروؔ کی تخت نشینی میں یہ یقینی تھا کہ مملکت کی پالیسی میں راجہ مان سنگھ کو بہت ہی اثر و دخل ہوتا۔ اور راجہ مان سنگھ محض تنہا ایک ذات ہی نہ تھا بلکہ وہ راجپوتوں کا مسلمہ لیڈر تھا اور اس دور کے ہندوؤں کی خواہشات اور امنگوں کا ترجمان بھی تھا۔ وہ ایک خاص طرز فکر کا علمبردار تھا۔ جس کی داغ بیل اکبرؔ کے عہد میں پڑ چکی تھی۔ خسروؔ کا دوسرا زبردست ہمنوا مرزا عزیزؔ کوکہ تھا۔ یہ بھی اکبرؔ کا نہایت ہی وفادار، جاں نثار اور معتمد علیہ امراء میں سے تھا۔ آخری دنوں میں اس نے اکبرؔ پر سب کچھ نثار بھی کر دیا تھا اور اکبرؔ سے اپنی مکمل وفاداری اور عقیدت کا اظہار کیا تھا۔ اس لیے ان دونوں کی مدد سے خسروؔ کی تخت نشینی کے یہ معنی تھے کہ اکبرؔ کی وضع کردہ پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی بلکہ یہ عین ممکن تھا کہ اکبرؔ کے مقابلے میں خسروؔ کے عہد میں اس میں مزید شدت ہو جاتی کیونکہ خسروؔ نہ صرف ایک ناتجربہ کار نوجوان تھا بلکہ ایک ہندو راجپوت شہزادی کے بطن سے تھا

---

۵۸۲ محمد صالح کنبوہ۔ عمل صالح المعروف شاہجہان نامہ حصہ اول ص ۶۴ (اردو ترجمہ)

۵۸۳

ہندوانہ ماحول میں تربیت ہوئی تھی اور اس کی پالیسی میں ماموں راجہ مان سنگھ اور خسر مرزا عزیز کوکہ جیسے انتہا پسند کا عمل دخل ہوتا اس لیے غالب گمان یہ تھا کہ خسرو[٥] کے تخت نشین ہونے کے بعد نہ صرف اکبرؒ کی پالیسی ہی جاری رہتی بلکہ راجپوتوں کا عمل دخل پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہو جاتا اور حکومت پر وہ مکمل طور پر قابض ہو جاتے۔ اکبرؒ کے عہد حکومت میں تو وہ حکومت کے معاون و مددگار اور اکبرؒ کے مشیر کی حیثیت سے حکومت کی پالیسی پر اثر انداز ہوتے تھے اور اب تو وہ حکومت ساز اور پالیسی ساز حیثیت سے حکومت کی پالیسی کو خود ہی وضع کرتے اور وہی اسے نافذ کرتے اس طرح انہیں اکبرؒ کے عہد سے بھی برتر پوزیشن حاصل ہو جاتی۔ یہ دونوں صورتیں مسلمانوں اور اسلام کے مستقبل کے لیے بہت ہی خطرناک ہوتیں اور ممکن تھا کہ خسروؒ کے تخت نشین ہو جانے کے نتائج و اثرات اکبرؒ کے دور سے بھی زیادہ شدید ہو جاتے اور مستقبل میں اسلام کی راہ میں اور بھی زبردست مشکلات اور دشواریاں حائل ہو جاتیں اس لیے آپ رح کے سامنے یہ ایک عملی سوال تھا کہ ان دونوں میں سے کس کے جانشیں ہو جانے سے اسلام کے لیے نسبتاً سہولت اور مستقبل میں گنجائش کے امکان پیدا ہو سکتے ہیں۔ جہانگیر کی بظاہر زندگی اور اس کی دلچسپیوں کا تعلق اسلام کے مطابق نہ تھا اور خسروؒ میں بظاہر کوئی قباحت نظر نہ آتی تھی۔ لیکن جہانگیر مذہب کے معاملہ میں ایک غیر جانبدار اور اسلام سے معاندانہ رویہ نہ رکھتا تھا اور نہ اس کے سامنے

---

[٥] نوٹ: خسرو کی تائید و حمایت راجپوت ہی نہیں بلکہ سکھ راہنما گرو ارجن سنگھ نے بھی کی تھی گرونانک سے لے کر اب تک سکھ راہنما عملی سیاست میں دلچسپی نہ لیتے تھے لیکن گرو ارجن سنگھ نے جہانگیر کے مقابلہ میں خسروؒ کی مدد کر کے ایک عملی دلچسپی لی اور اس کے بعد سکھوں کے نقطہ نظر اور طرز فکر میں ایک تبدیلی آتی ہے اور ایک سوچے سمجھے اسکیم اور منصوبہ کے تحت عملی سیاست میں برابر دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ البتہ گرو ارجن سنگھ کو خسروؒ کی مدد کرنے کے جرم میں جہانگیر قتل کرا دیتا ہے۔ تزک جہانگیری۔ ص ۹۹ و

کوئی دوسرا واضح اور مثبت تصور تھا اس کے برخلاف خسروؒ کے ہمنوا مذہب اور حکومت کی آئندہ پالیسی کے سلسلے میں نہایت واضح خطوط اور تصورات رکھتے تھے۔ ان کے پیش نظر ایک ذہنی و فکری تحریک تھی جس کی داغ بیل اکبرؒ نے ڈالی تھی اور اب اسی کو وہ مزید پروان چڑھانا چاہتے تھے اس لیے جہانگیر کی زندگی کی روش میں بظاہر قباحتیں تھیں لیکن آئندہ کے لیے مشکلات اور مواقع کے امکانات کم تھے اور خسروؒ میں بظاہر قباحتیں نہ تھیں لیکن اس کے برسر اقتدار آنے سے مستقبل میں احیاء اسلام کی کوششوں کے لیے سخت عملی دشواریاں اور مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں اس لیے حضرت مجددؒ رحمۃ اللہ علیہ ان حالات کا محض نظریاتی، تصوراتی یا خیالی بنیادوں پر ہی نہیں بلکہ حقیقت پسندانہ تجزیہ کے بعد جہانگیر کی تخت نشینی کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے مناسب سمجھتے ہیں یہ ایک آئیڈیل صورت نہ تھی لیکن آئیڈیل کے حصول کے لیے ایک عملی تدبیر تھی۔ جہانگیر اسلام کے معیارِ مطلوب پر تو پورا نہ اترتا تھا لیکن اس کے برسر اقتدار آنے سے اسلام کے معیار مطلوب تک پہنچنے کے لیے منزل تو کم از کم نظر آتی تھی جس تک پہنچنے کے لیے راستہ کھل رہا تھا۔

شیخ فرید کی حمایت:۔

حضرت مجددؒ رحمانی سیاسی مصالح اور حکمت کے پیش نظر اپنے ہمنواؤں، معتقدین اور قدردانوں کو جو حکومت کے اعلیٰ اور معزز عہدوں پر فائز تھے۔ تبدیلی حکومت کے معاملہ میں دلچسپی لینے کی ہدایت کرتے ہیں۔ چنانچہ شیخ فرید بخاریؒ[۵] نہایت ہی حکمت اور مستعدی کے ساتھ جہانگیر کی تخت نشینی کے لیے تگ و دو کرتے ہیں اور امراء کی ایک بڑی تعداد کو اپنا ہمنوا بنا کر جہانگیر سے اس بات کا وعدہ بھی لیتے ہیں کہ وہ تخت نشین

---

[۵] نوٹ:۔ شیخ فرید بخاری اور حضرت مجدد الف ثانی رحؒ دونوں پیر بھائی تھے اور حضرت خواجہ باقی باللہ رحؒ کے انتقال کے بعد شیخ فرید بخاری حضرت مجددؒ رحؒ کے زیر تربیت بھی رہے ہیں۔

ہونے کے بعد شریعت کا تحفظ اور اسلامی قوانین کا احترام کرے گا۔ اس لیے اکبر کی بیماری کے زمانے میں جب راجہ مان سنگھ اور مرزا عزیز کوکہ خسرو کو بادشاہ بنانے اور جہانگیر کو قید کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو شیخ فرید نے اس کی شدید مخالفت کی اور سینہ سپر ہو کر جہانگیر کے مخالفوں کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اس طرح جہانگیر کے خلاف سازشیں آپ ہی کی حکمتِ عملی اور مستعدی کی وجہ سے ناکام ہو جاتی ہیں اور جہانگیر آپ ہی کی کوششوں سے ۱۶۰۵ء میں تخت نشین ہو جاتا ہے۔[۸۴] تو اعتراف خدمت کے صلے میں آپ کو انعامات و اکرامات کے علاوہ "صاحب السیف و القلم" کا خطاب دیتا ہے۔[۸۵] جہانگیر کے تخت نشین ہونے کا اعلان تو ہو گیا اور خسرو اور اس کے حامیوں کی کوششیں اور سازشیں ناکام ہو گئیں لیکن ابھی جہانگیر کی حکومت مستحکم نہیں ہوئی تھی اور خسرو اور اس کے ہمنواؤں کو اب بھی اعتماد تھا کہ انہیں امراء مملکت کی حمایت حاصل ہے اس لیے خسرو نے جہانگیر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اسے بعض امراء مملکت کی حمایت بھی حاصل ہوئی لیکن اس موقع پر بھی شیخ فرید بخاری سامنے آئے اور نہایت ہی جوانمردی اور مستعدی کے ساتھ خسرو کا تعاقب کیا اور قلیل فوج اور بے سر و سامانی کے باوجود خسرو کی فوج کو شکست دے کر اس کے منصوبے کو ایک بار پھر ناکام بنا دیا۔ جہانگیر کو جب اس ناقابل یقین فتح کی خبر ملی تو وہ اس قدر خوش ہوا کہ قاصد کو فتح کی خبر سنتے ہی "خوش خبر خاں" کا خطاب دیا۔[۸۶] اور شیخ فرید کو بھیروال کا علاقہ بخش دیا جہاں خسرو کو شکست ہوئی تھی اور "مرتضیٰ خاں" کا خطاب دیا۔[۸۷] جہانگیر کی یہ کامیابی اور خسرو کی شکست شیخ فرید اور ان کے حامیوں کی رہین منت ہے۔ یہ شیخ فرید

---

۸۴ محمد صالح کمبوہ۔ عمل صالح المعروف بہ شاہجہان نامہ (اردو ترجمہ) حصہ اول ص ۴۶۔

۸۵ تزک جہانگیری ص ۴۵۔ ۸۶ تزک جہانگیری (اردو ترجمہ) ص ۹۰۔

۸۷ تزک جہانگیری ص ۹۵۔

ہی تھے جنھوں نے راجہ مان سنگھ اور مرزا عزیز کوکہ کی سازشوں کو سیاسی داؤ پیچ کے میدان میں ناکام کیا اس کے بعد جب خسرو نے میدان جنگ کا راستہ اختیار کیا تو شیخ فرید ہی نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر میدان جنگ میں کود پڑے اور یکے بعد دیگرے خسرو کو دوبارہ میدان جنگ میں شکست فاش دے کر اس کی امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔ اور جہانگیر کی بادشاہت کے لیے راستہ صاف کر دیا۔

شیخ فرید اور حضرت مجددؒ کے تعلقات:۔

شیخ فرید اور حضرت مجدد رح کے تعلقات بہت ہی گہرے اور عقیدت مندانہ تھے اس تعلق کی نوعیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت مجدد نے اکیس خط آپ کو تحریر کیے ہیں[۸۸]۔ اتنی بڑی تعداد میں کسی دوسرے امراء مملکت کو خطوط نہیں لکھے اور خطوط کی زیادہ تعداد ایسی ہے جو جہانگیر کی تخت نشینی سے کچھ قبل اور اس کے بعد لکھے گئے ہیں بلکہ مکتوب نمبر ۴۳ تا مکتوب نمبر ۵۴ یعنی بارہ ۱۲ خطوط مسلسل یکے بعد دیگرے آپ ہی کو لکھے گئے ہیں۔ خطوط کی یہ کثرت ظاہر کرتی ہے کہ حضرت مجدد رح کو شیخ فرید سے کس قدر توقعات تھیں اور شیخ فرید بھی کس سعادت مندی کے ساتھ احیاءِ اسلام کے مسئلہ میں حضرت مجدد رح کی رہنمائی حاصل کر رہے تھے۔ ان تمام خطوط کا ایک ہی مرکزی نقطہ احیاءِ اسلام، اتباع سنت نبوی ترویج شریعت اور غلبہ اسلام ہے۔ آپ ان خطوط کے معرفت ایک طرف تو اسلام کی تعلیمات کے متعلق شکوک و شبہات کو رفع کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ تعلیمات اسلامی اور سنت نبوی کی اتباع کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں اور ساتھ ہی ماضی میں کفر کے غلبہ سے اسلام اور مسلمانوں کو جو زبردست صدمے پہنچے ہیں اس پر غیرت دلاتے ہیں۔ اس لیے شیخ فرید کی جہانگیر کی تخت نشینی میں جدوجہد محض ایک ملازم کی وفادارانہ جذبہ ہی سے نہیں بلکہ اس میں ایک

---

۸۸ مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب نمبر ۴۳ تا ۵۴، ۶۳، الم ۶، ۱۰۳، ۱۵۲، ۱۶۳، ۱۶۵، ۱۹۳، ۲۱۳، ۲۳۳۔

شعوری مقصدی لگن بھی نظر آتی ہے۔ چنانچہ حضرت مجدد رح کو جہانگیر کی تخت نشینی کی اطلاع ملی تو شیخ فرید کو ایک خط میں اس واقعہ پر اپنی خوشی کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"آج دولت اسلام کی ترقی اور بادشاہ اسلام کی تخت نشینی کی خوشخبری خاص و عام کے کانوں میں پہنچی تو اہل اسلام نے اپنے اوپر لازم جانا کہ بادشاہ کے مددگار اور معاون ہوں اور شریعت کو رواج دینے اور مذہب کو تقویت دینے میں اس کی رہنمائی کریں خواہ یہ امداد و تقویت زبان سے ہو سکے خواہ ہاتھوں سے سب سے بڑھ کر مدد کتاب و سنّت اور اجماع امت کے طریق پر شرعی مسائل کو بیان کیا جائے اور عقائد کو جمع کیا جائے تاکہ کوئی بدعتی اور گمراہ آکر راستہ سے نہ بھکا دے اور کام خراب نہ کر دے۔ اس قسم کی امداد علمائے اہل حق سے مخصوص ہے جو آخرت کی طرف توجہ رکھتے ہیں اور علمائے دنیا جن کا مقصود ہمہ تن دنیا کمانی ہے ان کی صحبت زہر قاتل ہے اور ان کا فساد متعدی ہے۔"[۵۸۹]

حضرت مجدد رح کی یہ تحریر ظاہر کرتی ہے کہ آپ نے تبدیلی خیالات میں عملی دلچسپی لی اور حسب منشاء کامیاب ہونے پر اپنی خوشی کا اظہار کیا اور بادشاہ کی مدد اور حکومت سے تعاون کا مقصد شریعت کو رواج دینا اور مذہب کو تقویت دینا قرار دیا تاکہ قولی اور عملی دونوں صورتوں میں ان مقاصد کے لیے تعاون کیا جائے۔ اس کو اس لیے بھی ضروری قرار دیتے ہیں تاکہ کوئی عالم دنیا محض اپنے دنیاوی مفاد کے لیے بادشاہ کو گمراہ نہ کر دے۔

باطل کا غلبہ ختم کرنے کے لیے مختلف طریق کار:۔

احیاء اسلام اور ترویج شریعت کا روح پرور اور حیات آفریں نصب العین عامۃ المسلمین کی نگاہوں سے کبھی اوجھل نہیں ہوا۔ ہمیشہ اس میں اس مقصد کی بر آری کے لیے ایک تڑپ، لگن اور خواہش موجود رہی ہے البتہ اس مقصد کو کس طرح حاصل کیا جائے؟ اس

---

۵۸۹ مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب ۴۷ ص ۱۱۸۔

کے حصول کے لیے کیا طریق کار اور پروگرام ہو، اور کس پالیسی اور نہج کو اختیار کر کے اس منزل مقصود تک پہنچا جا سکتا ہے؟ اس میں اختلاف رہا ہے اس لیے ہمیں اس دور میں اکبرؔ کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں اور ضلالتوں کو دور کرنے اور اسلامی معاشرہ کو قائم کرنے کے لیے مختلف نوعیت کی کوششوں کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ بعض افراد (کہنے کو تو بعض افراد ہیں لیکن دراصل ایک طرزِ فکر یا طریق کار کا پتہ چلتا ہے) اکبرؔ کی زندگی ہی میں اس کی پالیسیوں اور طرزِ فکر سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور نتائج سے بے پرواہ ہو کر علانیہ اس کی مخالفت بھی کرتے ہیں بلکہ بغاوت بھی کرتے ہیں۔ اس طرزِ فکر یا طریق کار سے اکبرؔ کی پالیسی اور پروگرام کے خلاف نفرت، ناراضگی اور غم و غصہ اور اسلام، شعائرِ اسلام کے لیے محبت اور عقیدت کے جذبے کا بے پناہ اظہار ضرور ہوتا ہے اور یہ لوگ تمام خطرات، مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ بھی کرتے ہیں لیکن اس قسم کی مخالفت اور تحریکوں کو اکبرؔ اپنی طاقت کے بل بوتے پر دبا دیتا ہے اور یہ تحریک بظاہر ختم ہو جاتی ہے اور ان کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ دوسرے ایسے بھی لوگ اس دور میں ملتے ہیں جو کافرانہ ماحول کے غلبہ سے بیزار ہیں لیکن وہ مقابلے اور مدافعت کا رویہ اختیار کرنے کے بجائے اپنے دین و ایمان کو بچانے کے لیے کشمکش حیات سے علیحدہ ہو کر گوشہ نشین ہو جاتے ہیں اور عبادات اور ریاضت کرتے رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان طریقوں ہی سے اسلام اور اسلامی اقدار کا تحفظ ہو سکتا ہے اور کچھ تو ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے جاتے ہیں تاکہ وہ کافرانہ اور غیر اسلامی ماحول کے غلبے سے اپنے دین و ایمان کو محفوظ رکھ سکیں۔ یہ مختلف ردِ عمل تھا جو اکبرؔ کی پھیلائی ہوئی جدت طرازیوں اور اختراعات کا مسلمانوں کے مختلف گروپوں پر مرتب ہوا تھا۔

لیکن ان طریقوں سے نہ تو غیر اسلامی ماحول کا غلبہ دور ہوتا ہے اور نہ ہی اسلام کے احیاء کی کوئی صورت پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ کافرانہ اور مشرکانہ ماحول و فضا جوں کا توں برقرار رہتا ہے۔ ان تمام طریقوں کے برعکس کچھ لوگوں کا خیال یہ تھا کہ احیاءِ اسلام اور ترویجِ شریعت کا مقصد نہ ان بالا طریقوں پر عمل کرنے سے ہو سکتا ہے اور نہ ہی حکومت اور

سیاسی جھگڑوں میں شریک ہو کر اس بلند و بالا مقصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ان کے نزدیک حکومت اور سیاسی گروہ بندیوں اور سیاسی کشمکش سے الگ تھلگ رہ کر پہلے وعظ و تلقین، درس و تدریس، عبادات و ریاضت و مجاہدہ اور مراقبات کی کثرت سے معاشرہ میں صالح افراد کی ایک بڑی جماعت تیار کر دینے سے خود بخود اسلامی معاشرہ قائم ہو جائے گا۔

غالباً اسی طرز فکر اور انہیں کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اگر ہم "طبقاتِ اکبری"، "روضۃ العلماء"، منتخب التواریخ حصہ سوم اور "اخبار الاخیار" کا مطالعہ کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر اور جہانگیر کے اوائل عہد حکومت میں تو ہندوستان میں صرف صوفیاء، بزرگان دین، علماء کرام اور مشائخ ہی مشائخ ہیں ان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ ان میں سے بہت سے بزرگان دین اپنے زہد، اتقاء اور علم و فضل کے لیے بہت مشہور تھے۔ ان میں سے نہ معلوم کتنے مرجع خلائق خاص و عام بھی تھے۔ درس و تدریس کا ایک وسیع جال بھی پھیلا ہوا تھا۔ پند و نصائح اور وعظ و تلقین کا بازار بھی گرم تھا۔ مراقبات و عبادات کی بھی بڑی کثرت تھی اور بعض بزرگان دین روحانیت کے اعلیٰ مقام پر بھی فائز تھے اور ان سے محیر العقول واقعات بھی رونما ہوتے تھے۔ لیکن ان تمام بزرگان دین اور صوفیاء کرام کی موجودگی کے باوجود اسلام اور شعائر اسلام کی بے حرمتی ہو رہی تھی اور کافرانہ و مشرکانہ ماحول غالب ہو رہا تھا ان کی تمام کوششیں انتہائی خلوص اور اپنی تمام نیک نیتوں کے باوجود اکبر کی بے دینی اور الحاد کی تحریک کو نہ روک سکیں وہ خود اور ان کا حلقہ اثر ممکن ہے کہ محفوظ رہا ہو۔ لیکن بحیثیت مجموعی اسلامی معاشرہ اور مسلمانوں کا اجتماعی تمدن اور ثقافت اکبر کی ہندوانہ اور مشرکانہ پالیسیوں سے بہت کچھ متاثر ہوا اور خصوصیت سے حکومت کا نظم و نسق، دربار کی نشست و برخاست اس کی مجلسیں، تفریحات، پسند و ناپسند کا معیار تو بالکلیہ اسلام و شعائرِ اسلام سے بغاوت پر مبنی ہو گئیں۔

خلاصہ یہ کہ جن حضرات نے بڑی نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ احیاء اسلام کے لیے

محض یہ تدابیر اور لائحہ عمل اختیار کیا وہ اپنی جگہ پر تو کامیاب رہے لیکن عملاً اس کا کوئی دیرپا اثر نہیں نکلا بلکہ روز بروز کفر کا غلبہ ہوتا گیا اور شعائر اسلام کی گرفت کمزور ہوتی گئی۔

حضرت مجددؒ کا طریق کار:۔

حضرت مجددؒ کی تحریک احیاء اسلام و نفاذ شریعت دوسری تحریکوں سے بالکل مختلف تھی۔ آپ رحؒ کی تحریک میں دین و دنیا کا ایک حسین اور متوازن امتزاج نظر آتا ہے۔ وہ عبادات کی اہمیت سے غافل نہیں ہیں بلکہ تمام فرائض و سنن کی پابندی کو اولین اہمیت دیتے ہیں لیکن احیاء اسلام اور ترویج شریعت کے سلسلے میں حکومت اور اس کے زبردست قوت اور اثرات کے بھی قائل ہیں اس لیے حکومت کی پالیسی اور نصب العین کی تبدیلی کو احیاء اسلام کی تحریک کو فروغ دینے کے لیے ایک اہم ذریعہ قرار دیتے ہیں اس سلسلہ میں بادشاہ کو جو مرکزی اہمیت حاصل ہے اس سے اپنے کارکنوں کو متوجہ کرتے ہیں[۹۰]۔ اسی لیے جیسے ہی معلوم ہوا کہ حکومت میں تبدیلی کے مواقع قریب ہیں اور قیادت میں عنقریب تبدیلی ہوگی تو اپنی تمام توجہات اپنے حسب منشاء تبدیلی قیادت پر مرکوز کر دی۔ حالانکہ اس وقت آپ کی تحریک عام نہیں ہوئی تھی کیونکہ اکبرؔ کے انتقال سے چند سال قبل ہی آپؒ نے اپنی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت آپ کی عمر صرف ۴۱ سال تھی[ع] اور ۱۵۹۹ء میں آپ رحؒ حضرت خواجہ باقی باللہ رحؒ کی بیعت سے مشرف ہوئے تھے اور ۱۶۰۳ء میں اپنے پیرو مرشد یعنی حضرت خواجہ باقی باللہ رحؒ کے انتقال کے بعد رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس طرح ۱۶۰۵ء میں جب اکبر کا انتقال ہوا اور جہانگیر کی تخت نشینی کا مسئلہ پیش آیا تو اس وقت آپ کی تحریک ابتدائی مراحل میں تھی اور پوری طرح لوگ اس سے متعارف

۹۰۔ مکتوب امام ربانی جلد اول مکتوب ۴۷ ص ۱۱۷۔

ع۔ یہ خیال رہے کہ حضرت مجددؒ رحؒ ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوئے اور اکبرؔ کا انتقال ۱۶۰۵ء میں ہوا تھا۔ یعنی اکبرؔ کے انتقال کے وقت آپ کی عمر ۴۱ سال کے قریب تھی۔

نہیں ہو سکے تھے اور نہ ہی اتنے قلیل عرصہ میں اکبر کے زمانے کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں اور شکوک و شبہات کو دور کرنے کا موقع ملا تھا اور نہ ہی لوگوں کی ذہنی و فکری تطہیر ہی کا کوئی قابل قدر کام ہوا تھا۔ اس لیے نہ تو تحریک ہی پوری طرح مسلمانوں میں متعارف ہوئی تھی اور نہ ہی تجربہ کار یا صلاحیت اور سمجھ دار کارکنوں کی کوئی معتد بہ تعداد ہی موجود تھی اس لیے ان حالات میں انقلابِ قیادت کی تحریک میں دلچسپی بعید از حکمت معلوم ہوتی ہے لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ ان تمام بے سر و سامانیوں اور نامساعد حالات کے باوجود جہانگیر کے تخت نشین کرانے میں آپ نے دلچسپی لی اور اس میں کامیاب ہوئے۔

آپ کی تحریک احیاءِ اسلام کی ایک اہم کڑی حکومت اور ملکی معاملات میں دلچسپی لینا اور اپنے حسب منشاء حکومت کی تبدیلی میں حصہ لینا بھی تھا۔ جو دوسرے تمام طریق کار سے بالکل مختلف تھا۔ یہ طریقِ کار اور لائحہ عمل اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ عبادات، فرائض و سنن کی پابندی کے ساتھ ساتھ سیاست اور حکومت کے معاملات میں دلچسپی لینے لگے اور ان اداروں کو بھی احیاءِ اسلام اور ترویج شریعت کے استعمال کے لیے بحیثیت ایک ذریعہ کے اسلامی قوتوں کے زیر اثر لانے کی جدوجہد شروع کی۔ اس طرح حکومت کے معاملہ میں لوگوں کا طرز فکر تبدیل کیا اور احیاءِ اسلام کی جدوجہد کرنے والے کارکنوں کی سیرت و اخلاق و عادات کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ ان میں حرکت، جدوجہد، مقابلہ، مسابقت، مدافعت علوئے ہمتی، بلند حوصلگی، عزم و جرأت اور مشکلات اور موانع کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی اسپرٹ اور خطرات اور رکاوٹوں کو دور کرانے کی تدبیریں اختیار کرنے کی صفات پیدا کیں۔ جس سے ان میں "گر زمانہ با تو نہ سازد، با زمانہ بستیز" کی جرأت مندانہ حوصلہ و جذبہ پیدا کر دیا اور یہی جذبہ آگے چل کر آپ کے متبعین اور کارکنوں میں "زمانہ دیگر بساز" کا حوصلہ و صلاحیت پیدا کرتا ہے اور نہ وہ لوگ اس میں کامیاب و سرخرو بھی ہوتے ہیں۔

احیاءِ اسلام کے لیے جدوجہد کا آغاز:۔

حضرت مجددؒ کے نزدیک محض حکومت تبدیل کرنا اور کسی خاص شخص کو برسر اقتدار

لانا ہی مقصد نہ تھا اور نہ ہی اس سے اصل مقصد حاصل ہو سکتا تھا[ع]۔ یہ تو محض ایک راستہ یا طریق کار تھا جو آپ نے مسلمانوں کو احیاءِ اسلام اور نفاذ شریعت کے سلسلے میں دکھایا تھا۔ یہ منزل نہ تھی بلکہ منزل کی طرف پہلا قدم تھا۔ ابھی تو منزل تک پہنچنے میں دشواریاں

نوٹ: ع جہانگیر تخت نشین ہونے کے بعد بارہ قوانین پر مشتمل ایک دستور العمل جاری کرتا ہے جس میں منجملہ بہت سے احکام کے ایک حکم یہ بھی تھا کہ "شراب اور دوسری تمام نشہ آور چیزیں نہ بنائی جائیں اور نہ ہی فروخت کی جائیں"۔

(یہ خیال رہے کہ اکبرؒ کے عہد میں شراب کی باقاعدہ سرپرستی اور ہمت افزائی کی گئی تھی اور اس کے دو بیٹے مرادؔ اور دانیالؔ عین جوانی میں کثرت شراب نوشی سے انتقال کرتے ہیں) حالانکہ جہانگیر خود کثرت سے شراب پیتا تھا۔ اور اپنی شراب نوشی کا تذکرہ تفصیل سے اور مزہ لے کر کرتا ہے۔ دیکھئے تزک جہانگیری ص ص ۴۱، ۴۲، ۴۴، ۴۶، ۷۷، ۱۲۳، ۲۵۸، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۴۰۷، ۴۲۷، ۴۳۵، ۴۵۱، ۴۵۹، ۴۷۰، ۴۷۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۷، ۵۰۷، ۵۱۶، ۵۲۶، ۵۵۷، ۸۳۲ اور ۸۳۸ وغیرہ وغیرہ)۔

حکومت تبدیل ہونے سے یکایک نہ تو حکومت ہی احیاءِ اسلام کے مقصد کو اختیار کرتی ہے اور نہ ہی نفاذ شریعت کے لیے راستہ ہموار ہو جاتا ہے البتہ حکومت کی اسلام کے معاملہ میں معاندانہ اور مخالفانہ پالیسی باقی نہیں رہتی البتہ حکومت مثبت اور ایجابی طور پہ کسی سائنٹفک پالیسی پہ گامزن ہوتی ہے اس لیے اکبرؒ نے اسلام کے خلاف جو مضبوط حصار اور قلعہ تعمیر کیا تھا۔ اس میں جہانگیر کے حکمراں ہونے کے بعد شگاف پیدا ہو گیا اور یہی شگاف رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اور اسلامی طاقتیں منظم اور موثر ہوتی گئیں اور مسلمانوں کی عمومی خواہش کو حکومت کے لیے نظر انداز کرنا ناممکن ہو گیا۔ جہانگیر کے بعد ۱۶۲۸ء میں شاہ جہان کے برسرِ اقتدار آنے سے اکبرؒ کی شروع کی ہوئی تحریک اور پالیسی مزید کمزور ہو جاتی ہے اور اس کے برعکس اسلامی تحریک اور بھی منظم اور مضبوط ہو جاتی ہے۔ حکومت ایجابی طور پہ اسلام کے حق میں حائل تھی اور رفتہ رفتہ ایسے قدم اٹھا رہی تھی جس سے خلاف اسلام اور مسلمان دشمن طاقتیں مغلوب ہو رہی تھیں اور اسلام اور مسلمان (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

اور رکاوٹیں تھیں۔ اس لیے احیاء اسلام اور نفاذ شریعت کے صبر آزما اور مشکل کام کے لیے ہمہ گیر اور مسلسل جدو جہد کی ہر فرنٹ پر ضرورت تھی تبدیلی حکومت سے جو سہولت اور مواقع حاصل ہو گئے تھے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ رحمۃ نے ایک طرف تو وسیع پیمانے پر تبلیغ دین کے لیے وعظ و تلقین اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ لوگوں کے ذہنوں میں کفر و شرک کے غلبہ سے جو شکوک و شبہات اسلام، اسلامی عقائد اور تصورات کے متعلق پیدا ہو گئے تھے اُن کو دور کرنے کے لیے علمی کوششیں کیں اور اسلام کی تعلیمات اور عقائد کو بدلائل واضح کر کے لوگوں کے ایمان و عقائد میں حرارت و خود اعتمادی پیدا کر دی۔ اور مسلمانوں میں عبادات و فرائض و سنن کی ادائیگی کے ساتھ اسلامی شعائر اور اقدار

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) دوبارہ ابھرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ مثلاً جہانگیر کے عہد حکومت میں "عمل صالح المعروف بہ شاہ جہاں نامہ" کا مصنف ۲۶ بہمن شاہ سنہ ۵ اجلاس جہانگیر شاہ جہاں کے تیسویں سالگرہ کا جشن تلادان کے ضمن میں لکھتا ہے کہ "درہمیں حضرت کو یہ خیال آیا کہ آج جب کہ اس جشن کے بدولت ساری دنیا عیش و نشاط میں محو ہے ہم نفس امارہ کو مغلوب کر کے عیش و نشاط کی بنیاد یعنی شراب سے ہاتھ اٹھا کر اسی جشن میں توبہ کر لیں تو مناسب ہے اگرچہ اب تک کبھی اپنی خواہش سے شراب کو ہاتھ نہ لگایا تھا اور توبہ لازم نہ تھی لیکن توفیق الٰہی کی بدولت توبہ فرمائی، حکم دیا کہ شراب کو دریائے چنبل میں بہا دیں، چاندی سونے کے جتنے جام و سبو ساقی خانے میں تھے سبھوں کو حضرت کے سامنے توڑ کر محتاجوں میں تقسیم کر دیا گیا" ص ۱۳۱)۔ عمل و کردار میں یہ تبدیلی دراصل اس طرز فکر اور رجحان کی غمازی کرتی ہے جس کہ حضرت مجددؒ رحمۃ نے شروع کیا تھا۔ (یہی وہ زمانہ ہے جب وہ جہانگیر کے زیر عتاب آئے (سن جلوس ۱۴ مطابق ۱۶۱۹ء) یہ طرز فکر روز بروز قوی اور مؤثر ہوتا جاتا ہے اور شاہجہان کے عہد حکومت میں قوی تر ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اورنگزیب عالمگیر کی کامیابی کے بعد ہوا کا رخ یکسر بدل جاتا ہے اور اکبر کا تعمیر کردہ قلعہ زمین بوس ہو جاتا ہے اس طرح اکبر کے انتقال کے ٹھیک ۵۳ سال بعد یعنی ۱۶۵۸ء میں عالمگیر ایک ایسے معاشرے کا قیام اور ثقافت کی احیاء کی کوشش کرتا ہے جس کی اساس قرآن پاک اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تھی۔ یعنی حضرت مجددؒ رحمۃ کی کوششوں سے ۱۶۰۵ء میں جو تبدیلی آئی تھی وہ اپنے برگ و بار ۱۶۵۸ء میں لائی ہے۔

کے غلبہ کے لیے بھی تڑپ اور ولولہ پیدا کر دیا۔ کفر و شرک کی کھلم کھلا مخالفت کی بلکہ ان طاقتوں سے کشمکش اور مجادلہ کا رویہ اختیار کیا تاکہ انہیں مغلوب کیا جائے اور اسلامی طاقتوں کا دائرہ وسیع اور مؤثر ہو۔ مزید دوسری طرف با اثر امراء مملکت کے ایک گروہ کو منظم کرنے کی کوشش کی تاکہ اگر ایک طرف وعظ و تلقین اور تبلیغ کے ذریعہ لوگوں کی اصلاح ذہن و فکر ہو اور اعمال و کردار میں تبدیلیاں پیدا ہوں تو دوسری طرف ان اُمراء کی معرفت شعائر اسلام اور اقدار کے پروان کے لیے ایک سازگار ماحول اور فضا بھی پیدا کی جائے کیونکہ اس کے بغیر اصلاح کی قوتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملتا اور فتنہ و فساد کے سیلاب کو روکا نہ جا سکتا تھا۔

آپ رح نے جہانگیر کے اوائل عہد حکومت میں امراء مملکت اور اعلیٰ حکام میں اپنا حلقہ اثر پیدا کر لیا تھا، جو حکومت کے وسائل اور ذرائع کو کفر کی طاقتوں کے غلبہ سے بچانے اور نفاذ شریعت کے لیے آسانیاں فراہم کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ان اعلیٰ عہدیداران مملکت سے آپ رح کے روابط تھے اور ان کے نام آپ کے متعدد خطوط ملتے ہیں۔ ان خطوں کے ذریعہ ان کے ذہن و فکر کی تطہیر اور ان کے شکوک و شبہات کو دور کرتے ہیں اور انہیں نفاذ شریعت اور احیاء اسلام کے لیے بار بار ابھارتے بھی ہیں تاکہ وہ اس مقصد سے غافل نہ ہونے پائیں۔ اس سلسلے میں خصوصیت سے شیخ فرید، عبدالرحیم خانخانان، مرزا حسام الدین خان جہاں، جباری خاں، مرزا فتح اللہ حکیم، مرزا دراب، قلیج خاں، بہادر خاں، صدر جہاں خواجہ جہاں، لالہ بیگ، خان اعظم وغیرہ وغیرہ امراء مملکت کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان امراء مملکت کے نام جو خطوط لکھے گئے ہیں ان کی تعداد کم و بیش ایک سو تک پہنچتی ہے اور یہ تمام خطوط اپنی ترتیب کے لحاظ سے جلد اوّل کے اوائل ہی میں محفوظ ہیں بلکہ بسا اوقات مسلسل ایک ہی ترتیب میں انہیں امراء کے نام خطوط لکھے گئے ہیں۔ مثلاً شیخ فرید جنہوں نے جہانگیر کی تخت نشینی میں بہت ہی اہم رول ادا کیا تھا ان کے نام تسلسل سے مکتوب ۴۳ تا ۵۲ لکھے گئے ہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب جہانگیر کی تخت نشینی کا مسئلہ درپیش تھا۔ ان خطوط سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اثناء میں آپ کی پوری توجہ ان ہی حضرات کی طرف مرکوز رہی ہے اور مسلسل خط و کتابت کے ذریعہ سے ان سے رابطہ قائم رکھا ہے

مکتوبات جلد اول کے اوائل کے بیشتر خطوط امراءِ مملکت ہی کے نام ہیں جو آپ نے احیاءِ اسلام کے مقصد کی بر آری کے لیے لکھے ہیں۔ اس طرح آپ نے امراءِ مملکت کے ایک باشعور گروہ کو منظم کر کے احیاءِ اسلام اور نفاذِ شریعت کے مقصد اور نصب العین پر جمع کیا۔ ان خطوط میں نفس مضمون کے علاوہ اندازِ بیان بھی بہت ہی نفسیاتی اختیار کیا گیا ہے جو مکتوب الیہ کے دل و دماغ ہی کو نہیں بلکہ جذبات کو بھی اپیل کرتا ہے۔ مثلاً شیخ فرید کو اس انداز میں مخاطب کرتے ہیں کہ:۔

"اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے بزرگ باپ دادوں کے راستہ پر ثابت قدم رکھے اور مہینوں اور دنوں کی گردش کے غم و اندوہ کے حادثوں سے سلامت رکھے۔ اللہ تعالیٰ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل آپ کو دشمنوں پر فتح دے" [۹۱]

خان اعظم کو لکھتے ہیں کہ:۔

"حق تعالیٰ آپ کو احکام اسلام کے بلند کرنے میں اسلام کے دشمنوں پر مدد و نصرت دے" [۹۲]

خان خانان کو لکھتے ہیں کہ:۔

"حق تعالیٰ ہم کو اور آپ کو ظاہر و باطن میں سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تابعداری پر ثابت قدم رکھے اور اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم کرے جس نے آمین کہا" [۹۳]

خان خانان کے بیٹے مرزا داراب کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں کہ:۔

---

۹۱ مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب نمبر ۴۵ تا ۴۷ و ۴۸ ص ص ۱۱۱، ۱۱۵، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹۔

۹۲ مکتوب نمبر ۶۵ ص ۱۴۴۔

۹۳ مکتوب ۶۷ جلد اول ص ۱۴۸۔

"خدائے تعالیٰ آپ کی تائید کرے اور آپ کو فتح و نصرت دے۔"[۹۴]

جباری خاں کو اس طرح لکھتے ہیں:۔

"حق تعالیٰ شریعت حقہ کے سیدھے راستہ پر استقامت عطا فرمائے۔"[۹۵]

اور لالہ بیگ کو یوں مخاطب کرتے ہیں:۔

"حق تعالیٰ ہم میں اور تم میں غیرت اسلامی کو زیادہ کرے"[۹۶] وغیرہ وغیرہ۔

خطوط کے انداز تخاطب سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ہر ایک کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں جس سے وہ نہ صرف آپ کی بات سمجھنے کے لیے آمادہ ہو جائے بلکہ آپ کی باتیں اس کی دل کی گہرائیوں میں بھی اتر جائیں۔ اور وہ آپ کا ہمنوا ہو جائے۔ آپؒ کی ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ با اثر امراء مملکت کی اچھی خاصی تعداد ایک مقصد اور نصب العین پر جمع ہو گئی جن کے درمیان احیاء اسلام اور نفاذ شریعت کی تڑپ مشترک تھی۔ یہ ایک قابل حیرت کارنامہ تھا جو آپ نے انجام دیا۔ کیونکہ یہ ابھی اکبری عہد حکومت کا آخری دور تھا۔ جس میں شیعہ عقائد کی ترویج و اشاعت، ہندویت کا غلبہ و اقتدار اور شرک و کفر کی طاقتیں اپنے شباب پر تھیں لیکن اس کے باوجود آپ کی کوششوں سے اتنے قلیل عرصہ میں اسی حلقے میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جو احیاء اسلام کے جذبے سے سرشار تھا۔ آپ رح کی یہی پالیسی اور طریقِ کار تھا جس پر آپ کے مریدین و متاثرین نے آئندہ عمل کیا۔ وعظ و تلقین اور تبلیغ کے ذریعہ عامتہ المسلمین میں احیاء اسلام کی اسپرٹ اور آرزو کو بیدار کرتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ حکومت اور اس کے وسائل و ذرائع کو بھی اسلام کے زیر اثر لانے کی کوششیں کیں۔

آپ کے مکتوبات نے لوگوں کے اندازِ فکر اور نقطہ نظر میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ عامتہ المسلمین میں احیاء اسلام اور نفاذِ شریعت کی ایک تڑپ اور لگن پیدا ہو گی۔ اس کا

---

۹۴ مکتوب نمبر ۷۱ جلد اول ص ۱۵۳۔ ۹۵ مکتوب نمبر ۸۷ جلد اول ص ۱۷۰۔

۹۶ مکتوب نمبر ۸۱ جلد اول ص ۱۷۹۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ارکان حکومت میں بھی آپ کے اثرات کا اضافہ ہوتا رہا اور جوق در جوق لوگ آپ کے حلقہ بگوش ہوتے گئے۔

یہی وجہ ہے کہ جہانگیر کے عہد میں حکومت کی پالیسی اسلام کی مخالفت میں نہ تھی بلکہ غیر جانبدار رہی اور یہی غیر جانبداری شاہ جہان کے عہد میں اسلام کی حمایت اور ہمدردی میں تبدیل ہو گئی اس میں شک نہیں کہ یہ ادھوری تبدیلی تھی لیکن حضرت مجددؒ نے جو آگ سلگائی تھی وہ برابر سلگتی رہی۔ آخر کار یہی چنگاری بڑھ کر ایک شعلہ کی حیثیت اختیار کرتی ہے اور نتیجتاً عالمگیر کی کامیابی نے تاریخ کے دھارے کو بالکل اسلام کی سمت میں موڑ دیا اور ادھوری تبدیلی پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی کیونکہ عالمگیر نے عملی طور پر حکومت کا مقصد اور نصب العین احیاء اسلام اور نفاذ شریعت کو قرار دیا تھا۔

ہوسِ اقتدار کا طعنہ:-

حضرت مجددؒ کی اس پالیسی اور طریق کار سے بہت سے لوگوں کو اختلاف تھا وہ اسے پسند نہ کرتے تھے اس لیے ان کی مخالفت فطری تھی۔ امراء مملکت سے راہ و رسم کو لوگ پسند نہ کرتے تھے اس لیے آپ کو ہوس اقتدار کا طعنہ دیا کرتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک یہ تمام کام محض دنیوی حیثیت رکھتے تھے جس کا دین سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ وہ اسے دین کے خلاف تصور کرتے تھے اس لیے وہ حکومت، معاملات ملکی اور امور مملکت سے بے تعلقی ہی کو دین اور احیاء اسلام کا ذریعہ سمجھتے تھے یہ ایک زبردست غلط فہمی اور غلط نقطہ نظر تھا جو اسلام کے نام سے مذہب پسند طبقہ میں گھر کر گیا تھا۔ اس لیے آپ نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی اور امراء سے ملنے جلنے اور حکومت سے تعلق کس نوعیت اور مقصد کے لیے کیا جائے اس کی وضاحت اس طرح کی "کہ اگر نسبتی کروں تو کوئی مرید نہ رہے لیکن میرے متعلق کچھ اور کام ہے اور وہ شریعت کو رواج دینا اور مذہب کی تائید کرنا ہے۔ اسی واسطے بادشاہوں کی صحبت میں جانا اور اس تصرف سے انہیں مطیع کرنا اور ان کے ذریعہ شریعت کو رواج دینا

تھا۔[۹۷] یعنی ارباب حکومت سے ملنا جلنا دنیا کے لیے نہیں ہے بلکہ ان کی معرفت شریعت کو رواج دینا ہے۔ اس لیے کہ داناؤں نے کہا ہے کہ اَلشَّرعُ تَحتَ السَّیفِ۔ کہ شرع تلوار کے نیچے ہے اور شرع شریف کی رونق بادشاہوں پہ منحصر ہے۔[۹۸]

مسلم رائے عامہ کی تنظیم:۔

آپ رح نے انقلاب حکومت کی تحریک میں جو دلچسپی لی تھی اس کی پشت پہ نہایت ہی واضح اور متعین مقاصد تھے۔ محض تبدیلی حکومت ہی مقصد نہ تھا بلکہ یہ ایک ذریعہ تھا جس کی معرفت احیاءِ اسلام اور نفاذِ شریعت کے لیے راستہ ہموار کرنا تھا۔ لیکن یہ کام محض تبدیلی حکومت سے انجام نہیں پا سکتا تھا اس لیے اس راہ میں جو رکاوٹیں اور مشکلات تھیں اور جو جو قوتیں اور گروہ مزاحم تھیں ان کے خلاف بھی آپ نے جدوجہد جاری رکھی۔ اوّلین کوشش تو آپ نے مسلمانوں میں مثبت طور پر احیاءِ اسلام کی تڑپ اور لگن پیدا کرنے کی تاکہ انہیں اپنے دل میں ایک چبھن اور ٹیس پیدا ہو جو احیاءِ اسلام اور نفاذ شریعت کے لیے مضطرب کرے۔ ان کی زندگیاں نہ صرف قول کی حد تک بلکہ عملاً اسلام کے مطابق ڈھل جائیں۔ وہ خود منکرات اور فواحش سے اجتناب کریں اور خیر و نیکی کے راستہ کو اختیار کریں وہ محض عبادات، مراقبات اور وعظ و تلقین ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ ان میں کفر و شرک اور غیر اسلامی طاقتوں سے بیزاری اور نفرت بھی پیدا ہو تاکہ ان کا اجتماعی شعور بیدار ہو اور وہ کفر و شرک کی طاقتوں سے تعاون یا سمجھوتہ یا مصالحت کے بجائے اس کو مغلوب کرنے کی جدوجہد کریں۔

چنانچہ اکبرؔ (۱۵۵۶ء۔۱۶۰۵ء) کے عہد حکومت میں مسلمانوں اور اسلام کو جن نامساعد حالات سے سابقہ پیش آیا تھا اس کی طرف حکومت کے ایک اعلیٰ رکن کو مخاطب

۹۷۔ مکتوب، نمبر ۶۵۔ ص ۱۴۵۔

۹۸۔ مکتوب امام ربانی نمبر ۶۵۔ جلد اول۔ ص ۱۴۴۔

کر کے یوں لکھتے ہیں کہ :۔

"گزشتہ زمانہ میں اہل اسلام کے سر پر کیا کیا گزرا ہے۔ گزشتہ زمانہ میں باوجود کمال غریب ہونے کے اہل اسلام پر اس قسم کی تباہی اور خرابی نہ گزرتی تھی کہ مسلمان اپنے دین پر قائم رہتے۔ اور کفار اپنے طریق پر۔ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ ۔۔۔۔۔۔۔ گزشتہ زمانہ میں کافر غلبہ پا کر دائرہ اسلام میں کفر کے احکام جاری کرتے تھے اور مسلمان اسلام کے احکام جاری کرنے سے عاجز تھے اور اگر کرتے تھے تو قتل کیے جاتے تھے۔

ہائے افسوس! حق تعالیٰ کے محبوب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کرنے والے ذلیل و خوار تھے اور ان کے منکر معزز و معتبر تھے ۔۔ مسلمان زخمی دلوں کے ساتھ اسلام کی ماتم پرسی کرتے تھے اور دشمن ہنسی ٹھٹھا کر کے ان کے زخموں پر نمک چھڑکتے تھے۔ ہدایت کا آفتاب گمراہی کے پردے میں چھپا ہوا تھا اور حق کا نور باطل کے پردوں میں آگیا تھا"[۹۹]

اسلام کے ضعف اور مسلمانوں کے خواری اور بے بسی کا حال ایک دوسری جگہ یوں پیش کرتے ہیں کہ :۔

"اسلام کی غربت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ کفار کھلم کھلا اسلام پر طعن اور مسلمانوں کی مذمت کرتے ہیں اور ہر کوچہ و بازار میں نڈر ہو کر کفر کے احکام جاری کرتے ہیں اور اہل کفر کی تعریف کرتے ہیں اور مسلمان اسلام کے احکام جاری کرنے سے رکے ہوئے ہیں اور شرائع کے بجالانے میں مذموم اور مطعون ہیں" [۱۰۰]

اسی سلسلے میں صورت حال کا نقشہ یوں بیان کرتے ہیں کہ :۔

---

۹۹ مکتوب امام ربانیؒ ۔ جلد اول مکتوب ۴۷ ص ۱۱۷۔۱۱۸۔

۱۰۰ مکتوب امام ربانیؒ جلد اول مکتوب نمبر ۶۵ ص ۱۴۴ ۔

"اسلام اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ ہندوستان کے کفار بے کھٹکے مسجدوں کو گرا رہے ہیں اور ان کی جگہ ہندو مندر بنا رہے ہیں"

ان حالات کی طرف متوجہ کرنے سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ اس وقت مسلمانوں اور اسلام کی پوزیشن عملاً کیا ہے اس لیے کہ نام نہاد دینی پیشوا صوفیاء اور علماء کرام ایسے بھی تھے جو بہر حال صورت حال سے مطمئن تھے اور انہیں کوئی خرابی نظر نہیں آرہی تھی اور بعض اسلام کے علمبردار ہونے کے باوجود اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے بجائے گوشہ نشین ہو کر خود کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے اور اسی کو مسئلہ کا حل سمجھتے تھے۔

غیر مسلموں کے عزائم بے نقاب کیے:۔

اکبرؔ کے عہد حکومت میں اسلام اور مسلمانوں کو جو شدید صدمہ پہنچا تھا وہ اکبرؔ کی لایعنی جدت طرازیوں اور ہندو نوازانہ پالیسی کا براہ راست نتیجہ تھا۔ اسی لیے تمدنی اور ثقافتی معاملات میں ہندوؤں کو بہت غلبہ حاصل ہو گیا تھا اور ان کے حوصلے اور عزائم بہت ہی بلند ہو گئے تھے انہوں نے حکومت کے معاملات میں دخیل ہونے کے سبب حکومت کی پالیسی کو اسلام کی مخالفت میں موڑ دیا تھا اور جوں جوں ان کے اقتدار اور قوت میں اضافہ ہوتا گیا وہ مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کرنے لگے اور شعائر اسلام کی جگہ ہندوانہ رسم ورواج اور طور طریق کو فروغ دیا اور اس وقت حکومت کے تبدیل ہو جانے کے باوجود بھی مسلمانوں کو زبردست خطرہ ہندوؤں کی جارحانہ کارروائیوں ہی سے تھا ہندوؤں کو وقتی طور پر ابھی ناکامی ہوئی تھی لیکن اس سے ان کی قوت ٹوٹی نہیں بلکہ محفوظ تھی اور اب بھی وہ ایک زبردست قوت تھے اور خود جہانگیر جو راجپوت شہزادی کے بطن سے تھا خود اس کے حرم میں سات راجپوت شہزادیاں موجود تھیں۔ اور وہ خود مذہب اور شریعت کے

لناہ

معاملہ میں کوئی ایجابی دلچسپی نہ رکھتا تھا۔ اس لیے یہ خطرہ کہ کہیں وہ مخالف اسلام طاقتوں کے زیر اثر نہ آجائے غیر ممکن نہ تھا۔ اس لیے بہت ہی ضروری تھا کہ نہایت ہی حکمت و تدبر سے احیاء اسلام اور نفاذ شریعت کی تحریک کو آگے بڑھایا جائے اس لیے یہ ضروری تھا کہ غیر اسلامی نظریات، عقائد اور تصورات کی علمبردار جماعتوں کے خلاف مسلمانوں کی رائے عامہ کو بیدار اور منظم کیا جائے اور برابر انہیں مخالفین کے عزائم اور حوصلوں سے باخبر رکھا جائے تاکہ مسلمان ان سے نہ صرف ہوشیار رہیں بلکہ انہیں مغلوب کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ آپ رح حکومت کے ایک اعلیٰ رکن کو تحریر کرتے ہیں کہ:۔

"ایک صدی سے اسلام پر اس قسم کی غربت چھا رہی ہے کہ کافر لوگ مسلمانوں کے شہروں میں صرف کفر کے احکام جاری کرنے پر راضی نہیں ہوتے بلکہ چاہتے ہیں کہ اسلامی احکام بالکل مٹ جائیں اور اسلام اور اہل اسلام کا کچھ اثر نہ رہے اور اس حد تک نوبت پہنچ چکی ہے کہ اگر کوئی مسلمان شعائر اسلامی کو ظاہر کرتا ہے تو قتل کیا جاتا ہے۔" ۱۰۲

اہل کفار کے عزائم اور حوصلوں کے سلسلے میں حکومت کے ایک اہم ترین اعلیٰ ترین حکام کو یوں باخبر کرتے ہیں کہ:۔

"ان نابکاروں کا کام اسلام اور اہل اسلام پر ہنسی ٹھٹھہ کرنا ہے ہر وقت اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ اگر قابو پائیں تو مسلمانوں کو ہلاک کر دیں یا سب کو قتل کر دیں یا کفر میں لوٹا دیں۔" ۱۰۳

ترغیب جہاد:۔

اہل کفار کے عزائم اور حوصلوں سے باخبر کرنے کے بعد مسلمانوں کو کفر کے خلاف

---

۱۰۲ مکتوبات امام ربانی رح جلد اول مکتوب نمبر ۸۱ ص ۱۷۹۔

۱۰۳ مکتوبات امام ربانی رح جلد اول مکتوب نمبر ۱۶۳ ص ۲۷۷۔

جہاد کی ترغیب ان الفاظ میں دیتے ہیں کہ:۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت یہ ہے کہ اسلامی احکام بجا لائے جائیں اور کفر کی رسمیں مٹا دی جائیں کیونکہ اسلام و کفر ایک دوسری کی ضد ہیں ایک کو ثابت و قائم کرنا دوسرے کو مٹانا ضروری ہے کہ ان دو اضداد کا جمع ہونا محال ہے.......... حق تعالیٰ اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو فرماتا ہے۔ یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر سختی کر.......... حق تعالیٰ نے اہل کفر کو اپنا اور اپنے پیغمبر کا دشمن فرمایا ہے۔ پس ان خدا اور رسول کے دشمنوں کے ساتھ ملنا جلنا اور محبت کرنا بڑا بھاری گناہ ہے۔ کم سے کم ضرر ان کی ہم نشینی اور ملنے جلنے میں یہ ہے کہ احکام شرعی کے جاری کرنے اور کفر کی رسموں کو مٹانے کی طاقت مغلوب ہو جاتی ہے اور دوستی و مروّت مانع ہو جاتی ہے۔ اور یہ حقیقت میں بہت بڑا ضرر ہے" [۱۰۱]

حضرت مجدد الف ثانی رح اپنی ان تحریروں میں مسلمانوں کو اصل مقصد سے آگاہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ سمجھاتے ہیں کہ اگر اہل کفار سے میل جول رکھا جائے تو اس کے خطرات کیا ہو سکتے ہیں؟ اس لیے مثبت طور پر نہایت ہی واضح الفاظ میں مسلمانوں پر یہ حقیقت واضح کرتے ہیں کہ:۔

"اسلام کی عزت کفر اور کافروں کی خواری میں ہے جس نے اہل کفر کو عزیز رکھا اس نے اہل اسلام کو خوار کیا ان کے عزیز رکھنے سے یہ مراد نہیں کہ صرف ان کی تعظیم کریں اور بلند جگہ پر بٹھائیں بلکہ اپنی مجلسوں میں جگہ دینا اور ان کی ہم نشینی کرنا اور ان کے ساتھ گفتگو کرنا سب اعزاز میں داخل ہے.......

---

[۱۰۱] مکتوبات امام ربانی رح مکتوب نمبر ۱۶۳ ص ۲۷۵-۲۷۶۔

.... مزید آپ رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اہل کفر کے ساتھ بغض و عناد رکھنا اسلام کی علامت ہے۔ ؎۱۰۵

اسلام اسلام است کفر کفر است:۔

اسی سلسلے کا ایک دوسرا فتنہ جس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی وہ اسلام اور ہندو مت کے فرق کو ختم کرنا اور کفر و شرک اور اسلام کو ملا کر ایک مخلوط مذہب اور مشترک کلچر کو رواج دینا تھا یا عہد جدید کی اصطلاح میں متحدہ قومیت کے تصور کی عملی تشکیل تھی اس فتنہ کو اکبرؔ ی دور کے جدّت طرازوں نے خوب ہوا دی۔ ہندوؤں کے رشیوں اور مذہبی مفکرین نے اکبرؔ کے عہد حکومت سے پہلے ہی یہ تحریک شروع کر دی تھی کہ رامؔ اور رحمانؔ ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں ان میں کوئی فرق یا امتیاز نہیں اس قسم کا طرز فکر مسلم صوفیاء کے ایک گروہ میں رواج پا گیا تھا جن کے مرید ہندو اور مسلم دونوں ہوتے تھے۔ اکبرؔ کے عہد حکومت میں اس کی لایعنی اختراعات اور ہندو نواز پالیسیوں کی وجہ سے اس طرز فکر کو خوب پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ یہاں تک کہ یہ طرز فکر ایک باقاعدہ تحریک؎ کی شکل اختیار کر گئی۔ چونکہ یہ بہت خطرناک تحریک تھی اور اس کی کامیابی اور مقبولیت اسلام کے لیے ایک عظیم ترین خطرہ تھی اس لیے آپ نے اس کی شدت سے مخالفت کی اور اس کے دُور رس اور مضر نتائج سے لوگوں کو آگاہ کیا۔

اس سلسلے میں ایک ہندو ہردےؔ رام جس نے آپ رح کو دو خط لکھے تھے اس کو جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"رامؔ اور کرشنؔ وغیرہ ہندوؤں کے معبود ہیں۔ اس (رحمان) کی مخلوقات میں سے ہیں اور ماں باپ سے پیدا ہوتے ہیں۔ رامؔ دشرتھ کا بیٹا اور لچھمنؔ

؎۱۰۵ مکتوبات امام ربانی رح جلد اول مکتوب ۱۶۳ ص ۲۷۶ - ۲۷۷۔

؎ بھگتی تحریک کا مقصد ہندو مسلم کے فرق کو ختم کر کے دونوں کو متحد کرنا تھا۔

کا بھائی اور سیتا کا خاوند ہے۔ جب رام اپنی بیوی کو نگاہ نہ رکھ سکا تو پھر دوسرے کی کیا مدد کر سکتا ہے۔ عقل و دور اندیشی سے کام لینا چاہیئے اور ان کی تقلید نہ کرنا چاہیئے۔ یہ بڑی عار کی بات ہے کہ کوئی تمام جہانوں کے پروردگار کو رام یا کرشن کے نام سے یاد کرے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی عظیم الشان بادشاہ کو کمینہ یا خاکروب کے نام سے یاد کرے، رام و رحمٰن کو ایک جاننا بڑی بیوقوفی ہے۔ خالق اور مخلوق ایک نہیں ہوتا اور بے چوں و بیچوں کے ساتھ متحد نہیں ہوتا[۱۰۶]

اس طرح آپ نے اس مسئلہ پر واضح اور دو ٹوک فیصلہ کر کے مسلمانوں کو ایک شدید اور خطرناک قسم کی گمراہی سے بچا لیا۔ ورنہ اگر یہ تحریک کامیاب ہو جاتی تو ہندوستان میں

---

[۱۰۶] مکتوبات امام ربانی رح جلد اول مکتوب ۱۶۷ ص ۲۸۴۔

نوٹ:۔ حضرت مجدد الف ثانی رح نے اہل کفار کے متعلق جو کچھ لکھا اور ان کے متعلق جو شدید رویہ اختیار کیا اس کے متعلق بعض لوگ حضرت مجدد رح پر تعصب، تنگ نظری، تشدد پسندی اور رجعت پسندی وغیرہ کے الزام لگاتے ہیں ان کا یہ الزام بظاہر قوی معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ آج ہم اس دور کی اصطلاحات (TERMINOLOGY) سے واقف نہیں ہیں لیکن فی الحقیقت اس عہد جدید میں باوجود تمام بلند بانگ دعووں۔ آزاد خیالی۔ لبرل ازم۔ وسیع المشربی، وسیع النظری اور روشن خیالی وغیرہ کے ان کا رویہ اپنے حریفوں اور مغلوب اقوام سے کیا ہے؟ اپنے ہی گردوپیش کے حالات پر نگاہ ڈالیے عہد جدید کی ایک غالب تہذیب کمیونزم ہے لیکن کمیونسٹ غیر اشتراکیوں کے متعلق جو رویہ رکھتے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں بلکہ روس میں کسی غیر اشتراکی کو زندہ رہنے کا حق ہی نہیں۔ وہاں اشتراکیت کے علاوہ کسی نظریہ کے سن نہیں سکتے۔ تمام مصائب اور خرابی کی اصل ان کے نزدیک سرمایہ داری ذاتی ملکیت اور بورژوا ہے جو اشتراکیت کی لغت میں ایک نہایت ہی گھناؤنی گالی ہے۔ اس نے انسانوں کو محدود جغرافیائی، لسانی، لونی، نسلی اور معاشی مفاد کے بنیاد پر طبقوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے کے خلاف نفرت، حقارت، بغض وعناد (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

سب کچھ ہوتا۔ لیکن اسلام اور مسلمان نہ ہوتے۔ ان کی انفرادیت اور وحدت ختم ہو گئی ہوتی اور ہندویت کے ویدانتی طرزِ فکر اور انجذابی فلسفہ کا شکار ہو کر ہندوستان کے لاتعداد فرقوں اور جاتیوں سے ایک جات اور فرقہ بن کر رہ جاتے۔ لیکن آپ رح کی تحریک اور بروقت

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ۔ اور دشمنی کی فضا پیدا کی ہے۔ مغربی ممالک میں دوسری غالب قوت امریکہ کو دیکھئے کہ آج بھی نیگروؤں کے ساتھ رنگ کے اختلاف کی وجہ سے کیا سلوک کیا جا رہا ہے؟ ان کے مدارس، سواری کی بسیں، ریل میں ڈبے، آبادیاں اور ہوٹل وغیرہ تک سب الگ ہیں وہ امریکیوں کے ساتھ آزادانہ مل جل نہیں سکتے، انہیں معاشرہ میں خوار و ذلیل اور فتنہ کی جڑ قرار دیا جاتا ہے اور جمہوریت کے دعوں کے باوجود نیگروؤں کو مساوی حقوق حاصل نہیں۔ پھر ان کا رویہ اپنے حریف تہذیب و تمدن کمیونزم سے کیا ہے؟ یا جن ممالک میں آمریت مسلط ہے کیا وہاں اپنے مخالف کو زندہ رہنے کا حق دیا جاتا ہے؟ کیا کوئی معاشرہ و تہذیب و تمدن اپنے دشمن کو کھلی چھٹی دینے کے لیے تیار رہا ہے؟ کیا کسی نے اپنے دشمن کے ساتھ سخت رویہ اختیار نہیں کیا؟ کیا خود ہندوؤں نے اچھوتوں کو انسانی حقوق عطا کیے ہیں؟ کیا ہندوؤں نے مسلمانوں کا سوشل بائیکاٹ نہیں کیا تھا؟ کیا ہندوؤں نے مسلمانوں کو ناپاک اور ملیچھ قرار نہیں دیا تھا؟ کیا آج سیکولر ہندوستان میں سیاسی، اقتصادی، تعلیمی اور معاشرتی دائرے میں جمہوریت کے نام پر بے رحم اکثریت کے بل بوتے پر مسلمانوں کی تہذیبی و ثقافتی وجود کو مٹا کر ہندویت میں جذب کرنے کی جابرانہ کوشش نہیں ہو رہی ہے؟ تو پھر یہ اعتراض حضرت مجدد رح پر کیا؟ حضرت مجدد رح تو صرف یہ چاہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان دونوں اپنے حلقہ اور دائرہ میں الگ الگ رہیں اور ہندو، مسلمانوں اور اسلامی تہذیب و تمدن کو غارت نہ کرنے پائیں۔ لکم دینکم ولی دین ان کا دین ان کے لیے اور ہمارا دین ہمارے لیے۔ حضرت مجدد رح ہندوؤں کے حقوق کو تسلیم کرتے ہیں اور ان کے علیحدہ وجود کے قائل تھے جس کو آج کل نہ تو روسی کمیونسٹ غیر اشتراکی کو دینے کو تیار ہے اور نہ ہی امریکہ کسی کمیونسٹ کو اپنے ملک میں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ تہذیب و تمدن یا نظریہ جو غلبہ و اقتدار کے لیے جدوجہد کرتا ہے وہ اپنے معاند سے ایسا ہی شاید (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

مخالفت سے ہندوؤں کو یہ کامیابی نہ ہو سکی اور اس معاملے میں انہیں سخت مایوسی اور ناکامی ہوئی اور مسلمان کبھی ہندو اور مسلم ایک قوم ہو کر سوچنے پر آمادہ نہ ہو سکے اور نہ آج بھی ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اسلام و کفر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

نفاذِ شریعت اور بادشاہ کی اصلاح کی تاکید:۔

حضرت مجدد کی تحریک کا مقصد محض حکومت کو زیر اثر لانا اور کفار کے غلبہ و خطرات سے آگاہ کرنا ہی نہ تھا بلکہ حکومت کے ذرائع و وسائل سے احیاءِ اسلام اور ترویج شریعت کا کام لینا تھا اس لیے تبدیلی حکومت سے فائدہ اٹھانے کے لیے آپ نے اپنے کارکنوں کو ہدایت کی کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنی جدوجہد کو تیز کریں اس سلسلے میں حکومت کے ایک اعلیٰ ترین رکن صدر جہاں کو یوں مشورہ دیتے ہیں کہ:۔

"اور اب جب کہ سلطنت میں انقلاب رونما ہو گیا ہے اور اہل مذہب کے عناد کی تیزی ختم ہو چکی ہے۔ عظماء اسلام، وزراء اور علماء کرام کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی پوری توجہ احکام شرعیہ کی ترویج پہ لگا دیں اور اولین فرصت میں اسلام کے ان ارکان کو قائم کریں جو عہد ماضی میں منہدم کر دیے گئے تھے۔ ہم غریبوں کو اس بارے میں تاخیر و توقّف سے سخت بے چینی ہے۔ اگر بادشاہ میں اسلام کی ترویج کا کوئی جذبہ نہ ہو اور اس کے مقربین بھی اس بارہ میں کچھ نہ کہیں اور چند روزہ زندگی کو عزیز رکھیں تو فقراء و اہل اسلام کے لیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)۔ اور جارحانہ رویہ اختیار کرنے کے لیے مجبور رہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ غیر اسلامی نظریات کی حامل قوتیں جبر و تشدد اور قوت کے بل بوتے پر دوسروں کو اپنے میں جذب ہونے کے لیے مجبور کرتی ہیں اس کے برعکس اسلام ان کے علیحدہ وجود اور انفرادیت کو تسلیم کرتا ہے اور ذہن و فکر کی تبدیلی کے ساتھ برضا و رغبت مساوی حقوق کے ساتھ اپنے دائرہ میں شمولیت کی دعوت دیتا ہے۔

کام بڑا تنگ و تاریک ہو جائے گا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ ط کیا معلوم نہیں کہ اس بربادی کی وجہ سے ہمارا کیا حال ہے؟ آہ جو دولت ہم سے چھن گئی ہے اگر وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ سے گئی ہوتی تو وہ اور ان کے دیو، پری سب خون کے آنسو بہاتے .... اسلامی نشانوں میں سے ایک نشان اسلامی شہروں میں قاضیوں کا مقرر کرنا ہے جو گزشتہ زمانے میں محو ہو گیا تھا۔ سرہند میں جو اہل اسلام کے بڑے شہروں میں سے ہے کئی سال سے کوئی قاضی نہیں ہے"[۱۰۷]

حکومت کے عہدیدار اور علماء کرام کو متوجہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے دائرہ اثر میں احکام شرعیہ کی ترویج پر اپنی توجہ منعطف کریں اور اولین فرصت میں ارکان اسلام قائم کریں جو لوگ بااختیار رہیں اور جنہیں ذرائع و مواقع حاصل ہیں انہیں بالکل غفلت نہ کرنی چاہیئے اس کی وجہ سے احیاء اسلام کی جدوجہد کرنے والوں میں اضطراب ہوتا ہے اور اصل کام میں مشکلات اور دشواریاں ہو جاتی ہیں۔

اس طرح آپ نفسیاتی حیثیت سے ترویج شریعت اور احیاء اسلام کی جو ذمہ داری حکومت کے کارکنوں اور بادشاہ کے مقربوں پر عائد ہوتی ہے اس کی اہمیت اور ضرورت کو مزید موثر بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں معاشرہ میں بادشاہ کو جو مرکزیت اور بنیادی اہمیت حاصل تھی اس کی وضاحت اور تشریح کرنے کے بعد حکومت کے ایک اعلیٰ اور معزز رکن خان جہاں کو مخاطب کرتے ہیں کہ:۔

"بادشاہ کی بہتری میں کوشش کرنا گویا تمام بنی آدم کی اصلاح میں کوشش کرنا ہے اور بادشاہ کی اصلاح اس امر میں ہے کہ بلحاظ وقت جس طرح ہو سکے کلمہ اسلام کا اظہار کیا جائے۔ کلمہ اسلام کے بعد اہل سنت و جماعت کے معتقدات بھی کبھی کبھی بادشاہ کے کانوں تک پہنچا دیے جائیں اور مذہب مخالف کی تردید

۱۰۷ء مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب ۱۹۵ ص ۳۲۳۔

کرنی چاہیئے اگر یہ دولت میسر ہو جائے تو گویا انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وراثت عظمیٰ ہاتھ آگئی۔ آپ کو یہ دولت مفت حاصل ہے اس کی قدر جاننی چاہیئے زیادہ کیا مبالغہ کیا جائے۔ حالانکہ جس قدر زیادہ مبالغہ کیا جائے اسی قدر بہتر ہے۔ (اللہ توفیق دینے والا ہے) ۸۰ـہ . . . .

. . . . . . جب ایسا عظیم الشان بادشاہ آپ کی باتوں کو اچھی طرح سنتا اور مانتا ہے تو یہ کس قدر بھاری دولت ہے کہ آپ صراحتاً یا اشارتاً کلمہ حق یعنی کلمہ اسلام کو جو اہل سنّت و جماعت کے معتقدات کے موافق ہیں ان کے گوش گزار کریں اور جہاں تک گنجائش ہو سکے اہل حق کی باتوں کو پیش کریں بلکہ ہمیشہ امیدوار اور منتظر رہیں کہ کوئی ایسا موقع مل جائے جس میں مذہب و ملت کی نسبت گفتگو شروع ہو جائے تاکہ اسلام کی حقیقت ظاہر کی جائے اور کفر کا بطلان کیا جائے۔" ۸۰ـہ

خلاصہ یہ کہ آپ قدم قدم پر نہ صرف احیاء اسلام کی ترغیب دیتے ہیں بلکہ ان کو راستہ بھی سجھاتے ہیں اور اس کام کی عظمت و بلندی کا شدید احساس دلاتے ہیں کہ اس کام کا کرنے والا دراصل انبیاء کا وارث ہے۔

علمائے سوء سے اجتناب کی تاکید:۔

حضرت مجدّد الف ثانی رحمہ نے مسلمانوں میں محض احیاء اسلام اور غلبہ شریعت کے لیے

۸۰ـہ مکتوبات امام ربانی مکتوب نمبر ۶۷ جلد دوم ص ۲۲۳، ۲۲۵۔

نوٹ:۔ اکبرؔ کی بے راہ روی اور اسلام دشمنی میں متعدد اسباب میں سے ایک سبب علماء سو اور صوفیاء خام کی بے کرداری اور جاہ و اقتدار کی گھٹیا ہوس بھی تھی جس کے حصول کے لیے وہ اسلام کی من مانی تعبیر کیا کرتے تھے۔ ابتدائی صفحات میں چند واقعات درج ہیں جو علماء سو کے کردار کو ظاہر کرتے ہیں۔

جوش اور ولولہ ہی نہیں پیدا کر دیا بلکہ اس کے ساتھ عملی نفاذ میں جو دشواریاں اور مشکلات تھیں اس کو پیش نظر رکھا اور کارکنوں کی بھی صحیح رہنمائی کی تاکہ جوش میں آ کر کہیں غلط قدم نہ اٹھائیں۔ ماضی میں مسلمانوں اور اسلامی شعائر اور اقتدار کو جو زبردست صدمات پہنچے تھے اور کفر و الحاد کو جو غلبہ حاصل ہوا انہیں علماءِ سوء، اقتدار پرست اور نام نہاد مذہبی پیشواؤں کی بدکرداریوں، بداعمالیوں، پست حوصلگی اور دنیا پرستی کو بہت کچھ دخل تھا۔ ان کی حرکتیں احیاءِ اسلام کی راہ میں زبردست رکاوٹ تھیں۔ اس لیے حضرت مجددؒ لوگوں کو ان سے خبردار کرتے ہیں تاکہ لوگ محض علماء کے نام سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں اور ان کی ہمتیں پست نہ ہو جائیں۔ چنانچہ شیخ فریدؒ کو جو حکومت کے اعلیٰ عہدیدار تھے اور جنہوں نے جہانگیر کو تخت نشین کرانے میں نمایاں ترین اور اہم خدمات انجام دی تھیں، [۱۰۹] تحریر کرتے ہیں کہ:۔

"کسی بزرگ نے ابلیس لعین کو دیکھا کہ فارغ اور بیکار بیٹھا ہے اس کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ اس وقت کے علماء میرا کام کر رہے ہیں، بہکانے اور گمراہ کرنے کے لیے وہی کافی ہیں۔" [۱۱۰]

اسی سلسلے میں حکومت کے دوسرے اعلیٰ عہدیدار صدر جہاں کو یوں مخاطب کرتے ہیں کہ:۔

"زمانہ سابق میں جو فساد پیدا ہوا تھا وہ علماء ہی کے بداعمالی سے ظہور میں آیا تھا۔ .... علماء سوء دین کے چور ہیں ان کا مقصود ہمہ تن یہ ہے کہ خلق کے نزدیک مرتبہ و ریاست اور بزرگی حاصل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ ان کے فتنہ سے بچائے۔" [۱۱۱]

یہی وجہ ہے کہ جب آپ کو معلوم ہوا کہ:۔

"بادشاہ اسلام نے مسلمانی کی حیثیت سے جو اپنی ذات میں رکھتا ہے۔

---

[۱۰۹] دیکھئے حوالہ نمبر ۸۸۔

[۱۱۰] مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب ۵۳ ص ۱۲۶۔

[۱۱۱] مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب ۱۹۴ ص ۳۲۲۔

شیخ فرید سے فرمایا کہ چار علماء دیندار پیدا کریں تاکہ دربار میں ملازم رہیں اور مسائل شرعیہ کو بیان کرتے رہیں تاکہ خلاف شرع کوئی امر صادر نہ ہو۔"[۱۱۲]

تو آپ رحمۃ نے اس خبر پر اپنی خوشی اور مسرت کا اظہار یوں کیا:۔

"بحمد اللہ مسلمانوں کو اس سے بڑھ کر کونسی خوشی ہوگی اور ماتم زدوں کو اس سے زیادہ کیا خوشخبری ہوگی"[۱۱۳]

علماء کے انتخاب کے لیے ہدایات:۔

لیکن اس سلسلے میں علماء کے انتخاب پر محض خوشی کا اظہار کر کے خاموش نہیں ہو جاتے بلکہ اس سلسلے میں بہت ہی واضح ہدایت دیتے ہیں کہ کس قسم کے علماء کا انتخاب کیا جائے کیونکہ ذرا سی غلطی بجائے مفید ہونے کے نقصان عظیم کا باعث ہو سکتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ:۔

"ایسے علماء دیندار بہت تھوڑے ہیں جو حب جاہ و ریاست سے خالی ہوں اور شریعت کی ترویج اور ملت کی تائید کے سوا اور کچھ طلب نہ رکھتے ہوں اور حب جاہ ہونے کی صورت میں ہر ایک عالم اپنی طرف کھینچے گا اور اپنی بزرگی کو ظاہر کرنا چاہے گا اور اختلافی باتیں درمیان میں لاکر ان کو بادشاہ کے قرب کا وسیلہ بنائے گا تو ناچار معاملہ بگڑ جائے گا۔ گزشتہ زمانے میں ایسے علماء کے اختلاف نے جہان کو بلا میں ڈال دیا تھا۔ اور اب بھی وہی صحبت در پیش ہے ترویج شریعت کیا ہوگی بلکہ یہ تو خرابی کا باعث ہوگا۔ اللہ تعالیٰ بُرے علماء کے فتنہ سے بچائے۔ اگر اس غرض کے لیے ایک عالم مل جائے تو بہتر اور اگر علمائے آخرت میں سے کوئی دستیاب

---

[۱۱۲] مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب ۵۳ ص ۱۲۵۔

[۱۱۳] مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب ۵۳ ص ۱۲۶۔

ہو جائے تو نہایت ہی سعادت ہے کیونکہ اس کی صحبت اکسیر ہے اور اگر ایسا آدمی نہ ملے تو صحیح غور و فکر کے بعد اس قسم کے آدمیوں سے کسی بہتر کو اختیار کریں۔"[۱۱]

دیکھئے حضرت مجدد رح احیاء اسلام اور نفاذ شریعت کے لیے کس قدر اضطراب اور بے چینی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس معاملہ میں توقّف کو ذرا پسند نہیں کرتے۔ کارکنان مملکت کو ترویج شریعت کی عظمت کا احساس دلاتے ہیں اور عجلت کی تاکید کرتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ بادشاہ بھی اس کی ضرورت کو محسوس کر کے آمادہ ہو جاتا ہے اور اس مقصد کے لیے چار علماء کی تقرری کی خواہش کا اظہار کرتا ہے تو اس وقت آپ جوش و ولولہ کے باوجود حکمت تدبر اور عاقبت اندیشی سے مسئلہ کی نزاکت اور اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک طرف تو خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے ہیں اور دوسری طرف اس میں جو خطرات مضمر تھے اس سے آگاہ کر کے علماء کے انتخاب کا ایک معیار پیش کرتے ہیں کہ اگر علماء اس معیار مطلوب پر پورے نہ اتریں تو پھر ایک ہی پہ اکتفا کیا جائے تاکہ علماء میں اختلاف نہ پیدا ہو کیونکہ علماء کے اختلافات ہی نے جہاں کو بلا میں ڈال دیا تھا۔

حضرت مجدد رح نے یہ بات بہت ہی پتے کی کہی ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں بعض خود پسند اور متکبر حکمرانوں نے اپنی خواہش، خود پسندی خود رائی اور اجتہاد کے زعم باطل کو شریعت اور عین اسلام کا نام دینے کے لیے ایسے ہی علماء کا انتخاب کیا ہے جو ان کی ہوائے نفس کی تائید کرنے میں ان سے بھی پیش پیش ہوتے ہیں کبھی تو علماء کے اختلاف کا سہارا لے کر سرے سے اسلام اور شریعت کو اجتماعی زندگی سے خارج کر کے نجی زندگی تک محدود کرنے کی سعی کی ہے لیکن مسلم تاریخ کا یہ بھی ایک روشن پہلو ہے کہ جب حکمرانوں کو شریعت سے فرار میں ناکامی نظر آئی تو پھر امت میں اختلاف اور انتشار پیدا کرنے کے لیے اور اس سے حسب منشاء اپنا فائدہ

---

[۱۱] مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب ۵۳ ص ۱۲۶۔

حاصل کرنے کے لیے ایسے ہی علماء کو منصب و امامت سپرد کیا جاتا ہے جو حب جاہ، خلق کے نزدیک بزرگی و ریاست و امارت کا خواہشمند ہوتا ہے اس لیے ترویج شریعت اور احیاء اسلام میں علماء کا انتخاب ایک بہت ہی اہم اور بنیادی مسئلہ ہے اس کے نتائج بہت ہی دور رس ہو سکتے ہیں۔

عقل کی بیچارگی اور نبوت کی اہمیت و ضرورت:۔

اکبر کے عہد کے فتنوں اور گمراہیوں میں سے ایک زبردست فتنہ دنیاوی امور اور معاملات ملکی میں شریعت اور نبوت کی ہدایت و رہنمائی سے بے نیاز ہو کر "عقل" و فلسفہ، "تجربہ" اور ملکی و سیاسی معاملات میں خود ساختہ مصلحتوں کو رہنما بنا کر اجتماعی زندگی کے مسائل کو حل کرنا تھا۔ اکبر نے اپنے دور حکومت میں جتنی اختراعات اور اجتہاد کیے ان کی بنیاد عقل، فلسفہ، تجربہ اور ملکی و سیاسی خود ساختہ مصلحتیں ہی تھیں اور اس وجہ سے رفتہ رفتہ شریعت اور اسلام کی تعلیمات سے اس کی حکومت کی پالیسی بے نیاز ہوتی گئی۔ یہ ایک بہت ہی خطرناک طرز فکر تھا۔ اگر اس طرز فکر کی گمراہی اور ضلالت کی بروقت مخالفت نہ کی جاتی تو اس کے بہت ہی خطرناک نتائج اسلام اور مسلمانوں پر مرتب ہوتے اس لیے حضرت مجدد رح نے اس طرز فکر اور تصور کی شدت سے مخالفت کی اور مثبت طور پر ایک مستقل رسالہ ہی "اثبات النبوۃ" کے نام سے تحریر کیا جس میں نبوت کے مسئلہ پر مدلل بحث کر کے نبوت کی اہمیت، افادیت اور ضرورت کو ثابت کیا اور عقل کی کمزوریوں، کوتاہیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی۔ چنانچہ اس مسئلہ پر کہ تنہا عقل رہنمائی کے لیے قابل اعتماد ہے یا نہیں تحریر کرتے ہیں کہ:۔

> "عقل، اعتماد کے لائق نہیں ہے اس کے ماخوذہ احکام وہم کے غلبہ اور خیال کے تصرف سے نہیں بچ سکتے اور نسیان کی آمیزش اور خطا کے گمان سے محفوظ نہیں رہ سکتے"۔[115]

---

[115] مکتوبات امام ربانی رح جلد اول مکتوب ۲۶۶ ص ۱۵۴۔

اسی سلسلے میں نبوت اس کی غرض و غایت اہمیت اور افادیت پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا مبعوث ہونا اہل جہاں کے لیے سراسر رحمت ہے اگر ان بزرگوں کا واسطہ اور ذریعہ نہ ہوتا تو ہم گمراہوں کو اس واجب الوجود تعالیٰ و تقدس کی ذات و صفات کی معرفت کی طرف کون ہدایت فرماتا اور ہمارے مولیٰ جل شانہٗ کی مرضیات اور نامرضیات میں کون تمیز کرتا۔ ہماری ناقص عقلیں ان بزرگوں کے نور دعوت کی تائید کے بغیر معزول و بیکار ہیں اور ہمارے ناتمام اور ادھورے فہم ان کی تقلید کے بغیر اس معاملہ میں مخذول و خوار ہیں۔ ہاں عقل بھی اگرچہ حجت ہے لیکن حجت ہونے میں ناتمام ہے اور مرتبہ بلوغ تک نہیں پہنچتی ہے۔ حجتِ بالغہ انبیائے علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت ہے جس پر آخرت کا دائمی عذاب و ثواب وابستہ ہے[۱۱۶] اس طرح نہایت ہی لطیف اور موثر انداز میں عقل کو معیارِ کل سمجھنے والوں کے طرز فکر کی کجی اور گمراہی کی نشاندہی کرنے کے بعد نبوّت کی اہمیت و ضرورت کی وضاحت کرتے ہیں۔ نبوّت کی اہمیت محض اعتقادی یا قولی ہی نہیں ہے بلکہ اسلام میں نبوت پر ایمان و اقرار کا مطلب زندگی کے تمام معاملات میں اس کی رہنمائی و ہدایت کو تسلیم کرتا ہے۔ اس لیے نہایت ہی وضاحت اور شدّومد کے ساتھ اس بات پر زور دیا کہ شریعت کا اتباع کیوں ضروری اور لازمی ہے اس لیے آپ کے مکتوبات میں متعدد خطوط اس ضمن میں ملتے ہیں جس میں شریعت کی ضرورت اور اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔[۱۱۷]

اتباع شریعت ہی کے ضمن میں حکومت کے ایک اعلیٰ رکن خواجہ جہاں کو تحریر کرتے ہیں کہ:۔

"دنیاوی امور میں روشن شریعت کے حکم کے موافق چلنا چاہیئے اور کھانے،

---

[۱۱۶] مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب ۲۶۶ ص ۵۱۳۔

[۱۱۷] مثلاً مکتوبات امام ربانی رح جلد اول مکتوب ۳۶، ۴۴، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۸، وغیرہ وغیرہ۔

پہننے اور رہنے، سہنے میں شرعی حدوں کو مدِ نظر رکھنا چاہیئے اور حدوں سے تجاوز نہ کرنا چاہیئے۔ اور بڑھنے والے مالوں اور چرنے والے چارہ پاؤں پر زکوٰۃِ مفروضہ ادا کرنا چاہیئے۔ اور جب احکام شرعی سے آراستہ ہونا نصیب ہوا تو گویا دنیا کی تکالیف سے نجات حاصل ہو گئی اور آخرت کے ساتھ جمع ہو گئے۔"

تمنائی کلموں کے ساتھ خط کے آخر میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہم کو شریعت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تابعداری کی توفیق دے۔" ؎۱۱۸

اسی سلسلے میں حکومت کے ایک دوسرے رکن جبّاری خان کو متوجہ کرتے ہیں کہ:۔

"شریعت کو سچّا جاننا اور اسی کے مطابق عمل کرنا در حقیقت تمام شریعتوں کی تصدیق کرنا اور ان کے موافق عمل بجا لانا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا انکار کرنا تمام اسمائی و صفاتی کمالات کا انکار کرنا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تصدیق ہیں ان سب کی تصدیق ہے پس ناچار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منکر اور اس شریعت کی تکذیب کرنے والے ان تمام امتوں سے بدتر ہوں گے۔" ؎۱۱۹

تاکیدِ اتباعِ شریعت:۔

حضرت مجددؒ اپنے مکتوبات میں بڑی شدّ ومدّ سے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ نبوّت کی ہدایت اور سُنّتِ نبوی کے مطابق زندگی گزارنی چاہیئے اور اس سے ہٹ کر زندگی گزارنے کا تصوّر سراسر اسلام کے خلاف ہے۔ شریعت کو اجتماعی زندگی میں جو بنیادی اور

؎۱۱۸ مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب ۲۷ ص ۱۵۴-۱۵۵۔

؎۱۱۹ مکتوبات امام ربانی رح جلد اول مکتوب ۹۷ ص ۱۷۲-۱۷۳۔

مرکزی اہمیت حاصل ہے اس کے پیش نظر بار بار نہایت ہی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ اتباع سنت نبوی پر زور دیتے ہیں اور اس سے ہٹ کر زندگی گزارنے کے تصور کی شدت سے تردید کرتے ہیں۔ قلیچ اللہ کو شریعت کی متابعت کے سلسلے میں تلقین کرتے ہیں کہ:۔

"اے فرزند جو بات کل قیامت کے دن کام آئے گی وہ صاحب شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی متابعت ہے اور احوال و مواجید اور علوم معارف اور اشارات و رموز اگر اس متابعت کے ساتھ جمع ہو جائیں تو بہتر اور زہے قسمت ورنہ سوائے خرابی اور استدراج کے کچھ نہیں۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مزید تاکید کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے خلفائے راشدین علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کی متابعت پر ثابت قدم رہیں اور قول و فعل میں شریعت کی مخالفت سے بچیں کیونکہ متابعت میں امن و برکت ہے اور مخالفت میں بدبختی و ہلاکت" [۱۲۰]

نبوت اور شریعت کی اہمیت واضح کرنے کے بعد اس بات پر زور دیتے ہیں کہ عقائد اور اعمال کو بھی اسی کے مطابق ڈھالنا چاہیئے اور اس کی بنیاد کتاب و سنت اور علمائے حق کی تشریح و توضیح کے مطابق ہو اور ان لوگوں کے طور طریقوں سے بچنا چاہیئے جو بدعت کو شریعت کے نام سے رواج دیتے ہیں۔ شیخ فرید کو جو حکومت کے ایک اعلیٰ عہدیدار اور بادشاہ کے معتمد علیہ امراء میں سے تھے ان کو تحریر کرتے ہیں کہ:۔

"ہم پر اور تم پر ضروری ہے کہ اپنے عقاید کو کتاب و سنت کے مطابق جیسا کہ علمائے حق نے کتاب و سنت سے سمجھا اور اخذ کیا ہے، صحیح کریں کیونکہ ہمارا اور تمہارا سمجھنا اگر ان حضرات کی رائے کے مطابق نہ ہو تو قابل اعتبار نہیں اس لیے ہر بدعتی اور گمراہ اپنے باطل خیالات کی بنیاد قرآن و حدیث ہی پر رکھتا ہے اور وہیں سے ان کو اخذ کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ حالانکہ ان سے کوئی یقین

---

[۱۲۰] مکتوبات امام ربانی رح جلد اول مکتوب ۱۸۴ ص ۳۰۷۔

حاصل نہیں ہوتا۔ ،

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان عقائد کے درست کرنے کے بعد حلال وحرام، فرض و واجب، سنّت ومندوب ومکروہ وغیرہ کا سیکھنا اور اس علم کے مطابق عمل کرنا بھی ضروری ہے۔"(۱۲۱)

خلاصہ یہ کہ عقل کی بے بسی، لاچارگی کی وضاحت کی اور سیاسی مصالح اور ملکی تقاضے کے نام سے اتباع سنت سے انحراف کو گمراہی اور ضلالت قرار دیا اور ہر حال میں دینی اور دنیوی فلاح وکامرانی کے لیے شریعت نبوی پر عمل کرنے کی تلقین کی۔ آپ کی انہیں کوششوں اور تکرار کا نتیجہ تھا کہ لوگوں میں احیاء شریعت کا جذبہ بیدار ہوا اور عمل وکردار کی حسن وخوبی کے لیے شریعت معیار قرار پائی۔

بدعتِ حسنہ کوئی شئے نہیں :۔

ایک اور فتنہ تھا جو اس دور میں نام نہاد مذہبی پیشواؤں اور خدا ناترس مدعیان اجتہاد کی کچھ تو اپنے ہوا و ہوس اور کچھ بادشاہ کی خوشنامد اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اختیار کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ بہت سے مشرکانہ اور غیر اسلامی طور طریقوں اور رسم و رواج کو اسلام کے دائرے میں لایا گیا اور اسے ایک خوشنما نام "بدعت حسنہ" کا دیا گیا تاکہ ان باتوں کے لیے ایک شرعی جواز حاصل ہو سکے۔ یہ ایک کھلی گمراہی اور ضلالت تھی اس کے رواج پا جانے کے معنی یہ تھے کہ اسلام کی اصل صورت اور حلیہ ہی مسخ ہو جاتے اور اگر اس طرز فکر کی بنیادی غلطی واضح نہ کی جاتی تو ہر شخص اپنی خواہش نفس کی اتباع کے لیے جو چاہے اختیار کرتا اور اسے "بدعت حسنہ" کا نام دے کر اس کے مذہبی ہونے کی سند بھی فراہم کرتا۔ اس طرز فکر کے خطرناک عواقب کو محسوس کرتے ہوئے حضرت مجدد نے نہایت ہی واضح اور غیر مبہم الفاظ میں اس کی مخالفت کی ۔ مفتی خواجہ عبدالرحمن کو سنّت کی

---

(۱۲۱) مکتوبات امام ربانی رح جلد اول مکتوب ۱۹۳ ص ۳۱۸۔

اتباع اور بدعت سے بچنے کی ترغیب میں لکھتے ہیں کہ :۔

"دین میں جو نئی باتیں پیدا کی گئی ہیں اور جو بدعتیں ایجاد کی گئی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء کے زمانے میں موجود نہ تھیں اگرچہ وہ روشنی میں سفیدی صبح کی طرح ہوں پھر بھی اس ناتواں کو ان سے محفوظ رکھے اور ان میں مبتلا نہ کرے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ علماء نے کہا ہے کہ بدعت دو قسم کی ہے "حسنہ و سیئہ" یہ فقیر ان بدعتوں میں سے کسی بدعت میں حسن اور نورانیت کا مشاہدہ نہیں کرتا اور ظلمت و کدورت کے سوا کچھ محسوس نہیں کرتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو ہمارے دین میں ایسی بات ایجاد کرے جو اس میں نہیں ہے تو وہ چیز مردود ہے بھلا جو چیز مردود ہو وہ حسن کہاں پیدا کر سکتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہر بدعت ضلالت ہے تو پھر بدعت میں حسن کے کیا معنی ہوتے ہیں" ۱۲۲؎

"بدعت حسنہ" ہی کے خوشنما اور دلفریب نام سے مسلم معاشرے میں بہت سے غیر اسلامی اور مشرکانہ افعال کو پروان چڑھانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن جب آپ نے اس تصور ہی کی مخالفت کی اور اس کو باطل قرار دیا تو "بدعت حسنہ" کا قلعہ ہی منہدم ہو گیا اور بدعتیوں کے متعلق تو یہ کہا کہ :۔

"بدعتی کی صحبت کا فساد کافر کی صحبت سے زیادہ ہے" ۱۲۳؎

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ "بدعت حسنہ" کی کس شد و مد سے آپ نے مخالفت کی اور قوم کو اس مرض سے نجات دلائی اور کافر اور بدعتی میں سے آپ نے مسلمانوں اور اسلام کے لیے بدعتی کو زیادہ مضر اور خطرناک اس لیے قرار دیا کہ کافر تو مسلمانوں اور اسلام کا

۱۲۲؎ مکتوبات امام ربانی رح جلد اول مکتوب ۱۸۶ ص ۳۰۹ ۔ ۳۱۰ ۔

۱۲۳؎ مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب ۵۴ ص ۱۲۸ ۔

اعلانیہ مخالف اور دشمن ہے اور بہ عنی تو مسلمانوں اور اسلام کے لبادے میں نہایت بھولے پن اور معصومیت سے اسلام اور مسلمانوں میں مشرکانہ عقائد اور طور طریقوں کو رواج دے کر مسلمانوں کی پاکیزگی اور وحدت کو پارہ پارہ کرتا ہے اور ان میں کافرانہ اور مشرکانہ افعال کو پروان چڑھاتا ہے۔ آپ ہی کی کششوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں مشرکانہ اور کافرانہ رسم و رواج کو ترک کرنے کا جذبہ پیدا ہوا اور عالمگیرؒ کے (۱۶۵۸ - ۱۷۰۷ء) عہد حکومت میں تو دربار سے بھی مشرکانہ اور کافرانہ طور طریقوں اور رسم و رواج کو ترک کیا گیا۔

نظریۂ وحدۃ الوجود اور عقیدہ حلول کی تردید:۔

پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں پاک و ہند میں صوفیوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا تھا جو ہندوؤں کے ویدانتی فلسفہ سے متاثر تھا۔ اس نے عبادات، ریاضات، اور مراقبات کا ایک ایسا سلسلہ شروع کر رکھا تھا جو اسلام کے مزاج اور روح سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔ لیکن بہتوں نے اسلام کا نام لے کر غیر اسلامی تصورات کو مسلمانوں میں پروان چڑھانا شروع کیا اور ایسے گمراہ کن اور فاسد نظریات کی تبلیغ و اشاعت مسلمانوں میں شروع کی جن کا تعلق اسلام سے قطعی نہ تھا بلکہ وہ سراسر اسلامی تعلیمات اور سنّتِ نبویؐ کے منافی تھے۔ انہیں میں سے بعض حضرات نے یہ راگ بھی الاپا کہ ؎

بے سجادہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

یعنی شریعت کے اتباع سے آزاد ہو کر طریقت کے ذریعہ تصفیہ و تزکیہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح شریعت اور طریقت کا ایک مستقل مسئلہ پیدا ہوا۔ انہیں میں سے بعض نے "اتحاد حلول" کا نظریہ اختیار کیا جس کی بنیاد وحدۃ الوجود کے نظریہ پر رکھی گئی تھی۔ چنانچہ ہر مدعی نے "حلول و اتحاد" کا دعویٰ شروع کر دیا اور پھر اس ایک اصل سے نہ معلوم گمراہیوں کی کتنی شاخیں نکلیں۔ بہت سے مدعیان بے خبر نے کہا کہ عالم میں جو کچھ ہے بس خدا ہی ہے۔ زمین بھی خدا ہے۔ آسمان بھی خدا ہے۔ شجر و حجر و نباتات و جمادات، عناصر بسیط

اور ان کے مرکبات غرض سب خدا ہی ہیں (معاذ اللہ)[۱۲۴] یہ ایک بہت ہی خطرناک فکری کجی اور گمراہی تھی جو مسلمانوں کے عقیدے میں راہ پا رہی تھی اس کے نتائج اور عواقب بہت ہی دور رس اور مضر ہو سکتے تھے۔ اس سے تو اسلام کا حلیہ ہی مسخ ہو کر رہ جاتا اس لیے حضرت مجددؒ نے اس خطرناک گمراہی کے خلاف بھی جہاد شروع کیا اور بلا کسی تردد کے اس کو الحاد و زندقہ قرار دیا اور متعدد مکتوبات میں اس کے تمام پہلوؤں اور عواقب پر تفصیل سے بحث کی ہے اور واشگاف الفاظ میں واضح کیا کہ کس طرح یہ عقیدہ اور تصور اسلام کے بنیادی عقائد اور تصورات سے ٹکراتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق اللہ تعالیٰ کسی چیز میں حلول نہیں کرتا اور نہ کوئی چیز اس میں حلول کرتی ہے۔ اور حق تعالیٰ تمام اشیاء کو محیط ہے اور ان کے ساتھ قرب و معیت رکھتا ہے اس احاطہ اور قرب معیت سے وہ مراد نہیں ہے جو ہمارے فہم خاطر میں آ سکے۔

"حق تعالیٰ اشیاء کو محیط اور ان کے قریب اور ساتھ ہے۔ لیکن اس کے قرب اور احاطہ معیت کی حقیقت کو نہیں جانتے کہ کس طرح ہے۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔ حق تعالیٰ کسی چیز سے متحد نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی چیز اس سے متحد ہو سکتی ہے"[۱۲۵]

اسی سلسلے میں حکومت کے ایک اعلیٰ عہدیدار خان جہاں کو ایک طویل مکتوب میں عقائد اور ارکان اسلام کی بحث کے ضمن میں یوں تحریر کرتے ہیں کہ:۔

"حق تعالیٰ کسی چیز کے ساتھ متحد نہیں ہوتا اور نہ کوئی چیز اس کے ساتھ متحد ہوتی ہے اور نہ کوئی چیز اس میں حلول کرتی ہے۔ نہ وہ کسی شے میں حلول کرتا ہے"[۱۲۶]

---

[۱۲۴] تذکرہ مجدد الف ثانی رح مرتبہ منظور نعمانی ص ۱۲۶۔

[۱۲۵] مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب ۲۶۶ ص ۵۰۳۔

[۱۲۶] مکتوبات امام ربانی جلد دوم مکتوب ۶۷ ص ۲۱۲۔

تصوف کو شریعت کے تابع کرنا:۔

صوفیاء کے ان باطل عقائد اور تصورات کی تردید ہی نہیں بلکہ مثبت طور پر دلنشین انداز میں تصوف کا ایک ایسا تصور پیش کیا جس میں شریعت کو طریقت پر فضیلت اور اولیت حاصل تھی اور طریقت شریعت کے تابع تھی۔ آپ نے ان تمام عبادتوں اور ریاضتوں کی پرزور مخالفت کی جنہیں صوفیاء نے سنّت نبوی اور شریعت سے ہٹ کر اختیار کیا تھا اور کہا کہ:۔

"وہ ریاضتیں اور مجاہدے جو سُنّت کی تقلید کے سوا اختیار کریں وہ معتبر نہیں ہیں کیونکہ جوگی اور ہندو برہمن اور یونان کے فلسفی بھی اس امر میں شریک ہیں۔" [۱۲۷]

اس لیے عبادت اور ریاضت میں سُنّتِ نبوی صلعم کی اتباع کرنی چاہیئے اور تمام ایسے طریقوں سے پرہیز کرنا چاہیئے جس کی سند آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے نہ ملتی ہو۔ چنانچہ تصوف کے ایک ایسے طریقہ کی نشاندہی کرتے ہیں جس میں "سنّت" کو لازم پکڑتے ہیں اور بدعت سے بچتے ہیں اور حتی المقدور رخصت پر عمل جائز نہیں کرتے اگرچہ بظاہر باطن میں فائدہ دینے والا ہو اور عزیمت پر عمل کسنا نہیں چھوڑتے اگرچہ بظاہر باطن میں مضر جانیں احوال و مواجید کو احکام شرعی کے تابع کیا ہے اور ذوق و معارف کو علوم شرعیہ کے خادم سمجھتے ہیں۔ احکام شرعیہ کے نفیس موتیوں کو بچوں کی طرح وجد و حال کے جوز و مویز کے عوض نہیں دیتے اور صوفیہ کی بیہودہ باتوں پر مغرور اور فریفتہ نہیں ہوتے۔ نص کو چھوڑ کر فص کی طرف نہیں جاتے [۱۲۸] اسی سلسلے میں ایک دوسرے نظریئے کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ:۔

---

۱۲۷ مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب ۲۲۱ ص ۳۸۳۔

۱۲۸ مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب ۱۳۱ ص ۲۰۰۔

"اس طریق میں ریاضتیں اور مجاہدے نفسِ امارہ کے ساتھ احکام شرعی کے بجالانے اور سُنّتِ سنیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی متابعت کو لازم پکڑتے ہیں کیونکہ پیغمبروں کے بھیجنے اور کتابوں کے نازل کرنے میں نفسِ امارہ کی خواہشوں کو دور کرنا مقصود ہے جو اپنے مولائے جل شانہ، کی دشمنی میں قائم ہے۔ لیکن نفسیاتی خواہشوں کا دور کرنا۔ احکام شرعیہ کے بجالانے پر وابستہ ہے جس قدر شریعت میں راسخ اور ثابت قدم ہوگا اسی قدر ہوائے نفس سے دور تر ہوگا کیونکہ نفس پر شریعت کے اوامر و نواہی کے بجالانے سے زیادہ دشوار کوئی چیز نہیں ہے" ۱۲۹ء

شریعت، طریقت پر فوقیت رکھتی ہے:۔

آپؒ نے طریقت کے مقابلے میں تصوف کے ایک ایسے سلسلے کی حمایت اور اسے رواج دینے کی کوشش کی جس میں شریعت کو فوقیت حاصل تھی اور سماع و رقص اور وجد و حال کے تمام طریقوں کی مخالفت کی کیونکہ یہ سُنّتِ نبوی سے مطابقت نہیں رکھتے تھے اس طرح غیر اسلامی اثرات اور ویدانتی تصورات سے آپ نے تصوّف کو پاک کرنے کی سعی کی۔ آپؒ کے اس سلسلے تصوّف کا نتیجہ یہ ہوا کہ تصوف کے دائرہ میں بھی شریعت کی پابندی کا لحاظ کیا گیا اور مسلمانوں میں جو مشرکانہ عادتیں اور عقاید راہ پاگئیں تھیں وہ رفتہ رفتہ کم ہوئیں اور پھر مسلمانوں میں احیاءِ اسلام، ترویج شریعت یا نفاذِ شریعت کا جذبہ پیدا ہوا۔ عامتہ المسلمین کے یہی جذبات و احساسات ہی تھے جس سے عہد شاہ جہانی (۱۶۲۸-۱۶۵۷ء) اور عالمگیر (۱۶۵۸-۱۷۰۷ء) کے عہدِ حکومت میں شریعت کے نفاذ کا تذکرہ ہم سنتے ہیں اور تصوّف کے غیر اسلامی اور مشرکانہ طور طریقوں کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔

۱۲۹ء مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب ۱۳۱ ص ۱۴۴ و مکتوب ۲۲۱ ص ۳۸۲ وغیرہ۔
مزید ملاحظہ ہو جلد اول مکتوب ۳۶، ۳۷، ۴۳، ۴۸، ۴۳، ۲۷۶، ۲۷۲ حصہ دوم ۲۳ وغیرہ۔

گمراہ کن اور باطل عقائد کی تردید:۔

اکبر (۱۵۵۶-۱۶۰۵ء) کے عہد کے فتنوں اور ضلالتوں میں سے ایک فتنۂ ضلالت شیعہ عقائد اور تصورات کی عام لوگوں میں تبلیغ و اشاعت بھی تھی جس کو عہدِ جہانگیر (۱۶۰۵-۱۶۲۷ء) میں شیعوں کے اقتدار و غلبہ سے مزید تقویت ملی۔ یہ اختلاف تاریخِ اسلام کے مختلف تاریخی واقعات کی تعبیر و توضیح میں تھی خصوصیت سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی افضلیت کا عقیدہ اور جن صحابہ کرامؓ سے آپ کے سیاسی اختلاف ہوئے ان کی طرف سے بغض و عداوت کا تصور مسلمانوں میں عام ہوتا گیا۔ یہ لوگ حضرات خلفاء ثلاثہ (حضرت ابوبکر رضؓ۔ حضرت عمر رضؓ اور حضرت عثمان رضؓ) کی تکفیر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کی مذمت کرتے تھے۔ صحابہ کرامؓ کے اختلافات اور نزاعات، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں واقع ہوئے۔ مثلاً جنگِ جمل، جنگِ صفین وغیرہ کو ایک خاص انداز سے پیش کرتے اور صحابہ کرامؓ کے متعلق مختلف قسم کے شکوک و شبہات اور گمراہیاں پھیلاتے تھے۔ جہانگیر کے عہد میں شیعوں کو مملکت میں بہت ہی اثر و رسوخ اور غلبہ و اقتدار حاصل تھا۔ خود جہانگیر کے الفاظ ہیں:۔

"اب میری ساری بادشاہی اسی سلسلے (نور جہاں اور اس کے گھر والوں) کے ہاتھ میں ہے اس کا باپ دیوانِ کل ہے۔ بیٹا (نور جہاں کا بھائی آصف خاں) وکیلِ مطلق ہے اور بیٹی (خود نور جہاں) ہمراز و ہم صحبت ہے"

نوٹ:۔ واضح رہے کہ شیعوں اور سنیوں میں اسلام کے بنیادی عقاید اور تصورات مثلاً توحید، رسالت اور آخرت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف سیاسی مسائل میں شروع ہوئے اور بعد میں حکمرانوں اور حکومتوں نے اپنی سیاسی مصالح کے پیشِ نظر اختلافات کو ایک مستقل نوعیت دے دی اور اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ خصوصیت سے ایران میں صفویوں کے دورِ حکومت میں ان اختلافات کو بہت کچھ ہوا دی گئی۔

اس لیے "الناس علی دین ملوکھم" کے مطابق معاشرے میں شیعہ عقائد اور تصورات کا عام ہونا بالکل قدرتی امر تھا اور اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود شیعہ حضرات نہایت ہی جارحانہ انداز میں اپنے عقائد اور تصورات کی اعلانیہ تبلیغ مسلمانوں میں کرتے تھے اور مسلمانوں کے سواد اعظم کے جذبات و احساسات کا خیال نہ کرتے تھے۔ اس لیے عام مسلمانوں میں اسلامی تاریخ کی ان عظیم شخصیتوں کے متعلق بہت سی بے بنیاد غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں ان غلط فہمیوں اور گمراہ کن تصورات اور عقائد کو دور کرنے کے لیے اور صحابہ کرام کی صحیح

نوٹ:۔ اس عہد میں شیعوں کے اثر و اقتدار کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ قاضی نوراللہ شستری جسے شیعہ حضرات شہید ثالث کہتے ہیں اس نے اکبر کے عہد میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر تقرری اس شرط پر حاصل کی کہ مذاہب اربعہ کے طریقوں میں سے جس کے موافق اس کی رائے و اجتہاد ہوگی اس کے مطابق مقدمات کے فیصلہ کرے گا اور کسی ایک فقہی مذہب کا پابند نہیں رہے گا۔ چنانچہ تمام مقدمات میں امامیہ مذہب کے مطابق فیصلہ کرتا اور اگر کوئی اعتراض کرتا تو وہ یہ ثابت کر دیتا کہ ان کا یہ فیصلہ اہل سنت والجماعت کے فلاں فقہی مسلک یا مذہب کے مطابق ہے۔ قاضی صاحب تقیہ کی اس حالت میں شیعہ احکام جاری کرتے تھے۔ اکبر کے بعد جب جہانگیر ۱۶۰۵ء میں تخت نشین ہوا تو وہ بدستور اپنے عہدے پر قائم رہے۔ البتہ علماء نے بادشاہ سے یہ شکایت ضرور کی کہ قاضی نوراللہ شستری کا مذہب شیعہ سے تعلق ہے اور وہ اپنے فتووں میں سے کسی ایک فقہی مذہب یا مسلک کا پابند نہیں اور ہر مسئلہ کا فتویٰ اس فقہی مذہب کے مطابق دیتا ہے جو اس معاملہ میں مذہب امامیہ کے مطابق ہو۔ لیکن جہانگیر نے ابتدا میں اس شکایت پر توجہ نہ دی۔ یہاں تک کہ علماء نے قاضی صاحب کی شیعیت کے ثبوت میں ان کی ایک کتاب "مجالس المومنین" پیش کی جو انھوں نے خفیہ طور پر تالیف کی تھی اور اس کو عام لوگوں سے بھی پوشیدہ رکھا تھا۔ اس کتاب میں قاضی صاحب نے نہ صرف اپنی شیعیت کا اقرار کیا تھا بلکہ شیعوں کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ اب جب کہ ایران میں صفوی حکومت نہ صرف قائم ہو چکی ہے بلکہ وہ ایک مضبوط اور طاقتور حکومت ہے جس کی پشت پناہی شیعوں کو حاصل ہے۔ اس لیے انہیں (بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ)

پوزیشن سے عامۃ المسلمین کو روشناس کرنے کے لیے آپ نے ایک جامع رسالہ "ردِ روافض" تحریر کیا۔ جس میں شیعوں کے خیالات، نظریات اور عقائد کی مدلّل طور پر تردید کی گئی تھی۔ آپؒ نے احادیثِ رسولؐ اور اقوال سے یہ ذہن نشین کرایا کہ صحابہ کرام کے مابین جو تنازعات و اختلافات تھے وہ کسی بغض پر مبنی نہیں تھے بلکہ وہ اجتہاد کا نتیجہ تھے خلافت کی ترتیب کے متعلق جو چہ میگوئیاں اکثر شیعہ حضرات کی طرف سے اٹھائی جاتی تھیں اس کے متعلق بھی احادیث اور دیگر مستند ذرائع سے آپ نے ثابت کیا کہ خلافت کی یہ ترتیب درست ہے اور شیخین کی فضیلت مسلّمہ ہے اس سلسلے میں خان جہاں کو ایک خط میں تحریر کرتے ہیں کہ :۔

"حضرت خاتم الرسل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد امام برحق اور خلیفہ مطلق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں ان کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کے بعد حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ، بعد ازاں حضرت علی ابن طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کی افضلیت ان کی خلافت کی ترتیب پر ہے۔

حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی افضلیت صحابہ و تابعین کی اجماع سے ثابت ہے . . . .

. . . . . . شیخین کی افضلیت باقی امت پر قطعی ہے سوائے جاہل یا متعصب کے اس کا کوئی انکار نہیں کرتا۔ حضرت امیر کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جو کوئی مجھ کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما پر فضیلت دے وہ مفتری ہے . . . .

(بقیہ نوٹ صفحہ سابقہ)۔ تقیہ کی ضرورت نہیں بلکہ وہ اپنے خیالات اور عقائد کا برملا اظہار کریں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیعوں کا کس قدر غلبہ و اقتدار تھا اور ان کے حوصلے اور عزائم کیا تھے۔ ایسے حالات میں معاشرے میں ان کے تصورات اور طور طریقوں کا عام ہونا کوئی مشکل نہ تھا۔ (بحوالہ رودِ کوثر۔ صفحات ۳۴۰ تا ۳۵۳ مصنفہ شیخ محمد اکرام۔

"مجالس المومنین" وہ تذکرہ ہے جس میں تمام فارسی شاعروں (مثلاً رومی، حافظ، سعدی وغیرہ) کے ایسے اشعار اپنی طرف سے شامل کر دیے ہیں جن سے وہ شیعہ ظاہر ہو سکیں۔

.... صحابہ کرامؓ کے آپس کے اختلافات اور تنازعات کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ:۔

"وہ لڑائی جھگڑے جو اصحاب کرامؓ کے درمیان واقع ہوئے ہیں جیسے جنگ جمل اور صفین ان کو نیک وجہ پر محمول کرنا چاہیئے اور ہوا و تعصب سے دور رہنا چاہیئے کیونکہ ان بزرگوں کے نفوس حضرت خیر البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحبت میں ہوا و ہوس سے پاک اور حرص و کینہ سے صاف ہو چکے تھے۔ اگر ان میں صلح تھی تو حق کے لیے تھی اور اگر لڑائی جھگڑا تھا تو حق کے لیے تھا"[۱۳۰]

اسی ضمن میں ایک دوسرے خط میں تحریر کرتے ہیں کہ:۔

"جو کچھ صحابہ رضؓ کے درمیان لڑائی جھگڑے واقع ہوئے ہیں ان کو نیک توجیہہ پر محمول کرنا چاہیئے اور ہوا و تعصب سے دور سمجھنا چاہیئے .... اور یہ جو لڑائی جھگڑے ان کے درمیان واقع ہوئے ہیں وہ خلافت کے بارہ میں نزاع کے باعث نہ تھے بلکہ اجتہاد میں خطا کے سبب تھے۔"[۱۳۱]

حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کی عظمت:۔

خلفاء ثلاثہ کے علاوہ شیعہ حضرات، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے خلاف بھی نازیبا کلمات استعمال کرتے تھے اور ان پر طرح طرح کے اعتراض کرتے تھے جس سے مسلم معاشرہ میں ان کی اہمیت اور عظمت پر نہ صرف زد پڑتی تھی بلکہ بدگمانیوں کو بھی راہ ملتی تھی اس طرزِ فکر اور غلط بیانیوں کی متعدد خطوط میں حضرت مجددؒ تردید کرتے ہیں اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی عظمت اور مرتبے کے متعلق تحریر

---

[۱۳۰] مکتوبات امام ربانی جلد دوم مکتوب ۷، ص ۲۱۸۔

[۱۳۱] مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب ۲۶۶ ص ۵۳۱۔

کرتے ہیں کہ :۔

"حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حبیب رب العالمین کی زوجہ مطہرہ تھیں اور اپنی وفات تک حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام ان سے خوش رہے اور مرض موت کے ایام بھی انہیں کے حجرے میں بسر کیے اور حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی روح پاک کے رفیق اعلیٰ تک پہنچنے کے وقت انہی کے پاکیزہ جسم سے ٹیک لگائے ہوئے تھے اور انہی کے پاک حجرے میں مدفون ہوئے اس شرف و فضیلت کے علاوہ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا مجتہدہ بھی تھیں۔ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نصف دین ان کے حوالے کیا تھا اور اصحاب کرام مشکلات میں ان کی طرف رجوع کیا کرتے تھے اور ان سے مشکلات کا حل طلب کیا کرتے تھے۔ اس قسم کی صدیقہ مجتہدہ رض کو حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی مخالفت کے باعث مطعون کرنا اور ناشائستہ حرکات کو ان کی طرف منسوب کرنا بہت نامناسب اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لانے سے دور ہے۔ حضرت امیر رض اگر پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے داماد اور چچا کے بیٹے ہیں تو حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زوجہ مطہرہ ہیں"[۱۳۲]

حضرت طلحہ رض اور حضرت زبیر رض کی عظمت :۔

حضرت علی رض سے تنازعات کے سلسلے میں شیعہ حضرات حضرت طلحہ رض اور حضرت زبیر رض پر بھی طعن و تشنیع کرنے اور ان کی شان میں گستاخی کرنے سے باز نہ آتے تھے۔ اس لیے ان دونوں حضرات کے متعلق بھی حضرت مجددؒ رح پر زور الفاظ میں ان کی خدمات اور اعلیٰ مراتب کے متعلق ایک خط میں تفصیل سے یوں تحریر کرتے ہیں کہ :۔

"طلحہ و زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اصحاب کبار اور عشرہ مبشرہ میں سے

---

[۱۳۲] مکتوبات امام ربانی جلد دوم مکتوب ۳۶ ص ۹۷۔

ہیں ان پر طعن و تشنیع کرنا نامناسب ہے۔ اور اگر کوئی بدنصیب ان بزرگ ہستیوں پر لعنت و ملامت کرے تو اس کی یہ لعنت و ملامت خود اس پر لوٹے گی ...... یہ وہی طلحہ رضؓ اور زبیر رضؓ ہیں کہ جن کو حضرت فاروق اعظم رضؓ نے ان چھ آدمیوں میں داخل کیا تھا۔ اور جن کے متعلق فرمایا تھا کہ یہ اپنے میں سے کسی ایک کو میرے بعد خلیفہ منتخب کر لیں اور ان دونوں حضرات نے بااختیار خود اپنے نام واپس لے لیے اور صاف کہہ دیا (وَتَرَكْتُ حَظِّيْ) میں نے اپنا حصّہ ترک کیا۔ یعنی ہم خلافت نہیں چاہتے۔ اور یہ وہی طلحہ رضؓ ہیں جنہوں نے اپنے سگے باپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بے ادبی کی وجہ سے قتل کر دیا تھا اور اس کا سر حضور کے قدموں میں لا کر ڈال دیا اور قرآن مجید میں ان کے اس فعل پر تحسین و آفرین کی آیت نازل ہوئی۔ اور یہ زبیر رضؓ وہی زبیر رضؓ ہیں کہ مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کے قاتل کے دوزخی ہونے کی وعید سنائی تھی جیسا کہ حدیث میں آیا ہے "(قَاتِلُ زُبَيْرٍؓ فِي النَّارِ)" یعنی زبیر رضؓ کا قاتل جہنم میں جائے گا۔ پس خبردار! خبردار! بچو بچو ان حضرات اکابر دین اور اسلام کے مایہ ناز فرزندوں کی بدگوئی سے بچو جنہوں نے اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اپنی کوششیں ختم کر دیں اور حضرت سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت و حفاظت اور دین الٰہی کی تائید و حمایت کے لیے اپنی جان و مال کی بازی لگا دی اور رات دن، خفیہ و اعلانیہ اسی مقصد کے لیے سرگرم عمل اور کوشاں رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی محبت میں اپنے خویش و اقارب اور مال و اولاد، گھر بار، وطن، کھیتی باڑی، باغ و درخت اور نہروں کو چھوڑ دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کو اپنی جانوں پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو اپنے اموال و اولاد اور اپنی جانوں کی محبت پر ترجیح دی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے شرف صحبت حاصل کیا اور رسول اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں برکات نبوت سے مالا مال ہوئے۔ انہوں نے وحی کو آتے دیکھا۔ فرشتوں

کی حاضری سے وہ مشرف ہوئے۔ اپنی آنکھوں سے انہوں نے حضور کے معجزات اور آپ کی روشن نشانیاں دیکھیں حتیٰ کہ جو غیب تھا وہ ان کے لیے شہادت ہو گیا اور جو علم الیقین تھا وہ عین الیقین سے بدل گیا اور ان کو ایمان و ایقان کا وہ درجہ حاصل ہوا جو ان کے بعد کسی کو نہیں حاصل ہو سکتا......

.... ہاں یہ قدسیوں کی وہی جماعت ہے جن کی تعریف حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں نازل کی اور اعلان کر دیا کہ میں ان سے راضی ہوں اور وہ مجھ سے راضی ہیں"

خلاصہ یہ کہ حضرت طلحہ رضؓ اور حضرت زبیر رضؓ کی خدمات جلیلہ اور اسلام کے سلسلے میں ان کی سرفروشی اور ایثار کو بیان کرنے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہما کی خصوصی حیثیت کی وضاحت کر کے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ:۔

"ان کے بغض و عداوت سے ایسا ہی پرہیز کرنا چاہیئے جیسا کہ کفر سے کیا جاتا ہے جو جماعت اس مرتبہ کی ہو اور اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ نسبت حاصل ہو اگر بعض معاملات میں اس کے افراد میں اجتہادی اختلاف ہو جائے اور نوبت نزاع تک پہنچے اور ہر ایک اپنی رائے اور اپنے اجتہاد کے مطابق عمل کرے تو اس میں کسی کو طعن و اعتراض کی گنجائش نہیں بلکہ حق و صواب اس موقع پر اختلاف ہی ہے کیونکہ صاحب اجتہاد دوسرے کے اجتہاد پر عمل نہیں کر سکتا۔ ۱۳۳ے

حضرت مجددؒ رح کی یہ تحریریں نہایت ہی مدلل اور موثر ہیں اس سے شیعوں کے غلط پروپیگنڈے کی نہ صرف تردید ہو جاتی ہے بلکہ صحابہ کرام کے اجتہادی اختلاف کو ہوا دے کر مسلمانوں کے ذہن و فکر کو مسموم کرنے کی جو کوششیں کی گئیں تھیں اس کی بھی تردید ہو جاتی ہے اور لوگ ان مسائل کی صحیح نوعیت سے روشناس ہوتے ہیں۔

۱۳۳ے مکتوبات امام ربانی جلد دوم مکتوب ۳۶ ص ۹۹ - ۱۰۰۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل سنّت والجماعت:۔

حضرت مجدد رح شیعوں کے ان فاسد اور باطل خیالات کی تردید اور صحابہ کرام رض کی اہمیت اور پوزیشن کی وضاحت کے بعد شیعہ حضرات کی محبت اہل بیت کے دعویٰ، تقیہ اور اس سے متعلقہ دیگر مسائل پر بھی تفصیل سے بحث کرتے ہیں تاکہ پروپیگنڈہ کی اصل حقیقت سے نہ صرف لوگ متعارف ہو جائیں بلکہ وہ ان مسائل میں اسلام کی صحیح تعلیمات اور منشاء سے واقف ہو کر اپنے ذہن و فکر کی اصلاح بھی کریں۔

شیعوں کا عام مسلمانوں پر یہ اعتراض تھا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ کرم اللہ وجہہ سے محبت نہیں کرتے اور ان کی محبت صرف خلفائے ثلاثہ تک ہی محدود ہے۔ یہ ایک غلط پروپیگنڈہ تھا جو شیعہ حضرات نے عام مسلمانوں کی جانب منسوب کیا تھا اور مسلمان اس معاملہ میں افراط و تفریط کا شکار ہو گئے تھے اس لیے مسئلہ کی حقیقی نوعیت کے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ:۔

"حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی محبت اہلِ سنت و الجماعت کی شرط ہے اور جو شخص یہ محبت نہیں رکھتا اہل سنّت سے خارج ہے۔ اس کا نام خارجی ہے اور جس شخص نے حضرت امیر رض کی محبت میں افراط اختیار کیا اور جس قدر محبت مناسب ہے اس سے زیادہ اس سے وقوع میں آتی ہے اور محبت میں غلو کرتا ہے اور حضرت خیر البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اصحاب کو سبّ وطعن کرتا ہے اور صحابہ اور تابعین اور سلف صالحین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے طریق کے برخلاف چلتا ہے وہ رافضی ہے۔ پس حضرت امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی محبت میں افراط و تفریط کے درمیان جن کو رافضیوں اور خارجیوں نے اختیار کیا۔ اہل سنت و جماعت متوسط ہیں اور شک نہیں کہ حق وسط میں ہے۔ اور افراط و تفریط دونوں مذموم ہیں۔" [۱۳۴]

---

[۱۳۴] مکتوب امام ربانی جلد دوم مکتوب ۳۶ ص ۸۵۔

اہل سنّت وجماعت کا حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور خلفاء ثلاثہ کے متعلق جو نظریہ ہے آپ تحریر کرتے ہیں کہ :۔

”وہ شخص بہت ہی جاہل ہے جو اہل سنّت وجماعت کو حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے محبوں میں سے نہیں جانتا اور حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی محبت کو رافضیوں کے ساتھ مخصوص کرتا ہے۔ حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ کی محبت رفض نہیں ہے بلکہ خلفائے ثلاثہ سے تبرّے اور بیزاری رفض ہے اور اصحاب کرام سے بیزار ہونا مذموم اور ملامت کے لائق ہے۔

رفض کیا ہے :۔؟

رفض کیا ہے؟ اور رافضی کون؟ اس کے متعلق آپ رح تحریر کرتے ہیں کہ :۔

”آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت رفض نہیں ہے جیسے کہ جاہل لوگ گمان کرتے ہیں.......... رفض کی مذمت دوسروں کی تبرّے کے باعث ہوتی ہے نہ کہ محبت کے باعث.......... اہل بیت کی محبت کا نہ ہونا خروج ہے اور اصحاب سے تبرّے کرنا رفض ہے.......... غرض خروج و رفض کی بنا پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اصحاب کے بغض پر ہے۔ اور اہل سنّت وجماعت کی بنیاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اصحاب کی محبت ہے اس لیے اہل بیت کی محبت کا نہ ہونا اہل سنّت کے حق میں کس طرح گمان کیا جاسکتا ہے۔ جبکہ یہ محبت ان کے نزدیک ایمان کا جز ہے اور خاتمہ کی سلامتی اس محبت کے راسخ ہونے سے وابستہ ہے.......... اہل بیت کی محبت اہل سنّت وجماعت کا سرمایہ ہے۔ مخالف لوگ اس معنی سے غافل اور ان کی محبت متوسط سے جاہل ہیں۔“

اہل بیت وصحابہ کرام رضہ کے سلسلے میں مسلمانوں کے جو معتقدات ہونے چاہیئے اس کی وضاحت کرنے کے بعد شیعوں کے رویے کے متعلق آپ تنقید کرکے ان کی غلطیوں اور گمراہیوں کی

وضاحت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ :۔

"دین کے بزرگواروں پر طعن کرنا جو رافضیوں نے اختیار کیا ہے۔ اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اصحاب کو گالی نکالنا اپنا دین وایمان تصور کیا ہے۔ دیانت و دینداری سے دور ہے، یہ عجب دین ہے جس کا جزو اعظم پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جانشینوں کو گالی نکالنا ہے .... وہ لوگ جو دین کے بزرگواروں کے سب وطعن کو اپنے دین کا جزو اعظم تصور کرتے ہیں حق ان کے نصیب کیا ہوگا۔ رافضیوں کے بارہ فرقے ہیں سب کے سب اصحاب پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کافر کہتے ہیں اور خلفائے راشدین کو گالیاں نکالنا عبادت جانتے ہیں "

حضرت مجدد رحمۃ کی یہ تحریریں شیعہ حضرات کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کو دور کرنے میں بڑی ممد ومعاون ثابت ہوئی ہیں۔ اہل بیت کے محبت کے لبادہ میں اسلام سے جس محبت اور شیفتگی کا مظاہرہ کرتے تھے اس سے ان کی اصل صورت سامنے آتی تھی کہ وہ کہاں تک اسلام اور شریعت مصطفوی کے وفادار ہیں۔ ان کی اپنی طرز فکر اور عمل کی وجہ سے حضرت مجدد رحمۃ کو شیعوں کے متعلق کہنا پڑا کہ :۔

"ان لوگوں کا مقصود دین کا ابطال اور شریعت غراؐ کا انکار ہے بظاہر ہیں اہل بیت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کا اظہار کرتے ہیں مگر حقیقت میں رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شریعت کا انکار کرتے ہیں " ۱۳۵ء

ابطال عقیدہ تقیہ :۔

شیعوں کے گمراہ کن تصورات اور عقائد میں سے ایک نہایت ہی غلط اور فاسدانہ تصور تقیہ کا تھا۔ جس کو یہ لوگ حضرت امیر علی کرم اللہ وجہہٗ سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ اس بیعت

۱۳۵ء مکتوبات امام ربانی جلد دوم مکتوب ۳۶ ص ۸۶ تا ۹۳۔

کو جو حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی خلفاء ثلاثہ کے ہاتھ پہ واقع ہوئی تھی تقیہ پہ محمول کرتے ہیں اور اصحاب کرام کے درمیان منافقانہ صحبت خیال کرتے ہیں اور مدارت میں ایک دوسرے کو مکارانہ تصور کرتے ہیں کیونکہ ان کے زعم میں حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے موافق لوگ ان کے مخالفوں کے ساتھ تقیّہ کے طور پر منافقانہ صحبت رکھتے تھے اور جو کچھ ان کے دلوں میں ہوتا تھا اس کے برخلاف اپنی زبان پہ ظاہر کرتے تھے اور مخالفت بھی چونکہ ان کے زعم میں حضرت امیر رضی اللہ عنہ اور ان کے دوستوں کے دشمن تھے اس لیے ان کے ساتھ منافقانہ محبت کرتے تھے اور دشمنی کو دوستی کے لباس میں ظاہر کرتے تھے۔[ع] شیعوں کا یہ نہایت ہی فاسد اور گمراہ کن تصور تھا۔ انہوں نے محض خلفاء ثلاثہ کی خلافت کے انکار میں یہ خیال تک نہ کیا کہ ان کے "تقیّہ" کے اعتقاد سے اسلام کا حلیہ ہی نہ صرف مسخ ہو کر رہ جائے گا بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و بزرگی بھی کتنی بری طرح مجروح ہو جائے گی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نوٹ:۔ ع پچھلے صفحات میں قاضی نور اللہ شستری کے تقیّہ کا واقعہ تحریر کیا گیا ہے کہ وہ شیعوں کے مجتہد تھے۔ انہوں نے اکبر کے عہد میں قاضی القضاۃ کا عہدہ حاصل کیا اور تمام زندگی عملاً تقیّہ میں گذار دی۔ تمام مقدمات میں فیصلہ امامیہ فقہ ہی کے مطابق کرتے اپنے اوپر اعتراضات پہ ثابت کرتے کہ ان کا یہ فیصلہ مذہب اربعہ کے فلاں مذہب کے مطابق ہے۔ اپنی کتاب "مجالس المومنین" جس کو خفیہ تالیف کیا تھا اور خفیہ ہی رکھا اس میں تقیہ پہ بھی بحث کی ہے اور صفوی حکومت کے قیام کے بعد شیعوں کو تلقین کی تھی کہ اب چونکہ ایک طاقتور اور مستحکم شیعہ حکومت شیعوں کی پشت پناہ ہے اس لیے تقیہ کی ضرورت نہیں۔ جہانگیر کے ابتدائی دور حکومت میں علماء نے ان کے شیعہ ہونے کی شکایت کی تھی۔ لیکن جہانگیر نے اس وقت اس شکایت کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ آخر کار جب جہانگیر کے سامنے "مجالس المومنین" پیش کی گئی تو اسے بھی علماء کی شکایت سے اتفاق ہوا اور قاضی صاحب کو ۱۶۱۰ء میں پھانسی دی گئی۔ اس لیے شیعہ حضرات انہیں "شہید ثالث" کہتے ہیں۔ شیعہ حضرات ہی کی روایت ہے کہ جب نور جہاں کا عمل دخل زیادہ ہو گیا تو قاضی صاحب کے قتل کا بدلہ ان علماء سے لیا گیا تھا جنہوں نے قاضی صاحب کے خلاف بادشاہ جہانگیر سے شکایت کی تھی۔

(ملاحظہ ہو رود کوثر ص ۳۵۴-۳۵۱ مصنفہ شیخ محمد اکرام)۔

پر بھی نعوذ باللہ حرف گیری کا موقع ملے گا کہ وہ جس کو مسلمان ہادی برحق اور خیر البشر تصور کرتے ہوں اس کی صحبت میں بھی لوگ نعوذ باللہ مکار اور منافق رہے ہیں اور تمام صحبتوں میں سے بدتر صحبت حضرت خیر البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحبت ہو۔ جہاں سے یہ اخلاق ذمیمہ پیدا ہوتے ہیں اور تمام فرقوں میں سے برا اصحاب کرام کا فرقہ ہو جو نفاق و عداوت و بغض و کینہ سے پُر تھا۔" تقیہ کے عقیدہ کے نتائج اور عواقب بہت ہی خطرناک تھی اس سے نہ صرف مسلمانوں کی روح مردہ ہوتی تھی بلکہ اسلام اور صحابہ کرام کی ایک بھیانک تصویر سامنے آتی تھی اس لیے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر احادیث و قرآن کی روشنی میں مدلل تجزیہ و تشریح کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ :۔

"تقیّہ خیانت یعنی بزدلی اور نامردی کی صفت ہے، اسد اللہ کے ساتھ اس کو نسبت دینا نامناسب ہے۔ بشریت کی رو سے ایک ساعت یا دو ساعت یا ایک دو دن کے لیے اگر تقیّہ جائز سمجھا جائے تو ہو سکتا ہے۔ اسد اللہ میں تیس سال تک اس بزدلی کی صفت کا ثابت کرنا اور تقیّہ پر مصر سمجھنا بہت برا ہے اور جب صغیرہ پر اصرار کرنا کبیرہ ہے تو پھر بھلا دشمنوں اور منافقوں کی صفات میں سے کسی صفت پر اصرار کرنا کیسا ہوگا؟ کاش کہ یہ لوگ اس امر کی برائی سمجھتے شیخین رضی اللہ عنہما کی تقدیم و تعظیم سے اس لیے بھاگتے ہیں کہ اس میں حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی اہانت ہے اور تقیہ اختیار کر لیا ہے۔ اگر تقیہ کی برائی جو ارباب نفاق کی صفت ہے سمجھتے تو ہرگز تقیہ کو جائز قرار نہ دیتے اور دو بلاؤں میں سے آسان کو اختیار کرتے بلکہ ہم کہتے ہیں کہ شیخین کی تقدیم و تعظیم میں حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی کچھ اہانت نہیں ہے۔ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی حقیقت بھی بجائے خود ہے اور ان کی ولایت کا درجہ اور ہدایت و ارشاد کا رتبہ بھی اپنے حال پر ہے اور تقیّہ کے ثابت کرنے میں نقص و توہین ہے۔ کیونکہ یہ صفت ارباب نفاق کے خاصوں اور مکاروں اور فریبوں کے لوازم سے ہے۔"[۱۳۶]

[۱۳۶] مکتوبات امام ربانی جلد دوم مکتوب ۳۶ ص ۹۲ تا ۹۵۔

حضرت مجدّد رح نہایت ہی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ اپنے دیگر مکتوبات جلد اول میں مکتوب نمبر ۲۵۱ و ۲۶۶ و نیز جلد دوم مکتوب نمبر ۱۵، ۳۶، ۶۷، ۷۶ اور ۹۶ میں سنت اہل جماعت کا نہ صرف مسلک پیش کیا ہے بلکہ نہایت دلکش انداز میں قرآن پاک اور احادیث رسول اللہ کی روشنی میں شیعہ حضرات کے تمام فاسد خیالات اور گمراہ کن عقائد کی تردید کر کے انہیں بھی متنبہ کیا کہ ان کے تصورات و خیالات کی بنیاد قرآن پاک کی تعلیمات، سنت نبوی اور خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عمل کے مطابق نہیں ہے۔ وہ اہل بیت اور حضرت امیر رضی اللہ عنہ سے جس خلوص، محبت اور جوش عقیدت کا اظہار کرتے ہیں وہ سراسر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات، عمل اور اقوال کی ضد پر مبنی ہیں اور جو طرز عمل وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منسوب کرتے ہیں اس سے نہ ان کی عظمت میں اضافہ ہوتا ہے اور نہ ہی اسلام اور بانی اسلام کی خوبی اور عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ اس لیے خود شیعہ حضرات کے اہل بیت سے محبت اور خلوص کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے غیر عقلی، غیر علمی اور غیر اسلامی خیالات سے تائب ہوں اور ان متنازعہ معاملات میں اعتدال کی راہ اختیار کریں۔ جس سے نہ اسلام پر حرف آتا ہو اور نہ بزرگان دین اور صحابہ کرام کی توہین ہو بلکہ ان حضرات کو تمام ہوائے نفس سے پاک تصور کریں۔ آپ نے اس نازک مسئلہ میں شیعہ حضرات سے مناظرانہ یا مجادلانہ طرز تخاطب یا انداز بیان اختیار نہیں کیا بلکہ ناصحانہ طریقہ اختیار کیا۔ ان کے دل و دماغ کو اپیل کیا اور انہیں مثبت انداز میں غور و فکر کی دعوت دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف شیعوں کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کا سدِ باب ہوا بلکہ ایسے اصحاب جو محض پروپیگنڈے سے یا غلط معلومات یا محض حسن عقیدت میں افراط و تفریط کا شکار تھے۔ ان کی غلط فہمیاں ان پر واضح ہو گئیں اور انہوں نے اپنے ذہن و فکر اور عقیدے کی اصلاح کی۔ یہ آپ ہی کے مساعی کا نتیجہ تھا کہ باوجود اس کے جہانگیر کے عہد میں شیعوں کو معاملات ملکی میں زبردست غلبہ و اقتدار حاصل تھا۔ اور مغل حکومت کے ایران کے غالی شیعہ صفوی حکمرانوں سے گہرے روابط اور دوستانہ تعلقات[۱۳۶ (الف)] جہانگیر کے عہد حکومت میں

---

۱۳۶ (الف) ۔ تزک جہانگیری ۔ صفحات ۲۱۶، ۲۶۸، ۳۵۴، ۳۹۳، ۳۷۴، ۴۷۹، ۵۶۶، ۵۸۷ وغیرہ وغیرہ ۔

رہے ہیں لیکن ان تمام کے باوجود مسلمانوں کا سوادِ اعظم شیعوں کے پھیلائے ہوئے گمراہ کن اور فاسد خیالات سے محفوظ رہا۔

مکتوبات کا ایک عمومی جائزہ :۔

حضرت مجددؒ رح کی تحریک نفاذ شریعت بہت ہی وسیع اور ہمہ گیر تھی۔ آپ رح نے اپنی دعوت سے عامۃ المسلمین کو روشناس اور ان کے ذہن و فکر کی اصلاح کے لیے خطوطؒ کو ذریعہ بنایا تھا۔ یہ خطوط مختلف افراد کو مختلف اوقات میں مختلف موضوعات اور مسائل پہ لکھے گئے ہیں ہر خط کا مخاطب تو بظاہر ایک ہی فرد ہوتا تھا۔ لیکن وہ خطوط اپنے نفس مضمون کے اعتبار سے دوسرے لوگوں کے دلچسپی کا باعث بھی ہوتے تھے اس لیے وہ محض ایک فرد تک محدود نہیں رہتا تھا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہتمام کے ساتھ ان خطوط کی نقل دوسروں تک پہنچائی جاتی تھی۔ اگر آج کی اصطلاح میں اسے رسالہ سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ ہر ایک خط اپنے نفس موضوع کے اعتبار سے مکمل ہوتا تھا۔ ان خطوط کے مضامین بہت ہی متنوع ہیں۔۔ ان میں انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں کے متعلق رہنمائی و ہدایت ملتی ہے۔

اکبر کے عہد حکومت اور اس سے قبل کے دور میں پاک و ہند کے مسلمانوں میں مسلم معاشرے کے انحطاط اور ہندوؤں کی احیائی تحریک سے مسلمانوں کے اجتماعی زندگی میں خواہ اس کا تعلق سیاست و حکومت سے رہا ہو یا معاشرت یا عقائد و نظریات ہوں یا عبادات، ریاضت و مراقبات یا اسلام کی بنیادی عقائد کی تعلیم و تشریح سے تعلق ہو یا اسلامی تاریخ کے بعض واقعات کی تعبیر و تشریح سے ہو یا کوئی اور پہلو جس کا تعلق مسلمانوں کے اجتماعی زندگی اور معاملات سے ہو، ان سب کے متعلق نہایت ہی واضح مدلل مضامین خطوط کی شکل میں موجود ہیں۔ یہ ایسے مسائل ہیں جو زندہ معاشرے میں دوسری تہذیب و تمدن سے میل جول سے پیدا ہوتے ہیں۔ بالخصوص اس معاشرے کے لیے جو اپنی انفرادیت کو دوسروں میں جذب کرنے پہ آمادہ نہ ہو بلکہ اپنا تشخص برقرار رکھنے کے لیے کوشاں ہو۔ یہ عملی مسائل تھے جو آپ کو درپیش تھے۔ آپ رح نے ان علمی اور عملی مسائل کے نہایت ہی تشفی بخش جوابات قرآن پاک، اسوہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم اور عمل صحابہ کرام اور علماء سلف صالحین کے بیان کی روشنی میں نہایت ہی دل نشیں پیرایہ میں اپنے مکتوبات کے معرفت دیے ہیں۔ ان میں سے بعض مکتوبات تو بہت ہی طویل اور کئی کئی صفحات پر مشتمل ہیں اور یہ اپنے مندرجات کے اعتبار سے مستقل نوعیت کے ہیں۔ مضامین اور موضوعات کے اعتبار سے اگر ان مکتوبات کو تقسیم کرنا چاہیں تو مضامین کی فہرست بہت طویل ہو جائے گی۔ آپ رح کے اپنے عہد اور زمانہ سابق سے جو فتنے و گمراہیاں یا اعتراضات و شکوک و شبہات اسلامی معاشرت، شریعت یا اسلام کے دیگر تعلیمات کے سلسلے میں جنم لے چکے تھے۔ یا جن کو ہوا دے کر مسلم معاشرہ میں فکری انتشار اور ژولیدگی فکر پیدا کی گئی تھی اور عام مسلمانوں کے ذہن کو مسموم کر دیا گیا تھا۔ ان سب کو تفصیل کے ساتھ اپنے مکتوبات کے ذریعہ پیش کرتے ہیں اور قرآن پاک اور احادیث نبوی کے معرفت ان کا تشفی بخش جواب دیتے ہیں جو قاری کے دل و دماغ دونوں کو اپیل کرتا ہے مکتوبات کا انداز تخاطب و انداز بیان ایسا دل آویز اور (ATTRACTIVE) ہے کہ قاری کے دل میں وہ باتیں اترتی چلی جاتی ہیں اور اس کے ذہن و قلب پر اس کے اثرات مرتب ہوتے چلے جاتے ہیں اور عمل کی دنیا میں بھی انقلاب شروع ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مکتوبات کی معرفت ہی آپ کے عہد میں ترویج شریعت اور نفاذ شریعت کی پیاس عوام و خواص دونوں میں پیدا ہو چلی تھی اور آپ کا حلقہ اثر روز بروز وسیع ہوتا چلا گیا تھا۔ ماضی میں غلط عقائد و نظریات اور باطل و فاسد خیالات اور گمراہ کن تصورات سے معاشرے میں جو اضمحلال اور عمل و کردار میں جو کجی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ آپ کی برپا کی ہوئی تحریک سے دور ہونا شروع ہوئی۔ آپ رح کی تحریک سے لوگوں میں اسلام کے بارے میں خود اعتمادی اور احیاءِ اسلام کے لیے ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا۔

مکتوبات میں توحید۔ سنت نبوی۔ شریعت کی اہمیت و افادیت، نبوت کی عظمت عقل کی بیچارگی۔ مصلحت ملکی۔ اور فلسفہ کی خامیاں۔ مسلک جماعت اہل سنت، طریقہ نقشبندیہ و شریعت وغیرہ پر مثبت انداز میں جامع و مدلل بحث کی ہے اور فاسد و گمراہ کن خیالات اور فکر کی پرزور تردید کر کے ان کی کجی اور بودے پن کو مضبوط دلائل سے واضح

کر دیا ہے۔

آپ کے خطوط کے تین دفتر ہیں۔ دفتر اول میں ۳۱۳ خطوط ہیں یہ تعداد اصحاب بدر کی رعایت پر ہے۔ اصحاب بدر کو تاریخ اسلام میں ایک بنیادی اور مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ یہی اصحاب ہیں جنھوں نے رمضان المبارک میں قلیل تعداد ہونے کے باوجود لشکر کفار پر نہ صرف کاری ضرب لگائی بلکہ انہیں شکست فاش دے کر مسلمانوں کے حوصلے و عزم کو بلند کر دیا اور اہل کفر کے نخوت و پندار کو پاش پاش کر دیا۔ یہ مجموعہ ۱۰۲۵ھ میں کتابی شکل میں یعنی گرفتاری سے تین سال قبل شائع ہوا تھا جس کا تاریخی نام "درالمعرفت" ہے۔

دفتر دوم میں کل ۹۹ مکتوبات ہیں۔ یہ تعداد "اسمائے حسنیٰ" کی رعایت پر ہے۔ اس کا تاریخی نام "نورالحقائق" ہے۔ یہ مجموعہ کتابی شکل میں ۱۰۲۸ھ دربار جہانگیری میں طلبی سے کچھ عرصہ قبل ہی شائع ہوا تھا۔

دفتر سوم ۱۱۴ مکتوبات پر مشتمل ہے اس میں سے بیشتر خطوط وہ ہیں جو قید کے دوران لکھے گئے ہیں اس کی تعداد قرآن کی سورتوں کی تعداد پر مبنی ہے۔ اس کا تاریخی نام "معرفتہ الحقائق" ہے جو کتابی شکل میں ۱۰۳۱ھ میں شائع ہوا تھا۔

اس کے بعد چوتھے دفتر کی تیاری شروع ہو گئی تھی لیکن ابھی دس ہی خطوط لکھے گئے کہ آپ رح کا انتقال ہو گیا اس لیے یہ خطوط بھی دفتر سوم میں شامل کر دیے گئے۔ اس طرح دفتر سوم میں مکتوبات کی کل تعداد ۱۲۴ ہو جاتی ہے۔

ان مجموعہ مکاتیب کے علاوہ آپ نے اپنے عہد کی ضروریات اور تقاضے کے پیش نظر متعدد علمی رسائل بھی تحریر کیے ہیں۔ ان میں خصوصیت سے "اثبات النبوۃ" اور رسالہ "ردِ روافض" نہایت ہی اہم اور قابل قدر ہیں۔ اول الذکر میں نبوت کی اہمیت، عظمت اور افادیت پر نہایت ہی عالمانہ بحث ہے۔ یہ محض علمی بحث ہی کی کتاب نہیں ہے بلکہ اس دور کے ایک فکری، ذہنی و علمی چیلنج کا نہایت مسکت جواب تھی۔ اس کی معرفت یہ ثابت کیا گیا کہ ملکی، معاشرتی و اجتماعی معاملات کا اطمینان بخش حل، فلسفہ، عقل، تجربہ اور سیاسی مصلحت کے فلسفہ پر ممکن نہیں ہے بلکہ اس کے لیے نبوت کی ہدایت و رہنمائی لازمی

اور لابدی ہے۔ یہ حضرت مجدد رح کا محض دعویٰ یا مفروضہ ہی نہیں تھا بلکہ بعد میں جو سیاسی حالات بدلے اور معاشرے میں جو ذہنی و فکری انقلاب برپا ہوا تو نبوت کی ہدایت و رہنمائی ہی کو اورنگ زیب عالمگیر نے (۱۶۵۸ء - ۱۷۰۷ء) اپنی مملکت کی اساس قرار دیا تھا جس پر آج بھی مسلمانوں کے سوادِ اعظم کی عظیم الشان تعداد متحد متفق اور یکسو ہے۔

مواخذ الذکر کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلوی رح (۱۷۰۳ء - ۱۷۶۲ء) نے جو اپنے عہد کے ایک جید عالم اور مفکر گزرے ہیں اور متعدد بلند پایہ علمی کتابوں کے مصنف بھی ہیں "ردِ روافض"[ع۵] کا ترجمہ کیا اس کے معنی یہ تھے کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر اس وقت تک حرف آخر کا درجہ رکھتی تھی۔

مخالفت کا آغاز اور الزامات:۔

حضرت مجدد الف ثانی رح کی تحریک نفاذ شریعت دھیرے دھیرے آگے بڑھتی اور لوگوں کے دلوں و دماغ میں اپنا گھر بناتی رہی۔ اس تحریک کے نتیجہ میں معاشرے میں ایک ذہنی و فکری انقلاب برپا ہو رہا تھا۔ لوگوں کے سوچنے اور عمل کے زاویے بدل رہے تھے۔ آپ رح کے پیش نظر ایک جامع اور ہمہ گیر ذہنی و فکری انقلاب تھا جس کی اساس قرآن پاک اور سنّت نبوی تھی اس لیے معاشرے کے سب سے اہم اِدارہ یعنی حکومت وقت کی اساسی پالیسی کو شریعت کے تابع بنانا تھا۔ چنانچہ اس راہ میں جو قوتیں اور گروہ مزاحم تھیں ان کو راستے سے نہ صرف ہٹایا بلکہ ان کی قوت اور اثرات کو بھی ختم کر دیا۔ اس لیے جب تک آپ کی تحریک ابتدائی مراحل میں تھی اور آپ لوگوں کو ترویج شریعت اور اتباع سنّت نبوی کی تلقین کرتے رہے اور فاسد و گمراہ کن عقائد و خیالات کی تردید کرتے رہے تو آپ کی کوئی ایسی موثر مخالفت نہ ہوئی کیونکہ حکومت وقت کی پالیسی ان معاملات میں غیر جانبداری کی تھی لیکن

ع۵ شاہ ولی اللہ دہلوی رح کے ترجمہ کا نام "رسالۃ السنیۃ فی انتصار الفرقۃ السنیۃ" ہے جو غالباً آپ نے ۱۱۴۵ھ میں کیا ہے۔

رفتہ رفتہ جب آپ کی تحریک کے قدم جمنے شروع ہوئے اور آپ رح کی دعوت عوام میں مقبول ہونے لگی، فتنے و فساد کے بادل چھٹنے لگے اور معاشرہ میں ایک نمایاں با صلاحیت، فعال ہر گرم گروہ آپ کے معتقدین و متاثرین کا احیاء سنت نبوی اور نفاذ شریعت کا پیدا ہو گیا تو مختلف حلقوں کو تشویش ہوئی اور آپ کی مخالفت کا آغاز ہوا۔ ابتدا میں تو بعض دین پسند حلقے محض غلط فہمی سے آپ کی تحریک احیاء اسلام کو اپنے مخصوص مزاج و انداز فکر کے مطابق نہ پا کر آپ کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے تھے اور مخالفت بھی کی لیکن جونہی اپنی غلط فہمی کا احساس ہوا اور صحیح صورت حال سے واقف ہو گئے تو نہ صرف مخالفت ترک کر دی بلکہ وہ بھی دل سے ہمنوا ہو گئے اور آپ کی کامیابی کے خواہاں ہو گئے تھے۔ لیکن جن کے دلوں میں کجی تھی ان کی مخالفت و مخاصمت بڑھتی گئی۔ اقتدار پرست علماء دنیا اور شکم پرست صوفیاء خام اور نام نہاد بزرگان دین جن کا کاروبار دین اور سیادت و قیادت خطرے میں تھی وہ لوگ آپ کی مخالفت میں کھل کر آ گئے۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ معاشرے میں حضرت مجدد رح کی تحریک جڑ پکڑ رہی ہے۔ فائدین، مصلحین کا ایک ایسا گروہ معاشرہ میں ابھرنا شروع ہو گیا ہے جو علم و عمل، صلاحیت و کردار میں ان سے کہیں بہتر ہے جس میں قیادت و رہنمائی کی بھی صلاحیتیں موجود ہیں اس لیے ان کے مقابلے میں معاشرے میں نہ صرف ان کی گرفت کمزور ہو رہی ہے بلکہ ان کے پیروں تلے زمین نکلتی جا رہی ہے اور لوگوں کے لیے ایک سوالیہ نشان بنتے جا رہے ہیں اس لیے یہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے نہ صرف مخالفت کرتے ہیں بلکہ الزامات بھی عائد کرتے ہیں آپ رح پر دین سے انحراف، خلفاء راشدین وغیرہ کی توہین۔ کلمات کفر کے اظہار وغیرہ کے بے بنیاد الزام لگائے جاتے ہیں۔

حکومت وقت، دربار کے متقدر با اثر شیعہ امراء مملکت بھی آپ کی تحریک کی مقبولیت اور ہمہ گیری سے خوش نہ تھے۔[۱۳۷] وہ محسوس کرتے تھے کہ جہانگیر کے عہد میں انہیں جو سیاسی

---

[۱۳۷] شیعہ حضرات کے عقائد و تصورات کے سلسلے میں دیکھئے حضرت مجدد رح کا رسالہ "ردّ روافض" و مکتوب نمبر ۲۵۱، ۲۶۶ جلد اول اور مکتوب نمبر ۱۵، ۳۶، ۶۷، (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

غلبہ اور حکومت کے نظم و نسق میں جو فوقیت حاصل ہے وہ آپ کی تحریک کی کامیابی سے ماند پڑ جائے گی۔ حضرت مجدّد رح کے عہد جہانگیری کے متعدد امراءِ مملکت سے خصوصی تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ جنہیں آپ نے متعدد خطوط لکھے ہیں اور ان خطوط کے مندرجات کا مرکزی نقطہ احیاء شریعت نبوی اور غلبہ اسلام کے لیے انہیں بیدار اور متحرک کرنا تھا۔ یہ امراء مملکت اعلیٰ عہدوں اور منصب پر فائز تھے اور کاروبار مملکت میں انہیں اہم مقام حاصل تھا۔ ان امراء مملکت سے ربط و ضبط اور خط کتابت سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کو ان سے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے کیا توقعات تھیں اور آپ نے انہیں ذہنی و فکری طور پر متاثر کیا تھا۔[۱۳۸] اس طرح امراء مملکت میں بھی آپ کے متاثرین، معتقدین یا اپنے ہمدردوں کا ایک موثر گروہ پیدا ہو گیا تھا جس کو آپ کے مقاصد سے ہمدردی تھی اس لیے آپ کے مخالفین نے آپ کو بطور ایک سیاسی خطرہ کے جہانگیر کے سامنے پیش کیا ہوگا۔ اور جہانگیر نے بھی آپ کی فعال اور با اثر تحریک اور امراء مملکت میں بھی آپ سے ربط و ضبط و تعلقات رکھنے والوں کے ایک موثر گروہ کی موجودگی سے سیاسی خطرہ محسوس کیا ہوگا اس لیے کہ عام لوگوں میں آپ نے احیاء اسلام اور نفاذ شریعت کے لیے ایک تڑپ و لگن پیدا کر دی تھی اور لوگ حکومت کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ۹۶ وغیرہ جلد دوم۔ حضرت مجدّد رح کی ان تحریروں سے شیعہ حضرات کی پھیلائی ہوئی گمراہیاں نہ صرف کم ہوتی ہیں بلکہ معاشرے میں ان کا حلقہ اثر بھی کم اور محدود ہونا شروع ہوتا ہے۔

۱۳۸ مکتوبات امام ربانی جلد اول مکتوب نمبر ۳ تا ۵ مسلسل ۴۳، ۴۷، ۱۰۳، ۱۵۲، ۱۶۳، ۱۶۵، ۱۹۳، ۲۱۳، ۲۳۳، ۲۶۹۔ یہ خطوط آپ نے شیخ فرید بخاری کو لکھے ہیں جنہوں نے جہانگیر کو تخت نشین کرانے میں سب سے اہم اور موثر رول ادا کیا تھا۔ دیکھئے

مزید ملاحظہ ہو۔ دیگر امراء مملکت کے نام مکتوبات جلد اول مکتوب نمبر ۲۳، ۲۵، ۶۰، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۳، ۸۵، ۸۶، ۹۰، ۱۹۱، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۸، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۳۲، ۲۴۹، ۲۶۸ وغیرہ وغیرہ۔

پالیسی کو شریعت کے تابع دیکھنا چاہتے تھے لیکن نہ تو جہانگیر کی زندگی باشرع تھی اور نہ حکومت کی پالیسی شریعت کی رہنمائی میں تھی اس لیے جہانگیر نے یہ محسوس کیا ہو کہ اگر حضرت مجدّد رح کی تحریک اسی رفتار سے کام کرتی رہی اور عوام میں اس کا دائرہ اثر بڑھتا رہا تو پھر اس کی حکومت کے لیے خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ عامۃ المسلمین میں احیاء اسلام کی پیاس بڑھتی رہے گی۔ اور یہ اس کی تسکین کے لیے قدم اٹھانے کے لیے تیار نہ تھا۔ [۱۳۹] اس لیے وہ اپنے شخصی مفاد کے پیش نظر بھی حضرت مجدّد رح اور ان کی مقبولیت اور اصل مقصد سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے آپ کے خلاف قدم اٹھانے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے تاکہ حکومت کی سختی، تشدد اور عتاب شاہانہ سے تحریک کی بڑھتی ہوئی قوت کو روکا جا سکا اس طرح لوگ حکومت وقت کے سخت اقدام سے خوف زدہ ہو کر اس کی وابستگی و ہمدردی سے کنارہ کش ہو جائیں گے۔

خلاصہ یہ کہ آپ کے خلاف قدم اٹھانے کا فیصلہ اس وقت کیا گیا جب کہ معاشرہ میں آپ کو ایک قوت اور اہمیت حاصل ہو گئی تھی اور لوگوں کی اچھی خاصی تعداد میں آپ کی تحریک نے گھر کر لیا تھا۔ اس لیے تمام مفاد پرست طبقہ خواہ ان کا تعلق علماء دُنیا سے تھا خواہ وہ شکم پرست اور بے ضمیر اور خود غرض صوفیاءِ خام تھے یا دربار کے خود غرض مقتدر و با اثر امراء مملکت تھے۔ وہ سب آپ کے خلاف نوٹس لینے پر آمادہ ہوئے کیونکہ آپ کی مقبولیت اور آپ کی

---

۱۳۹ یہ محض مفروضہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ حضرت مجدّد رح دربار میں طلب کیے جاتے ہیں ان کے خلاف الزامات و اتہامات کی ایک لمبی چوڑی فہرست ہوتی ہے قلعہ گوالیار میں قید کر دیے جاتے ہیں لیکن رائے عامہ کے دباؤ سے آپ قلعہ سے رہا کر دیے جاتے ہیں اس کے بعد حکومت کی پالیسی میں ایک نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے اور مثبت طور پر ایسے احکامات جاری کرتا ہے جو عامۃ المسلمین کے نزدیک لازماً پسندیدہ رہے ہوں گے مثلاً راجوری کے نو مسلموں کو حکم دیا کہ آیندہ سے وہ اپنی لڑکیوں کی شادی ہندوؤں میں نہ کریں۔ اور قلعہ کانگڑہ کے فتح ہونے کے بعد حکومت کی سابقہ پالیسی اور روایات کے برعکس دہ نہ گا مندر میں اذان دلوائی اور خطبہ پڑھوایا اور حکم دیا کہ گائے بھی ذبح کریں۔

(بحوالہ تزک جہانگیری ص ۱۵۱، ۶۷، ۶۹)۔

تحریک کے فروغ سے ان کی سیادت و قیادت، اثر و رسوخ اور سیاسی اہمیت و برتری کو خطرہ تھا۔ اس لیے ان طبقوں نے جہانگیر کو بھی آپ کے خلاف ورغلایا اور آپ کے دعوت اور تحریک کو ایک خطرہ بنا کر پیش کیا اور آپ کی طرف سے جہانگیر کو اتنا بدگمان کر دیا کہ جب اس نے آپ کا تذکرہ کیا تو نہایت ہی رکیک، غیر شریفانہ، ناشائستہ الفاظ آپ کے حق میں استعمال کیے [۱۴۰] لیکن آپ کی مقبولیت اور معاشرے میں اثرات کی زیادتی اور فروغ اور امراء مملکت میں آپ کے متاثرین کی موجودگی، غیر اسلامی افکار و خیالات پر تنقید و احتساب اور نفاذ شریعت اور سنت نبوی کی اتباع کی تلقین وغیرہ آپ کے خلاف کسی اقدام کے لیے وجہ جواز نہیں بن سکتی تھی اور نہ ہی کوئی ایسا واقعہ یا تجربہ یا عمل پیش کیا جا سکتا تھا جس سے یہ ثابت کیا جا سکتا کہ آپ حکومت کے لیے ایک سیاسی خطرہ ہیں اور حکومت پر قابض ہونا چاہتے ہیں یا بغاوت پر آمادہ ہیں اس لیے آپ کے خلاف قدم اٹھانے کے لیے حکومت نے "احترام اسلام"، "ناموس خلفاء راشدین" کا سہارا لے کر دربار میں طلب کیا تاکہ اس کی جوابدہی کے لیے جہانگیر کے حضور پیش ہوں [۱۴۱]۔

چنانچہ جہانگیر خود اپنے سن جلوس کے چودھویں سال کے واقعات کے ضمن میں لکھتا ہے کہ:۔

---

[۱۴۰] تزک جہانگیری ص ۵۶۳ و ۶۳۳ مثلاً "جعل سازی" مکر و فریب کا جال فریب دینے اور معرفت کی دوکانداری، واہیات خطوط، دفتر بے معنی، بے عقل و کم فہم، مغرور، خود پسند، زہد فروشی، بیہودہ گوئی وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

[۱۴۱] نوٹ:۔ دربار میں طلب غالباً اس خیال کے پیش نظر کیا گیا ہو کہ جب آپ جہانگیر کے سامنے دربار میں پیش ہوں گے تو دربار کے مروجہ طریقے کے مطابق بادشاہ کو سجدہ کریں گے یا سجدہ سے انکار۔ اول الذکر صورت اختیار کرنے میں خود حضرت مجدد رح کی اخلاقی موت واقع ہو جائے گی اور مؤخر الذکر صورت میں دربار شاہی کے آداب آئین کی توہین کے مرتکب ہو کر بادشاہ کے غیظ و غضب اور عتاب شاہی کے شکار ہوں گے اس طرح دونوں صورتوں میں مقصد حاصل ہو جائے گا۔

دربار میں حضرت مجددؒ کی طلبی اور جہانگیر کی دشنام طرازی :۔

"دریں ایام بعرض رسید کہ شیخ احمد نام شیادے در سرہند دام زرق و سالوس فرو چیدہ بسیارے از ظاہر پرستان بے معنی را صید خود کردہ و بہر شہرے و دیارے یکے از مریدان خود را کہ آئین دکان آرائی و معرفت فروشی و مردم فریبی را از دیگراں پختہ تر دانند، خلیفہ نام نہادہ، فرستادہ، و مزخرفاتے کہ بمریداں و معتقدانِ خود نوشتہ کتابے فراہم آوردہ مکتوبات نام کردہ و دراں جنگ مہملات بسا مقدمات لاطایل مرقوم گشتہ کہ بکفر و زندقہ منجر مے شود۔ ازآں جملہ در مکتوبے نوشتہ کہ درا ثناء سلوک گذارم بمقام ذی النورین افتاد مقامے دیدم بغایت عالی و خوش بصفا ازاں جا درگذشتم بمقام فاروق پیوستم و از مقامِ فاروق بمقام صدیق عبور کردم و ہر کدام را تعریفے درخورِ آں نوشتہ و ازاں جا بمقام محبوبیت واصل شدہ مقامے مشاہدہ افتادہ، بغایت منور و ملون خود را با انواع انوار و الوان منعکس یافتم، یعنی استغفر اللہ! از مقامِ خلفا درگذشتہ بعالی مرتبت رجوع نمودم و دیگر گستاخی ہا کہ دہ کہ نوشتن آں طولے دارد و از ادب دور است۔ بنا بریں حکم فرمودم کہ بدرگاہِ عدالت آئین حاضر سازند حسب الحکم بملازمت پیوست و از ہرچہ پرسیدم جواب معقول نتوانست۔ سامان نمود و با عدم خرد و دانش بغایت مغرور و خود پسند ظاہر شد۔ صلاح حال او منحصر دریں دیدم کہ روزے چند در زندانِ ادب محبوس باشد، تا شوریدگی مزاج و آشفتگی دماغش قدرے تسکیں پذیرد۔ و شورش عوام نیز فرو نشیند۔ لاجرم بانی رائے سنگھ دلن حوالہ شد کہ در قلعہ گوالیار مقید دارد۔

تزک جہانگیری جشن چاردہمیں نوروز صفحہ ۲۷۲-۲۷۳-

اردو ترجمہ :۔ "ان دنوں مجھ سے عرض کیا گیا کہ شیخ احمد نامی ایک جعل ساز نے سرہند

ہیں مکروفریب کا جال بچھا کر بھولے بھالے لوگوں کو پھانس رکھا ہے - اس نے ہر شہر اور ہر علاقے میں اپنا ایک ایک خلیفہ مقرر کیا ہے یہ خلیفے لوگوں کو فریب دینے اور معرفت کی دوکانداری کرنے میں بہت پختہ ہیں اس نے ایسے مریدوں اور معتقدوں کے نام وقتاً فوقتاً جو واہیات خطوط لکھے ہیں انہیں مکتوبات کے نام سے ایک کتاب کی شکل میں جمع کیا ہے [۱۴۲] اس دفتر بے معنی میں اس نے بہت سی ایسی بیہودہ باتیں تحریر کی ہیں جو کفر کی حد تک پہنچتی ہیں ایک مکتوب میں اس نے لکھا ہے کہ مقامات سلوک طے کرتے ہوئے وہ مقام ذی النورین میں پہنچا جو نہایت عالی شان اور پاکیزہ تھا - وہاں سے گزر کر مقام فاروق اور مقام فاروق سے گزر کر مقام صدیق میں پہنچا پھر وہاں سے گزر کر مقام محبوبیت میں پہنچا جو نہایت ہی منور و دلکش تھا - اس مقام میں اس پر مختلف روشنیوں اور رنگوں کے پرتو پڑتے رہے گویا استغفر اللہ بزعم خویش وہ خلفاء کے مرتبے سے بھی بڑھ گیا اور ان سے عالی تر مقام پر فائز ہوا [۱۴۳] - اس نے اس طرح کی اور بھی بہت سی گستاخانہ باتیں خلفاء کے شان میں لکھی ہیں جن کو تحریر کرنا طوالت اور خلفاء کی شان میں بے ادبی کا باعث ہوگا - مذکورہ وجوہات کی بنا پر میں نے اسے دربار میں طلب کیا تھا - جب حسب الطلب حاضر خدمت ہوا تو میں

---

[۱۴۲] اشارہ ہے مکتوبات امام ربانی رح کی جلد اول کی طرف جو دربار میں طلبی سے تین سال قبل ۱۰۲۵ھ بمطابق ۱۶۱۶ء میں شائع ہوئی اور آپ کو دربار میں ۱۰۲۸ھ بمطابق ۱۶۱۹ء دربار میں طلب کیا گیا تھا اور قید کا حکم دیا گیا تھا اس مجموعہ میں ۳۱۳ مکتوبات ہیں یہ تعداد اصحاب بدر کی رعایت پر ہے اور تاریخی نام "در المعرفت" ہے -

[۱۴۳] اشارہ ہے جلد اول کی مکتوب یازدہم کی طرف جو آپ نے اپنے پیرومرشد خواجہ باقی اللہ رح کو تحریر کیا تھا - آپ خواجہ صاحب سے ۱۵۹۹ء میں بیعت ہوئے اور خواجہ صاحب کا انتقال ۱۶۰۳ء میں ہوا اس اثناء میں آپ نے خواجہ صاحب کو کل بیس خطوط لکھے ہیں ان میں سے گیارہویں خط کی طرف یہ اشارہ ہے -

نے اس سے جتنے سوالات بھی کیے ان میں سے کسی ایک کا بھی کوئی معقول جواب نہیں دے سکا بے عقل و کم فہم ہونے کے علاوہ مغرور، خود پسند، بھی نکلا۔ چنانچہ میں نے اس کے حالات کی اصلاح کے لیے یہی موزوں سمجھا کہ اسے کچھ دنوں کے لیے قید رکھا جائے تاکہ اس کے مزاج کی شوریدگی اور اس کے دماغ کی آشفتگی جاتی رہے اور عوام میں جو شورش پھیلی ہوئی ہے وہ تھم جائے۔ چنانچہ اسے انی رائے سنگھ دلن کے حوالہ کیا کہ اسے قلعہ گوالیار میں قید رکھے۔[۱۴۴]

جہانگیر کی تحریر کا تجزیہ:۔

تزک جہانگیری کے اس اقتباس سے واضح طور پر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ حضرت مجدد رح کی تحریک بہت ہی وسیع اور ہمہ گیر ہو گئی تھی اور اسے قبولیت عام کی سند حاصل ہو رہی تھی۔ اس کی آواز قصبات و شہروں سے نکل کر گاؤں گاؤں تک پہنچ چکی تھی اور بہت ہی منظم و با صلاحیت، فعال اور سرگرم کارکنوں پر مشتمل تھی جن کی باتوں میں ایک وزن تھا اور معاشرے میں انہیں اعتماد بھی حاصل تھا اور یہ لوگ آپ کی باتوں پر لبیک کہتے تھے اور آپ ہر ان کی رہنمائی اور اصلاح کے لیے برابر خطوط لکھتے رہتے تھے اور آپ کی یہی مقبولیت کفر و اسلام سے سمجھوتہ کرنے والوں کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹک رہی تھی اس لیے وہ آپ کے درپے آزار ہوتے ہیں۔

پھر یہ کہ اگر تزک جہانگیری کے محولہ بالا اقتباس پر غور کیا جائے تو اس کے مندرجات صاف طور پر یہ غمازی کر رہے ہیں کہ جہانگیر سخت سراسیمہ اور مضطرب ہے اور اس پر غیظ و غضب کا ایک ایسا عالم طاری ہو گیا ہے کہ وہ تہذیب اور شائستگی اور شرافت کے معیار سے گر کر آپ کا تذکرہ کرتا ہے اس نے آپ کے متعلق جو الفاظ خود تحریر کیے ہیں اور جس بے ادبی

---

[۱۴۴] تزک جہانگیری اردو ترجمہ سلیم واحد سلیم۔ ص ۵۶۳، ۵۶۴۔

سے آپ کا تذکرہ کیا ہے وہ محض معتقدین ہی کو نہیں بلکہ تاریخ کے ہر ایک غیر جانبدار طالب علم کے لیے ناگوار خاطر ہوں گے۔ اس انداز بیان کے لیے کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ ان جملوں میں نہ تو ادبیت ہے اور نہ ہی انسانی تہذیب و شرافت کا پاس و لحاظ ہے بلکہ یہ حقیقتاً سراسر ایک افترا، بہتان، الزام اور غلط بیانی پر مبنی بیان ہے جس کی بین السطور کو اگر پڑھنے کی کوشش کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جہانگیر کو آپ رح سے اس قدر بدظن و بدگمان کر دیا گیا تھا کہ وہ آپ کے تذکرے میں اپنا ذہنی توازن کھو چکا ہے اور زبان کی پاکیزگی اور ادب و شائستگی کا لحاظ بھی نہ کر سکا۔

جہانگیر کے الزامات واتہام:۔

جہانگیر نے اپنے سن جلوس کے چودھویں سال کے ضمن میں آپ رح کے متعلق خود جو کچھ تحریر کیا ہے اس کو تو بعض مورخین نے من و عن قبول کر لیا ہے اور اس بیان کو صداقت پر مبنی تصور کرتے ہیں اور جہانگیر کی صفائی پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت مجدد رح سے جو غلطی یا کوتاہی سرزد ہوئی ہے جس سے مسلمانوں میں اضطراب، بے چینی اور شورش کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے تدارک کے لیے جہانگیر مجبور تھا کہ آپ کے خلاف یہ اقدام کرے تاکہ شورش فرو ہو اور مملکت میں امن و امان قائم ہو جائے لیکن یہ تاریخ کا صرف ایک پہلو ہے۔ اس میں حقیقت کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ جہانگیر نے آپ کے خلاف جو فرد جرم عائد کی ہے اس پر ناقدانہ نگاہ ڈالی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس بیان میں کہاں تک صداقت ہے؟ اور آپ کو دربار میں جواب دہی کے لیے جو سبب ظاہر کیا گیا ہے کیا فی الواقعہ وہی سبب ہے؟ اور قلعہ گوالیار میں قید کرنے کے حکم کی جو وجہ بیان کی گئی ہے اس کی اصل حقیقت کیا ہے؟ نیز یہ کہ خود جہانگیر کا عمل کہاں تک احترام اسلام کا ترجمان اور خود اس کی زندگی کہاں تک اسلام اور خلفائے راشدین کی محبت و اخلاص کی گواہی دیتی ہے؟ جس نے احترام اسلام اور ناموس خلفاء راشدین کا سہارا لے کر آپ کو قید کرنے کے لیے ایک ہندو امیر کے سپرد کیا۔

یہ اہم سوالات ہیں جو تاریخ کے ہر غیر جانبدار طالب علم کے ذہن میں بار بار ابھرتے ہیں اور یونہی سرسری طور پر جہانگیر کے بیان سے گزرنے سے انصاف کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ اس لیے جہانگیر کے مندرجات کو من وعن تسلیم کرنے کے بجائے یہ ضروری ہے کہ اس کے لگائے ہوئے فرد جرم پر کھل کر بحث کی جائے تاکہ انصاف کا تقاضا پورا ہو سکے۔

الزامات کا ناقدانہ جائزہ:۔

جہانگیر نے اپنے محولہ بالا بیان میں آپ رح پر جو فرد جرم قائم کی ہے اس کی فہرست تو لمبی چوڑی ہے لیکن اس کے ثبوت میں کوئی واقعہ تحریر نہیں کیا ہے آپ کے خلاف الزامات یہ ہیں کہ:۔

"سرہند میں مکر و فریب کا جال بچھا کر لوگوں کو پھانسنا" "ہر شہر و قریہ میں خلیفہ مقرر کرنا جو لوگوں کو فریب دینے اور معرفت کی دوکانداری کرنے میں بہت پختہ ہیں" "مریدوں اور معتقدوں کے نام وقتاً فوقتاً واہیات خطوط لکھنا، "خطوط کو ایک کتاب کی شکل میں شائع کرنا جو دفتر بے معنی ہے"

ان الزامات میں سے پہلے الزام یعنی سرہند میں مکر و فریب کا جال بچھا کر لوگوں کو پھانسنے کی حقیقت یہ ہے کہ سرہند میں آپ مقیم تھے اور یہیں سے آپ تحریک احیاءِ اسلام اور نفاذ شریعت کی مہم چلا رہے تھے جس سے لوگوں میں اتباعِ سنت نبوی اور غلبہ اسلام کے لیے ایک تڑپ، ولولہ اور جذبہ پیدا ہوا۔ یہیں سے کفر و الحاد اور ظلمت و جہالت کے خلاف علمی اور عملی جہاد کی رہنمائی ہوتی ہے۔ یہیں سے لوگوں کو ہدایت اور صراط مستقیم پر چلنے کی دعوت دی جاتی ہے اور لوگ جوق در جوق آپ کی طرف کھنچے چلے آتے تھے یہ سلسلہ آپ کی زندگی ہی میں نہیں بلکہ انتقال کے ساڑھے تین سو سال گزرنے کے بعد بھی پاک و ہند کے مسلمان نہایت ہی عقیدت و احترام سے آپ کی خدمات جلیلہ کے احترام میں بہر حال نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔

رہا دوسرا الزام یعنی ہر شہر اور قریہ میں خلیفہ مقرر کرنا جو لوگوں کو فریب دینے اور معرفت

کی دکانداری میں بہت پختہ ہیں۔ اس کی حقیقت بھی بالکل عیاں ہے اس لیے کہ تحریک احیاء شریعت بہت ہی وسیع ہمہ گیر اور منظم تھی۔ اس کے اثرات ملک کے دور دراز گوشے تک پھیلے ہوئے تھے اور یہ محض منتشر اور دفتر بے نہار افراد کا مجموعہ نہ تھی اور نہ ہی یہ مفاد پرست، خود غرض افراد پر مشتمل تھی اس لیے آپ کی تحریک سے جو لوگ متاثر ہوئے وہ منظم ہو کر آپ کے پیغام کو اپنے حلقہ اثر میں پھیلاتے اور اس راہ میں جو علمی اور عملی مشکلات حائل ہوتیں اسے دور کرنے کی کوشش کرتے تھے اس لیے ملک کے گوشہ گوشہ میں اس کے مراکز قائم تھے اور یہ محض شہروں اور قصبات ہی تک محدود نہ تھی بلکہ دیہاتوں میں بھی پھیلی ہوئی تھی اور یہ تمام لوگ آپ کے پیغام کو ایک دوسرے تک پہنچاتے تھے اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بہت تیزی سے لوگوں میں نہ صرف اسلام کا شعور پیدا ہوا بلکہ ان کی زندگیاں بدل گئیں اور ہمہ تن احیاء اسلام کے داعی بن گئے اور پھر یہ لوگ غبی اور احمق نہ تھے بلکہ معاشرے کے ذہین، باصلاحیت، اہل علم، معاملہ فہم اور سوجھ بوجھ رکھنے والے افراد تھے جن کی نگاہیں دوررس اور فکر صائب تھی۔ اس لیے ان کی باتوں میں اثر تھا۔ لوگ ان سے متاثر ہوتے تھے۔ پھر یہ محض قول ہی کے دھنی نہ تھے بلکہ جو کچھ کہتے تھے اس پر عمل بھی کرتے تھے اور ان کی زندگیاں کسی مفاد اور خود غرضی پر مبنی نہ تھیں بلکہ یہ پیکر اخلاص و عمل تھے اس لیے لوگ نہ صرف ان کی باتیں سنتے تھے بلکہ عمل بھی کرتے تھے اور ان کی آواز پر لبیک بھی کہتے تھے۔

رہا تیسرا جرم یا الزام کہ مریدوں و معتقدوں کے نام وقتاً فوقتاً واہیات خطوط لکھنا اور انہیں ایک کتاب کی شکل میں شائع کرنا جو دفتر بے معنی ہے۔ اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ آپ نے ترویج شریعت اور اتباع سنت نبوی کے اعلیٰ مقاصد سے عام لوگوں کو روشناس کرانے کے لیے خط و کتابت کو بطور ایک موثر ذریعہ کے استعمال کیا تھا۔ آپ نے یہ خطوط مختلف افراد کے نام مختلف اوقات میں لکھے ہیں۔ ان کا ایک ہی مرکزی نقطہ یعنی احیاء اسلام ترویج شریعت اور سنت نبوی کا اتباع کے مختلف پہلوؤں کی مختلف انداز میں تشریح اور توجیہ تھی۔ ہر خط کا مخاطب تو بظاہر ایک ہی فرد ہوتا تھا لیکن نفس مضمون عمومی ہوتا تھا اور انداز بیان ایسا جامع، دلکش اور دل آویز کہ آج بھی قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہی

اس خط کا مخاطب ہے۔

چنانچہ آپ کی تحریک انہی خطوط کے ذریعہ خاص و عام تک پہنچتی ہے۔ اگر عہد جدید کی اصطلاح میں ان خطوط کو رسالہ یا پمفلٹ کا نعم البدل سمجھیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ جہاں تک انہیں واہیات خطوط کہنے یا سمجھنے کا تعلق ہے تو آج بھی یہ مکتوبات ملتے ہیں ان کے مطالعہ سے ہر شخص اس نتیجہ پہ پہنچے گا کہ انہیں واہیات کہنا نہایت بد ذوقی، کند ذہنی اور کور باطنی کی دلیل ہے۔ افسوس ہے کہ حاسدین، معاندین اور حشو شاہزادیوں نے جہانگیر کو آپ رح کے خلاف ایسا ورغلایا اور ایسا بدظن و بدگمان کر دیا کہ اسے آپ رح کے متعلق ایسے نازیبا الفاظ استعمال کرنے پڑے جو اس کے مرتبے واد ب سے گرے ہوئے ہیں اور اس کی ذات و شخصیت پر ایک بدنما داغ ہیں اور جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

جہاں تک مکتوبات کو ایک کتابی شکل میں شائع کرنے کا تعلق ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ خطوط چونکہ عام افادیت اور دلچسپی کے تھے اور کسی وقتی یا ہنگامی مسائل سے متعلق نہ تھے بلکہ ان کی ایک مستقل حیثیت تھی جن میں اسلام کے بنیادی مسائل توحید و رسالت، آخرت اور اسلام کی تشریح، توضیح، اسلامی تاریخ کے بعض واقعات کی تعبیر و تشریح اور مختلف معاملات کے متعلق اسلام کی حدود وغیرہ پر بحث تھی اور آپ کے حلقہ ارادت وا ثر میں روز بروز اضافہ ہونے کی وجہ سے ان کی مانگ بھی بہت تھی اس لیے عمومی مفاد کے پیش نظر یکجا شائع کرتے تا کہ یہ تمام خطوط یکجا مل سکیں اور لوگ اس سے استفادہ کر سکیں۔

چنانچہ خطوط کا پہلا مجموعہ ۱۶۱۶ء بمطابق ۱۰۲۵ھ یعنی گرفتاری سے تین سال قبل شائع ہو اتھا۔ اور جہاں تک ان خطوط کے مجموعہ کو "دفتر بے معنی" کہنے کا تعلق ہے تو ناطقہ سربگریبان ہے اسے کیا کہیے؟ ایسے اہم مسائل اور مباحث پر مشتمل مجموعہ کو دفتر بے معنی وہی شخص کہہ سکتا ہے۔ جو بصارت و بصیرت سب سے عاری ہو یا غیظ و غضب نے اس کی آنکھوں پہ پردے ڈال دیے ہوں اور عقل و فہم کے دروازے بند کر دیے ہوں۔

یہ مجموعہ ۳۱۳ خطوط پہ مشتمل ہے اور یہ تعداد اصحاب بدر کی رعایت پہ رکھی گئی ہے۔ غلبہ اسلام کے سلسلے میں اصحاب بدر کی ۳۱۳ کی تعداد کو تاریخ اسلام میں تاریخی اہمیت حاصل ہے۔

کفر و ظلمت کے خلاف یہ پہلی معرکتہ الآرا مسلح جنگ تھی۔ جس میں ان سرفروشان اسلام کو اللہ تعالیٰ نے فتح و کامرانی عطا کی۔ اسی تاریخی اہمیت و مناسبت سے پہلے مجموعہ میں خطوط کی یہ تعداد تھی اس کا تاریخی نام "درّ المعرفت" ہے جس کے لفظی معنی "معرفت کے موتی" ہیں۔ یہ خطوط آج بھی ملتے ہیں اور قبولیتِ عامہ کا یہ عالم ہے کہ متعدد بار فارسی اور اردو میں شائع ہو چکے ہیں ان کے مطالعہ سے حقیقت شناس اور تاریخ کا ہر غیر جانبدار طالب علم بہ آسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ جہانگیر کے الزام کی کیا نوعیت اور حقیقت ہے اور اس میں کہاں تک صداقت ہے؟ کہ یہ خطوط "واہیات" اور دفتر بے معنی ہیں؟ یا واقعی یہ معرفت کے موتی ہیں؟

صحیح یا غلط، مگر ایک الزام:۔

البتہ ان لمبے چوڑے اپنے مختصر الزامات کی تان جہانگیر نے حضرت مجدد کے مکتوبات یازدہم کی ایک عبارت پر توڑی ہے، لیکن یہ عبارت کسی طرح تزک جہانگیری کی مذکورہ ہرزہ سرائی کے لیے وجہ جواز نہیں بن سکتی۔ البتہ زیادہ سے زیادہ بجائے خود ایک الزام کی نوعیت سے پیش کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ جہانگیر یہ الزام حضرت مجدد پر اس طرح قائم کرتا ہے کہ گویا استغفر اللہ وہ خلفاء کے مرتبہ سے بھی بڑھ گیا اور ان سے عالی مقام پر فائز ہوا۔"

قبل اس کے کہ اس الزام پر کلام کیا جائے مناسب یہ ہے کہ جس عبارت کی بنیاد پر یہ فردِ جرم عائد کی گئی ہے اس کے سلسلے میں چند نہایت اہم اور قابل غور پہلو پیش نظر رکھے جائیں۔

مکتوب یازدہم اور اس کی تاریخ تحریر کا تعین:۔

اس بات کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے کہ تزک جہانگیری میں حضرت مجدد رح کی جس عبارت کا حوالہ دیا گیا ہے وہ مکتوب یازدہم جلد اول سے ماخوذ ہے یہ خط آپ نے اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ رح کو تحریر کیا تھا آپ رح ۱۵۹۹ء میں خواجہ صاحب سے بیعت ہوئے اور خواجہ صاحب کا انتقال ۱۶۰۳ء بمطابق ۱۰۱۲ھ میں ہوا یعنی آپ کے مرید ہونے

کے بعد چار سال تک خواجہ صاحب بقید حیات رہے۔ اس اثناء میں تین بار خواجہ صاحب کے یہاں بہ نفس نفیس رشد و ہدایت اور تربیت کے سلسلہ میں مقیم رہے اور جب سرہند میں رہتے تو خط کے ذریعہ ہدایت و رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے خواجہ صاحب کو کل بیس ۲۰ خطوط لکھے ہیں جو سب کے سب ایک ہی ترتیب میں جلد اول میں نمبر ۱ تا ۲۰ تک محفوظ ہیں ان میں جس خط کی عبارت کا حوالہ "تزک جہانگیری" میں دیا گیا ہے وہ ترتیب میں گیارہویں شمار سے پر ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ خط آپ نے ۱۵۹۹ء کے بعد اور ۱۶۰۳ء سے پہلے لکھا ہوگا اور اس عرصہ میں چونکہ آپ نے کل ۲۰ خط تحریر کیے ہیں یعنی اوسطاً سال میں پانچ (۵) خط لکھے ہیں اس لیے یہ گیارہواں نمبر کا خط ۱۶۰۱ء کے آخر میں یا ۱۶۰۲ء کے ابتداء میں تحریر کیا گیا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہو تو بھی بہر حال بین طور پر ثابت ہوتا ہے کہ یہ خط جہانگیر کی تخت نشینی سے تین یا چار سال پہلے لکھا گیا تھا کیونکہ جہانگیر ۱۶۰۵ء میں تخت نشین ہوا اس لیے اگر واقعی یہ خط ایسا تھا جو قابل گرفت تھا تو وہ اس زمانے میں تحریر کیا گیا تھا جب کہ جہانگیر حکمران نہیں تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس خط سے عوام میں فی الواقع کوئی شورش پھیلی ہوئی تھی جیسا کہ جہانگیر نے لکھا ہے تو اگر ایسا ہوتا تو جہانگیر کے پیش رو والی حکومت کے لیے بہترین موقع تھا کہ وہ اس کا نوٹس لیتی لیکن یہ اکبر کا دور تھا اور اس معاملہ میں جہانگیر کو کوئی اختیار نہیں تھا تو جہانگیر تخت نشینی کے فوراً بعد تو نوٹس لے سکتا تھا کیونکہ بقول اس کے خط کے مندرجات سے لوگوں میں ہیجان اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن اس وقت ایسا نہیں کیا گیا بلکہ ایک طویل عرصہ تک حکومت خاموش رہی اس کے معنی یہ ہوئے کہ حکومت کے نزدیک یہ خط اس وقت قابل مواخذہ نہ تھا۔

نوٹ :۔ حضرت خواجہ باقی باللہ رح ۹۷۱ھ بمطابق ۱۵۶۳ء میں پیدا ہوئے اور یہی سال ولادت آپ کے عظیم المرتبت مرید و خلیفہ امام ربانی حضرت احمد سرہندی مجدد الف ثانی کا بھی ہے۔ آپ کا سال وفات ۱۰۱۲ھ بمطابق ۱۶۰۳ء ہے۔

اس خط کی عبارت پر جس پر "خلفاء سے افضل" اور "گستاخانہ باتیں" تحریر کرنے کا الزام عائد کیا تھا آپ کو جہانگیر سن جلوس کے چودھویں سال یعنی ۱۶۱۹ء میں یعنی اگر واقعی کوئی جرم سرزد ہوا تھا تو اس کے سرزد ہونے کے ۱۸ یا ۱۹ سال کے بعد دربار میں طلب کیا جاتا ہے۔ ۱۸ یا ۱۹ سال تک حکومت کی خاموشی سے متعدد سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔ اگر واقعی اس خط کے مندرجات خطرناک کافرانہ اور گمراہ کن تھے اور خلفاء کی شان میں گستاخی ہوئی تھی اور عوام میں شورش و ہیجان پیدا ہوا تھا تو آخر حکومت ۱۸ یا ۱۹ سال تک کیوں خاموش رہی؟ کیا یہ حکومت کی مجرمانہ غفلت۔ نا فرض شناسی۔ نا اہلی اور معاملات ملکی سے بے خبری نہ تھی کہ وہ جس کو مجرم سمجھتی ہے اور اس کے نزدیک معاشرے میں جو فساد پیدا کرنے کا مرتکب ہوا ہے اور جرم اتنا بڑا ہے کہ اسے دربار میں طلب کیا جاتا ہے اور پھر اسے قید بھی کیا جاتا ہے اس کی مجرمانہ تحریر اور مجرم کو اٹھارہ انیس سال تک پھلنے اور پھولنے کی اجازت دیتی ہے۔ حکومت کی اس طویل خاموشی سے اس گمان کو تقویت ہوتی ہے کہ دربار میں طلبی کے کچھ اور اسباب تھے۔

عدل و انصاف کا ایک عام قاعدہ ہے کہ کسی مجرم کو جرم کی سزا دینے کے لیے جرم کے سرزد ہونے کے بعد فوراً یا کم از کم (R E A S O N A B L E) مدت میں اس کی گرفت ہونی چاہیئے۔ لیکن حضرت مجدّد کے معاملہ میں اٹھارہ، انیس سال بعد حکومت کو یکایک "جرم" اور "مجرم" کا خیال آیا۔ یہ انصاف کا انوکھا اور اچھوتا انداز ہے جو محض مطلق العنانیت آمریت، جبر و تشدد، ظلم و بربریت، خود پسندی و تکبر اور لاقانونیت اور فرعونیت کی منظور ہو سکتی ہے۔ لیکن عدل و انصاف، شرافت و شائستگی اور حقیقت پسندی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ کوئی انصاف پسند اس کو عدل نہیں کہہ سکتا اور یہ واقعہ جہانگیر کی ذات و شخصیت پر ایک بڑا بدنما داغ ہے جس کا ارتکاب مفاد پرست درباری اور شکم پرست مذہبی پیشواؤں نے محض اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے اس سے کروایا۔

مسلمانوں کی تاریخ میں اس قسم کے متعدد واقعات ملتے ہیں کہ داعیانِ اسلام اور مصلحین امت کی دعوت حق سے جب ارباب اقتدار کے ایوان لرزنے لگتے ہیں اور ان

کی عیش وعشرت اور اللّے تللّے کی زندگی کو خطرہ ہوتا ہے اور علماءِ دنیا اور صوفیاءِ خام کی قیادت وسیادت اور مفادات خطرے میں ہوتے ہیں تو مشترک مفاد کے لیے گٹھ جوڑ کر کے داعیان اسلام پر اتہام، الزامات اور بہتان تراشی شروع کرتے ہیں اور انہیں یکایک اسلام کا مفاد عزیز ہو جاتا ہے اور اس کے محافظ اور نگران بن کر سامنے آتے ہیں اور اٹھارہ انیس سال پرانی تحریریں بھی کھنگالی جاتی ہیں اور کبھی عبارتوں کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے اور کبھی ادھوری باتوں کا حوالہ دیا جاتا ہے اور جب کچھ بن نہیں پڑتا تو ـــ وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں ـــ وہ انہیں بہت ناگوار ہوتی ہے اور اس پر فیصلہ صادر کر دیا جاتا ہے۔

مکتوب یازدہم کی اصل حقیقت :۔

رہا یہ مسئلہ کہ کیا واقعی یہ خط کلمات کفر پر مشتمل ہے یا اس خط کی تحریر ایسی ہے جس سے نعوذ باللہ خلفاءِ راشدین کی توہین کا اظہار ہوتا ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ حضرت مجدد رح نے یہ خط اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ رح کو ۱۵۹۹ء تا ۱۶۰۳ء بمطابق ۱۰۰۸ھ تا ۱۰۱۲ھ کے درمیان تحریر کیا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب آپ زیر تربیت تھے اس لیے آپ پر جو کیفیت یا احوال گزرتے تھے اس سے اپنے پیر و مرشد کو باخبر کرتے تھے تاکہ ان مسائل میں آپ کو صحیح رہنمائی و ہدایت مل سکے یہ تھا خط کے لکھنے کا پس منظر اور جب یہ خط لکھا گیا ہے اس وقت اس سے اس قسم کے غلط معنی نہیں پہنائے گئے لیکن جب اس خط کی عبارت پر اعتراضات اور شکوک و شبہات کو ہوا دی گئی اور مخالفین و معاندین نے عوام میں غلط فہمی پیدا کرنے کے لیے رقیبانہ اور معاندانہ رویہ اختیار کیا تو عوام اور خواص کی غلط فہمی کو دور کرنے اور حقیقت حال سے روشناس کرانے کے لیے حضرت مجدد رح تحریر کرتے ہیں کہ :۔

"یہ بات اور دوسری باتیں جو اس عرضداشت میں واقع ہوئی ہیں ان واقعات میں سے ہیں جو اپنے پیر و مرشد کی طرف لکھے گئے ہیں اور اس گروہ میں یہ بات ثابت و مقرر ہے کہ جو کچھ ظاہر ہوتا رہے خواہ صحیح ہو یا غلط بے تحاشا اپنے

پیر و مرشد کی طرف ظاہر کرتے رہیں"[۱۴۵]

حضرت مجدد رح کی یہ تحریر بہ نہایت وضاحت سے اصل صورت حال پیش کر رہی ہے کہ تزک جہانگیری میں جس مکتوب کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ کسی فخر و مباہات یا دعویٰ کے طور پر نہیں لکھا گیا تھا بلکہ اس اثناء میں جب کہ آپ کے پیر و مرشد بقید حیات تھے اور وہ برابر آپ کی رہنمائی کر رہے تھے ان کو اس کیفیت اور حال سے مطلع کرنے کے لیے تحریر کیا تھا تاکہ ہر حال میں آپ کو صحیح رہنمائی حاصل ہو سکے۔ اور آپ کے لیے یہ ضروری تھا کہ آپ اپنے پیر و مرشد کے علم میں اپنی یہ کیفیت لاتے کیونکہ اس راہ کے سالکین پر یہ پابندی ہے کہ:۔

"جو کچھ ظاہر ہو خواہ صحیح یا غلط، بے تحاشا پیر و مرشد کو اس سے باخبر کرتے رہیں"

اس لیے آپ نے کوئی ایسی انھونی بات نہیں کی جس سے خواہ مخواہ کی غلط فہمی ہو بلکہ آپ نے اپنی اس کیفیت سے اپنے پیر و مرشد کو باخبر کیا جو آپ پر طاری ہوئی اور کسی فخر و مباہات یا دعویٰ کا شائبہ بھی آپ کے ذہن میں نہ تھا بلکہ آپ پر جو کچھ گزری اسے اپنے پیر و مرشد کے سامنے بے کم و کاست بیان کرنا مقصود تھا۔

---

[۱۴۵] مکتوبات امام ربانی رح جلد اول مکتوب ۱۹۲ ص ۳۱۷

نوٹ:۔ یہ عذر معقول نہ ہوگا کہ مکتوبات کی پہلی جلد کتابی شکل میں ۱۶۱۶ء میں شائع ہوئی تو جہانگیر کو اس کا علم ہوا، صحیح نہیں ہے اس لیے کہ حضرت مجدد رح کا ہر خط اگرچہ ایک فرد کے نام ہوتا تھا لیکن اس میں مضامین اور موضوع بحث عام دلچسپی کے ہوتے تھے اس لیے اس کی کاپیاں دوسروں تک بھی پہنچتی رہتی تھیں دوسرے یہ کہ اس خط کے مندرجات پر بعض حلقوں میں ابتداء ہی میں مخالفانہ ردعمل بھی ہوا اور لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہوئے اور یہ اسی وقت ممکن ہوا جب کہ اس خط کی اشاعت عام ہوئی اور اس خط سے عام لوگ بھی متعارف ہوئے اس لیے حکومت کا یہ موقف قرار دینا کہ اسے علم بعد میں ہوا صحیح نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ اس خط کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے بھی آپ نے خط تحریر کیے ہیں جو مکتوبات جلد اول ہی میں ۱۹۲ اور ۲۰۲ کے شمارے پر درج ہیں جس سے اصل مدعا رہا... (بر صفحہ آئندہ)

محض اس پر اکتفا نہ کی :۔

پھر حضرت مجددؒ نے اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں مرسلہ اپنے اس مکتوب کا پس منظر بیان کرنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ اس خط کو جو معنی پہنائے گئے تھے اور اس کی بنیاد پر جو اتہام اور الزامات تراشے گئے تھے اور آپ کی جانب سے جو باتیں اس خط کی عبارت کے حوالے سے منسوب کی جا رہی تھیں اس سلسلے میں بھی آپ اپنے نقطہ نظر اور مسلک کو پوری وضاحت اور صراحت سے پیش کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ :۔

"وہ شخص جو اپنے آپ کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل جانے اس کا امر دو حال سے خالی نہیں ہے یا وہ زندیق محض ہے یا جاہل ....

.... وہ شخص جو حضرت امیر رضی اللہ عنہ کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل کہے اہلِ سنت و جماعت کے گروہ سے نکل جاتا ہے تو پھر اس شخص کا کیا حال ہے جو اپنے آپ کو افضل جانے اور اس گروہ میں یہ بات مقرر ہے کہ اگر کوئی سالک اپنے آپ کو خارش زدہ کتے سے بہتر جانے تو وہ ان بزرگوں کے کمالات سے محروم ہے .... انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد حضرت صدیق رضی اللہ عنہ تمام انسانوں سے افضل ہیں وہ بڑا ہی احمق ہے جو اس اجماع کے خلاف کرے۔" [۱۴۶]

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) لوگوں کے سامنے آگیا اور غلط فہمی دور ہو گئی، یہ خطوط بھی چونکہ اول الذکر کے پیدا شدہ یا پیدا کردہ شکوک و شبہات کو دور کرنے کے لیے لکھا گیا تھا اس لیے لازمی طور پر اس کی اشاعت بھی وسیع پیمانے پر ہوئی تھی اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ حکومت کو اصل خط کا علم بعد میں ہوا واقعہ کے خلاف ہے۔

چوتھے یہ کہ خطوط کی کتابی شکل کی اشاعت اور آپ کی دربار میں طلبی کے درمیان ۳ سال کا وقفہ ہے جو اچھا خاصا طویل وقفہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس اثناء میں کچھ اور اسباب پیدا ہو گئے تھے اور خط کی اس عبارت کو محض ایک بہانہ بنایا گیا تھا۔

[۱۴۶] مکتوبات امام ربانی رح جلد اول مکتوب ۲۰۲ ص ۳۳۳۔

اس طرح آپ نے نہایت ہی واشگاف الفاظ میں بلا کسی ابہام کے خلفائے راشدین سے متعلق اپنے عقیدے اور مسلک کو پیش کیا ہے اور پھر اس کے بعد کسی قسم کی غلط فہمی اور شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی اور اس واضح اعلان کے بعد بھی یہ کہنا اور سمجھنا کہ آپ اپنے کو خلفاء راشدین سے افضل سمجھتے اور کہتے ہیں، جہالت، دیدہ دلیری، ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں۔

احترامِ صحابہ رضؓ سے متعلق مزید شواہد:۔

حضرت مجدد رحؒ کی مذکورہ بالا تحریر یہ ہی سے نہیں بلکہ متعدد دوسرے مکتوبات سے بھی خلفاء راشدین کے باب میں آپ کے عقیدے و نقطہ نظر، مسلک اور مدعا کی پوری وضاحت ہوتی ہے۔ آپ نے متعدد مکتوبات میں نہایت ہی وضاحت سے خلفاء راشدین کی عظمت ۔ مرتبے، خدمات، ایثار کا تذکرہ کیا ہے اور نہایت تفصیل سے قرآن و حدیث کی روشنی میں بحث کرتے ہوئے خلفاء راشدین کی عظمت، احترام اور اتباع کو ایک مسلمان کے لیے لازم قرار دیا اور ان کی ترتیب خلافت اور اجتہادات کی کلی طور پر تائید کرتے ہیں۔ ان کے خلاف کسی قسم کی بدگمانی اور ان کی عظمت اور جلالت شان سے متعلق کس طرح کے شک و شبہ کو جائز تصور نہیں کرتے یہاں تک کہ بعض صحابہؓ کی ایسی باتیں جو ان کے آپس کے اختلافات و مشاجرات سے متعلق ہیں اور جن پر اس وقت صحابہ رضؓ میں دو گروہ ہو گئے تھے۔ حضرت مجدد رحؒ دونوں گروہوں کو اور انکے تمام افعال کو نیک خیالات پر محمول کرتے ہیں۔[۱۴۷] اس لیے ان خطوط کے مطالعہ سے یہ یقین کامل ہوتا ہے کہ حضرت مجدد رحؒ کے دل میں صحابہ کرامؓ کا کس قدر احترام تھا اور خلفاء راشدین اور خصوصیت سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ کو تو وہ تمام امت میں افضل ترین انسان قرار دیتے ہیں اس لیے ایک انصاف پسند شخص کے دل میں شک کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا کہ حضرت مجدد رحؒ نے خلفاء راشدین

---

[۱۴۷] مکتوبات امام ربانی رحؒ جلد اول مکتوب ۲۵۱، ۲۶۶ ۔ جلد دوم مکتوب نمبر ۱۵، ۳۶، ۶۷، ۹۶ وغیرہ۔

کی توہین کی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جہانگیر نے اپنے جلوس کے چودھویں سال کے ضمن میں حضرت مجددؒ رح کو دربار میں طلبی اور قید کرنے کے جو اسباب تحریر کیے ہیں وہ تحقیق و تجزیہ سے صحیح اور معقول ثابت نہیں ہوتے۔ تمام الزامات کی تنقیح، تزک جہانگیری میں ظاہر کردہ اسباب کی تردید کرتے ہیں اور جہانگیر کے بیان میں کوئی صداقت معلوم نہیں ہوتی اور حضرت مجددؒ رح کی مذکورہ وضاحتوں اور صراحتوں کے باوجود جہانگیر کا یہ کہنا کہ اپنے کو خلفاء سے افضل سمجھتے ہیں، ان کی شان میں گستاخانہ خطوط لکھے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ اپنے اندر معقولیت نہیں رکھتی بلکہ دیدہ دلیری اور ہٹ دھرمی بھی ہے۔ لہٰذا عقل و فہم یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ حضرت مجددؒ کو دربار میں طلب کرنے اور قید کرنے کے لیے یہ عبارت اصل وجہ تھی البتہ یہ ضرور ہے کہ اس تحریر کو آپ کے خلاف قدم اٹھانے کے لیے ایک بہانہ ضرور بنایا گیا تھا۔

اصل وجہ سیاسی تھی:۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت مجددؒ رح کی دربار میں طلبی اور قید و بند کی اصل وجہ خط کی عبارت اگر نہیں تھی تو پھر وہ کون سے اسباب اور عوامل ہیں جن کی بنا پر آپ کو دربار میں طلب کیا گیا اور یہ ضروری خیال کیا گیا کہ قلعہ گوالیار میں غیر معینہ مدت [۱۴۸] کے لیے قید کر دیا جائے بالخصوص جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دربار میں سرے سے شعائر اسلام ہی کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی نہ صرف قدر و منزلت نہ تھی بلکہ دربار میں آنے والوں پر بادشاہ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی پابندی لگا کر کھلے بندوں شعائر اسلام کی توہین ہو رہی تھی

۱۴۸۔ مکتوب امام ربانی رح جلد سوم مکتوب ۲ ص ۸ - ۹ یہ خط قلعہ گوالیار سے لکھا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ "اطلاع دینا ضروری ہے شاید ملاقات ہو یا نہ ہو۔ .... ایک دوسرے کی ملاقات اگر خدا تعالیٰ کو منظور ہوئی تو ہو کر رہے گی ورنہ اس کی تقدیر پر راضی رہو اور دعا کرو کہ دار السلام میں سب جمع ہوں اور دنیاوی ملاقات کی تلافی کو اللہ تعالیٰ کے کرم سے آخرت کے حوالہ کریں۔"

اور بادشاہ کی عملی زندگی خدا اور رسول کی محبت و وفاداری اور صحابہ کرام کی محبت و عظمت پر ایک بھرپور طنز کی نوعیت رکھتی تھی تو پھر ایسے دربار رکھنے والے ایسے بادشاہ کو اس کی کیا پرواہ ہوسکتی ہے کہ کون اپنے آپ کو خلفاء راشدین سے افضل سمجھتا ہے اور کون ادنیٰ اس لیے یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ دربار میں طلبی کا اصل محرک محولہ بالا مکتوب تھا اور قید و بند کی سزا دینے کی حقیقی وجہ وہ تھی جو تزک جہانگیری میں ظاہر کی گئی ہے۔

پھر جب شعائر اسلام ہی کی کوئی قدر و منزلت دربار میں نہ تھی تو پھر خلفاء سے اپنے کو افضل سمجھنے یا نہ سمجھنے کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ حضرت مجدد رح کی دربار میں طلبی کے لیے محولہ مکتوب کو ایک بہانہ بنایا گیا تھا ورنہ آپ کے خلاف قدم اٹھانے کی حقیقی وجہ سیاسی اور صرف سیاسی تھی۔ لیکن نہ تو بادشاہ میں اور نہ دربار کی مقتدر اور با اثر امراء میں اور نہ ہی درباری علماء اور شکم پرست نام نہاد مذہبی پیشواؤں ہی میں یہ اخلاقی جرأت اور حوصلہ تھا کہ وہ آپ کی دربار میں طلبی کی اصل وجہ زبان پر لاتے کیونکہ نہ تو آپ کی کسی تحریر یا تقریر یا کسی عمل یا کسی دوسرے اقدام سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوا تھا جو سیاسی خطرے یا بغاوت کی زد میں آتا۔ لیکن آپ کی مثبت تحریک احیاء اسلام، ترویج شریعت اور اتباع سنّت نبوی سے معاشرے میں جو خوشگوار اور پائیدار تبدیلی رونما ہو رہی تھی اور لوگوں کے ذہن و فکر، عمل و کردار، پسند و ناپسند کے معیار اور طرز عمل اور معاملات زندگی میں جو انقلاب عظیم رونما ہو رہا تھا۔ اس سے تمام مفاد پرست دنیادار مقتدر حضرات خوفزدہ و ہراساں تھے اس لیے وہ آپ کی تحریک کی مقبولیت کے خلاف بند باندھنا چاہتے تھے تاکہ معاشرہ میں خوف اور آپ کے خلاف بدگمانی و شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں اور ان کے اثر و اقتدار میں کوئی حرف نہ آئے۔ اس کے لیے انہوں نے "احترام اسلام اور ناموس خلفاء" کا سہارا لیا اور جہانگیر کو ایک سیاسی خطرہ پیش کر کے آپ کے خلاف اقدام کرنے کے لیے آمادہ کر لیا۔

حکومت میں شیعوں کا غلبہ و اقتدار:۔

جہانگیر کے عہد حکومت میں مختلف اسباب کی بنا پر شیعوں کو زبردست اقتدار حاصل ہو گیا تھا اور وہی مملکت کی پالیسی پر چھائے ہوئے تھے اور خصوصیت سے جہانگیر کے سن جلوس کا چودھواں سال تو شیعوں کے اقتدار و اثرات کا نقطہ عروج تھا۔ شیخ فرید بخاری جن سے حضرت مجدد رح کے گھر سے روابط تھے اور جنہوں نے جہانگیر کی تخت نشینی میں نہایت ہی موثر اور اہم رول ادا کیا تھا اور حکومت کے اعلیٰ ترین منصب شش ہزاری ذات اور پنج ہزاری سوار پر آخری عہد میں فائز تھے ان کا انتقال جہانگیر کے گیارھویں سن جلوس میں ہو گیا تھا۔ ۱۴۹

اس لیے دربار میں سب سے مقتدر اور با اثر گروہ شیعہ امراء کا تھا اور یہ لوگ سیاسی اور اعتقادی دونوں حیثیت سے حضرت مجدد کی تحریک کے سخت مخالف تھے کیونکہ حضرت مجدد رح شیعہ حضرات کی پھیلائی ہوئی اعتقادی گمراہیوں، فاسد خیالات اور باطل نظریات کی سخت مخالفت کر رہے تھے۔ قرآن اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں علمی بنیادوں پر نہایت ہی وضاحت سے دلیل و براہین کے ساتھ اپنے رسالہ "رد روافض" میں شیعوں کی غلطیوں اور باطل خیالات کی تردید کر چکے تھے اور جلد اول مکتوب نمبر ۵۴، ۲۵۱ و ۲۶۶ اور جلد دوم مکتوب نمبر ۱۵، ۳۶، ۶۷، ۹۶ وغیرہ میں نہایت ہی دلنشیں انداز میں مثبت طور پر شیعوں کے عقائد اور طرز فکر پر گرفت کی تھی۔ جس سے معاشرہ میں

---

۱۴۹ تزک جہانگیری (اردو ترجمہ) سلیم واحد سلیم ص ۳۴۲ و

"شیعہ عقاید و تصورات کا غلبہ اس قدر ہو گیا ہے کہ قصبہ سامانہ کے خطیب نے عید قربان کے خطبہ میں خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ذکر کو ترک کیا ہے اور ان کے مبارک ناموں کو نہیں لیا" جلد دوم مکتوب ۱۵ ص ۴۵۔

شیعہ اثرات اور غلبہ متاثر ہو رہا تھا اور خصوصیت سے جلد دوم کے مذکورہ مکتوبات اسی زمانے میں لکھے گئے تھے جو بہت ہی جامع اور مدلل ہیں اس لیے بااثر اور مقتدر شیعہ حضرات کی مخالفت عین فطری تھی کیونکہ ان کے عقائد اور تصورات کی عمارت ہی متزلزل ہو رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ ان کے اقتدار و غلبہ کو بھی خطرہ تھا۔

شیعوں کو مختلف سیاسی اسباب کی بنا پر حکومت کے معاملات میں کافی اثر و رسوخ حاصل تھا لیکن جہانگیر کے عہد میں ۱۶۱۱ء کے بعد یعنی جہانگیر کی نور جہاں سے شادی کے بعد تو ان کا اثر و اقتدار اور غلبہ اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تھا۔ بلکہ عملاً حکومت نور جہاں اور اس کے باپ اور بھائی کے ہاتھوں میں آگئی تھی۔ شہنشاہ جہانگیر نے اسے پہلے نور محل کا خطاب دیا پھر چند روز کے بعد نور جہاں کے خطاب سے نوازا۔ نور جہاں بیگم کے تمام رشتہ دار دن بھائی بندوں پر شاہی نوازشیں اور عنایتیں کیں، نور جہاں کے باپ اعتماد الدولہ (مرزا غیاث بیگ) کو "وکیل کل" کا عہدہ دیا۔ نور جہاں کے بڑے بھائی ابوالحسن کو اعتقاد خاں کا خطاب اور خان ساماں (امیر ساماں) کا عہدہ عطا کیا۔ اعتماد الدولہ کے متعلقین کو ترخانی اور اس کے ملازموں خواجہ سراؤں اور غلاموں کو خانی کے خطابات دیے۔ برکت رائے دائی کو (جو دل آرام کے نام سے مشہور تھی اور جس نے نور جہاں بیگم کو دودھ پلایا تھا) حاجی کوکہ کی جگہ صدر اناث مقرر کیا۔ عورتوں کو معاشی مدد دیے جانے کے احکام اس کی مہر کے ساتھ معتبر سمجھے جاتے تھے۔ خطبہ کو چھوڑ کر حکومت اور سلطنت کے تمام امور عملاً نور جہاں کے ہاتھ میں آگئے وہ تھوڑی دیر کے لیے جھروکہ میں آکر بیٹھ جاتی۔ تمام امراء حاضر ہو کر کورنش بجالاتے تھے اور احکام سنتے تھے۔ سکے نور جہاں کے نام پر ڈھالے گئے تھے۔ اور سکے کا نقش یوں تھا۔ شعر

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور
بنام نور جہاں بادشاہ بیگم زر

فرامین شاہی کے طغریٰ پر یہ الفاظ نقش کیے گئے۔

"حکم علیہ العالیہ نور جہاں بیگم بادشاہ"۔ رفتہ رفتہ معاملات نے یہ شکل اختیار کر لی

کہ شہنشاہ جہانگیر کی بادشاہت نام کی رہ گئی شہنشاہ جہانگیر خود کہا کرتا تھا کہ "میں نے سلطنت نور جہاں کو بخش دی ہے مجھے تو ایک سیر شراب اور آدھ سیر گوشت کے علاوہ کچھ نہیں چاہیئے" [۱۵۰]
نور جہاں کو جہانگیر کے مزاج اور معاملات ملکی میں جو اثر و دخل تھا اس کی وسعت اور ہمہ گیری کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا باپ اعتماد الدولہ، اس کا بھائی آصف خاں۔ اعتقاد خاں اور امیر ابراہیم خاں کو جہانگیر سے نور جہاں کی شادی کے بعد کس تیز رفتاری سے عروج اور اقتدار حاصل ہوا۔ اعتماد الدولہ کا ۱۶۱۱ء میں ۲۰۰۰ + ۵۰۰ کا منصب تھا۔ وہ ۱۶۱۹ء میں ۷۰۰۰ (سات ہزار) + ۷۰۰۰ (سات ہزار) کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہوا [۱۵۱] آصف خاں ۵۰۰ + ۱۰۰

---

[۱۵۰] تزک جہانگیری۔ اردو ترجمہ سلیم واحد سلیم ص ۳۵ تا ۳۷ مرزا ہادی کا دیباچہ۔
مزید ملاحظہ ہو نور جہاں کے اثر و اقتدار کے لیے ص ۲۸۵ - ۲۸۹ - ۳۳۷ - ۳۶۵ - ۳۷۲ - ۳۹۸ - ۴۰۳ - ۴۰۷ - ۴۱۹ - ۴۲۴ - ۵۲۶ - ۵۴۴ - ۵۷۷ - ۶۷۰ - ۶۸۲ - ۶۸۷ - ۶۸۹ - ۶۹۴ - ۶۹۵ - ۷۰۱ - ۷۱۲ وغیرہ وغیرہ۔

[۱۵۱]

مزید ملاحظہ ہو تزک جہانگیری (اردو ترجمہ) سلیم واحد سلیم ص ص ۱۶۱ - ۲۱۹ - ۲۲۲ - ۲۳۸ - ۲۳۹ - ۲۴۶ - ۲۶۸ - ۲۷۹ - ۲۹۸ - ۲۹۹ - ۳۳۶ - ۳۳۸ - (اعتماد الدولہ کو شش ہزاری ذات و سہ ہزار سوار کے منصب سے ہفت ہزاری ذات و پنج ہزار سوار کے منصب پر بڑھا کر اسے نومن توغ (علم) عنایت کر کے حکم صادر کیا کہ آئندہ سے خرم کے بعد اس کے لیے نقارہ بجا کرے۔) ۳۷۵ (اس دن اعتماد الدولہ کو شرف محرمیت بخشتے ہوئے شاہی خواتین کو اس سے پردہ نہ رکھنے کا حکم دیا) ۳۹۷ - ۴۰۰ (اپنے سر کا دستار اتار کر اسی طرح بندھا بندھایا ہوا اعتماد الدولہ کے سر پر رکھ کر اسے غیر معمولی عنایت سے سرفراز کیا) ۴۰۶ - ۵۰۹ - ۵۴۴ (جہانگیر گھر گیا) ۵۴۹ (اپنے گھر میں جہانگیر کی دعوت کی اور تحفے تحائف پیش کیے جہانگیر کے الفاظ ہیں امراء عظام میں سے کسی نے بھی ایسا عمدہ پیش کش مرتب نہیں کیا ہے) ۵۵۱ - ۵۵۸ - ۵۸۹ - ۶۵۸ - ۶۵۸ - ۶۷۳ - ۶۸۹ - ۶۹۵ - ص ص - جہانگیر کی یہ اپنی تحریریں اعتماد الدولہ کے اثرات و اقتدار کو ظاہر کرتی ہیں۔

کے منصب سے ۵۰۰۰ + ۳۰۰۰[۱۵۲] (پانچ ہزار + تین ہزار) اعتقاد خاں کا ۲۰۰۰ + ۲۰۰۰ سے ۴۰۰۰ + ۱۰۰۰ (چار ہزار + ایک ہزار) اور ابراہیم خان کو فتح جنگ کا خطاب اور بہار کی گورنری عطا ہوئی ۔[۱۵۳]

اس کے علاوہ جہانگیر نے اعتماد الدولہ کو تومن توغ (علم عنایت کیا) اور خرم (شاہ جہان) کے بعد نقارہ بجانے کی اجازت دی جو اعلیٰ ترین اعزاز تھا یہ ترقیاں اور اعلیٰ عہدے اور

---

[۱۵۲] آصف خاں کے لیے مزید ملاحظہ ہو تزک جہانگیری (اردو ترجمہ) سلیم واحد سلیم ۔ ۲۹۸ ۔ ۳۳۵ (جلوس کے بعد گیارھویں جشن نوروز) کو آصف خاں کو چار ہزاری ذات و دو ہزاری ذات و دو ہزار سوار کے منصب میں ہزاری ذات و دو ہزار سوار کا اضافہ کر کے اسے نقارہ و جھنڈا عنایت کیا) ۳۳۷ (جہانگیر آصف خاں کے گھر گیا اور اس کے محل میں نصف روز تک مقیم رہا اور پیش کش قبول کیے) ۴۰۳ (مع بیس ہزار سوار کا اضافہ کر کے اسے پانچ ہزاری ذات و سوار کے منصب پر فائز کیا) ۱۱۰ (جہانگیر شاہی خواتین کے ساتھ آصف خاں کے گھر گیا وغیرہ) ۴۷۲ (آصف خاں کے پانچ ہزاری ذات و سہ ہزار کے منصب میں ایک ہزار سوار کا اضافہ کر کے اسے پانچ ہزاری ذات و چار ہزار دو اسپہ و سہ اسپہ سوار کے منصب پر بڑھایا) ۴۹۷ ۔ ۵۰۹ (جہانگیر نامہ کی ایک جلد مدار الملک اعتماد الدولہ اور دوسری آصف خاں کو عنایت کی) ۵۵۰ (آصف خاں کے گھر اہل محل کے ساتھ گیا اور اس کی تحفہ و تحائف کو قبول کیا) ۵۶۲ ۔ ۵۷۲ (آصف خاں کے گھر گیا اور پیش کش قبول کی) ۶۴۰ (وزن شمسی کا جشن آصف خاں کے گھر پر منایا) ۶۴۵ (صوبہ گجرات کا دیوان مقرر کیا) ۶۷۲ (اہل محل کے ساتھ آصف خاں کے گھر گیا اور تحفے قبول کیے) ۶۸۴ (آصف خاں کے گھر گیا اور حمام میں غسل کیا اور پیش کش قبول کیے) ۷۲۲ ۔ ۷۴۰ ۔ ۸۳۷ (وکیل السلطنت مقرر کیا) آصف خاں کے اثر اقتدار کو ظاہر کرتی ہیں ۔

[۱۵۳] ابراہیم خاں، نور جہاں کا بھائی اور اعتماد الدولہ (مرزا غیاث کا بیٹا) اور آصف خاں کا بھائی تھا اس کو بھی جہانگیر نے "فتح جنگ" کا خطاب دیا تھا اور بہار میں گورنر کے عہدے پر متعین کیا اس کو بھی جہانگیر کی قربت اور سرپرستی حاصل رہی ۔ دیکھئے تزک جہانگیری ص ۳۴۳ (صوبہ بہار کا گورنر مقرر کیا ۔ اس کے منصب میں اضافہ کر کے اسے چار ہزاری ذات و سوار کے منصب پر فائز کرتے ہوئے "فتح جنگ" کے خطاب سے نوازا ۔ ۳۷۱ ۔ (سفارش قبول کر کے راوت شنکر کے منصب (باقی بر صفحہ آئندہ)

جہانگیر کا یہ اعتماد اس بات کے شاہد ہیں کہ انہیں مملکت کے معاملات میں کس قدر اثر اور رسوخ حاصل ہو گیا تھا جو کسی دوسرے کو حاصل نہیں تھا پھر انہیں محض یہ اعلیٰ ترین مناصب وعہدے ہی حاصل نہ تھے بلکہ وہ جہانگیر کے نہایت ہی مقرب اور معتمد علیہ امراء بھی تھے اس کا مزید ثبوت اس سے ملتا ہے کہ جہانگیر نور جہاں کے باپ اور بھائی دونوں کے گھروں میں بطور مہمان قیام کیا کرتا تھا۔ اور حضرت مجدد رح کی دربار میں طلبی سے صرف ہفتہ قبل دو ہفتہ کے وقفہ سے جہانگیر باری باری باپ اور بیٹے یعنی اعتماد الدولہ اور آصف خاں کی دعوتیں قبول کرتا ہے۔ اور بطور مہمان ان کے گھروں میں قیام

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) میں اضافہ کیا۔) ۳۹۶ (بنگال کا گورنر مقرر کیا۔ ۴۰۲ (ہیروں کا ذکر جس میں ایک کی مالیت ایک لاکھ روپیہ تھی) ۴۲۰-۵۱۰-۵۶۱- (تلوار روانہ کیا) ۶۳۹ (ہیرا پیش کیا) ۶۶۲ (پیش کش) ۶۷۳ (موسم سرما کا خلعت روانہ کیا) ۶۳۹ (ابراہیم خاں فتح جنگ کے بھتیجے احمد بیگ کو اڑیسہ میں صوبہ دار مقرر کیا اور خاں کا خطاب دیا۔ ۶۸۷ (۴۳ ہاتھی جہانگیر کو پیش کیے) اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نور جہاں اور اس کے باپ اور بھائی کو جہانگیر کے عہد میں کس قدر عروج و اقتدار حاصل تھا اور نور جہاں کی معرفت شیعہ حضرات کے غلبہ و اقتدار کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ قاضی نور اللہ شستری جس نے "مجالس المومنین" نام کی ایک کتاب خفیہ تصنیف کی تھی اور اسے خفیہ ہی رکھا تھا جب اس کے مندرجات کا علم جہانگیر کو ہوا تو اس نے قاضی نور اللہ شستری صاحب کو ۱۶۱۰ء میں پھانسی کی سزا دی لیکن جب نور جہاں کی شادی جہانگیر سے ۱۶۱۱ء میں ہو گئی اور معاملات ملکی میں جب نور جہاں کو ہمہ گیر اقتدار اور غلبہ ہو گیا تو اس نے جہانگیر سے قاضی صاحب کے قتل کے متعلق گفت و شنید کی۔ جہانگیر نے یہ عذر پیش کیا کہ نشہ کی حالت میں مجھ سے یہ حکم حاصل کر لیا گیا تھا۔ نور جہاں نے ان علماء کو محل میں طلب کیا جنہوں نے قاضی صاحب کے خلاف شکایت کی تھی اور ان کی شکایت کی بنا پر قاضی صاحب کو قتل کیا گیا تھا۔ ان علماء کو شاہی محل میں جاتے ہوئے تو دیکھا گیا تھا۔ لیکن پھر انہیں شاہی محل سے واپس جانا نصیب نہ ہوا۔ ملاحظہ ہو (رود کوثر مصنفہ شیخ محمد اکرام صاحب ص ۳۵۰-۳۵۱ بحوالہ قاضی نور اللہ شستری کی سوانحعمری "صحیفہ نور" مولفہ سید حسین زیدی۔

کرتا ہے[۱۵۴]۔ بادشاہ کا کسی کی دعوت قبول کرکے اس کے یہاں جانا اور قیام کرنا ایک اعلیٰ ترین اعزاز تھا جو ان دولتوں حضرات کو حاصل تھا۔ اس قربت و اعلیٰ ترین اعزاز اور اعتماد جو

---

[۱۵۴] تزک جہانگیری ص ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۸۔ ۵۶۲۔

جمعرات ۸ ماہ فرور دیں کو مدار الملک اعتماد الدولہ نے اپنے گھر میں شاہانہ جشن کا اہتمام کرکے مجھ سے ضیافت قبول کرنے کی درخواست کی، جسے میں نے اس کی قدر افزائی کے لیے منظور کیا۔ اس نے مجلس کو آراستہ کرنے اور اپنی پیش کش کو بڑھانے چڑھانے میں بہت توجہ کی تھی۔ نزدیک و دور تالاب کے کناروں اور گلی کوچوں میں تاحد نگاہ قسم قسم کے فانوس اور چراغوں سے چراغاں کیا گیا تھا اس کی پیش کش میں چاندی کا ایک نفیس اور پر تکلف تخت بھی تھا جس کے پائے شیر کی شباہت پر بنائے گئے تھے گویا تخت کو اٹھائے ہوئے ہوں۔ یہ تین سال میں مکمل ہوا ہے اور اس پر ساڑھے چار لاکھ روپے خرچ ہوئے ہیں۔ بنانے والا جس نے اسے خوب بنایا ہے۔ ہنرمند نام کا ایک فرنگی ہے۔ جو زرگری۔ نگینہ سازی اور دیگر فنوں میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ ہنرمند کا خطاب میں نے دیا ہے۔ اعتماد الدولہ نے اس پیش کش کے علاوہ ایک لاکھ روپے کی مالیت کے ہتھیار اور دوسری نفیس اشیاء بیگمات اور دوسری اہل خواتین کو پیش کیں۔ یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ حضرت عرش آشیانی (شہنشاہ اکبر) کی سلطنت کے آغاز سے لے کر اب تک کہ میری سلطنت پر چودہ سال گزر چکے ہیں امراء عظام میں سے کسی نے بھی ایسی عمدہ پیش کش مرتب نہیں کی۔ فی الواقع دوسروں کو اس سے کوئی نسبت نہیں۔ (تزک جہانگیری ۵۴۹۔ ۵۵۰۔

جمعرات ۱۵ ماہ فروردیں کو آصف خاں نے اپنے گھر میں جو نفیس و دلکش مقام پر واقع ہے شاہانہ محفل اور جشن کا اہتمام کرکے مجھ سے ضیافت قبول کرنے کی درخواست کی میں اس کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے اہل محل کے ساتھ گیا۔ اس رکن السلطنت نے میری آمد کو عطیہ خداوندی سمجھتے ہوئے اپنی پیش کش کو بڑھانے چڑھانے اور مجلس کی رونق میں اضافہ کرنے کے لیے نہایت توجہ و انہماک سے کام لیا تھا۔ میں نے گراں بہا جواہرات زربفت کے پارچہ جات اور دیگر تحائف میں سے جو کچھ پسند آیا قبول کیا باقی اشیاء اس کو بخش دیں۔ قبول (باقی بر صفحہ آئندہ)

ان حضرات کو مملکت کے معاملات میں حاصل تھا اور جہانگیر کے دل و دماغ اور مملکت کی پالیسی پر نور جہاں اور یہ لوگ جس طرح چھا چکے تھے اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جہانگیر کوئی کام ان کی مرضی و مشورہ اور علم کے بغیر نہیں کر سکتا تھا۔ مملکت کے متعلق تمام معلومات انہی حضرات کی معرفت اس تک پہنچتی رہی ہوں گی اور مملکت کے معاملات میں جو بھی قدم اٹھایا گیا ہو گا وہ انہیں کے پیش کردہ معلومات اور حالات کی روشنی میں ہو گا اس لیے حضرت شیخ احمد سرہندی رح (حضرت مجددؒ) کی دربار میں طلبی اور قلعہ گوالیار میں قید کے معاملہ میں ان حضرات کا رول شک و شبہہ سے بالاتر نہیں ہے بلکہ قرائن۔ تاریخی واقعات اور حضرت شیخ احمد سرہندی رح کی اس دور کی تحریریں (خصوصیات سے جلد نمبر ۲ مکتوب نمبر ۱۵-۳۶-۶۷-۹۶ وغیرہ) اور گرفتاری کے بعد کے سیاسی حالات کے تجزیہ سے یہ یقین ہوتا ہے کہ یہی لوگ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کی دربار میں طلبی اور قلعہ گوالیار میں نظر بندی کے باعث ہوتے ہیں۔ کیونکہ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں حضرت شیخ احمد سرہندی رح کی تحریروں سے یہ بات واضح کی جاچکی ہے کہ ان کی کوششوں سے شیعہ حضرات کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کا نہ صرف سدباب ہو رہا تھا بلکہ معاشرے میں مثبت بنیادوں پر احیاءِ اسلام اور اتباعِ سُنّتِ نبویؐ اور نفاذ شریعت کی اسپرٹ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) کی ہوئی اشیاء میں سے ایک لعل بھی ہے اسے آصف خاں نے پچیس ہزار میں خریدا تھا قبول کردہ اشیاء کی مجموعی مالیت ایک لاکھ سڑسٹھ ہزار روپیہ تھی۔ (۱۶۷۰۰۰ روپیہ تھی)۔

روز شرف (۱۹ ماہ فروردین) اعتماد الدولہ کو سات ہزار (۷۰۰۰) ذات و سوار کے منصب پر بڑھایا۔ ص ۵۵۱۔

جمعرات ۱۲۔ اردی بہشت کو اعتماد الدولہ کے رشتہ دار قاسم خاں کو جھنڈا عنایت کر کے سرفراز کیا۔ ص ۵۵۸۔

جمعرات ۱۶ ماہ خورداد کو آصف خاں کو مرصع کھپوہ پھول کٹارہ سمیت عنایت کیا ص ۵۶۲۔

اس ڈیڑھ ماہ یعنی ۸ ماہ فروردین اور ۲۲۔ خورداد کے عرصہ میں جہانگیر کے قریب معزز ترین اور معتمد علیہ یہی امراء مملکت تھے اور شیخ احمد سرہندی رح ۲۲ خورداد ہی کو دربار میں طلب کیے جاتے ہیں ص ۵۶۳۔ اور قلعہ گوالیار میں قید کیے جاتے ہیں۔

بھی پیدا ہو رہی تھی اور اس کی زد براہ راست ان حضرات کے سیاسی اور اعتقادی غلبے اور اثرات دونوں پر پڑ رہی تھی اس لیے ان کے سیاسی اور اعتقادی مفاد کا تقاضا یہی تھا کہ وہ موقع ملتے ہی حضرت شیخ احمد سرہندی رح کی فعالیت اور قبولیت کو روکنے کے لیے اور اپنے مفادات اور اقتدار کے تحفظ کے لیے آپ کے خلاف قدم اٹھائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے نام نہاد مذہبی پیشواؤں اور صوفیاء خام کی بھی خدمات حاصل کی گئیں۔ یہ تمام لوگ اپنے مفاد کے پیش نظر حضرت شیخ احمد سرہندی رح کی مخالفت میں پیش پیش تھے اس لیے ان لوگوں نے ہی جہانگیر کو آپ کے خلاف ورغلایا۔ یہاں ایک بار پھر جہانگیر کا وہ بیان پیش نظر رہے جس کا اقتباس اس سے پہلے دیا جا چکا ہے اس کی ابتداء جہانگیر یوں کرتا ہے کہ:۔

"ان دنوں مجھ سے عرض کیا گیا کہ شیخ احمد سرہندی نامی۔۔۔۔۔۔۔۔۔[۱۵۵]

مجہول کا صیغہ ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ عرض کرنے والا یا عرض کرنے والے ہیں۔ وہ آخر کون ہو سکتے ہیں ؟

معلوم ہوا کہ حضرت شیخ احمد سرہندی رح کے خلاف یہ تمام باتیں اس کے مقربین اور مصاحبین ہی نے گوش گذار کی تھیں اور اسے آپ سے اس قدر بدگمان کر دیا تھا کہ وہ آپ کے تذکرے میں نہ اپنا ذہنی توازن برقرار رکھ سکا اور نہ ہی اپنے قلم کی عصمت اور شائستگی کا پاس و لحاظ رکھ سکا یہ تمام بے بنیاد باتیں پہنچانے اور بے سروپا الزام لگانے والے لوگ بہر حال وہ لوگ تھے جو بادشاہ کے معتمد علیہ اس کے مقرب اور مصاحب اور اس کی طرف سے حکومت کے معاملات کے نگران تھے اور جہانگیر نے انہیں کے مشورہ اور بہم کردہ معلومات کی بنا پر آپ کے خلاف یہ غیر ادبی زبان اور گستاخانہ الفاظ تحریر کیے۔

دربار میں طلبی گھٹیا سازش کا نتیجہ تھی:۔

یہ سارے امور اس بات کی صاف صاف غمازی کرتے ہیں کہ حضرت شیخ احمد سرہندی رح

---

[۱۵۵] تزک جہانگیری ص ۵۶۳۔

(مجدد رح) کی دربار میں طلبی اور قید و بند کی سزا محض سیاسی اسباب کی بنا پر ہوئی تھی اور اس مقصد کے لیے ایک ایسی عبارت کا سہارا لیا گیا تھا جو اٹھارہ، انیس سال قبل[۱۵۶] تحریر کی گئی تھی اور اصل مقصد و مدعا کچھ اور تھا نہ کہ انصاف اور اصلاح اور پس پردہ کوئی اور ذہنیت کام کر رہی تھی جو سراسر بغض، عناد، حسد اور انتقامانہ ذہنیت پر مبنی تھی یعنی دربار کے مقتدر اور با اثر امراء اور نام نہاد مذہب کے علمبردار آپ رح کی تحریک نفاذ شریعت کو کچلنا چاہتے تھے اور عامتہ المسلمین کو غلط اور بے بنیاد پروپیگنڈا سے برگشتہ کرنا تاکہ تحریک کی بڑھتی ہوئی مقالیت اور مقبولیت کو روکا جا سکے اور مذہب پسند طبقے میں آپ کے خلاف بدگمانی اور شکوک و شبہات پیدا کی جا سکے یہ ایک نہایت ہی گھناؤنی اور گھٹیا سازش تھی جو آپ رح کے دربار میں طلبی کے سلسلے میں اختیار کی گئی تھی اس کے پس پردہ کوئی بلند مقصد اور نصب العین کام نہ کر رہا تھا۔ آپ کا جرم سوا اس کے کچھ نہ تھا کہ آپ رح لوگوں کو احیاء اسلام اور ترویج شریعت کے لیے آواز دے رہے تھے اور اس آواز پر لبیک کہنے والوں کو قول اور عمل سے پابند شریعت بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے اور انہیں منظم کر کے ایک پاکیزہ معاشرے کے قیام کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔

ردِّ عمل:۔

حضرت مجدد رح کی دربار میں طلبی سے ان کے معتقدین و متاثرین پریشان و متفکر تھے اور مخالفین بہت ہی خوش و خرم ہوئے۔ معتقدین اس لیے پریشان تھے کہ جہانگیر بہر حال ایک مطلق العنان اور مغلوب الغضب حکمران تھا جو ہمیشہ شراب کے نشہ میں بدمست رہتا تھا اور خود قوت فیصلہ سے معذور اور حقیقی واقعات سے لاعلم تھا دوسرے یہ کہ بادشاہ کے مقربین اور مصاحبین کا بغض و عناد جو جہانگیر کو حضرت مجدد رح کے خلاف ورغلا

---

۱۵۶ اشارہ ہے مکتوب نمبر ۱۱ جلد اول جو اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ کو ۱۵۹۹ء تا ۱۶۰۳ء کے درمیان غالباً ۱۶۰۱ء میں لکھا ہو گا۔

چکے تھے اور جہانگیر کے ذہن و فکر پر اس طرح حاوی ہو گئے تھے کہ جہانگیر انہیں کی آنکھوں سے دیکھنے اور انہیں کے ذہن و فکر سے غور کرنے لگا تھا۔ اس لیے خطرہ تھا کہ چونکہ جب یہ طلبی ہی سراسر نہایت گھناؤنے مقاصد سے ہوئی ہے اس لیے جہانگیر کا رویہ اور سلوک نہ صرف نازیبا بلکہ سراسر حق و انصاف کے خلاف ہو گا۔

اس کے برعکس مخالفین اور حاسدین بہت ہی خوش تھے کہ بہر حال جب وہ بادشاہ کو حضرت مجدد رح کی اٹھارہ[18] انیس[19] سال قبل کی تحریر پر اتنا کچھ باور کرا چکے ہیں تو اس کے بعد حسب منشاء جو کچھ چاہیں گے ان کے خلاف فیصلہ بھی حاصل کر ہی لیں گے۔ معتقدین اور مخالفین دونوں کو یہ یقین تھا کہ آپ دربار کے مروجہ آداب کے برعکس بادشاہ کو سجدہ نہیں کریں گے[۱۵۷] آپ کے اس فعل سے نہ صرف دربار کی مروجہ آداب و تعظیم مجروح ہوں گی بلکہ جہانگیر کی انانیت کو بھی عملاً ٹھیس لگے گی اس لیے اس کا غیظ و غضب میں آجانا عین ممکن تھا۔ اسی لیے معتقدین متفکر تھے اور کہا جاتا ہے کہ شاہ جہان جو آپ کا معتقد تھا اس نے یہ اطلاع کرائی تھی کہ علماء نے بعض فقہی کتب کے حوالہ سے بادشاہ کے لیے سجدہ تحیت کو جائز قرار دیا ہے اس لیے آپ بھی بادشاہ کو ملاقات کے وقت سجدہ کریں۔ اس کے بعد میں ذمہ لیتا ہوں کہ آپ کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔[۱۵۸] لیکن حضرت مجدد رح جو عزم و حوصلہ کے پہاڑ اور استقلال کے مضبوط چٹان تھے اور جو "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ مستیز" کے طریق پر عامل تھے ان پر دربار سے طلبی اور متوقع خطرات سے ذرا بھی خوف و ہراس طاری نہیں ہوا بلکہ نہایت

---

۱۵۷ مکتوبات امام ربانی جلد دوم مکتوب نمبر ۹۲ ص ۱۷۱ سجدہ جو پیشانی کو زمین پر رکھنے سے مراد ہے اس میں نہایت ذلت و انکسار اور کمال تواضع و عاجزی ہے اسی واسطے اس قسم کی تواضع حق تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ مخصوص ہے اس کے سوا کسی اور کے لیے جائز نہیں، یہ خط یعنی مکتوب نمبر ۹۲ میر محمد نعمان کے بعض سوالوں کے جواب میں لکھا گیا ہے اس میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ "بادشاہوں کے لیے سجدہ تحیت کا کیا حکم ہے"

۱۵۸ محمد فرمان۔ حیات مجدد ص ۲۴۳۔

ہی عزم اور حوصلہ سے اس موقع کو خوش آمدید کہا اور پروقار انداز میں متانت اور خوداعتمادی کے ساتھ جہانگیر کے دربار میں سادگی کے ساتھ شاہی تعظیم و آداب کے پرتکلف اور مصنوعی طریقے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے حاضر ہوئے۔

الزامات کی صفائی میں بیان :۔

دربار میں طلبی کا مقصد متنازعہ[۱] عبارت پر عائد کردہ الزامات کی جوابدہی ظاہر کی گئی تھی اس لیے اس عبارت پر آپ سے جواب طلب کیا گیا........ آپ رح نے اس عبارت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"کہ جس طرح سے اہل سنّت کے نزدیک اگر کوئی شخص حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر سمجھے تو وہ اہل سنّت والجماعت سے خارج ہو جاتا ہے اسی طرح صوفیاء کے گروہ میں اگر کوئی شخص اپنے کو کتّے سے بھی بہتر سمجھے جو خبیث ترین مخلوق ہے تو وہ صوفی نہیں رہتا۔ کسی صوفی کی کیا مجال کہ وہ اپنے کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر سمجھے۔ مکتوب میں جو کچھ درج ہے اس کا تعلق صوفیانہ مقامات سلوک کے اس سیر و عروج سے جو انہیں اپنے مرشد کامل اور پیر و مرشد کی توجہ کی بدولت میسر آتا ہے اس کے علاوہ وہ ان مقامات سلوک کے عروج تک پہنچا صوفیوں کو گھڑی بھر کے لیے میسر آتا ہے۔[۲]

---

۱ متنازعہ عبارت سے مکتوب یازدہم جلد اول کی عبارت ہے جس پر پچھلے صفحات میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

۲ مکتوب یازدہم جلد اول کی متنازعہ عبارت پر حضرت مجدّد رح کی نقطہ نظر کو سمجھنے کے لیے آپ رح کے مکتوبات جلد اول مکتوب نمبر ۱۹۲-۲۰۲-۲۵۱-۲۶۶-اور جلد دوم مکتوب نمبر ۱۵-۳۶-۶۷-اور ۹۶ کو بھی پیش نظر رکھا جائے ان مکتوبات کے مطالعہ سے حضرت مجدّد رح کے اپنے الفاظ میں خلفاء راشدین اور صحابہ کرام کے بارے میں آپ رح کے خیالات معلوم ہوتے ہیں۔

بالکل اسی طرح جیسے شاہی دربار میں جہاں نامدار امراء اور مقربین کو شب و روز قرب و حضوری حاصل ہے۔ بادشاہ ضرورتاً یا مصلحتاً اپنے کسی عاجز لشکری کو طلب کر کے گھڑی بھر کے لیے اس سے ہمکلام ہوتا ہے اور پھر اسے لشکر میں اپنے مقام پر واپس بھیج دیتا ہے اس وقتی قربت سے جو اس لشکری کو حاصل ہوا اس کا درجہ امراء، وزراء اور مقربین شاہی سے تو نہیں بڑھ جاتا۔ سیر مقامات کے سلسلے میں ہم لوگوں کے عروج کا بھی یہی حال ہے۔ میں بھی ان مقامات سے گھڑی بھر کے بعد دنیوی حال میں واپس آیا ہوں تو اپنے کو خستہ و پوشیدہ گھر سر ہند میں پاتا ہوں اس سے کہاں ظاہر ہوتا ہے کہ میرا مرتبہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے بڑھ گیا ہے۔ مکتوب میں میرا لکھنا کہ میں نے اپنے آپ کو مقام محبوبیت کی روشنی اور رنگینی سے متعلق پایا تو اس سے یہ مفہوم نہیں نکلتا کہ میں اس مقام میں وارد ہوا۔ زمین روز سورج کی ضیاء سے روشن ہوتی ہے۔ لیکن یہ تو نہیں سمجھا جاتا کہ زمین سورج کے مقام پر پہنچ گئی ہے ؎[159]

اشتعال انگیزی:۔

حضرت مجدد رح کی یہ تشریح و توضیح نہایت ہی واضح اور تشفی بخش تھی اس میں کسی قسم کا ابہام نہیں تھا۔ اس لیے جہانگیر بھی بظاہر مطمئن ہو گیا اور حضرت مجدد رح کو لطف و کرم کے ساتھ رخصت کرنا چاہا لیکن حضرت مجدد رح کی اس وضاحت سے مقتدر امراء، درباری علماء اور خوشامدی عاملین حکومت جنہوں نے آپ کے خلاف یہ تمام جال پھیلایا تھا وہ کب مطمئن ہونے والے تھے بلکہ جہانگیر کے رویے سے انہیں اپنے مقاصد میں ناکامی ہوتی نظر آئی اس لیے دوبارہ جہانگیر کی انانیت کو بھڑکاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھئے یہ شخص کیسا متکبر اور

---

۱۵۹ تزک جہانگیری اردو ترجمہ ۵۶۳-۴ ص ماخذ از حاشیہ سلیم واحد سلیم و حیات مجدد۔ مصنفہ محمد فرمان ص ۲۵ تا ۲۷۔

خود پسند ہے کہ اس نے آپ کو سجدہ تعظیمی نہیں کیا حالانکہ آپ ظل اللہ اور خلیفہ الٰہی ہیں اور علماء نے آپ کے لیے سجدہ تعظیمی جائز قرار دیا ہے۔ مزید برآں اندرونی طور پر امراء مملکت میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا کر بغاوت کی تیاری کر رہا ہے۔ جہانگیر کی یہ نہایت ہی دکھتی رگ تھی۔ اس کو حضرت مجدد رح کی یہ شانِ بے نیازی ناگوارِ خاطر محسوس ہوئی ہوگی اور یہ اس کے لیے ایک قدرتی اور فطری امر تھا کیونکہ اس کے ارد گرد ایسے درباری امراء، علماء دنیا اور صاحب غرض بندوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی جو شرف آدمیت، ضمیر، غیرت اور خودداری کو بالائے طاق رکھ کر محض حصولِ خوشنودی اور بادشاہ کا تقرب اور منفعت حاصل کرنے کے لیے اسے سجدہ تک کیا کرتے تھے جو ایک ننگِ انسانیت فعل تھا۔ اس لیے ایسے ماحول اور ایسی فضاء میں جہاں اعلیٰ انسانی ظرف، ضمیر، خودداری اور غیرت و حمیت کا نقدان ہو اور ایک شخص محض اپنی دنیاوی جاہ و منصب اور دولت و امارت کے نشہ میں خود رفتہ ہو کر لوگوں کے سروں کو جھکوانے میں اپنے نفس کی انا کو تسکین دیتا ہو اس کو بہر حال حضرت مجدد رح کے رویے سے غضبناک ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے حضرت مجدد رح کو دربار کے مروجہ طریقے کے مطابق سجدہ بجالانے کا حکم دیا گیا اور مفتی عبدالرحمان جن کا شمار اکابر علماء وقت میں ہوتا تھا انہوں نے فتویٰ بھی دیا کہ اس وقت سجدہ کرنا جائز ہے اس لیے کہ جان بچانا فرض ہے[۱۶۰] لیکن آپ رح نے دربار کے مروجہ، مشرکانہ اور کافرانہ آداب کو بجالانے سے سختی سے انکار کیا[۱۶۱]

۱۶۰ھ حیات مجدد۔ محمد فرمان ص ۲۲۔

۱۶۱ھ حضرت مجدد رح کی بادشاہوں کو سجدہ تحیت کے سلسلے میں ایک واضح اور مثبت تحریر موجود ہے اس سلسلے میں میر محمد نعمان کو مکتوب نمبر ۹۲ جلد دوم میں لکھتے ہیں کہ "سجدہ جو پیشانی کو زمین پر رکھنے سے مراد ہے اس میں نہایت ذلت وانکساری اور کمال تواضع و عاجزی ہے۔ اسی واسطے اس قسم کی تواضع حق تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ مخصوص ہے اس کے سوا کسی اور کے لیے جائز نہیں۔ .... خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو سجدہ جائز نہیں اگر حق تعالیٰ کے سوا کسی غیر کو سجدہ جائز ہوتا تو میں عورتوں کو کہتا کہ مردوں کو سجدہ کریں۔ جلد دوم مکتوب ۹۲ ص ۲۷۲۔

اور کہا کہ بادشاہ کو سجدہ کرنے کے سلسلے میں علماء کا فتویٰ کمزوروں اور معذوروں کے لیے ایک اجازت اور رخصت ہے۔ لیکن عزیمت اور اتباع سُنّتِ نبوی کا یہ تقاضا ہے کہ خدائے عزوجل کے سوا کسی دوسرے کو سجدہ نہ کیا جائے۔ اسلامی شریعت کی اسپرٹ یہ ہے کہ تمام انسان اللہ کی مخلوق ہیں اور ان کے درمیان پیدائش۔ عہدے اور مرتبے کی حیثیت سے کوئی فرق نہیں وہ قانون خداوندی کے نزدیک مساوی ہیں اس لیے انسان خواہ کتنا ہی عظیم اور اعلیٰ عہدے اور منصب پر ہی کیوں نہ ہو اس کے آگے سر جھکانا یا اس کو تعظیمی سجدہ کرنا قطعی درست نہیں آپ رح نے محض اس کی تلقین نہیں کی بلکہ عملاً جہانگیر کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ [۱۶۲]

جہانگیر کا غیظ و غضب:۔

حضرت مجدد رح کے سجدہ کے انکار سے جہانگیر کی انانیت کو زبردست ٹھیس لگی ہوگی اس نے کبھی یہ تصور و گمان بھی نہ کیا ہوگا کہ کوئی اللہ کا بندہ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو اس کے دربار کے مروجہ سجدہ تعظیمی کے ادا کرنے سے انکار کر سکتا ہے۔ اب تو آپ کا یہ فعل حکومت کے لیے وقار کا مسئلہ بن گیا۔ لیکن آپ رح کا یہ فعل سراسر شریعت کے اتباع پر مبنی تھا۔ اس میں نہ کسی کی مخالفت تھی اور نہ مخاصمت، نہ کسی کی توہین نہ کسی کی دل آزاری نہ اہانت، یہ تو

---

[۱۶۲] بادشاہوں کو سجدہ تحیت کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ بعض فقہاء نے اگرچہ بادشاہوں کے لیے سجدہ تحیت یعنی سجدہ تعظیم جائز رکھا ہے۔ لیکن بادشاہوں کے لیے بھی مناسب ہے کہ اس امر میں حق تعالیٰ کی بارگاہ میں تواضع کریں اور اس قسم کی ذلت و انکساری حق تعالیٰ کے سوا کسی غیر کے لیے پسند نہ کریں۔ حق تعالیٰ نے تمام جہان کو ان کے تابع اور ان کا محتاج بنایا ہے اس نعمت کا شکر بجا لا کر اس قسم کی تواضع کو جس سے کمال عجز و انکسار ظاہر ہوتا ہے حق تعالیٰ کی بارگاہ کے ساتھ مسلّم رکھیں اور اس امر میں کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ بنائیں۔ جلد دوم مکتوب ۹۲ ص ۲۷۲۔

محض شریعت کی پاسداری تھی۔ اس لیے آپ رح نے تمام مروجہ آداب و تعظیمات جو شریعت کی خلاف ورزی پر مبنی تھے ان کی پابندی سے انکار کر کے بادشاہ کے نفس اور انا کو ضرور ٹھیس پہنچائی اور غالباً یہی وجہ ہے کہ حضرت مجددؒ رح کے اس فعل سے اس کی خود پسندی اور انانیت بری طرح مجروح ہوئی اور وہ اپنے اندرونی کرب و بے چینی اور غم و غصہ کی کیفیت کو اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکا چنانچہ اپنے اندرونی اضطراب و شکست خوردگی کے احساس ہی کو چھپانے کے لیے حضرت مجددؒ رح کو "بے عقل" و "کم فہم" ہونے کے علاوہ "مغرور" اور "خود پسند" قرار دیتا [۱۶۳]۔ حالانکہ آپ رح کے جس فعل کو جہانگیر بے عقلی، کم فہمی، غرور اور خود پسندی سے تعبیر کرتا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ نے محض اتباع سنت اور شریعت کی تعلیم کو سربلند کرنے اور انسان کے اعلیٰ ظرف و خودی کے تحفظ و سربلندی کے لیے بلا خوف و خطر اپنی جان کی بازی لگا کر ایک متکبر، خود پسند، خودسر، مطلق العنان اور جابر حکمران کی خوشنودی اور جان بخشی حاصل کرنے کے لیے ایسا فعل کرنے سے انکار کر دیا جو شریعت کے احکام کی کھلم کھلا خلاف ورزی پر مبنی تھا اور آپ کا یہی فعل جہانگیر کے طبع نازک پر ناگوار خاطر گزرا اور اس نے آپ رح کو قلعہ گوالیار میں قید کرنے کے لیے ایک ہندو امیر انی رائے[ع] سنگھ دلن کے حوالہ کیا تاکہ آپ کو

---

[۱۶۳] تزک جہانگیری ص ۵۶۴۔

ع انی رائے سنگھ دلن، جہانگیر کے معتمد علیہ امرائے مملکت میں سے تھا کیونکہ جہانگیر مرزا رستم کو پانچ ہزاری ذات و سوار کے منصب پر فائز کر کے اسے مدد خرچ کے طور پر دو لاکھ روپیہ دیے اور ٹھٹہ کا صوبیدار بنایا تھا۔ لیکن جب اس سے ناخوش ہوا اور معزول کیا تو انی رائے سنگھ دلن کے سپرد کیا تاکہ اس کے اعمال کی اچھی طرح سے تحقیقات کرے۔ ص ۲۸۱۔ تزک جہانگیری۔

خسرو جس نے باقاعدہ جہانگیر کے خلاف بغاوت کی تھی اس کو بھی جہانگیر نے پہلے انی سنگھ دلن ہی کے حوالہ کیا تھا بعد میں بعض مصلحتوں کی بنا پر آصف خاں کے حوالہ کیا ص ۳۵۴۔

مرزا حکیم کے پوتے ہرمز اور ہوشنگ بھی انی سنگھ دلن ہی کی نگرانی میں قلعہ گوالیار میں بند کیے گئے تھے۔ ص ۶۷۵۔ کشتواڑ کے راجہ کتور سنگھ کو اس کی نگرانی میں قلعہ گوالیار (باقی بر صفحہ آئندہ)

قید میں رکھے چنانچہ[۱۶۴] آپ کو قلعہ گوالیار میں ایک غیر معینہ مدت کے لیے قید کرا دیا گیا[۱۶۴]

سجدہ سے انکار کی اہمیت :۔

حضرت مجدد رح کا سجدہ نہ کرنا بظاہر ایک معمولی واقعہ معلوم ہوتا ہے لیکن آپ نے شریعت کی پاسداری اور انسانیت کے وقار اور سربلندی کے لیے جو جرأت مندانہ قدم اٹھایا تھا اس نے لوگوں کی ضمیر و غیرت کو جھنجھوڑنے کے لیے ایک تازیانہ کا کام کیا۔ لوگوں میں غیرت و حمیت کی چنگاری بھڑک اٹھی اور آپ کے ایک ہی وار سے برسوں کی اس کافرانہ اور غیر اسلامی شعائر و آداب کی جڑیں اکھڑنی شروع ہو گئیں اور دربار میں جہاں خوشامدیوں اور خواہش کے بندوں کا مجمع تھا اور جن کی خوشامدانہ باتوں نے جہانگیر کے نفس کو موٹا کر دیا تھا ان کے لیے آپ کا یہ فعل ایک درس عبرت تھا اور شریعت اسلام کے علمبرداروں کو آپ نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) میں بند کیا گیا تھا۔ ۱۳ ص۔

اس کے علاوہ جہانگیر انی سنگھ پر اتنا مہربان تھا اس کو سو مہر طلائی کی قیمت کا ایک گھوڑا عطا کیا تھا۔ ص ۴۷۴ اور حضرت مجدد رح کو حوالہ کرنے سے صرف ایک ماہ پندرہ دن قبل یعنی سن جلوس کے چودھویں سال میں ۸ ماہ فروری میں کو دو ہزاری ۲۰۰۰ ذات و ہزار و شش صد (۱۶۰۰) سوار کے مناصب عطا کیے تھے۔ تزک۔ ص ۵۵۰۔

جہانگیر جس سے ناخوش ہوا یا جس نے اس کے خلاف بغاوت یا سرکشی اختیار کی ان تمام کو انی سنگھ دلن ہی کے حوالہ کیا اور ہر مرتبہ اُسے مزید انعامات و مناصب سے نوازا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انی سنگھ دلن جہانگیر کا بہت ہی وفادار معتمد علیہ آدمی تھا۔ اسی لیے حضرت مجدد رح کو بھی اس کے سپرد کیا اور اسے یقین تھا کہ ایک طرف تو انی سنگھ دلن اس کا وفادار ہے دوسرے ہندو بھی ہے اس لیے اس کو حضرت مجدد رح کی ذات یا تحریک سے کوئی دلچسپی نہیں ہو گی بلکہ وہ جہانگیر کی خوشنودی کے لیے اور اپنے مفاد کے پیش نظر آپ پر کڑی نگاہ رکھے گا اور کسی قسم کی مراعات وغیرہ نہیں مل سکے گی۔

[۱۶۴] تزک جہانگیری ص ۵۶۴۔

عزم و حوصلہ، ہمت و جرأت اور استقلال و ثبات کا ایسا درس دیا کہ ان کے سامنے دنیا کی یہ تمام جاہ و منزلت، دولت اور امارت بے حقیقت معلوم ہونے لگی۔ آپ کی یہ روش مسلمانوں کے تنِ مردہ میں ایک حیات آفریں روح بن کر سرایت کر گئی اور رفتہ رفتہ لوگوں کی خودی، غیرت اور حمیت دینی بیدار ہونا شروع ہوئی اور لوگ سجدہ تعظیمی کو نہ صرف خلافِ شریعت سمجھنے پر مجبور ہوئے بلکہ ان میں یہ حوصلہ اور جذبہ بھی پیدا ہوا کہ وہ اس کو بجا لانے سے انکار کریں رائے عامہ کی روز افزوں بیداری ہی کا نتیجہ تھا کہ شاہ جہاں کے عہد میں سجدہ کے رواج کو منسوخ کیا گیا[۱۶۵] اور عہد عالمگیری میں ہر صورت میں سجدہ تعظیمی، زمین بوس، اور چہار تسلیم موقوف ہو گیا اور درباری آداب کا یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ لوگ اسلام کی تعلیمات کے مطابق بآوازِ "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ اور وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہیں اور کسی قسم کے اشارے وغیرہ سلام کے لیے نہ کریں۔ اس طرح کافرانہ اور سراسر مشرکانہ طریقہ آداب بالکل ختم ہو گیا اور اس کی جگہ اسلامی شعائر آداب کو اختیار کیا گیا۔ یہ تبدیلی اس لیے ممکن ہوئی کہ ایک طرف تو آپ کی تعلیمات اور دوسری طرف آپ کے عمل نے مسلم رائے عامہ کو بیدار کیا کہ اسلامی آداب و تعظیم کیا ہے اور مسلمانوں کے اسی احساس و شعور کی وجہ سے حکمرانوں کو اپنی پالیسی تبدیل کرنی پڑی اس واقعہ کی اہمیت و اثرات و نتائج کو علامہ اقبال یوں پیش کرتے ہیں ؎

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان !
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار !

دورِ ابتلاء:۔

حضرت مجددؒ کی دربار میں طلبی اور متنازعہ عبارت پر سیر حاصل گفتگو سے یہ بات

---

۱۶۵ خانی خان۔ منتخب اللباب حصہ دوم ص ۱۹ اردو ترجمہ۔

واضح ہو گئی کہ اس ڈرامے کے پس پشت مخالفین اسلام کے کچھ اور ہی مقاصد تھے۔ وہ تو غالباً آپؒ کے قتل کے درپے تھے لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی تو کم از کم قید تو کرا ہی دیا اور جبر و تشدد اور سختی سے ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ خوفزدہ ہو کر لوگوں کی دلچسپیاں آپ کی تحریک سے ختم ہو جائیں اور انہیں یہ یقین تھا کہ حضرت مجددؒ رحمۃ اللہ علیہ قید و بند سے ان کی تحریک نیم جان ہو جائے گی۔ اور وہ خود قید کی صعوبتوں اور تکالیف سے دل گرفتہ ہو جائیں گے اور ان کی ہمت پست ہو جائے گی اور حوصلے جواب دے دیں گے۔ لیکن حضرت مجددؒ رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر نفاذِ شریعت کا اعلیٰ مقصد اور نصب العین تھا جس کے حصول کے لیے انہوں نے اپنے دل و دماغ کی تمام صلاحیتیں وقف کر رکھی تھیں وہ راہِ حق میں ان ابتلاؤں و آزمائش سے نہ تو خوفزدہ ہوتے ہیں اور نہ انہیں کوئی اذیت اور تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ انہیں قید و بند کی سزا، مال و متاع کی ضبطی اور اہل و عیال اور اعزا اقارب سے اس لیے جدا کیا گیا کہ انہیں پسندیدہ اور مرغوب اشیاء کی جدائی سے اذیت اور تکلیف ہو۔ لیکن وہ اس صورت حال پر مطمئن اور قانع نظر آتے ہیں۔ انہیں کسی تکلیف اور رنج کا احساس نہیں ہوتا بلکہ اس واقعہ سے وہ ایک خاص ذہنی سرور اور لذت کی کیفیت محسوس کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو کسی بلند اصول، نظریے اور عقیدے پر محض زبان ہی سے ایمان نہیں رکھتے بلکہ ان میں اس کو سربلند کرنے کا حوصلہ و داعیہ بھی ہوتا ہے اور اس کے لیے جد و جہد بھی کرتے ہیں تو وہ اس راہ کی تمام موانع اور مصائب و آلام کا روزِ اول ہی سے احساس رکھتے ہیں اور جب یہ آن پڑتی ہیں تو اسے نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں اور اس میں وہ ایک روحانی سرور و بالیدگی محسوس کرتے ہیں البتہ وہ حضرات جو اصول، نظریہ اور عقیدہ کی حقیقی طاقت اور قوت سے ناآشنا ہوتے ہیں اور محض دنیاوی لذت عیش و عشرت اور جاہ و مرتبہ اور حصول و منصب کو ہی حقیقی مقصد حیات سمجھتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے مخالفوں کو ان دنیاوی آسائش و آرام سے محروم کر کے جبر و تشدد کے مظاہرہ اور قید و بند کی صعوبت میں مبتلا کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے کامیابی حاصل کر لی اور مخالف کو ناکام کر دیا ہے۔ غالباً اسی اصول و نظریہ کی بنیاد پر حضرت مجددؒ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا اور محسوس کیا گیا کہ وہ ان مصائب و

تکالیف سے مجبور ہو کر اپنے رویے سے باز آجائیں گے اور ان کے متاثرین اور معتقدین حکومت کے عتاب سے خوفزدہ ہو کر ساتھ چھوڑ دیں گے۔

روحانی انبساط اور سکون قلب کا اظہار:۔

حضرت مجددؒ کے مخالفین اور معاندین نے جن مقاصد کے تحت جہانگیر کو ورغلا کر آپ کو قید کرایا تھا۔ وہ مقصد ان کا پورا نہیں ہوتا کیونکہ قید و بند، مال و جائیداد کی ضبطی اور معاندانہ پروپیگنڈہ سے حضرت مجددؒ پر نہ خوف و ہراس طاری ہوتا ہے اور نہ پریشان و متفکر ہوتے ہیں بلکہ اطمینان و سکون قلب کے ساتھ اس صورت حال کا حوصلہ و عزم کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں اور قلعہ گوالیار میں نظر بندی کے دوران اپنے بیٹے خواجہ محمد معصومؒ کو ایک نہایت ہی فکر انگیز خط تحریر کرتے ہیں جس کے ہر ہر لفظ سے روحانی انبساط اور دلی سرور کا پتہ چلتا ہے اور کہیں تلخی اور نامرادی کا تصور دور دور تک نظر نہیں آتا۔ لکھتے ہیں کہ:۔

"حمد ہے اللہ تعالیٰ کی جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے، راحت میں بھی اور مصیبت میں بھی، فراخی میں بھی اور تنگی میں بھی، آرام میں بھی اور تکلیف میں بھی، رحمت میں بھی اور زحمت میں بھی، سختی میں بھی اور نرمی میں بھی عافیت میں بھی اور آزمائش میں بھی اور صلوٰۃ و سلام اس ذات مقدس پر جس کے برابر کسی نبی کو ایذا نہیں پہنچائی گئی اور جس کے مثل کسی رسولؐ کی آزمائش نہیں ہوئی۔

فرزندان گرامی! ابتلاء و آزمائش اگرچہ تلخ و بے مزہ ہے لیکن اگر خدا کی طرف سے اس کا موقع ملے تو بہت غنیمت ہے اس وقت چونکہ خدا نے تم کو فرصت دی ہے اس لیے اس کا شکر بجالاؤ اور اپنے کام میں متوجہ رہو اور ایک لمحہ و لحظہ اپنے لیے فراغت جائز نہ سمجھو اور تین باتوں سے ایک میں ضرور مشغول رہو۔ قرآن مجید کی تلاوت کرو۔ لمبی قراءت کے ساتھ نماز ادا کرو اور کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کا تکرار کرتے رہو............ فرصت

غنیمت ہے۔ فتنہ کے زمانے میں تھوڑے کام کو بہت اجر کے عوض قبول کر لیتے ہیں اور فتنہ کے زمانے کے سوا سخت ریاضتیں اور مجاہدے درکار ہیں...... .... شاید ملاقات ہو یا نہ ہو یہی نصیحت ہے کہ کوئی مراد اور ہوس نہ رہے اپنی والدہ کو بھی اس امر پر اطلاع دے دو اور اسے اس پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دو باقی اس زندگانی کے احوال چونکہ گزر جانے والے ہیں اس لیے کیا بیان کیا جائے............. اس وقت کو بیہودہ امور میں ضائع نہ کرو اور ذکر الٰہی کے سوا کسی کام میں مشغول نہ ہو........ ...... اب کتابوں کے مطالعہ اور طلباء کے مذاکرے کا وقت نہیں ہے اب ذکر کا وقت ہے۔ تمام نفسانی خواہشوں کا جو جھوٹے خدا ہیں لا کے نیچے لاکر سب کی نفی کرو اور کوئی مراد و مقصود سینے میں نہ رہے۔ حتّٰی کہ میری رہائی بھی جو کہ تمہارے لیے نہایت ضروری ہے۔ تمہاری مراد و مطلوب نہ ہو۔ اور حق تعالےٰ کی تقدیر اور فعل و ارادہ پر راضی رہو.......... حویلی اور سرائے۔ چاہ اور باغ، کتابوں اور اشیاء دیگر کا غم سہل ہے۔ ان میں سے کوئی چیز تمہارے وقت عزیز کی مانع نہ ہو اور حق تعالیٰ کی مرضیات کے سوا تمہاری کوئی مراد و مرضی نہ رہے۔ ہم اگر مر جاتے تو یہ چیزیں بھی چلی جاتیں۔ بہتر ہے کہ ہماری زندگی ہی میں چلی جائیں تاکہ کوئی فکر نہ رہے، اولیاء اللہ نے ان امور کو اپنے اختیار و ارادہ سے چھوڑا ہے ہم حق تعالیٰ کے ارادہ و اختیار سے ان امور کو چھوڑ دیں اور شکر بجالائیں.............. جہاں تم بیٹھے ہو اسی کو اپنا وطن خیال کرو۔

نوٹ:۔ خط کشیدہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ قید غیر معینہ وقت کے لیے تھی اس لیے یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ "ملاقات ہو یا نہ ہو"

نوٹ:۔ ہدایت دیتے ہیں کہ "میری رہائی تمہاری مراد و مطلوب نہ ہو" دوسرے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جائیداد اور کتب وغیرہ اشیاء ضبط ہو گئی تھیں۔

چند روزہ زندگی جہاں گزرے یادِ حق میں گزرے۔ دنیا کا معاملہ آسان ہے۔ اس کو چھوڑ کر آخرت کی طرف متوجہ رہو اور اپنی والدہ کو تسلی دو اور آخرت کی ترغیب دو۔ باقی رہی ایک دوسرے کی ملاقات اگر خدا تعالیٰ کو منظور رہا تو ہو کر رہے گی۔ ورنہ اس کی تقدیر پر راضی رہو اور دعا کرو کہ دار السلام میں سب جمع ہوں اور دنیاوی ملاقات کی تلافی کو اللہ تعالیٰ کے کرم سے آخرت کے حوالہ کریں۔ الحمد للہ علیٰ کل حال (ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی حمد ہے۔) ۱۶۶

ایک اور مکتوب :۔

قلعہ گوالیار ہی سے ایک دوسرے خط میں میر محمد لقمان کو اپنے واقعہ کے ردِعمل پر حمد و ثناء کے بعد یوں اظہار کرتے ہیں کہ :۔

"پوشیدہ نہ رہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے جو اس کے جلال و غضب کے رنگ میں ظاہر ہوتی ہے قفسِ زندان میں محبوس نہیں ہوا تھا۔ اور ایمان شہودی کی راہ تنگ سے بالکلیہ آزاد نہیں ہوا تھا اور سایہ ہائے خیال و مثال کے کوچوں سے پوری طرح باہر نہیں نکلا تھا اور قادرِ مطلق کے غیب پر ایمان رکھنے کی شاہراہ پر چلنے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی تھی اور حضور سے غیب میں، عین سے علم میں اور شہود سے استدلال میں پوری طرح داخل نہیں ہوا تھا۔ دوسروں کے ہنر کو عیب اور ان کے عیب کو ہنر کمال ذوق اور وجدانِ صحیح کے ساتھ نہ سمجھ پایا تھا اور بے ننگی و بے نامی کا خوشگوار شربت اور خواری و رسوائی کا خوش ذائقہ مربّہ نہ چکھا تھا اور خلقِ خدا کی ملامت و طعنہ زنی کے جمال سے لطف اندوز اور لوگوں کے جفا و بلا کے حسن سے محظوظ نہ ہوا تھا اور مردہ بدست زندہ پیکر اپنے ارادہ اختیار سے بالکلیہ

---

۱۶۶ مکتوبات امام ربانی رح جلد سوم مکتوب ۲۔ ص ۷۔ ۹۔

دستبردار نہ ہوا تھا اور آفاق و انفس سے تعلق کے تمام رشتے بالاہتمام کمال نہ ٹوٹے تھے اور تضرع و التجاء و انابت و استغفار و ذلت و انکسار کی حقیقت معلوم نہ ہوئی تھی، اور حق تعالیٰ کے استغنا کی رفیع الشان بارگاہ کو جس کے گرد عظمت و کبریا کے پردے تنے ہوئے ہیں، مشاہدہ نہ کیا۔ اور اپنے آپ کو بندہ خوار و زار و ذلیل و بے اعتبار و بے ہنر و بے طاقت اور کامل محتاج اور فقیر معلوم نہ کیا......

.... اگر محض فضل خداوندی سے فیوض و ارادات الٰہی کا تسلسل اور اس کے غیر متناہی انعامات و عطیات کا پے در پے ظہور اس محنت کدے میں مجھ جیسے شکستہ دل کے شامل حال نہ ہوتا تو قریب تھا کہ معاملہ یاس و ناامیدی کی حد تک پہنچ جاتا اور رشتہ امید شکستہ ہو جاتا۔ حمد ہے اس خداوند کی جس نے مجھ کو عین بلا میں عافیت عطا فرمائی اور ظلم و جفا میں عزت بخشی اور مشقت و تکلیف میں مجھ پر احسان کیا اور راحت و مصیبت میں شکر کی توفیق دی اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی پیروی کرنے والوں، اولیاء کرام کے نقش قدم پر چلنے والوں علماء و صلحاء سے محبت رکھنے والوں میں داخل فرمایا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں۔ انبیاء کرام پر اولاً اور ان کے متبعین پر ثانیاً۔[167]

یہ خطوط حضرت مجدد رح نے قلعہ گوالیار سے لکھے ہیں۔ اس میں نہ کوئی شکوہ ہے نہ شکایت نہ تو قید کی مشکلات و تکالیف کا تذکرہ، نہ اہل و عیال اور مال و متاع کی جدائی کا افسوس و غم اور نہ ہی رہائی کی تمنا اور آرزو بلکہ اس کے برعکس قلعہ گوالیار میں قید و بند کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت و انعام تصور کرتے ہیں اور غلبہ اسلام کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتلاء و آزمائش کو یاد کر کے اپنا غم بھول ہی نہیں جاتے بلکہ اس کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے وہ اس موقع کو ایک سعادت تصور کرتے ہیں کیونکہ انہیں یہ سب کچھ راہ حق میں دیکھنا پڑا!

---

[167] مکتوبات امام ربانی رح جلد سوم مکتوب ۵ ص ۱۵-۱۶!

ہے اور خوشنودی خدا اور رضاء الٰہی کے حصول کے لیے اسے ایک بہترین موقع قرار دیتے ہیں۔ متعلقین و متاثرین کو تلقین کرتے ہیں کہ نفس کی تمام خواہش کو ترک کرکے ذکر الٰہی میں مشغول رہیں۔ انہیں مال و متاع کی محرومی سے قطعی رنج اور تکلیف نہیں ہوتی بلکہ اس میں وہ ایک حقیقی لذت اور خوشی محسوس کرتے ہیں۔ یہ دراصل آپ کے کردار کی عظمت اور مقصد سے عشق و لگاؤ کا نتیجہ تھا۔ آپ کو دنیا کی یہ مال و متاع، اسباب آرام و آسائش زندگی یا جاہ و منصب عزیز نہ تھا۔ آپ نے اعلاء کلمۃ الحق کا نعرہ بلند کیا تھا۔ اسی لیے جد و جہد کر رہے تھے اس لیے جب امتحان کا وقت آیا تو آپ نے ثبات و عزم کا ثبوت پیش کیا اور کسی دنیاوی شئے کی محبت اس راہ میں مانع نہ ہوئی۔

صبر و رضا کی تلقین:۔

حضرت مجددؒ در حقیقت محض قلعہ گوالیار میں قید کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے عتاب سے عوام کو خوفزدہ کرنے کیلئے سختیاں و تشدد کی پالیسی بھی اختیار کی گئی اور عامۃ المسلمین کو آپ سے برگشتہ کرنے کے لیے بے بنیاد پروپیگنڈے کی ایک وسیع مہم بھی شروع کی گئی تھی اور ہر جگہ مخالفت اور مخاصمت کو ایسی ہوا دی گئی جس سے لوگوں کے ذہن میں نہ صرف یہ کہ آپ کے خلاف شکوک و شبہات اور بدگمانی پیدا ہوئی بلکہ بغض، نفرت اور غم و غصہ کی بھی پرورش ہوئی اس لیے نہ صرف عام لوگوں کی ہمتیں پست ہو رہی تھیں بلکہ آپ کے بعض معتقدین اور متاثرین اور اچھے خاصے سمجھدار لوگوں کے بھی حوصلے پست اور جذبات سرد ہو رہے تھے۔ چنانچہ یاس و ناامیدی کی کیفیت طاری ہو چلی تھی۔ یہ ایک خطرناک صورت حال تھی جس سے آپ کو سابقہ پیش آ گیا تھا۔ لیکن آپؒ نے بروقت اس کا تدارک کیا۔ چنانچہ آپؒ اپنے متاثرین۔ معتقدین کی نہایت ہی حکمت اور دور اندیشی سے قید ہی سے حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور ان کی یاس و ناامیدی کو آس و امید سے بدل دیتے ہیں۔ آپؒ اس صورت حال پر اس طرح متوجہ

کرتے ہیں کہ :۔

"آپ نے خلق کی جفا و ملامت کے بارہ میں جو لکھا تھا یہ خود اس گروہ کے جمال اور ان کے زنگار کا صقل ہے پھر قبض و کدورت کا باعث کیوں ہو؟ جب یہ فقیر اس قلعہ میں پہنچا تو اوائل حال ہی میں محسوس ہوتا تھا کہ ملامت خلق کے انوار شہروں اور دیہاتوں سے نورانی بادلوں کی طرح پے در پے پہنچ رہے ہیں اور میرے معاملہ کی پستی سے بلندی کی طرف لیے جا رہے ہیں۔ برسوں تربیت جمالی سے میری منزلیں طے کرائی گئیں اب تربیت جلالی سے قطع مسافت کرائی جا رہی ہے۔ لہٰذا آپ مقام صبر بلکہ قیام رضاء میں رہیں اور جمال و جلال کو مساوی جانیں۔ آپ نے لکھا تھا کہ فتنہ کے ظاہر ہونے کے وقت نہ ذوق رہا ہے نہ حال۔ چاہیئے تھا کہ ذوق و حال دگنا ہو جاتا۔ کیونکہ محبوب کی جفا اس کی وفا سے زیادہ لذت دیتی ہے۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ عام لوگوں کی طرح باتیں کر رہے ہیں اور محبت ذاتیہ سے دور نکل گئے ہیں۔ لہٰذا آپ گزشتہ بات کے برخلاف جلال و ایلام کو انعام سے زیادہ اور برتر تصور کریں اس لیے کہ جمال و انعام میں مراد محبوب کے ساتھ اپنی مراد کا شائبہ ہوتا ہے اور جلال و ایلام (تکلیف) میں اپنی مراد کے برخلاف مراد محبوب ہوتی ہے۔[۱۶۸]

حضرت مجدد رح کا یہ خط بہت ہی فکر انگیز اور بصیرت افروز ہے مخالفت و مخاصمت کے طوفان بلا اور بے بنیاد، بے سروپا الزامات و اتہامات کا مقابلہ آپ رح نے نہایت ہی صبر و سکون کے ساتھ کر کے حاسدوں اور دشمنوں کے ہر وار کو بری طرح سے ناکام کر دیا تھا۔

رہائی سے ناکامی پر اطمینان و سکون :۔

حضرت مجدد رح اپنی تحریک احیاء اسلام و نفاذ شریعت کی وجہ سے عامۃ المسلمین

---

[۱۶۸] مکتوبات امام ربانی رح جلد سوم مکتوب نمبر ۲ ص ۱۶-۱۷

میں محبوب و مقبول تھے۔ اور ان کی قید و بند سے ان کے معتقدین و متاثرین کو تکلیف ہو رہی تھی اس لیے ان کی فطری خواہش تھی کہ آپ رہا کر دیے جائیں اس کے لیے ہر قسم کی دوڑ دھوپ بھی کی گئی لیکن چونکہ آپ کے قید کرنے کا مقصد ہی مختلف تھا اس لیے تمام کوششوں کے باوجود آپ رہا نہ ہو سکے اس بنا پر لوگوں میں ایک طرح کی بے چینی و اضطراب تھا اور وہ آزردہ خاطر تھے لیکن جب آپ کو اس کیفیت کا علم ہوا تو آپ انہیں مطمئن کرنے کے لیے تحریر کرتے ہیں کہ :۔

"میرے خیر اندیش دوستوں نے ہر چند میری رہائی کے بارے میں کوشش کی لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا جو کچھ خدا نے کیا وہی بہتر ہے بمقتضائے بشریت مجھ کو بھی اس سے کچھ رنج ہوا اور دل میں کچھ تنگی ظاہر ہوئی لیکن کچھ مدت کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ سب حزن اور دل تنگی فرحت و شرح صدر سے بدل گئی اور یقین خاص سے معلوم ہوا کہ اگر اس جماعت کی مراد جو میرے درپے آزار ہیں اللہ جل سلطانہ کے مراد کے موافق ہے تو پھر اس پر ناپسندیدگی اور دل تنگی بے معنی اور دعویٰ محبت کے منافی ہے کیونکہ محبوب کا ایلام اس کے انعام کی طرح محب کے نزدیک محبوب و مرغوب ہوتا ہے۔ محب جس طرح محبوب کے انعام سے لذت پاتا ہے اسی طرح اس کے ایلام میں بھی مزہ پاتا ہے بلکہ اس کے ایلام میں زیادہ لذت پاتا ہے کیونکہ یہ صورت حظ نفس کے شائبہ سے خالی اور مراد نفس سے پاک ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ جو جمیل مطلق ہے اس شخص کو تکلیف ہی میں رکھنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ بھی بعنایت الٰہی اس شخص کے نظر میں جمیل ہے بلکہ لذت کا سبب ہے اور چونکہ اس جماعت کی مراد حق سبحانہ کی مراد کے موافق ہے بلکہ ان کی مراد اللہ تعالیٰ کی مراد ظاہر ہونے کا دروازہ ہے اس لیے اس جماعت کی مراد بھی یقیناً اس کی نظر میں مستحسن اور باعث لذت ہے جس شخص کا فعل محبوب کے فعل کا مظہر ہو تو اسی شخص کا فعل بھی محبوب ہی کے فعل کی طرح محبوب ہوتا ہے اور اس فعل کا کرنے والا بھی اس

علاقہ کی وجہ سے محب کی نظر میں محبوب ہوتا ہے۔ اس شخص سے جس قدر جفا زیادہ ہوتی ہے اسی قدر محب کی نظر میں حسین معلوم ہوتا ہے کیونکہ غضب محبوب کی صورت کی نمائندگی اس میں زیادہ ہوتی ہے اس راہ کے دیوانوں کا معاملہ ہی جدا گانہ ہے لہٰذا اس شخص کی برائی چاہنا اور اس سے بددل ہونا محبت محبوب کے منافی ہے کیونکہ یہ شخص صرف محبوب کے فعل کا آئینہ ہے اور بس اس لیے جو لوگ درپے آزار ہیں وہ دوسروں سے زیادہ محبوب نظر آنا چاہئیں۔ آپ دوستوں سے کہہ دیں کہ وہ دل کی تنگی دور کریں اور جو لوگ درپے آزار ہیں ان کی طرف سے بددل نہ ہوں بلکہ ان کے فعل سے لذت حاصل کریں۔ ہاں چونکہ ہم کو دعا کرنے کا حکم ہے اور حضرت حق تعالیٰ کو دعا والتجا وتضرع وزاری پسند ہے اس لیے دفع مصائب کی دعا کریں اور عفو و عافیت کی درخواست کریں اور جو میں نے (جور و جفا کو) صورت غضب کا آئینہ کہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حقیقت غضب دشمنوں کا حصہ ہے۔ دوستوں کے لیے صورتاً غضب ہے اور حقیقتاً عین رحمت ہے۔ غضب کی اس صورت میں محبؔ کے لیے اس قدر فائدے اور نفعے رکھے گئے ہیں جو بیان سے باہر ہیں نیز غضب کی صورتوں میں جو دوستوں کو عطا فرماتے ہیں منکر لوگوں کی خرابی ہے اور ان کی ابتلا و آزمائش کا باعث ہے [169]

قلعہ گوالیار ہی کی قید و بند کے زمانے کی اپنی دلی کیفیت کا تذکرہ ایک دوسرے مکتوب میں یوں کرتے ہیں کہ:۔

"قید کے دنوں میں جب اپنی ناکامی اور بے اختیاری کا مطالعہ کرتا تھا تو عجیب حظ حاصل ہوتا تھا اور نہایت ہی ذوق پاتا تھا۔ ہاں فراغت و آرام والے لوگ مصیبت والوں کے ذوق کو کیا معلوم کر سکتے ہیں اور ان

۱۶۹؎ مکتوبات امام ربانی جلد سوم مکتوب ۱۵ ص ۲۵-۲۶۔

کے بلا کے جمال کو کس طرح پا سکتے ہیں۔ بچوں کا حفظ شیرینی پر ہی منحصر ہے لیکن جس نے تلخی سے حفظ حاصل کیا۔ وہ شیرینی کو جَو کے برابر بھی نہیں خریدتا۔[۱۷۰]

راہِ حق کا مجاہد:-

حضرت مجدد رح کے یہ مکتوبات نہایت ہی روح پرور اور حیات آفریں تصورات اور دل آویز خیالات کا مجموعہ ہیں۔ خصوصیت سے ان لوگوں کے لیے جو اعلاء کلمۃ الحق اور احیاء سنت نبوی کے علمبردار ہیں ان کے لیے بصیرت افروز اور عبرت آموز ہیں۔ ان کی راہ پھولوں کی سیج نہیں۔ انہیں ہر تکلیف اور مصیبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا ہے بلکہ اس راہ میں جس قدر صبر و ہمت اور استقامت سے رضاء الٰہی کے لیے مصائب و مشکلات کو انگیز کیا جائے اسی قدر خدا تعالیٰ کی رحمتیں مقصد کی برآری میں قریب تر ہوں گی۔ دوسرے یہ کہ جو لوگ کسی بلند مقصد۔ اعلیٰ نصب العین۔ عقیدہ اور نظریہ حیات کی سربلندی کے لیے جد و جہد کرتے ہیں ان کی کامیابی اور سرخروئی کا پیمانہ مادی مقاصد اور نصب العین کے کام کرنے والوں سے مختلف ہوتا ہے۔

حضرت مجدد رح پر بے بنیاد الزامات عائد کیے گئے۔ دربار میں طلب کیا گیا قید و بند کی سزا دی گئی۔ ظاہری اسباب آسائش و آرام اور آزادی سے محروم کر دیا گیا۔ اہل و عیال سے جدا کیے گئے۔ مال و متاع اور جائیداد ضبط ہوئی۔ مخالفت میں بے بنیاد پروپیگنڈہ کا بازار گرم کیا گیا۔ سختی و تشدد سے خوف و ہراس کی فضا پیدا کی گئی۔ جاہ و منصب کی تقسیم سے لوگوں کو ہمنوا بنایا گیا۔ آپ رح کے لوگوں کے لیے کام کا راستہ مسدود کرنے کی کوشش کی گئی۔ عوام میں مخالفانہ و مخاصمانہ جذبات کو بھڑکا کر آپ کے خلاف برانگیختہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان سب میں حکومت کی قوت، جبر اور خزانے کے بل بوتے پر وقتی کامیابی

---

[۱۷۰] مکتوبات امام ربانی جلد سوم مکتوب نمبر ۸۳ ص ۲۰۵۔

ہوتی ہے اس لیے آپ کے معاندین، مخالفین، حاسدین جن کا مقصد دنیاوی عیش و عشرت اور مال و متاع کی فراوانی یا جاہ و منصب کے حصول کے سوا کچھ نہ تھا وہ خوش تھے کہ انہیں اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی اور ان کا خیال تھا کہ آپ رح کی تحریک نہ صرف کمزور و بے اثر ہو جائے گی بلکہ ان حالات کا مقابلہ نہ کر کے دم توڑ دے گی۔ لیکن حضرت مجددؒ رح کے متذکرہ بالا مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان تمام آفات اور رکاوٹوں سے دل گرفتہ نہیں ہوتے نہ ہی آپ کے دل میں کسی قسم کا خوف و ہراس پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی جھنجھلاہٹ یا انتقام کا کوئی خیال آتا ہے بلکہ نہایت ہی پر وقار انداز میں سکونِ قلب اور دلجمعی کے ساتھ ان تمام مشکلات و مواقع کا یوں مقابلہ کرتے ہیں جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔ وہ ہر حال میں صبر و شکر کا اظہار کرتے ہیں اور ہر فعل میں رضائے الٰہی کے متمنی ہوتے ہیں۔

آپ کے اسی بے پناہ صبر و استقامت، دلجمعی، اطمینان قلب، تعلق باللہ کی کیفیت اور زندگی کے اس پہلو پر حقیقی مسرت اور لطف اندوزی اور اس سے روحانی بالیدگی اور سرور کی کیفیتوں نے آپ کے حاسدوں اور دشمنوں کو سخت مایوس و نامراد کر دیا۔ انہوں نے تو آپ کو روحانی و جسمانی اذیت اور تکالیف پہنچانے کے لیے یہ تمام پاپڑ بیلے تھے یعنی انسان کی محبوب اشیاء اہل و عیال، مال و متاع، دوست و احباب، آزادی وغیرہ سے محروم کر کے قلعہ گوالیار میں بند کر دیا۔ اور آپ بے اختیار اور مجبور و بے بس ہو گئے تو پھر آپ کے خلاف دل کھول کر خوب خوب پروپیگنڈا کیا گیا تاکہ لوگوں کی نظروں میں گر جائیں۔ آپ کے خلاف یہ اقدامات کرنے کے بعد وہ خوش و مطمئن تھے۔ لیکن جب اس کے برعکس یہ دیکھا کہ تمام محبوب اشیاء کی جدائی و محرومی آپ کو کسی قسم کی تکلیف و اذیت میں مبتلا نہ کر سکی بلکہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ مستعد اور حوصلہ مند ہو گئے ہیں۔ ان تمام سختیوں کے باوجود آپ بہت ہی مطمئن و خوش و خرم ہیں ان میں ذرہ برابر تکلیف و پریشانی کا احساس نہیں اور نہ ہی یاس و نامرادی ان کے قریب آ سکی بلکہ وہ یک گونہ لذت و روحانی سکون محسوس کرتے ہیں اس سے آپ کے حاسدین اور معاندین کو سخت مایوسی ہوئی اور آپ کے خلاف جو اسکیم بنائی گئی تھی وہ اپنا اصل مقصد حاصل کرنے میں

ناکام ہو گئی۔

زنداں میں تبلیغ حق:۔

حضرت مجددؒ کو قلعہ گوالیار میں قید تو کر دیا گیا۔ آزادی عمل و اختیار سے محروم تو کر دیا گیا۔ جسم مقید اور بے بس تھا۔ لیکن آپ میں شریعت اسلامیہ کے غلبہ کے لیے جو جذبہ اور تڑپ تھی انہیں وہ قید میں بھی متحرک اور سرگرم عمل رکھتی ہے۔ آپ قید میں بھی اپنے مقصد کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ آپ کا پیغام کسی کے خلاف نہ تھا بلکہ آپ دین و دنیا دونوں کے سنوارنے کے لیے لوگوں کو دعوتِ اسلام دیتے تھے جس میں خود اتنی کشش اور جاذبیت ہے کہ جب لوگ اس کے دائرہ اثر میں داخل ہو جاتے ہیں تو ان کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ حضرت مجددؒ تو اپنے عمل و کردار سے سراپا اسلام کے داعی و نمونہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زنداں کے ساتھی آپ کے حسنِ کردار اور تعلیمات سے متاثر ہو کر آپ کے حلقہ بگوش ہونے لگے۔ اس میں بھی آپ کی تعلیمات کا چرچا ہونے لگا اور یہاں بھی آپ کو قبولیت عام حاصل ہونے لگی۔ یہ حکومت اور آپ کے مخالفین اور حاسدین کے لیے روح فرسا خبر تھی اس لیے کہ جس کام پر قدغن لگانے اور جس تحریک کو برگ و بار لانے سے روکنے کے لیے یہ تمام پاپڑ بیلے گئے تھے۔ اس کو کوئی گزند نہیں پہنچا بلکہ اس مقصد کو حضرت مجددؒ کی دربار طلبی اور قید کے واقعہ سے مزید تقویت حاصل ہوئی۔ لوگوں میں خوف و ہراس اور مایوسی کے بجائے ایک نیا عزم، حوصلہ، جوش، ولولہ اور توقعات پیدا ہوئیں۔ عامۃ المسلمین میں حضرت مجددؒ اور ان کے پیغام سے جو لگاؤ اور اُنس پیدا ہو گیا تھا وہ کم نہ ہوا بلکہ اس کے دائرہ اثر میں مزید اضافہ ہوا اور حضرت مجددؒ کی شخصیت اور بھی نکھر کر سامنے آگئی۔ لوگوں میں کھرے اور کھوٹے سکے میں تمیز پیدا ہوئی۔ آپؒ نے بھرے دربار میں ایک مطلق العنان اور آمر مطلق حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر ادر کافرانہ اور مشرکانہ شعائر آداب کو بجا لانے سے انکار کر کے شریعت کی سربلندی کے لیے جو جرأتمندانہ اقدام کیا تھا اس سے شریعت کے علمبرداروں کے حوصلے بلند ہو گئے تھے اور درباری کافرانہ ماحول اور ظلمت کدہ میں روشنی

کی ایک مٹی کرن نمودار ہوگئی۔

رہائی اور اس کے اسباب :۔

آپ رح کو حکومت نے بھونڈے طریقے سے قید تو کر دیا تھا۔ لیکن اس قید و بند کے لیے کوئی اخلاقی اور قانونی جواز نہ تھا اور نہ ہی لوگوں کے ضمیر کو مطمئن کیا جا سکتا تھا کہ آپ کو شریعت اور خلفاء راشدین کے احترام کی وجہ سے بند کیا گیا ہے اس لیے حکومت کا اقدام بہت ہی کمزور اور ناقص تھا۔ جو سراسر جبر، طاقت، کھلی دھاندلی، اور قوت کے مظاہرہ کے طور پر کیا گیا تھا۔ حکومت کے اس فعل سے اس کے وقار میں عوام کی نظر میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ لوگوں کی زبانیں تو خاموش کی جا سکتی تھیں۔ لیکن ضمیر کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے اس فعل سے بجائے اس کے کہ عامۃ المسلمین مطمئن ہوتے یا حکومت کے وقار میں اضافہ ہوتا اس کے برعکس یہ احساس پیدا ہوا کہ حکومت کا یہ اقدام سراسر ظالمانہ اور آمرانہ ہے جس کے لیے اس کے پاس کوئی اخلاقی، دستوری یا قانونی جواز نہیں، بلکہ یہ محض ایک سیاسی اقدام ہے جس سے حکومت کے فیصلے کا کھوکھلا پن ثابت ہوتا تھا۔ اس لیے عام بے چینی اور اضطراب کے پیش جہانگیر ایک ہی سال میں آپ کو آزاد کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔[۱۷۱]

---

۱۷۱ جہانگیر چودھویں سن جلوس (۱۴) میں ۲۲ خرداد آپکو قید کرتا ہے اور پندرہویں سن جلوس ۲۱ خرداد کو قید سے بظاہر رہا کرتا ہے۔ تزک جہانگیری (اردو ترجمہ) ص ۵۲۳، ۶۳۳۔

یہ خیال رہے کہ جہانگیر نے جب قید کیا تھا تو مدت قید کا تعین نہیں کیا تھا۔ اس لیے حضرت مجدد رح نے مکتوب نمبر ۲ جلد سوم ص ۷ تا ۹ میں لکھتے ہیں "شاید ملاقات ہو یا نہ ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ باقی رہی ایک دوسرے کی ملاقات اگر خدا تعالیٰ کو منظور ہوا تو ہو کر رہے گی ورنہ اس کی تقدیر پر راضی رہیں اور دعا کریں کہ دار السلام میں سب جمع ہوں اور دنیاوی ملاقات کی تلافی کو اللہ تعالیٰ کے کرم سے آخرت کے حوالہ کریں۔

رہائی کا فیصلہ کسی خلوص یا عقیدت کی بنا پر نہ تھا بلکہ آپ کی قید و بند سے حکومت کو اصل مقصد میں ناکامی ہو رہی تھی اور مفت میں بدنامی الگ تھی کیونکہ حضرت مجددؒ کو لوگ بے گناہ اور مظلوم تصور کر رہے تھے اور ان سے عقیدت و محبت میں اضافہ ہی ہو رہا تھا[۱۷۲]۔ اور خواہ مخواہ

---

۱۷۲ یہ محض مفروضہ نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے۔ شہنشاہ اکبر نے (۱۵۵۶ء-۱۶۰۵ء) نے اسلام کی ضد میں شراب نوشی کی اس قدر افزائی و سرپرستی کی کہ اس کے دو بیٹے دانیال ۳۳ سال اور مراد ۳۰ سال کی عمر میں انتقال کر جاتے ہیں۔ (تزک جہانگیری ص ۶۳-۶۴) اور جہانگیر اپنی شراب نوشی اور شراب کی افادیت کا تذکرہ اپنی خود نوشت سوانح حیات میں دل کھول کر کرتا ہے اور اپنے عہد حکومت میں ان متعدد امراء مملکت کا تذکرہ کرتا ہے جو کثرت شراب نوشی سے انتقال کرتے ہیں مثلاً شیر افغان سعادت بیش رو خاں۔ مہا سنگھ۔ عنایت خاں۔ شاہنواز خاں۔ شہزادہ پرویز (تزک جہانگیری ص ۱۵۶-۱۷۱-۳۹۹-۵۱۶-۵۵۷-۸۳۳ وغیرہ) اور خرم کی شراب نہ پینے کی شکایت کرتا ہے اور شراب کی افادیت بتلا کر پینے کی تلقین کرتا ہے (تزک جہانگیری ص ۳۲۵) لیکن حضرت مجددؒ کی گرفتاری کے بعد ترک شراب نوشی کے واقعات شروع ہوتے ہیں۔ مثلاً خان جہاں کے بیٹے کی یک لخت شراب ترک کرنے کے واقعہ کا تذکرہ خود جہانگیر کرتا ہے۔ اور جہانگیر خود سمجھاتا ہے کہ طبی نقطہ نگاہ سے یکدم چھوڑنا مناسب نہیں ہے بلکہ دھیرے دھیرے ترک کرنا چاہیئے لیکن وہ نہ مانا اور مردانہ وار اس مرحلے سے نکل گیا۔ (تزک جہانگیری ۶۳۶) خرم کو خود جہانگیر نے شراب کی افادیت بتلا کر شراب پینے کی تلقین کی تھی لیکن اس کے باوجود خرم (شاہ جہان) کو شراب سے رغبت نہ ہوئی اور اس نے "اسی زمانے میں ۲۶ بہمن سنہ جلوس ۱۵ مطابق یکم ربیع الثانی ۱۰۳۰ھ (۲۳ فروری ۱۶۲۱ء) تیسویں سالگرہ کا جشن تلادان کے موقع پر نفس امارہ کو مغلوب کرنے کے لیے عیش و نشاط کی بنیاد شراب سے ہاتھ اٹھا کر اس جشن میں توبہ کی۔ اگرچہ اب تک کبھی اپنی خواہش سے شراب کو ہاتھ نہ لگایا تھا اور توبہ لازم نہ تھی لیکن توفیق الٰہی کی بدولت توبہ فرمائی اور حکم دیا کہ شراب کو دریائے چنبل میں بہا دیں۔ چاندی سونے کے جتنے جام و سبو ساقی خانے میں تھے سبھوں کو حضرت کے سامنے توڑ کر محتاجوں میں تقسیم کر دیں" (عمل صالح المعروف بہ شاہجہان نامہ جلد اول محمد صالح کنبوہ ترجمہ ڈاکٹر ناظر حسن زیدی ص ۱۳۱۔

حکومت کی اخلاقی ساکھ عامۃ المسلمین میں مجروح ہو رہی تھی اس لیے بہتر یہی سمجھا گیا کہ آپ کو رہا کر دیا جائے۔ چنانچہ جہانگیرؔ نے اپنے سن جلوس کے پندرہویں سال کے واقعات کے ضمن میں آپ کے متعلق یہ تحریر کیا کہ:۔

"شیخ احمد سرہندی کو جو "زہد فروشی" و بیہودہ گوئی" کے سبب کچھ عرصہ سے قید کاٹ رہا تھا، طلب کیا ہوا تھا۔ اس دن کو اس کے حاضر ہونے پر اسے خلعت اور ہزار روپے عنایت کر کے آزاد کر دیا۔ ساتھ ہی اختیار دیا کہ چاہے سرہند واپس چلا جائے یا میرے حضور میں رہے۔ اس طرح آپ قلعہ گوالیار سے رہا ہو گئے ۔[۱۷۳]

ایک طرح کی نظر بندی:۔

حضرت مجددؒ کو قلعہ گوالیار سے رہا کر دیا گیا لیکن شاہی حکم کے تحت بادشاہی کے ہم رکاب تھے۔ شاہی لشکر جہاں جاتا آپ بھی اس کے ساتھ تشریف لے جاتے تھے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ کے ساتھ یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا گیا تھا کہ آپ یکسوئی کے ساتھ اپنی تحریک کی رہنمائی نہ کر سکیں اور حکومت کے زیر نگرانی رہیں۔ تاکہ آپ رحؒ کی تحریک کی مقبولیت سے حکومت اور ارباب اقتدار نے جو خطرہ محسوس کیا تھا۔ اس کو مزید تقویت نہ ملے اور آپ رحؒ پر موثر کنٹرول اور گرفت رہے۔ اس طرح آپ رحؒ کی آزادی عمل مفقود تھی دوسرے شاہی لشکر میں ہونے کی وجہ دوسرے لوگ بھی آسانی سے مل جل نہیں سکتے تھے۔ لیکن جہانگیرؔ کا سن جلوس کے پندرہویں سال کے ضمن میں یہ تحریر کرنا کہ:۔

"اس کے (حضرت مجددؒ) حاضر ہونے پر اسے خلعت اور ہزار روپے عنایت کر کے آزاد کر دیا ساتھ ہی اختیار دیا کہ چاہے سرہند میں واپس چلا جائے یا میرے حضور میں رہے"۔[۱۷۴]

---

[۱۷۳] تزک جہانگیری ص ۶۳۳ ۔ [۱۷۴] تزک جہانگیری ص ۶۳۳ ۔

اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ جہانگیر نے آپ کو آزاد کر دیا تھا اور آپ کو یہ اختیار دیا تھا کہ جہاں مناسب سمجھیں وہاں قیام کریں۔ دوسرے یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ جہانگیر نے خلعت و ہزار روپیہ دے کر عزت افزائی کی اور برکت کے طور پر ساتھ رہنے کی خواہش کی اور فیصلہ کا اختیار آپ کو دیا اور آپ رح نے شاہی رکاب میں رہنا پسند کیا تھا۔ بظاہر یہ دونوں باتیں صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن آپ رح نے اس دوران میں جو خطوط لکھے ہیں ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ شاہی رکاب میں رہنے پر مجبور تھے بلکہ ایک طرح سے نظر بند تھے تاکہ آپ رح حکومت کے زیر نگرانی رہیں اور آزاد ہو کر کوئی ایسا کام نہ کر سکیں جو آپ رح کی تحریک کی تقویت کا باعث ہو اسی لیے آپ کو سرہند نہیں جانے دیا گیا بلکہ شاہی رکاب میں ساتھ ہی چلنے کو کہا گیا اس سلسلے میں اپنے بیٹے کو تحریر کرتے ہیں کہ:-

"فرزندان گرامی! اگرچہ ہماری دوام صحبت کے مشتاق اور خواہاں ہیں اور ہم بھی ان کے حضور و ملاقات کے آرزومند ہیں لیکن کیا کریں تمام امیدیں میسر نہیں .... لشکر میں اس طرح بے اختیار و بے رغبت رہنا بہت ہی غنیمت ہے ـ ٥ ....

.... وہ تکلیف جو بادشاہ کی طرف سے ہے ⊙ اس کو اپنے مولیٰ جل شانہ کی کمال مہربانی اور رضامندی کا دروازہ جانتا ہے ....

فرزندوں کی جدائی میں دل تڑپتا ہے اور ان کی دوری اور نایافت سے جگر جلتا ہے .... اگر دہلی ہے تو وہ بھی تمہارا ہمسایہ ہے اور آگرہ ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے کرم سے قریب ہے۔ ۱۷۵

---

٥ یعنی لشکر میں قیام رغبت و اختیار کی بنا پر نہیں تھا۔

⊙ یعنی بادشاہ کی طرف سے تکلیف تھی یہ اور بات ہے کہ آپ اس تکلیف میں لذت محسوس کرتے ہیں اس لیے کہ یہ تمام تکلیف ایک اعلیٰ مقصد و نصب العین کے لیے تھی جو آپ رح رضاء الٰہی کے حصول کے لیے کر رہے تھے۔

۱۷۵ مکتوبات امام ربانی جلد سوم مکتوب نمبر ۸۷، ص ۱۸۹۔

ایک دوسرے خط میں اسی ضمن میں مزید تحریر کرتے ہیں کہ :-

"اس سفر و محنت میں ان بیٹوں کی جدائی کے برابر کوئی رنج و الم معلوم نہیں ہوتا۔ کسی وقت بھی ان کی یاد سے فارغ نہیں ہوتا۔[۱۷۶]"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لشکر میں آپ رح کا قیام آزادانہ خواہش و مرضی کے مطابق نہ تھا بلکہ رہنے کے لیے مجبور کیا گیا تھا۔ اس دورانِ قیام میں آپ کو بار بار بیٹوں کی جدائی کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن حالات سے مجبور تھے اور تشکر و سپاس کے جذبے کے تحت ان حالات کا مقابلہ کر رہے تھے۔

لشکر میں بھی آپ آزاد نہ تھے بلکہ تمام معمولات پر پابندی تھی۔ اس کے مطابق آپ وقت گزار رہے تھے۔ لیکن ان پابندیوں کے باوجود بھی آپ مطمئن تھے اور اس میں بھی لذت و حلاوت محسوس کرتے تھے۔

آپ کے اپنے الفاظ ہیں :-

"لوگ ہر وقت ہماری محنتوں کو مدِّ نظر رکھتے ہیں اور اس تنگی سے خلاصی طلب کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ نامرادی اور بے اختیاری اور ناکامی میں کس قسم کا حسن و جمال ہے اور کونسی نعمت اس کے برابر ہے کہ اس شخص کو اپنے اختیار سے بے اختیار کر دیں اور اپنے اختیار کے مطابق اس کو زندگانی بخشیں اور اس کے اپنے امور اختیاری کو بھی اس بے اختیاری کے تابع بنا کر اس کے دائرہ اختیار سے باہر نکال دیں جیسے کہ مردہ نہلانے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔" [۱۷۷]

اس کے علاوہ اسی اثناء کے مکتوبات نمبر ۲۷ و ۸۲ بھی ہیں۔ ان سب کے بین السطور مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ رح کو دراصل اس اثناء میں نظر بند رکھا گیا تھا۔ اس سے

---

۱۷۶ مکتوبات امام ربانی جلد سوم مکتوب نمبر ۸۲ ص ۲۰۳۔

۱۷۷ مکتوبات امام ربانی جلد سوم مکتوب نمبر ۸۳ ص ۲۰۴۔

حکومت کے دو مقاصد تھے۔ ایک تو حکومت بظاہر آزاد کرکے مفت کی بدنامی سے بچ گئی تھی اور عامۃ المسلمین میں جو وقار مجروح ہوا تھا اس میں کسی قدر کمی ہوئی۔ دوسرے آپ کو شاہی لشکر میں قیام کرنے کو کہا گیا۔ جہاں بادشاہ کے معتمد علیہ آزمودہ مصاحبین اور مقربین رہتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ شاہی ملازمین کا مراعات یافتہ گروہ جن کی بادشاہ سے اپنے مخصوص مفاد کے پیش نظر ذاتی وابستگی ہوتی ہے اس لیے ان کے درمیان میں آپ رح کی موجودگی سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ بادشاہ کے ہمرکابی میں جو لوگ تھے وہ اپنے ذاتی مفاد اور حکومت سے مختلف توقعات کی بنا پر مشکل ہی سے یہ خطرہ مول لے سکتے تھے کہ وہ آپ رح کی طرف ہمدردی کا اظہار کریں یا متوجہ ہوں ان لوگوں کو آپ سے دلچسپی نہ ہو سکتی تھی ان کا ذوق ورجحان کچھ مختلف ہی تھا۔ اس کا تذکرہ اور ان لوگوں کی عدم دلچسپی کے متعلق خود حضرت مجدد رح لکھتے ہیں کہ:۔

"ہر روز تازہ واقعات مسودہ اور بیاض میں لکھے جاتے ہیں لیکن کوئی نہیں جو ان کا ادراک کر سکے اور ان سے حظ اٹھا سکے" ۱۷۸ھ

اس طرح لشکر میں قیام کی وجہ سے آپ کو یہ آزادی نہ تھی کہ پوری دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ اپنی تحریک احیاء اسلام کی رہنمائی کر سکیں کیونکہ آپ پہ حکومت کی نگرانی تھی۔ دوسرے جن لوگوں کے درمیان آپ تھے ان پہ آپ رح تبلیغ و ہدایت ضرور کرتے رہے ہوں گے لیکن معاشرے کے وہ ایسے افراد تھے جو اپنی وابستگیوں اور دلچسپیوں کی وجہ سے کم ہی آپ کی طرف راغب ہو سکتے تھے اس لیے یہ خیال تھا کہ اس اثناء میں آپ کی تحریک ختم تو نہیں ہوگی لیکن اس کی قوت و طاقت اور اثرات میں اضافہ کبھی نہیں ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ لشکر شاہی میں قیام آپ کی اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق نہ تھا بلکہ حکومت نے اپنی سیاسی مصلحت کے پیش نظر اور آپ کی مقبولیت کو روکنے کے لیے لشکر شاہی میں قیام کرنے کے لیے مجبور کیا تھا۔ یہ ایک بالکل دوسری بات ہے کہ حضرت مجدد رح

۱۷۸ھ مکتوبات امام ربانی جلد سوم مکتوب نمبر ۲۸ ص ۲۰۳۔

جو احیاءِ اسلام کے داعی اور مبلغ تھے وہ کسی حال میں بھی اپنے مقصد کو اوجھل نہیں ہونے دیتے اور حکومت کے عتاب سے کبیدہ خاطر یا افسردہ ہونے کے بجائے وہ ہر موقع پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مشکلات اور تکالیف کو پیش نظر رکھ کر اپنی تکالیف و پریشانی میں بھی وہ اپنی فلاح و کامیابی کا راستہ تلاش کر لیتے ہیں۔

جہادِ عشق:۔

حضرت مجددؒ کا پیغام یا مشن اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی، اتباعِ سنّتِ نبویؐ اور احیاءِ شریعت کا تھا۔ یہ ایک ایسا حیات آفریں، اور زندگی بخش پیغام ہے کہ ہر جگہ اور ہر آن داعی حق پہنچا سکتا ہے اس کا تعلق انسان کے ذہن و فکر اور قلب و دماغ کی تبدیلی سے ہے۔ انسان کے جسم کو تو قید کیا جا سکتا ہے اس کو آزادیٔ عمل سے محروم کیا جا سکتا ہے لیکن جو لوگ انسانیت کی اعلیٰ قدروں اور صفات کو بیدار کرتے ہیں انہیں کہیں بھی رکھا جائے اور وہ کسی بھی حال میں رہیں اپنا پیغام ضرور پہنچا سکتے ہیں اور ان کی اپیل ضرور اپنا رنگ لا کر رہتی ہے۔ حضرت مجددؒ سراپا زندۂ شریعت اور احیاءِ اسلام کے علمبردار تھے۔ انہیں اپنے مقصد سے انتہائی عشق و لگن تھا اس لیے جب بھی اور جہاں کہیں بھی اور جس حال میں بھی موقع ملتا۔ اسلام کے عقائد اور دیگر متعلقہ مسائل پر کھل کر وضاحت کے ساتھ لوگوں کو مخاطب کرتے۔ چنانچہ بادشاہ کی ہمرکابی کے اثناء میں بھی حکمت و تدبر کے ساتھ اپنے مشن کو جاری رکھا۔ دین کا پیغام پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ اس سے ضرور فائدہ اٹھاتے اور سامعین اور مخاطب کی حیثیت کے مطابق مسائل پر اسلام کا نقطۂ نظر پیش کرتے تاکہ ان کے ذہن کی کجی دور ہو اور ان میں صحیح فکر پروان چڑھے۔ اس سلسلے میں اپنے ایک پروگرام کا تفصیلی طور پر ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"عجیب و غریب صحبتیں گذری ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان گفتگوؤں سے امورِ دینیہ اور اصولِ اسلامیہ میں ہرگز سستی اور مداہنت دخل

نہیں پاتی۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان محفلوں میں بھی وہی باتیں ہوتی ہیں جو خاص خلوتوں اور مجلسوں میں بیان ہوا کرتی ہیں اگر ایک مجلس کا حال لکھا جائے تو دفتر ہو جائے۔ خاص کر آج ماہ رمضان کی سترہویں رات کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت اور عقل کے عدم استقلال اور آخرت کے ایمان اور اس کے عذاب و ثواب اور رویت اور دیدار کے اثبات اور حضرت خاتم الرسل کی نبوت کی خاتمیت اور ہر صدی کے مجدد اور خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اقتدا اور ترویج سنت اور تناسخ کے باطل ہونے اور جنّ، جنّاتوں کے احوال اور ان کے عذاب و ثواب کی نسبت بہت کچھ مذکور ہوا اور بڑی خوشی سے سنتے رہے۔ اس اثناء میں اور بھی بہت سی چیزوں کا ذکر ہوا۔ اقطاب اور اوتاد اور ابدال کے احوال اور ان کی خصوصیتوں وغیرہ کا بیان ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ سب کچھ قبول کرتے رہے اور کوئی تغیر ظاہر نہیں ہوا۔ ان واقعات اور ملاقات میں شاید کوئی اللہ تعالیٰ کی پوشیدہ حکمت اور خفیہ راز ہوگا۔" [۱۷۹]

اس تقریر میں آپ نے جن مسائل پر اظہار خیال کیا ہے وہ بہت ہی بنیادی اور اہم مسائل ہیں جن کے متعلق عہد اکبری میں (۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء) شکوک و شبہات اور اعتراض اٹھائے گئے تھے اور خصوصیت سے یہ تقریر ان حضرات کے سامنے ہوئی جو ارباب حل و عقد تھے اور انہیں کے ذہن و فکر میں اس قسم کے شکوک و شبہات تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ رحم سامعین اور مخاطب کے اصل مرض سے واقف تھے اور ان کے علاج کا نسخہ بھی تیر بہدف تھا۔

آپ کی یہ تعلیم و تلقین، تبلیغ و ہدایت، صبر و رضا، بہر حال اپنا اثر لاکر رہی۔ آپ کی باتیں لوگوں کے دلوں میں گھر کرتی رہیں اور لوگ آپ سے برابر متاثر ہوتے رہے۔ تمام

۱۷۹؎ مکتوبات امام ربانی جلد سوم مکتوب ۴۳ ص ۱۱۱۔

عرصہ قید کے دوران آپ رح مجسم پیکرِ تسلیم و رضا رہے ہیں۔ آپ نہ کسی پر الزام لگاتے ہیں نہ اتہام اور دشنام طرازی کا طریقہ اختیار کرتے ہیں اور نہ ہی کسی کی تحقیر و تذلیل کرتے ہیں نہ اپنی مشکلات و مصائب پر جھنجلاہٹ کا اظہار کرتے ہیں بلکہ ان تمام دشواریوں اور اذیتوں کا ذرہ برابر احساس بھی نہیں ہونے دیتے بلکہ تاثر یہی ہوتا ہے کہ اپنے مقصد کے حصول میں ان تمام آفات اور مشکلات پر بھی آپ کو اطمینان قلب اور سکون خاطر حاصل ہے نتیجہ یہ ہے کہ شاہی رکاب میں بھی محض اپنے اخلاص، کردار و عمل سے اپنا ہمنوا بنا لیتے ہیں اور آپ کے خلاف جتنی سازشیں اور گھناؤنی حرکتیں آپ کو تکلیف پہنچانے اور اذیت دینے کے لیے کی گئیں وہ سب کی سب ناکام ہو گئیں اور دشمنوں، حاسدوں اور مخالفین اسلام کو سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

آپ رح نے اپنے کردار و عمل سے محض امراء اور عامۃ المسلمین ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ موقع ملنے پر بادشاہ کو مخاطب کرتے ہیں اور اسے دعا کے اسرار اور علماء و صلحاء کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ انہیں معاملات دنیا میں کیا اہمیت اور مقام حاصل ہے اس لیے باوجود تمام دنیاوی اسباب اور مادی وسائل کے ان کی اہمیت اور افادیت سے غافل نہیں ہونا چاہیئے۔[۱۸۰]

حضرت مجدد الف ثانی رح کی تحریک نفاذ شریعت و احیاء اسلام کا راستہ روکنے کے لیے دور از کار حیلے، بہانے تلاش کر کے دربار میں طلب کر کے قید کیا گیا۔ قید سے آزاد کر کے لشکر شاہی کے ساتھ قیام کرنے کا حکم دیا گیا اور اس اثناء میں مسلسل حکومت نگرانی کرتی رہی ان تمام اقدامات کا مقصد آپ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور تحریک کے اثرات اور قوت کو غیر مؤثر کرنا تھا۔ لیکن ان تمام مشکلات اور مواقع کے باوجود آپ کی تحریک برابر بڑھتی رہی اور معتقدین و متاثرین کے حوصلے اور عزائم بلند رہے بلکہ احیاء اسلام کے علمبرداروں میں مقابلے اور مسابقت کا مزید جوش و ولولہ پیدا ہوا اور مخالفین و حاسدین

---

۱۸۰ مکتوبات امام ربانی جلد سوم مکتوب نمبر ۷۴ ص ۱۱۹ - ۱۲۱ -

اور معاندین کی تمام تدابیر اور علماء دنیا اور نام نہاد مذہبی پیشواؤں کے کفر و ارتداد کے فتاویٰ کا انبار اور حکومت کے بے بنیاد پروپیگنڈا اور جبر و تشدّد کے تمام ہتھیار آپ کے مرتبے اور عظمت کو گھٹا نہ سکے اور نہ آپ رح کی بڑھتی ہوئی مقبولیّت کو روکا جا سکا۔

علماءِ کرام اور حضرت مجدّد رح کی دربار میں طلبی :۔

حضرت مجدّد رح کے متنازعہ مکتوب یازدہم پر پچھلے صفحات میں تفصیل سے بحث ہو چکی ہے[ع] اسی کے متعلق علماءِ کرام نے جہانگیر کے حضور میں شکایت کی کہ سرہند کا ایک مشائخ زادہ اپنے تئیں حضرت صدیق اکبر رض سے افضل سمجھتا ہے اور ایسے دعویٰ کرتا ہے جن سے کفر لازم آتا ہے۔ آزاد بلگرامی صاحب اپنی عربی کتاب سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں کہ:۔

"علماء نے بادشاہ ہند جہانگیر کے پاس شکایت کی کہ شیخ مجدّد رح کا دعویٰ ہے کہ ان کا مقام حضرت صدیق اکبر رض کے مقام سے بالا ہے۔ اور صاحب خزینۃ الاصفیاء کے بیان کے مطابق تو بعض علماء نے حضرت مجدّد رح کے قتل کا فتویٰ دے دیا تھا اور اس مسئلہ کو اتنا اچھالا گیا کہ حضرت مجدّد رح کے خلاف ایک عام شورش پیدا ہو گئی" [۱۸۱]

علماء کوئی شک نہیں کہ محافظ دین اور نائب رسول ہیں۔ انہیں یہ حق ہے کہ دین کے

ع حضرت مجدّد رح کے معترضین یا مخالفین آپ رح کی ایک ہی عبارت کو یعنی مکتوب یازدہم ہی کو آپ کے خلاف پیش کرتے ہیں اور اسی پر طرح طرح کے الزامات عائد کرتے ہیں حالانکہ آپ کی متعدد تصانیف ہیں اور مکتوبات کے تین دفتر ہیں جن میں مکتوبات کی کل تعداد ۵۳۶ ہیں ان میں سے کوئی دوسری عبارت بطور سند کے آپ کے خلاف پیش نہیں کرتے اور آپ پر اعتراض بھی مکتوب یازدہم کے لکھنے کے ۱۸ یا ۱۹ سال بعد لگایا جاتا ہے اور ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ اس کے معترضین اور مخالفین کے متعلق بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱۸۱ شیخ اکرام رود کوثر (اشاعت سوم) ص ۲۲۴ - ۲۲۶ -

تحفظ اور شریعت کی سر بلندی کے لیے بہانہ کریں لیکن حضرت مجددؒ کے سلسلے میں علماء کرام کا یہ رویہ ایک غیر جانبدار طالب علم کے لیے نا قابل سمجھ اور حیرت و استعجاب کا باعث ہے کہ وہ حضرت مجددؒ کی شکایت جہانگیرؔ سے کرتے ہیں۔ جہانگیر آور حضرت مجددؒ کی زندگیاں، مشاغل، پسند و ناپسند ایک کھلی کتاب کی طرح عام لوگوں کے سامنے تھیں۔ جہانگیرؔ ایک صاف گو اور حقیقت پسند شخص تھا۔ اس نے اپنی سوانح حیات کے سترہ سال کے حالات خود اپنے قلم سے تحریر کیے ہیں۔ وہ جو کچھ کرتا ہے یا کہتا ہے یا پسند کرتا ہے وہ بلا کسی ذہنی تحفظ کے صاف صاف لکھتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی کے کسی گوشے کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے اپنے بیان کے مطابق وہ اسلام کا منکر نہیں۔ وہ اسلام کا حامی ہے۔ اکبرؔ کا احترام کرتا ہے اور اس کو اچھے الفاظ میں یاد کرتا ہے لیکن اکبرؔ کی طرح اس کی مملکت کی پالیسی اسلام کے عناد پر مبنی نہیں ہے۔ وہ چونکہ اس گروہ کی حمایت سے برسرِ اقتدار آیا تھا جو اسلام کا حامی تھا اس لیے سیاسی طور پر اسلام کا حامی تھا لیکن اس کے باوجود اس کی اپنی زندگی اور معاملات ملکی میں اسلام ایک راہنما اصول کی طرح نہ تھا۔ بلکہ سیاسی مصلحت یا سیاسی اثرات کے تحت اسلام کا حامی تھا۔ عقائد، تصورات میں اہلا بہ اسلام کے خلاف نہ تھا لیکن اسلام سے اسے کوئی مثبت لگاؤ بھی نہ تھا۔

وہ خود اپنی سوانح حیات (تزک جہانگیری) کی ابتدا تو اللہ تعالیٰ کے نام سے کرتا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی تذکرہ نہیں کرتا اور نہ ہی خلفاء راشدین یا صحابہ کرامؓ کا کوئی تذکرہ کرتا ہے۔[۱۸۲] تحریر میں ایرانی مہینے اور سن الٰہی کثرت سے لکھتا ہے اور کہیں کہیں سن ہجری اور قمری مہینوں کا بھی تذکرہ آیا ہے۔ شبؔ برات۔ عیدؔ کے مسلم تہواروں کے ساتھ ساتھ شیو راتری۔ دسہرہ۔ ہولیؔ۔ اور دیوالی بھی مناتا ہے اور تولادان کی رسم ادا کرتا ہے۔[۱۸۳]

---

۱۸۲ تزک جہانگیری (اردو ترجمہ) سلیم واحد سلیم ص ۳۶۔

۱۸۳ تزک جہانگیری (اردو ترجمہ) سلیم واحد سلیم ص ۱۷۱۔ ۲۸۷۔ ۳۸۳۔ ۵۷۳۔ ۶۴۶۔

و تولادان کی رسم کے لیے ص ۱۰۴۔ ۱۳۹۔ ۳۵۱۔ ۵۴۰۔ ۵۷۰۔ ۵۹۷۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)۔

مسلم صوفیاء سے عقیدت و احترام کے ساتھ ساتھ ہندو جوگیوں، سنتاسیوں اور نجومیوں سے بھی بہت ہی احترام اور عقیدت سے ملتا ہے بلکہ جدروپ گوشائیں سے عقیدت کا یہ عالم ہے کہ اس سے بار بار ملاقات کے لیے جاتا ہے ایک مرتبہ تو ایک ہفتہ میں تین بار اس سے ملنے کے لیے گیا۔[۱۸۴] نشہ آور اشیاء کثرت سے استعمال کرتا ہے۔ اپنے افیون کے کھاتے اور شراب پینے کا تذکرہ کثرت سے کرتا ہے۔ بلکہ شراب کی افادیت بتلاتا ہے۔ اور اپنے بیٹے خرم کو شراب پینے کی تلقین بھی کرتا ہے[۱۸۵] تخت نشینی کے بعد پہلے جشن نوروز کے موقع پر خود لکھتا ہے کہ:۔

"میں نے حکم دیا ہے کہ شراب اور مُنشّی اشیاء جو کوئی جتنی مقدار میں استعمال کرنا چاہے اسے دے دی جائے۔ کوئی کسی کو پینے اور عیش منانے سے نہ روکے۔" شعر

ساقی بنور بادہ برافروز جام ما
مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)۔ جہانگیر جلوس نو ۱۸ ماہ آبان میں لکھتا ہے کہ دیوالی شروع ہوئی۔ میرے حکم کے مطابق دو تین راتیں اکثر درباریوں نے میرے حضور میں جوا کھیلا اور خوب ہار جیت ہوئی۔ ص ۲۸۷۔

۱۸۴ مسلم صوفیاء کا احترام و عقیدت، تزک جہانگیری۔ ۳۰۸۔ ۳۴۶۔ ۳۵۲۔ ۴۴۶۔ ۴۴۸۔ ۴۹۹۔ ۵۳۵۔ ۵۴۱۔ ۵۹۱۔ ہندو جوگیوں کے لیے ۳۷۸۔ ۳۸۲۔ ۴۹۰۔ ۵۲۲۔ ۵۲۵۔ ۵۷۷۔ اسن جلوس ۱۴ جمعہ ۹۔ آبان، پیر ۱۲۔ آبان۔ بدھ ۱۴۔ آبان کو یعنی ایک ہفتہ میں تین بار جہانگیر گسائیں جدروپ سے ملنے کے لیے اس کے پاس جاتا ہے اور اسی سال ساڑھے چار ماہ قبل یعنی ۲۲ خورداد کو حضرت مجدد کو دربار میں طلب کر کے قید کا حکم دیتا ہے (ص ۵۶۳) جدروپ گسائیں کے مشورہ سے سیر کا وزن ۳۶ درم کے برابر مقرر کیا تھا۔ ص ۵۷۹۔ ۴۶۲۔ ۴۶۷۔ ۶۷۶۔ ۶۸۷۔ ۷۰۰ وغیرہ۔

۱۸۵ تزک جہانگیری ص ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۶۵۔ ۴۸۳۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳ وغیرہ وغیرہ۔

(ترجمہ) ساقی شراب کے نور سے ہمارے ساغروں کو روشن کر دے اور ایسے مطرب نغمے گا کہ زمانے کی گردش ہماری آرزو کے مطابق ہو جائے۔

یہ ہے جہانگیر کی عملی زندگی خود اپنی سوانح حیات کی روشنی میں، اس کے قول و فعل سے کہیں خلفاء راشدین اور صحابہ کرام سے کسی عقیدت و احترام کا پتہ نہیں چلتا۔ اس لیے جہانگیر سے جب علماء کرام حضرت مجددؒ کے خلاف صحابہ کرام کے خلاف گستاخانہ باتیں منسوب کرنے کا الزام عائد کرتے ہیں تو یہ ایک مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے۔ حضرت مجددؒ کی زندگی سرتاپا شریعت کی اتباع پر مبنی ہے۔ ان کے قول، فعل میں کہیں رتی برابر تضاد نہیں ہے۔ لیکن علماء کرام حضرات ان کی شکایت ایک ایسے شخص سے کرتے ہیں جس کی زندگی سراسر شریعت سے انحراف پر مبنی ہے۔ مصرعہ

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیئے

ان علماء کرام، دینی پیشوا اور صوفیاء کرام کی خوش فہمی و سادہ لوحی پر حیرت ہوتی ہے جو بادشاہی دربار کے مقتدر اور مفاد پرست اور خود غرض امراء کی ہاں میں ہاں ملا کر حضرت مجددؒ کی ۱۹ سال قبل کی تحریر پر شور و غوغا کرتے ہیں۔ حضرت مجددؒ جن کی زندگی شریعت کے تابع تھی جن کی تحریروں سے بیشمار لوگوں کے قلب و دماغ کی کایا پلٹ گئی تھی۔ جن کے عمل و کردار اور معاملات زندگی میں انقلاب آگیا تھا۔ اس سے ان علماء حضرات کو اسلام خطرے میں نظر آتا ہے اور اس سے ان کے نزدیک خلفاء کی شان میں گستاخی نظر آتی ہے اور اس کو ختم کرنے کے لیے جہانگیر اور درباری مفاد پرست امراء کے ہاتھوں میں کھلونا بنتے ہیں۔ ان کا یہ فعل یا تو انتہائی سادہ لوحی، کم فہمی، کوتاہ نظری، جہالت یا حماقت پر مبنی تھا یا نام تو اسلام کا لیا۔ لیکن سرے سے نہ تو انہیں اسلام عزیز تھا اور نہ ہی اسلام کا احترام جانتے تھے اور نہ ہی اسلام کے معیار حق و عدل سے واقف تھے۔ یہی علماء ہیں جنہیں ننگ دین یا علماء دنیا اور علماء سو سے منسوب کیا جاتا ہے۔ جن کی ذات اسلام کے لیے قوت و بازو بننے کے بجائے اسلام کے نادان دوستوں کے ہاتھوں کھلونا بنتی ہے۔ ایسے ہی علماء کے بارے میں حضرت مجددؒ لکھتے ہیں کہ :-

"ایک بزرگ نے ابلیس لعین کو دیکھا کہ بیکار بیٹھا ہے اس سے اس کی وجہ پوچھی اس نے کہا کہ اس زمانے کے علماء میرا کام انجام دے رہے ہیں اور وہ دنیا کو گمراہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔" ۱۸۶ھ

عالم کہ کامرانی و تن پروری کند
او خویشتن گم است کرا رہبری کند

یہی وہ لوگ ہیں جو دین کو رسوا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ ان لوگوں نے بظاہر تو حضرت مجددؒ رح کو ختم کرانے کی پوری کوشش کی۔ لیکن اللہ نے حضرت مجددؒ رح کو زندہ رکھا اور انہیں وہ عظمت و سربلندی حاصل ہوئی کہ آج بھی لوگ انہیں عزت و احترام سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں کو حرز جان بنائے ہوئے ہیں۔ اس سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور خصوصیت سے وہ لوگ جو ظلمت کدہ ہند میں ایمان کی شمع روشن کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے حضرت مجددؒ رح کی زندگی اور تعلیمات میں روشنی ہی روشنی ہے۔ اور علماء جنہوں نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی وہ حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ اور حضرت مجدد رح کامیاب و سرخرو رہے۔

قلعہ گوالیار سے رہائی کا ایک اور نقطہ نظر:۔

یہ خیال کہ جہانگیر کو حضرت مجددؒ رح سے عقیدت ہو گئی تھی اور آپ کو قید کرنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور اس کے بعد رہا کرنے کا فیصلہ کیا یہ خیال سراسر خوش فہمی اور تاریخ سے لاعلمی کی بنا پر ہے۔ جہانگیر کو اگر آپ رح سے عقیدت ہوتی اور آنحضرت کو خواب میں دیکھنے کی وجہ سے رہائی کا فیصلہ کرتا تو خود اپنے قلم سے آپ کے متعلق رہا کرتے ہوئے یہ نہ لکھتا کہ:۔

"شیخ احمد سرہندی کو جو "زہد فروشی" و "بیہودہ گوئی" کے سبب کچھ

۱۸۶ھ۔ مکتوبات امام ربانی رح جلد اول مکتوب نمبر

عرصہ سے قید کاٹ رہا تھا۔ طلب کیا ہوا تھا"۔ ۱۸۷

جہانگیر نے اس موقع پر بھی آپ کے شان میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں اس سے سراسر بے ادبی و گستاخی ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں عقیدت اور خلوص کے بجائے ایک طرح کی بے چینی اضطراب۔ سراسیمگی۔ حقارت۔ نفرت اور شکست خوردگی کا احساس پایا جاتا ہے۔ دوسرے یہ خیال کہ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کے بعد رہا کرنے کا فیصلہ کیا یہ بھی سراسر خوش فہمی اور خوش عقیدگی پر مبنی مفروضہ ہے۔ جس کو عقل و فہم سے کوئی سروکار نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کے لیے کچھ آداب و شرائط اور حدود ہیں اور اس کے لیے ایک معیار تقویٰ ہے جو جہانگیر میں ہمیں بہت کم نظر آیا ہے۔ جہانگیر جس کی زندگی شریعت کی خلاف ورزی پر مبنی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا ادنیٰ شائبہ تک نہیں۔ جس نے اپنی سترہ سالہ سرگزشت بھی خود لکھی ہو اور کہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ نہیں کیا۔ کثرت سے شراب پیتا ہے۔ افیون کھاتا ہے۔ ۱۸۸ کافرانہ و مشرکانہ رسم و رواج ادا کرتا ہے۔ علم نجوم پر ایمان رکھتا ہے ۱۸۹ ہندوستانیوں و جوگیوں کی مشرکانہ عبادات اور راہبانہ زندگی کا عقیدتمند ہے ۱۹۰۔ ایسے شخص کو ہم مسلمان تو مان سکتے ہیں لیکن عقل و فہم یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں کہ اس شخص کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں نظر آئیں گے اور حضرت مجدد کی بے گناہی پر شہادت دیں گے۔ یہ

---

۱۸۷ تزک جہانگیری (اردو ترجمہ) ص ۶۳۳۔

۱۸۸ تزک جہانگیری ص ۱۵۱ (شاہی افیون رکھنے کی خدمت خواص خاں کو سپرد کی اس سے قبل شیخ سیمین روزانہ کی افیون دینے اور پانی پلانے کی خدمت پر مامور تھا۔

۱۸۹ ۱-۲۷۱-۲۸۷-۵۷۳-۶۳۶-۶۷۶-۳۸۳ (دیوالی۔ دسہرہ۔ تیوراندی)

تولادان کی رسم۔ ۴۰-۱۰۴-۳۵۱-۴۰۵-۵۷۰-۵۹۷۔

جوتک روسے منجم کو زر میں تلوایا ص ۴۷۶ مزید اثہ قیبل اور روپوں میں تلوایا ۶۸۷۔

۱۹۰ تزک جہانگیری ۲۷۸-۳۸۲-۴۹۰-۵۲۲-۵۲۵-۵۷۷-۵۷۹-۷۰۰۔

یقین محض خوش فہمی اور خوش عقیدگی اور عقل و فہم سے عاری ہونے کے بعد ہی آسکتی ہے۔ اور پھر اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ جہانگیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کے بعد ہی حضرت مجدد رح کو رہا کرنے کا فیصلہ کیا تب تو اس کو حضرت مجدد رح کے تذکرے میں پاس و ادب کا لحاظ کرنا چاہیئے تھا۔ اس لیے کہ آپ رح کی عظمت، بزرگی، بے گناہی اور معصومیت کی تصدیق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مل چکی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا آزاد کرتے وقت بھی جو کلمات "زہد فروشی" اور "بیہودہ گوئی" کے استعمال کیے ہیں وہ سراسر معاندانہ ہیں اور تذلیل و تحقیر کرنے والے ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی یقین کیا جا سکتا ہے، کہ اس نے آپ رح کو کسی عقیدت یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کے بعد رہا کیا ہے؟ کیا یہی احترام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہو سکتا ہے کہ جس کی بے گناہی کی تصدیق آپ کریں اس کے متعلق یہ "القاب و آداب" استعمال کیا جائے؟ کیا یہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام کے خلاف نہیں ہیں؟

جہانگیر نے اپنے عہد حکومت کے سترہ سال تک کے واقعات خود ہی لکھے ہیں اور معمولی معمولی واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس نے اپنے باپ اکبر کو خواب میں دیکھنے کا تذکرہ کیا ہے[۱۹۱] اس لیے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھتا تو خود ضرور بالضرور تذکرہ کرتا کیونکہ یہ اس کی زندگی کا بہت ہی اہم واقعہ ہوتا لیکن پورے تذکرہ میں کہیں اس قسم کا تذکرہ نہیں ملتا اس لیے بھی یہ محض خیال وہم ہے کہ جہانگیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کے بعد آپ کو رہا کیا ہے۔

---

۱۹۱ تزک جہانگیری (اردو ترجمہ) ص ۲۸۷۔ ایک رات میں نے عرش آشیانی (شہنشاہ اکبر) کو خواب میں دیکھا مجھے کہہ رہے ہیں "بیٹا عزیز خاں، خان اعظم کی خطا میری خاطر بخش دو" چنانچہ خواب سے بیدار ہوتے ہی میں نے اسے قلعہ گوالیار سے واپس طلب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اس کے بیٹے عبداللہ خاں کو جو رنتھمبور کے قلعہ میں قید تھا دربار میں لایا گیا۔ اس کی بیڑیاں کھلوا کر اس کے باپ کے گھر بھجوا دیا۔ ص ۳۰۷۔

خلاصہ یہ کہ اس قسم کی تمام روایات محض خوش فہمی ۔ جوش عقیدت اور تاریخی واقعات سے لاعلمی پر مبنی ہیں ۔ اور آپ کے دربارہ میں طلبی ، قلعہ گوالیار میں نظر بندی بظاہر رہائی کے بعد ایک طرح کی نظر بندی جس طرح خالص سیاسی مصلحت اور حکومت کے مفادہ کے پیش نظر تھا اسی طرح آپ کی بظاہر رہائی بھی خالص سیاسی اور حکومت کے مفاد کے پیش نظر ہوئی ہے اس میں نہ کسی عقیدت کو دخل تھا اور نہ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب و بشارت کی ۔

جہانگیر اور ترویج شریعت :۔

جہانگیر حضرت مجدد رح کو سن جلوس ۱۴ میں قلعہ گوالیار میں قید تو کر دیتا ہے لیکن حضرت مجدد رح نے احیاء اسلام یا ترویج شریعت اور نفاذ شریعت کی جو حیات افزا اور روح پرور تحریک شروع کی تھی وہ عامتہ المسلمین کے دلوں کی آرزو بن چکی تھی وہ روز بروز موثر اور قوی تر ہوتی جا رہی تھی ۔ اس تحریک کو چہار دیواری میں مفید نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ چنانچہ جہانگیر کی نجی زندگی تو پرانے ڈگر ہی پہ چلتی رہتی ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی ۔ یعنی وہ شراب بھی پیتا ہے[192] افیون بھی کھاتا ہے[193] ہندوؤں کے تہوار دیوالی و دسہرہ بھی مناتا ہے[194] جشن وزن شمسی و قمری بھی ترتیب دیتا ہے[195] علم نجوم پر اعتماد کرتا ہے[196] اور ہندو جوتشیوں (منجموں) کی عزت و احترام کرتا ہے اور انہیں روپیوں اور اشرفیوں میں تلا کر تمام رقم

---

۱۹۲ تزک جہانگیری ۔ ص ص ۔ ۵۷۲ ۔ ۵۷۵ ۔ ۶۴۸ ۔ ۶۸۶ ۔ ۷۱۲ ۔ ۷۵۲ ۔ ۸۲۲ ۔
۸۵۲ ۔ ۸۵۳ ص ۔

۱۹۳ تزک جہانگیری ص ۔ ۶۵۰ ۔ ۶۵۱ ۔ ۷۱۲ ۔ ۸۵۲ ۔ ۸۵۳ ۔

۱۹۴ تزک جہانگیری ص ۵۷۳ ۔ ۶۴۶ ۔ ۶۸۵ ۔

۱۹۵ تزک جہانگیری ص ۔ ۵۷۰ ۔ ۵۹۷ ۔ ۶۴۰ ۔ ۶۶۳ ۔ ۶۸۷ ۔ ۶۹۴ ۔

۱۹۶ تزک جہانگیری ص ۶۲۴ ۔ ۶۳۱ ۔ ۶۸۷ ۔ ۷۰۷ ۔ ۷۳۷ ۔

بطور انعام بھی دیتا ہے[197] اور مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے شب برات بھی مناتا ہے[198] اور چاند گرہن ہونے پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سربسجود ہوتا ہے اور وقت کے تقاضے کے مطابق نقدی، جنس بطور خیرات و صدقہ فقیروں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کرتا ہے۔[199] اس کی یہ مشاغل اور عادتیں ظاہر کرتی ہیں کہ اس کی پرائیویٹ زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی لیکن اپنے طرز تحریر، حکومت کی پالیسیوں اور نقطہ نظر سے مسلمانوں کو یہ تاثر دینے کی ضرور کوشش کرتا ہے کہ اسے شرعی امور کے نفاذ میں ماضی کے مقابلے میں زیادہ دلچسپی ہے۔ اپنی تحریروں میں اب اللہ تعالیٰ کا نام دعائیہ و تمنائیہ انداز میں زیادہ ہی لیتا ہے اور کبھی کبھی سجدۂ شکر ادا کرنے کا تذکرہ بھی کرتا ہے[200] اور اپنی غربا پروری، خیر و خیرات اور صدقات دینے کا تذکرہ تفصیل سے کرتا ہے[201]

سن جلوس ۱۵ اور ۱۶ میں جہانگیر یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ اسے شرعی امور کے نفاذ میں زیادہ ہی دلچسپی ہے۔ ایک الجھے ہوئے دعویٰ میں قاضی اور میر عدل کو حکم دیتا ہے کہ شریعت کے احکام کے مطابق اس کا فیصلہ کرنے کے لیے جو امور لازمی

---

[197] تزک جہانگیری۔ ص ۴۶۷۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جہانگیر حضرت مجدد رح کے اثرات سے بہت غیر اسلامی باتوں سے تائب ہو گیا تھا وہ صحیح نہیں ہے۔

[198] تزک جہانگیری ص ۵۶۷۔ [199] تزک جہانگیری ۶۵۷۔

[200] تزک جہانگیری۔ ص ص ۔۴۶۔ ۶۵۴۔ ۶۸۴۔ ۶۸۶۔ ۶۹۷۔ ۷۰۲۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۲۵۔ ۷۳۳۔ ۷۴۳۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۵۔ ۷۶۹۔ وغیرہ وغیرہ۔

[201] تزک جہانگیری۔ ص ۶۶۹۔

نوٹ۔ سن جلوس ۱۵ کے واقعات کے ضمن میں لکھتا ہے کہ وہ اس سال پچاسی ہزار بیگے زمین، تین ہزار تین سو پچیس خروار غلہ۔ چار گاؤں، دو ہل، ایک باغ، دو ہزار تین سو ستائیس روپے، ایک مہر، چھ ہزار نو سو درب۔ سات ہزار آٹھ سو اسی جیتل۔ ایک درم غرباء میں تقسیم کیے ہیں۔

ہوں بجا لائیں۔[۲۰۲] راجوری کے مسلمانوں میں ہندوانہ رسوم اور بدعتیں جاری تھیں مثلاً عورتیں خاوند کے ساتھ ستی ہوتی تھیں۔ غریب لوگ لڑکی پیدا ہونے پر اس کا گلا گھونٹ کر مار دیتے ہیں۔ ہندوؤں سے رشتہ داریاں کرتے تھے۔ اپنی لڑکیاں ہندوؤں سے اور ہندوؤں کی لڑکیاں اپنے لڑکوں سے بیاہتے تھے"

جہانگیر نے حکم دیا کہ آئندہ سے اس رواج پر عمل نہ کیا جائے اور جو شخص اس حکم کی خلاف ورزی کرے اسے سزا دی جائے۔[۲۰۳]

سن جلوس ۱۶ میں خان عالم کا بھتیجا ہوشنگ کسی کو ناحق قتل کر دیتا ہے تو جہانگیر جرم ثابت ہو جانے پر اسے بطور قصاص قتل کیے جانے کا حکم دیتا ہے۔[۲۰۴]

فتح کانگڑہ کے بعد قلعہ کانگڑہ اور درگا مندر کی سیر کے لیے جاتا ہے تو قاضی اور میر عدل جو اس کے ہمرکاب تھے ان کو حکم دیتا ہے کہ قلعے میں داخل ہونے پر جن اسلامی اور شرعی امور کو بجا لانا ضروری سمجھیں، بجا لائیں اور جب اندر داخل ہوا تو اذان دلوا کر نماز اور خطبہ پڑھوایا اور اپنے سامنے گائے ذبح کروائی اور اللہ تعالیٰ کا سجدہ شکرانہ بجا لا کر اس قلعہ کے اندر ایک عالی شان مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا۔[۲۰۵]

اکبر کے عہد حکومت میں ذبیحہ گائے پر پابندی عائد تھی کیونکہ ہندوؤں کے نزدیک گائے ایک مقدس جانور ہے اور وہ اس کی پوجا کرتے ہیں اس لیے گائے ذبح کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ نہ صرف گائے ذبح ہوئی بلکہ قلعہ کانگڑہ میں جہاں ہندوؤں کا مقدس درگا مندر ہے گائے ذبح کی گئی۔ جہانگیر کا یہ فعل شریعت اسلامیہ کی اسپرٹ کے قطعی خلاف ہے کیونکہ اسلام کسی غیر مسلم

۲۰۲۔ تزک جہانگیری۔ ۶۲۹۔ سن جلوس ۱۵۔ اردی بہشت۔

۲۰۳۔ تزک جہانگیری۔ ۶۵۱۔ سن جلوس ۱۵ ماہ آبان۔

۲۰۴۔ تزک جہانگیری۔ ص ۶۸۴۔ سن جلوس ۱۶۔

۲۰۵۔ تزک جہانگیری۔ ص ۶۹۶۔ ۶۹۷ سن جلوس ۱۵۔

کی عبادت گاہ کی تقدیس کو تباہ کرنے کی اجازت دیتا ہے اور نہ ہی کسی غیر مسلم کی دل آزاری کو روا رکھتا ہے۔ اور جہانگیر خود اپنے ماضی کے روایات کے برعکس یہ کام کرتا ہے۔ ع۱ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر گائے ذبح کرا کے عامۃ المسلمین کے جذبات کو تسکین دینا چاہتا ہے اور ان پر یہ تاثر قائم کرنا چاہتا ہے کہ وہ شریعت کا حامی ہے کیونکہ اس کے اس فعل سے ہندو دو وجہ سے خوش نہیں ہو سکتے تھے۔ پہلی تو یہ کہ گائے ان کے نزدیک متبرک اور مقدس جانور ہے۔ دوسرے قلعہ کانگڑہ میں "درگا مندر" واقعہ ہے جو ہندوؤں کے نزدیک متبرک و مقدس

ع۱ گائے ذبح کرنے کے واقعہ کو اس پس منظر میں دیکھا جائے کہ جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کے موقع پر ۱۲ قوانین پر مشتمل جو دستور العمل جاری کیا تھا اس کے دسویں شق کے مطابق جہانگیر کی پیدائش سے اب تک جتنے سال بنتے ہیں اتنے دن ذبیحہ نہ کیا جائے اس کے علاوہ ہفتہ میں دو دن ذبیحہ نہ ہو یعنی جمعرات اور اتوار کے دن۔ جمعرات اس لیے کہ تخت نشینی کا دن ہے۔ اور اتوار اس لیے کہ شہنشاہ اکبر کا یوم پیدائش ہے۔ دوسرے اکبر اتوار کو اس لیے بھی مبارک سمجھتا تھا کہ یہ دن سورج سے نسبت رکھنے کے ساتھ دنیا کی پیدائش کا پہلا دن بھی ہے۔ ایک بار جمعرات کو عید قربان (۱۰۱۹ھ) ہوئی تو جہانگیر نے حکم دیا کہ جمعرات کے بجائے جمعہ کے دن عید کی قربانیاں کی جائیں" (یعنی جمعرات کے بجائے جمعہ کو قربانی کر کے شریعت کے بجائے اپنے حکم کو ترجیح دی) (تزک جہانگیری ص ۲۰۴ - ۲۰۵ - ۲۱۰ ص -) لیکن قلعہ کانگڑہ میں یہ رواداری قائم نہیں رہتی کیونکہ یہاں سیاسی حکمت عملی اس بات کی متقاضی تھی کہ جہانگیر مسلمانوں کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ ترویج شریعت اور شعائر اسلام کا حامی ہے۔ دوسرے یہ قلعہ شاہجہان کی رہنمائی میں فتح ہوا تھا۔ اس نے سن جلوس ۱۵ میں اعلانیہ شراب سے توبہ کی تھی، تیسرے حضرت مجدد رح جو نے شعائر اسلامی کی ترویج و نفاذ کی کوشش کر رہے تھے وہ حال ہی میں قید سے رہا ہو کر نظر بند تھے۔ اس لیے جہانگیر اپنے اس فعل سے ان حضرت کے سیاسی اثرات کو بھی مسلمانوں سے زائل کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے قلعہ کانگڑہ میں گائے ذبح کرنے کا منفرد واقعہ ہے۔ جبکہ جہانگیر کے پورے دور حکومت میں کہیں اور گائے ذبح کرنے کا واقعہ نہیں ملتا۔)

ہے۔ اس لیے ہندوؤں کے خوش ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا البتہ جہانگیر کے اس فعل سے عام مسلمانوں میں اس کو ضرور سستی شہرت حاصل ہوئی ہوگی جن کو خوش کرنے کے لیے اس نے یہ کام کیا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عامۃ المسلمین میں اکبر کے عہد میں پھیلائی ہوئی گمراہیوں اور ضلالتوں کے رواداری کے نام پر بے حمیتی کے بارے میں شدید بیزاری پیدا ہو گئی تھی اور ان کو خوش کرنا ہی جہانگیر کا اصل مقصد تھا تاکہ عام مسلمانوں میں اس کی اسلام سے وابستگی کی شہرت ہو۔

قلعہ کانگڑہ میں جہانگیر نے مسجد تعمیر کرنے کا حکم بھی دیا جو جلد ہی تعمیر ہو جاتی ہے۔ وہ اس کا تذکرہ اپنی تزک میں اہتمام سے کرتا ہے[۲۰۶]۔ پھر اسی پر نہیں کرتا بلکہ اسی زمانے میں کشمیر میں فقراء کے لیے گرم لباس اور مساجد میں وضو کے لیے گرم پانی کا انتظام کرنے کے لیے ایک قصبہ کی مال گزاری ملا طالب اصفہانی کے حوالے کیے جانے کا حکم دیتا ہے[۲۰۷]۔

جہانگیر محض ان اقدامات ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس اثناء میں "درگا مندر" کی سیر کرتے ہوئے "بت پرستی" کی مذمت بھی کرتا ہے۔ مندر پر نذر چڑھانے کو گمراہی قرار دیتا ہے۔ پتھر جس کی لوگ عبادت کرتے ہیں اس کے متعلق کہتا ہے کہ یہ پتھر "کفار شقاوت آثار کا معبود اور مرکز عقیدت" ہے۔ بت پرستوں کے متعلق "کفار" اور جو لوگ بت پرستی کراتے ہیں ان کے متعلق "کفر و ضلالت" کی دوکان آراستہ کرنے کا الفاظ استعمال کرتا ہے یہی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری سمجھتا ہے کہ "ہندوانہ طرز تعمیر" کے متعلق بھی نفرت و حقارت کا اظہار کرے چنانچہ اس بارے میں کہتا ہے کہ ہندو جو بھی عمارت اپنے ڈھب سے بناتے ہیں انتہائی تکلف سے بنانے کے باوجود "دلنشیں نہیں" ہوتی[۲۰۸]۔ جہانگیر کا ہندوں کی بت پرستی کی مذمت، ان کی عمارتوں

---

[۲۰۶] تزک جہانگیری ص ۷۰۰۔ [۲۰۷] تزک جہانگیری ص ۷۰۸

[۲۰۸] تزک جہانگیری ص ۶۹۷ تا ۶۹۹۔

نوٹ:۔ جہانگیر کے یہ خیالات سن جلوس ۱۶ کے ہیں۔ جو اس کی سیاسی حکمت عملی (باقی بر صفحہ آئندہ)

پر ناپسندیدگی کا اظہار اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ہندو مسلم کے اشتراک سے جس نئے کلچر یا ثقافت کی سرپرستی کی ابتدا اکبرؒ کے عہد میں شروع ہوئی تھی۔ اور جہانگیر کے عہد میں جس کو اب تک فروغ حاصل ہوا تھا۔ اب مسلم رائے عامہ اس کے سخت خلاف ہو گئی تھی۔ جسے مطمئن کرنے اور اپنے نقطہ نظر کو واضح کرنے کے لیے یہ سخت الفاظ اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔

جہانگیرؒ نے منفی انداز بیان ہی سے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ایجابی طور پر قلعہ کانگڑہ کی فتح کو اللہ تعالیٰ کی زبردست عنایت اور مہربانی قرار دے کر سجدۂ شکر بجالایا اور کہتا ہے کہ جب سے دین مبین اسلام اس سرزمین میں پہنچا ہے کسی ایک شان و شوکت والے مسلمان بادشاہ کو یہ فتح نصیب نہیں ہوئی وہ اس فتح کو اپنی اسلام سے وابستگی اور اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت قرار دیتا ہے۔ اور مزید کہتا ہے کہ ظاہری اسباب پر نظر رکھنے والے کم فہم لوگ بہت مشکل سمجھتے تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص لطف و کرم

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) کا نتیجہ ہیں۔ ابتدائی عہد حکومت میں اس کے یہ خیالات مندروں کے متعلق نہیں ملتے بلکہ وہ پہلا شخص ہے جس کے زمانے میں بیر سنگھ بندیلہ کو بت خانہ بنانے کی اجازت دی گئی۔ (مقدمہ رقعات عالمگیری۔ مصنفہ سید نجیب اشرف ندوی ص ۲۴۶)۔

جہانگیر کی اس ہمت افزائی یا چشم پوشی ہی کا نتیجہ تھا کہ متھرا میں کثرت سے شاندار مندر تعمیر ہوئے اور متھرا اس زمانے میں (دین مبین اسلام اس سرزمین میں) فرقہ کا مقدس اور اہم ترین مرکز کی حیثیت سے دوبارہ شہرت اور مرکزی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ اور اس کے آخری عہد حکومت تک صرف بنارس میں ستر (۷۰) نئے مندر تعمیر ہو جاتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو

مزید ملاحظہ ہو۔ مآثر الامراء مصنفہ صمصام الدولہ شاہنواز خاں حصہ دوم۔ مترجم ایوب قادری ص ۱۹۹۔۲۰۲۔

ہے جو مجھ پر ہوا ہے۔[۲۰۹]

جہانگیر۔ فتح کانگڑہ اور اس کی سیر سے احیاء شریعت کے حامیوں کو جو خوشگوار تاثر دیتا ہے اس کو مزید پائیدار بنانے کے لیے عبدالعزیز خاں نقشبندی کو قلعہ کانگڑہ اور اس کے نواحی علاقوں کا فوجدار مقرر کرتا ہے اور ان کو دو ہزار (۲۰۰۰) پیادوں اور ڈیڑھ ہزار (۱۵۰۰) سوار کے منصب پر متعین کرتا ہے[۲۱۰]۔ جہانگیر کی یہ تمام کارروائی اس کی سیاسی حکمت عملی کا

---

[۲۰۹] تزک جہانگیری۔ ص ۶۵۴۔ ۶۵۶۔

نوٹ:۔ کانگڑہ فتح کرنے کی ذمہ داری شاہ جہان نے لی تھی۔ اس مہم میں اس کے ہندو امراء میں سے راجہ بکرماجیت ہری نرائن ھاڈا۔ رائے پرتھی، اس کے بیٹے اور رام چندر بھی شریک تھے۔ (تزک ص ۹۸۴) اور راجہ ستدر نے محاصرہ کر کے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔ (تزک جہانگیری ۶۵۷ ص) جہانگیر نے قلعہ کانگڑہ میں جو کچھ کیا اس سے ہندو امراء خوش نہیں ہو سکتے تھے لیکن سن جلوس ۴ میں شیخ احمد سرہندی کو قلعہ گوالیار میں قید کیا گیا جن کا شاہ جہان معتقد تھا۔ اس لیے اس قید سے ترویج شریعت کے حامیوں میں ایک بے چینی و اضطراب لازمی تھا۔ غالباً جہانگیر انہیں کی حمایت حاصل کرنے اور اطمینان کے لیے تمام اصلاحات کرتا ہے تاکہ وہ مطمئن ہوں۔ اس کے بعد ہی شاہ جہان سے سرد مہری کا آغاز کرتا ہے جس کا انجام جنگ کی صورت میں نکلتا ہے۔

[۲۱۰] تزک جہانگیری ص ۶۵۶۔

نوٹ:۔ سن جلوس ۱۵۔ ماہ آذر میں کانگڑہ کا قلعہ دار مقرر کیا۔ ایک ماہ چند دن کے بعد تبادلہ کر کے قندھار کا قلعہ دار مقرر کیا۔ سولہویں سن جلوس یکم مرداد الٰہی میں ۳ ہزار ذات اور دو ہزار (۲۰۰۰) سوار کے منصب پر ترقی دی۔ انیسویں سن جلوس ۱۹۔ ماہ خرداد کو سیدہ نامی منصب دار کو سپرد کر دیا کہ اسے سورت کی بندرگاہ سے جہاز میں بٹھا کر مکہ معظمہ کو روانہ کر دے لیکن بعد میں فرمان بھیجا کہ اسے قتل کر دے۔ چنانچہ سیدہ نے حسب فرمان اس بدقسمت کو راستے میں ٹھکانے لگا دیا۔ معتمد خاں کے بیان کے مطابق خواجہ خندہ پیشانی خوش مزاجی اور بے تکلفی کے صفات سے بہرہ ور تھا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اسے جوار رحمت میں جگہ دے۔ ـ تزک جہانگیری ص ۶۵۶۔ ۶۶۳۔ ۷۸۹) و اقبال نامہ جہانگیری ص ۱۶۴، ۱۷۶۔

نتیجہ ہیں۔ کیونکہ سن جلوس ۷ سے اس کی سیاسی محاذ آرائی شاہ جہان سے شروع ہو جاتی ہے اور اس کی سیاسی حلیف وہ طاقتیں بنتی ہیں جن سے احیاء اسلام اور ترویج شریعت کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

جہانگیر اور اسلام :۔

جہانگیر اسلام سے منحرف تو نہ تھا اور نہ ہی اس کی مملکت کی پالیسی اکبر کی طرح اسلام سے عناد پر مبنی تھی۔ تخت نشینی کے بعد اس نے بہت سے ایسے اقدامات بھی کیے ہیں جس سے اکبری عہد کے رجحان کمزور ہوتے ہیں اور اسلامی قوتوں کو ابھرنے کا موقع ہے۔ ۱۶۰۵ء سے لے کر ۱۶۱۱ء تک معاملات ملکی میں اُنہی امراء مملکت کو دخل رہا ہے جو اسے اقتدار میں لائے تھے البتہ ۱۶۱۱ء میں نورجہاں سے شادی کے بعد اس کے خانوادے کو عروج و اقتدار حاصل ہوا۔ ۱۶۱۴ء میں شیخ فرید کے انتقال کے بعد (شیخ فرید نے اقتدار میں لانے کے لیے اہم کردار ادا کیا) وہ مکمل طور پر خانوادہ نورجہاں کے زیر اثر آ جاتا ہے۔ انہیں حضرات کے زیر اثر ۱۶۱۹ء میں حضرت مجدد رح کو قلعہ گوالیار میں قید کرتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد سن جلوس ۱۵ اور ۱۶ میں بہت سے ایسے کام کرتا ہے جس کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام مسلمان اسے اسلام کا حامی تصور کریں چنانچہ اس زمانے میں وہ زیادہ ہی ایسے لوگوں سے ملاقاتیں کرتا ہے جن کو وہ اپنے تصور اسلام کے مطابق پاتا ہے۔ وہ اپنے باپ شہنشاہ اکبر کے روضہ کی زیارت کو جاتا ہے اور ایک محفل سماع منعقد کرتا ہے جس میں مشائخ۔ علماء۔ حفاظ اور قوالوں کو طلب کر کے وجد و سماع کی محفل آراستہ کرتا ہے اور حاضرین میں سے ہر ایک کو اس کے استحقاق اور قابلیت کے مطابق خلعت وغیرہ دیتا ہے [۲۱۱]۔ اس کے چند دن کے بعد متھرا میں گسائیں جدروپ سے ملنے جہانگیر خود جاتا ہے اور اپنی تزک میں اس کا تذکرہ نہایت ہی عقیدت و احترام سے کرتا ہے۔ اس کے اپنے الفاظ ہیں :۔

---

[۲۱۱] تزک جہانگیری ۲۸۷، سن جلوس ۱۴، ماہ آبان ۲۔ بروز جمعہ۔

"وہ کافی دیر تک خلوت میں کسی دوسرے کی مداخلت کے بغیر اس سے ملاقات رہی۔"

"سچ تو یہ ہے کہ اس کا وجود بہت غنیمت ہے اور اس کی گفتگو سے انسان بہت محظوظ اور مستفید ہو سکتا ہے۔ وہ اس سے اس قدر متاثر معلوم ہوتا ہے کہ پہلی ملاقات کے تین دن بعد پھر اس کی قیام گاہ پر ملاقات کے لیے جاتا ہے۔ پھر تیسری بار دو دن کے بعد اس سے ملاقات کرنے اور رخصت ہوتے جاتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ جدا ہوتے وقت بلا مبالغہ طبیعت افسردہ ہوئی۔"

گسائیں جدروپ کا تذکرہ جہانگیر ان الفاظ میں کرتا ہے:-

"اللہ تعالیٰ نے اسے غیر معمولی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ اس کی ذات میں اعلیٰ درجے کی ذہانت۔ بلند فطرتی۔ تیز ادراک علم و دانش کے ساتھ مجتمع ہونے کے باوجود اس نے اپنے آپ کو علائق دنیوی سے آزاد کر کے دنیا و ما فیہا کو ٹھوکر لگا دی ہے اور کنج عزلت میں بیٹھ گیا ہے۔ اس نے دنیوی مال و متاع سے ستر پوشی کے لیے صرف آدھ گز پرانا کھدر اور ایک مٹی کا پیالہ اختیار کیا ہے جس میں صرف چند گھونٹ پانی سما سکتا ہے۔ سردی ہو، گرمی ہو یا برسات ستر کو چھوڑ کر سر سے پیر تک ننگا رہتا ہے۔ ایک ایسے غار کو اپنی رہائش گاہ قرار دیا ہے جسے سخت محنت و کوشش سے بنایا گیا ہے اور جس میں داخل ہونے کے لیے دودھ پیتے بچوں کی طرح گھٹنوں کے بل داخل ہونا پڑتا ہے۔" ۲۱۲ھ

۲۱۲ھ تزک جہانگیر ص ۵۷۷-۵۷۸-۵۷۹-۵۸۰- اس سے قبل بھی جہانگیر جدروپ گسائیں سے ملنے گیا تھا۔ اس کی روحانی بلندی۔ علائق دنیا سے بے نیازی، گوشہ نشینی، عبادت گزاری، کنج عزلت کی تنگی وغیرہ کی تعریف کرتا ہے۔ (تزک ۳۷۸-۳۸۲-۵۲۲-۵۲۵ ص)۔

نوٹ:- حضرت مجدد کو قلعہ گوالیار میں قید کرنے کے تقریباً ساڑھے چار ماہ (باقی بر صفحہ آئندہ)

جہانگیر کی یہ تحریر بہت واضح ہے اس سے اس کے تصور اسلام کے متعلق اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسلام اس قسم کی دینداری کا قائل نہیں یہ زندگی سراسر شریعت اسلام کے منافی اور سنّتِ نبوی ؐ سے انحراف پر مبنی ہے کوئی مسلمان اس کو اپنے لیے نمونہ نہیں بنا سکتا۔ اور نہ ہی اس کی تقلید اور تعریف و توصیف کر سکتا ہے۔ لیکن جہانگیر کو یہی دینداری پسند ہے اسی لیے وہ بار بار جدروپ گسائیں سے ملتا ہے اور اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہے۔

جہانگیر اسی سال دہلی میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحؒ سے ملاقات کا تذکرہ کرتا ہے:۔

"دہلی میں اس مرتبہ کے ورود پر شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے جو اہل علم و فضل میں سے ہے شرف حضوری حاصل کر کے اپنی ایک تصنیف؎ ملاحظہ کے لیے میری نظر سے گزاری۔ جو ہندوستان کے علماء و مشائخ کے حالات زندگی پر مشتمل ہے اس نے اس تصنیف پر بہت محنت کی ہے۔ وہ ایک مدت سے ترک دنیا کر کے دہلی میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ قابل قدر آدمی ہے اور اس کی ملاقات لطف سے خالی نہیں۔ میں نے اسے طرح طرح کے الطاف و عنایت سے نواز کر کے رخصت کیا" ۲۱۳

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) بعد جہانگیر جدروپ گسائیں سے ملنے خود جاتا ہے۔ اور ایک ہفتہ میں تین بار جا کر ملتا ہے۔ اور اسی کے مشورہ سے سیر کا وزن ۳۶ درم کے برابر مقرر کیا۔ (تزک جہانگیری۔ ص۔ ۵۸۰)۔

۲۱۳ تزک جہانگیری۔ ص ۵۸۳۔ (حضرت مجدد کو قید کرنے کے پانچ ماہ ۲۳ دن بعد ملاقات کرتا ہے)۔

؎ تصنیف کا نام "اخبار الاخیار" ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحؒ دہلی میں ماہ محرم ۹۵۸ھ بمطابق ۱۵۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اکبر۔ جہانگیر کا دور حکومت دیکھا اور شاہ جہان کے عہد میں ۲۱ ربیع الاول (باقی بر صفحہ آئندہ)

اسی سال ماہ بہمن میں جہانگیر شیخ محمد میر سے ملاقات کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس کے اپنے الفاظ ہیں:۔

"لاہور میں شیخ محمد میر نام کا ایک نہایت فاضل، ریاضت کش، مبارک نفس اور صاحب حال سندھی نژاد درویش گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا ہے اور صبر و توکل پر عمل کرتے ہوئے صفائی باطن سے بہرہ ور ہو چکنے کے علاوہ دولت فقر سے مالامال اور حصول دنیوی سے بے نیاز ہے۔.........

.......دیر تک تخلیے میں ان کے ساتھ عالمانہ صحبت رہی فی الواقع نہایت

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ۱۰۵۲ھ بمطابق ۱۶۴۲ء کو انتقال کیا آپ اپنے عہد کے زبردست عالم تھے بہت سی بلند پایہ علمی کتابوں کے مصنف ہیں۔ تمام عمر تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں صرف کیا آپ ہی نے ہندوستان میں علم حدیث کی شمع کو روشن کیا ہے۔

آپ اور حضرت مجددؒ پیر بھائی بھی تھے۔ آپ بھی خواجہ باقی باللہؒ سے مرید تھے۔ ابتدا میں آپ کو حضرت مجددؒ کے نظریات سے اختلاف ہو گیا تھا۔ اور حضرت مجددؒ کی تردید میں رسالہ بھی لکھا۔ یہ اختلاف علمی، نیک نیتی اور تحفظ شرع و سنت نبوی پر مبنی تھا۔ حضرت مجددؒ نے اپنے خیالات کی وضاحت کی تو تمام شکوک و شبہات دور ہو گئے اور وسعت قلب کے ساتھ حضرت مجددؒ کے کارناموں کا اعتراف کیا۔

آپ اور حضرت مجددؒ میں خط و کتابت بھی رہی ہے حضرت مجددؒ کے خطوط آپ کے نام جلد اول نمبر ۱۵ جلد دوم مکتوب ۲۹ اور جلد سوم میں مکتوب نمبر ۱۰۰ ہے۔

جہانگیر نے جس تصنیف کا تذکرہ کیا ہے وہ "اخبار الاخیار" ہے جس میں ہندوستان کے علماء و مشائخ کا مستند تذکرہ ہے شیخ محدث نے حضرت معین الدین چشتیؒ اجمیری سے لے کر اپنے زمانے کے مشہور علماء اور مشائخ کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کے بیان کے مطابق "اخبار الاخیار" شیخ محدث کے علمی تبحر، انداز تحقیق اور وسعت مطالعہ کا بہترین آئینہ دار ہے۔

شریف النفس ہیں اس دور میں ان کا وجود نہایت غنیمت و قیمتی ہے۔ میں وارفتگی کے ساتھ ان سے محو کلام رہا اور نہایت قابل قدر عارفانہ باتیں سننے میں آئیں۔ ان کی خدمت میں نیاز پیش کرنے کو بہت جی چاہا لیکن ان کی ذات گرامی کو ان باتوں سے بالا دیکھ کر ہمت نہ ہوئی۔ سفید ہرن کی کھال کا بنا ہوا ایک مصلیٰ ان کی خدمت میں نذر کیا۔" ۲۱۴ھ

طویل اقتباسات کے لیے قارئین معاف کریں لیکن ان سے درخواست ہے کہ جہانگیر کی تحریریں جو حضرت مجددؒ رح کے متعلق اور صرف اس سے چند ماہ بعد اس کی تحریریں جو اس نے گسائیں جدروپؒ، شیخ عبدالحقؒ محدث دہلوی رح اور میاں محمد میرؒ رح کے متعلق لکھی ہیں ۲۱۵ھ ان کا مطالعہ، تجزیہ اور موازنہ کریں تو معلوم ہو گا کہ وہ حضرت مجددؒ رح سے تو بہت ہی برہم ہے اور ان کے خلاف ایسے الفاظ استعمال کیے جس سے اس کی قلم کی شائستگی و شرافت اور ادبیت مجروح ہوتی ہے اس کے برعکس وہ گسائیں جدروپ کی مذہبیت سے اس قدر متاثر ہے کہ وہ خود اس کے پاس ایک ہفتہ میں تین بار ملنے جاتا ہے اور کس قدر احترام و عقیدت سے اس کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس نے گسائیں جدروپ کے جن عادات و صفات اور خوبیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جہانگیر کے نزدیک مذہبیت و دینداری کا تصور کیا تھا؟

اسی طرح حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح اور میاں محمد میرؒ رح سے بھی عقیدت و احترام کا تذکرہ کرتا ہے۔ لیکن یہاں بھی اس کی پسند کا اپنا ایک معیار ہے اور اس معیار پر جو پورا اترا اس کی اس نے قدر کی۔

۲۱۴ھ تزک جہانگیری ۔۵۹۱ ۔ ۵۹۲ ص ص (حضرت مجدد رح کے قید کے تقریباً ۸ ماہ بعد ملاقات ہوتی ہے۔

۲۱۵ھ تزک جہانگیری۔ ص۔ ۵۶۳ ۔ ۵۷۷ ۔ ۵۷۸ ۔ ۵۷۹ ۔ ۵۸۰ ۔ ۵۸۳ اور ۵۹۱ ۔ ۵۹۲ ص۔

یہ بزرگان دین اپنے وقت کے قابل احترام بزرگ ضرور تھے۔ یہ لوگ متقی۔ خدا ترس، عبادت گزار اور جہانگیر کے اپنے الفاظ ہیں :۔

"ترک دنیا کر کے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ انہیں علائق دنیا سے کوئی تعلق یا سروکار نہ تھا۔ یہ لوگ صبر و توکل و قناعت پر عمل کرتے تھے اور صفائی باطن سے بہرہ ور ہو چکنے کے علاوہ دولت فقر سے مالامال اور حصول دنیا سے بے نیاز تھے۔"

ان بزرگوں کی یہی صفت تھی جس سے جہانگیر متاثر ہوا۔ یہ لوگ خود نیک۔ راست بازی صداقت شعاری اور شرافت کا نمونہ تھے۔ کسی کی دل آزاری نہ کرتے تھے۔ یہ خود بہت اچھے اور پاک، صاف کردار کے مالک تھے۔ ان کی ریاضت، عبادت گزاری نفس کشی اور علم سے لوگ متاثر ہوتے تھے۔ ان کی خواہش و آرزو تھی کہ لوگوں کے اخلاق و کردار سدھریں۔ ان میں تقویٰ۔ دینداری پیدا ہو۔ جو لوگ ان سے ملتے رہے ہوں گے وہ ان سے ضرور متاثر ہوتے رہے ہوں گے۔ ان کی زندگیوں میں تبدیلیاں آتی رہی ہوں گی۔ لیکن حضرت مجدد رح کے مکتوبات کا مطالعہ کریں[۵] تو وہ ان بزرگوں سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔ ان خطوط کے مطالعہ سے قاری میں ایک ولولہ، جوش و تڑپ اور عزیمت و حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ ان کا ہر خط شریعت کی عظمت و اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ اس سے قاری کے ذہن و فکر اور عمل میں ہی تبدیلی نہیں آتی بلکہ اس میں حرکت و تڑپ بھی پیدا ہوتی ہے کہ وہ شریعت پر نہ صرف خود عمل کرے بلکہ غالب کرے۔ حضرت مجدد رح کی یہی صفت تھی جس کی طرف ان کے پیر و مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ رح نے تربیت کے دوران ہی اشارہ کر دیا تھا کہتے ہیں کہ :۔

۵۔ حضرت مجدد رح کے خطوط کے تین دفتر ہیں۔ پہلے دفتر میں ۳۱۳ (تین سو تیرہ) دوسرے میں ۹۹ اور تیسرے میں ۱۲۴ خطوط ہیں۔ لیکن جہانگیر صرف مکتوب نمبر ۱۱ جلد اول کا تذکرہ کرتا ہے اور اس خط کے بنیاد پر الزام، اتہام کی پوری عمارت تعمیر کرتا ہے۔

"شیخ احمد نام مردے است در سرہند کثیر العلم و قوی العمل۔ روزے چند فقیر با او نشست و برخاست کردہ عجائب بسیار از روزگار و اوقات او مشاہدہ کردہ آں می ماند کہ چراغے شود کہ عالم ہا از و روشن گردند" ۲۱۶ھ

(ترجمہ) شیخ احمد نامی سرہند میں ایک بہت علم والے اور عمل میں بہت قوی ایک آدمی ہیں۔ کئی روز اس فقیر نے ان کے ساتھ نشست و برخاست کی ہے اور ان کے زمانہ اور اوقات کے بہت سے عجائب مشاہدہ کیے ہیں وہ ایک چراغ کے مثل ہیں کہ ساری دنیا ان سے روشن ہوتی ہے۔

حضرت مجدد رح کی یہی صفت تھی جس نے ان کو علماء حق و مخلص بزرگان دین اور اپنے عہد کے عامۃ المسلمین کی نگاہوں میں ممتاز و سربلند کر دیا تھا۔ انہوں نے محض وعظ و تلقین پر اکتفا نہیں کیا۔ محض آرزوں و خواہش پر نہیں جیئے بلکہ اپنے متاثرین کو عمل و حرکت پر آمادہ کیا۔ وہ محض کہتے نہ تھے بلکہ کرتے تھے اور زور دیا کرتے تھے کہ شریعت کے مطابق زندگی، معاشرت، ثقافت اور پوری نظام زندگی ہونی چاہیئے۔ اپنے عہد کی ایک ایک کمزوریوں، خرابیوں خامیوں، فتنوں اور کج رویوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور امراء مملکت کو جس قدر خطوط لکھے ہیں ان میں انہیں اس بات پر آمادہ کرتے ہیں کہ وہ شریعت کو غالب کرنے کے لیے اپنے منصب و مرتبے سے پوری پوری کوشش کریں۔ ان کے عقائد و تصورات کی اصلاح کرنے پر زور دیا۔ معاشرے میں عقائد یا عمل میں یا معاشرتی زندگی یا زندگی کے کسی پہلو میں بھی سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو بات بھی آپ رح کو نظر آئی اس کی نہ صرف گرفت کی بلکہ اصلاح کے لیے پیش قدمی کی اور اپنی تحریروں سے ایک منظم۔ فعال۔ سرگرم لوگوں پر مشتمل ایک حلقہ اثر پیدا کر لیا۔ جس کے درمیان قدر مشترک نفاذ شریعت اور اتباع سنت نبوی کا اعلیٰ ترین نصب العین تھا۔

۲۱۶ھ کلیات باقی باللہ رح مرتبہ مولانا ابوالحسن ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مکتوب نمبر ۶۵ ص ۱۳۰۔

آپ رحؒ نے اپنے عہد کے بزرگان دین کی طرح "گوشہ نشینی"، "ترک دنیا" یا علائق دنیوی سے علیحدگی یا حصول دنیا سے بے نیازی اختیار نہیں کی بلکہ اس کے برعکس اس بات کی جدوجہد کی اور لوگوں کو اپنا ہمنوا بنایا کہ زندگی کو مکمل طور پر شریعت کے تابع کیا جائے۔ آپ کی ان کوششوں سے معاشرے میں ایک موثر خواہش پیدا ہوئی کہ شریعت کو غلبہ حاصل ہو۔ معاشرے میں جوں جوں یہ خواہش زور پکڑتی ہے۔ دربار پرست علماء دین، مفاد پرست اور ابن الوقت امراء مملکت اور شریعت کی تعلیمات سے بے نیاز عقل پرست اور ہوائے نفس کے بندے اپنے لیے دائرہ تنگ محسوس کرتے ہیں اور انہیں حضرت مجددؒ رح کی مقبولیت سے اپنے اپنے مفادات کو خطرہ محسوس ہوتا ہے اس لیے وہ آپ کے خلاف حرکت کرتے ہیں۔ جہانگیرؔ نے آپ کے خلاف جو تند و تیز جملے لکھے ہیں اس کا یہی پس منظر ہے۔ اس کی زندگی کا نقطہ نظر۔ اس کی مذہبیت، دینداری کا تصور۔ اس کا اسلام حضرت مجددؒ رح سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اپنے معیار اسلام پر حضرت مجددؒ رح کو پورا نہیں پاتا اسی لیے اس کو حضرت مجددؒ رح میں خرابیاں ہی خرابیاں نظر آتی ہیں۔ جس کو اس نے صاف صاف بیان کیا ہے۔ اس کے برعکس اس کے تصور اسلام اور مذہبیت پر جو لوگ پورے اترتے ہیں۔ ان کی تعریف و توصیف کرتا ہے اور انہیں اچھے الفاظ میں یاد کرتا ہے سن جلوس ۱۵ اور ۱۶ میں اس نے نفاذ شریعت کے سلسلے میں جو اقدامات کیے ہیں وہ مسلم رائے عامہ کے دباؤ کے تحت کیے ہیں یا اس کی سیاسی حکمت عملی کا نتیجہ ہیں جو مسلم رائے عامہ کو مطمئن کرنے کے لیے کرتا ہے اس لیے کہ سن جلوس ۱۷ سے اس کی مملکت کی پالیسی تبدیل ہو جاتی ہے۔

شاہ جہان اور جہانگیر:۔

شاہ جہان ۱۶۰۵ء سے ۱۶۲۱ء تک جہانگیر کا سب سے زیادہ منظور نظر اور لائق ترین بیٹا تھا۔ جہانگیر بھی اس پر بہت اعتماد کرتا ہے۔ ۱۶۰۵ء میں تخت نشین ہوتے ہی اس کو نائب سلطنت مقرر کر کے خسرو کے تعاقب کے لیے روانہ کرتا ہے [۵۲۱/۱۷]۔ اسی کو شاہی خواتین کو

[۵۲۱/۱۷] اقبال نامہ جہانگیری مصنفہ میرزا معتمد خان بخشی ص ۲۴۔ نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۶۳ء۔

اپنے پاس لانے کے لیے متعین کرنا ہے۔[۲۱۸] دوسرے ہی سن جلوس بمطابق ۱۲ مارچ ۱۶۰۷ء کو آٹھ ہزاری ذات و پانچ ہزاری سوار کا ممتاز منصب۔ جاگیر، تومان، طوغ، علم اور نقارہ عطا کیا۔[۲۱۹] خسرو نے جب دوسری بار باغیانہ سازش کی اور جان لینے کا ارادہ کیا تو خرم ہی نے سب سے پہلے جہانگیر کو اطلاع دی تھی۔ اس سبب سے جہانگیر بہت خوش ہوا اور اس کی سعادت مندی پر دعائیں اور سازش کرنے والوں کو عبرتناک سزائیں دیں۔[۲۲۰] خرم کی اس خدمت سے جہانگیر کی نہ صرف جان بچی بلکہ سازش ناکام ہوئی اور اس کی حکومت قائم رہی۔ اس سے جہانگیر کی نگاہ میں اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا اور جہانگیر کی نگاہ میں معتمد علیہ ہو گیا۔ اور خرم کے منصب ۸ ہزاری ذات اور پنج ہزاری سوار کے برابر قرار دے کر اوجین اور سرکار حصار فیروزہ کے علاقے اسے تنخواہ کے طور پر جاگیر میں دیا۔[۲۲۱] خرم کی شادی کے موقع پر جہانگیر اس قدر خوش تھا کہ نہ صرف اس نے اکثر امراء اور درباریوں کو خلعت دی بلکہ قلعہ گوالیار میں قید کاٹنے والے بہت سے قیدیوں کو رہائی بھی دی۔[۲۲۲] (قلعہ گوالیار میں خطرناک قسم کے سیاسی قیدی رکھے جاتے تھے) سن جلوس ۶ میں جہانگیر نے خرم کا منصب دس ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کر دیا۔[۲۲۳]

---

۲۱۸ تزک جہانگیری۔ ص ۱۰۲۔

۲۱۹ تزک جہانگیری ۱۱۴۔

۲۲۰۔ تزک جہانگیری ۱۴۵ و اقبال نامہ جہانگیری ص ۴۰۔

۲۲۱ تزک جہانگیری ۱۵۴۔

۲۲۲ تزک جہانگیری ص ۱۰۲۔ اقبال نامہ جہانگیری ۵۵۔

۲۲۳ تزک ۲۱۳ ص۔

نوٹ: شاہ جہان کا اصل نام "خرم" تھا۔ یہ نام شہنشاہ اکبر نے پیدائش کے چھٹے دن کی تقریب میں رکھا تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت اکبر ہی کے زیر نگرانی ہوئی اور اکبر خرم کو بہت عزیز رکھتا تھا۔

سن جلوس ۷ میں خرم کو بارہ ہزاری[۱۲۰۰۰] منصب میں ترقی دی گئی[۲۲۴]۔ جہانگیر خرم سے اس قدر خوش و مطمئن تھا کہ بذاتِ خود اس کی شادی میں محل کی بیگمات، اپنی والدات، خادمات اور کثیر تحائف کے ساتھ ایک دن اور ایک رات اس کے گھر میں گزاری[۲۲۵]۔ اس شادی سے خرم کے اثر و اقتدار میں مزید اضافہ ہوا۔ اس کی یہ شادی ارجمند بانو بیگم بنت اعتقاد خاں (آصف خاں) سے ہوئی جو نور جہاں کی حقیقی بھتیجی اور وزیر اعظم اعتماد الدولہ کی پوتی تھی اور یہی لوگ اب جہانگیر کی مملکت اور حکومت کے سیاہ و سفید کے مالک ہو رہے تھے۔ اپنی خدمات اور زمانہ سازی کے بدولت انہیں روز بروز معاملات ملکی میں عروج و اقتدار اور جہانگیر کے مزاج میں دخل حاصل ہو رہا تھا۔ بلکہ یہی گروہ عملاً حکمران بنا[۲۲۶]۔

جہانگیر کے عہد کی تاریخ اور اس کی کامیابیاں اور کارنامے دراصل شہزادہ خرم ہی کی اعلیٰ صلاحیت، کارکردگی۔ جراتمندانہ عزم و حوصلہ کا نتیجہ ہیں خرم کو جو بھی کام سونپا گیا اس کو اس نے بحسن و خوبی انجام دیا۔ گو ابھی نو عمر ہی تھا لیکن اپنے حسن تدبیر اور کارناموں سے اپنے عظیم ہونے کا ثبوت دیا۔ وہ اخلاق و کردار احساس فرض، عزم و حوصلہ، حسن انتظام حربی صلاحیتوں کے اعتبار سے اپنے تمام بھائیوں سے ہر لحاظ سے ممتاز اور بلند ترین درجہ پہ فائق تھا۔

خرمؔ نے اپنی حربی صلاحیت اور عسکری قیادت اور سیاسی فراست کا ثبوت میوآڑ کی جنگ میں دیا۔ راجپوتانہ کی ریاستوں میں میواڑ کے حکمرانوں کو بہت ہی اہمیت حاصل تھی۔ اس گھرانے کے کسی بھی راجہ نے ہندوستان کے کسی بھی بادشاہ کی اطاعت نہیں کی بلکہ اکثر بادشاہوں کے خلاف اس گھر کے حکمرانوں نے کامیاب جنگیں لڑی ہیں۔ اسی ریاست کے حکمران رانا سنگرام سنگھ نے بابر کے ساتھ زبردست جنگ کی تھی۔ اکبرؔ نے بھی حملہ

۲۲۴؎ تزک ص ۲۳۸۔

۲۲۵؎ تزک ۲/۶ ۲۔ اقبال نامہ جہانگیری ۱۷۔

۲۲۶؎ تزک ص ۲۳۸-۲۵۶-۲۷۹-۲۸۹-۲۹۸ و اقبال نامہ جہانگیری ۶۳۔

کیا اور مکمل طور پر فتح نہ کر سکا جہانگیر نے بھی اپنی شہزادگی کے دور میں اس ریاست کو فتح کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس لیے حکمران ہونے کے بعد اولین فرصت میں میواڑ فتح کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے سلطان پرویز، مہابت خاں، راجہ کشن سنگھ عبداللہ خان راجہ باسو، مرزا عزیز کوکہ (خان اعظم) کو یکے بعد دیگرے میواڑ کی مہم کو سر کرنے کے لیے روانہ کیا گیا۔ لیکن انہیں اس مہم میں مکمل کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔ اس لیے اب جہانگیر نے اس مہم کے لیے سلطان خرم کو نامزد کیا۔ خرم نے ایک نئے عزم و حوصلہ سے ذمہ داری کو قبول کیا اپنے حسن تدبیر سیاسی فراست اور عسکری اہلیت کی بنا پر اس نے جلد ہی میواڑ کی مہم کو کامیابی سے ہمکنار کیا اور راجہ امر سنگھ کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ راجہ امر سنگھ نے مزاحمت ختم کر کے اطاعت قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ خرم کی یہ بہت ہی عظیم کامیابی تھی۔ مغلوں کی ایک دیرینہ خواہش خرم کی جراتمندی، اولوالعزمی اور جنگی مہارت کی وجہ سے بحسن و خوبی کامیابی کی منزل سے سرفرازہ ہوئی[۲۲۷] جہانگیر اس کامیابی سے بہت ہی خوش ہوا۔ اس کے عہد کا یہ ایک عظیم کارنامہ ہے اس لیے جب شہزادہ خرم میواڑ کی کامیاب مہم سے واپس ہوا تو جہانگیر نے تمام امراء دربار کو حکم دیا کہ "خرم کا استقبال کریں اور اپنے مرتبے و حیثیت کے مطابق اپنی اپنی پیش کش کو اس کے نظر سے گذاریں اور خود شہزادہ خرم سے بغلگیر ہوا اور اسے آغوش میں لے کر شفقت کا بوسہ دیا اور اس کی بہت ہی قدر افزائی کی[۲۲۸] اور اس کو (۱۵۰۰۰) پندرہ ہزار ذات اور آٹھ ہزار (۸۰۰۰) سوار کا منصب عطا کیا۔ اور اس کے علاوہ انعام و اکرام و تحائف وغیرہ بھی دیے[۲۲۹]۔ اس کامیاب مہم سے خرم کی عزت و وقار میں اضافہ ہوا اس سے اس کی اہلیت و صلاحیت بھی روز روشن کی طرح عیاں ہوئی۔

۲۲۷؁ تزک جہانگیری۔ ۹۶۔ ۱۶۸۔ ۱۷۶۔ ۲۶۹۔ ۲۷۱۔ ۲۷۵۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۴۔

و اقبال نامہ جہانگیری ص ۲۲۔ ۵۴۔ ۸۰ تا ۸۲۔

۲۲۸؁ تزک جہانگیری ۲۹۴۔ ۲۹۵ ص۔

۲۲۹؁ تزک ۳۰۷ ص

دکن :۔

دکن فتح کرنے کی کوششوں کا آغاز شہنشاہ اکبر ہی کے عہد میں ہو چکا تھا۔ شہزادہ دانیال ۱۵۹۲ء میں اور شہزادہ مراد ۱۵۹۵ء میں دکن کی مہم کے لیے متعین کیے گئے تھے۔ لیکن یہ دونوں ناکام رہے۔[230] جہانگیر نے تخت نشین ہوتے ہی دکن کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے ۱۶۰۶ء میں خان خاناں اور ۱۶۱۰ء میں سلطان پرویز کو روانہ کیا اور خان جہان لودی اور بہت سے دیگر امراء کو دکن کی مہم کے لیے روانہ کیا۔ لیکن جب دکن کی مہم شہزادہ پرویز وغیرہ سے سر نہ ہو سکی تو جہانگیر نے سلطان خرم کو جس نے حال ہی میں میواڑ کی مہم سر کی تھی، فتح دکن کے لیے نامزد کیا۔[231] کام کی عظمت و اہمیت کے پیش نظر جہانگیر نے خرم پر غیر معمولی عنائتیں کیں۔ اسے "شاہ" کا خطاب دے کر حکم دیا کہ آئندہ سے اسے "شاہ سلطان خرم" کہا جایا کرے۔ اس کے علاوہ بہت سے تحفے، تحائف و شاہی مراعات و اعزاز دیے۔[232] خرم کے لیے یہ ایک غیر معمولی اعزاز تھا۔ اس سے قبل کسی اور بادشاہ کی زندگی میں "شاہ" کا خطاب نہیں دیا گیا تھا۔

شاہ خرم اکتوبر ۱۶۱۶ء (سن جلوس ۱۱) کو دکن کی مہم کے لیے روانہ ہوا تو جہانگیر نے دعا دی کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ اس مہم میں کامیاب و سرخرو ہو۔[233] چنانچہ شاہ خرم فتح دکن کے لیے ایک نئے عزم و حوصلہ سے روانہ ہوا۔ اس کے جلو میں اور بہت سے لائق آزمودہ کار جنرل تھے۔ جن کے تعاون سے وہ دکن کی مہم میں کامیاب ہوا۔ جہانگیر کو جب یہ

۲۳۰ھ

۲۳۱ھ تزک ص ۱۶۸-۱۷۴-۱۷۸-۱۸۳-۲۰۰-۲۰۴-۲۰۴-۲۱۵-۳۱۸-۳۳۱-۲۳۱ ۔
و اقبال نامہ جہانگیری - ۵۴-۷۴-۹۴-۵۵-۷۰-۷۱ ۔

۲۳۲ھ تزک ۳۶۲ و اقبال نامہ جہانگیری ص ۹۱۔

۲۳۳ھ تزک ۳۶۲ ۔

اطلاع ملی کہ ولایت دکن کی مہم فتح پر منتج ہوتی ہے اور دکن کے تمام حکمرانوں نے سر اطاعت خم کر کے فرمانبرداری قبول کر لی ہے اور انہوں نے قلعوں، شہر پناہوں کے دروازوں کی چابیاں بالعموم اور قلعہ احمد نگر کی چابیاں بالخصوص پیش کر دی ہیں تو اس نے اس خبر پہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت عظمیٰ اور عطیہ کبیرہ پر سربسجود ہو کر شکرانہ ادا کیا اور بہت ہی خوشی کا اظہار کیا۔ ۲۳۴ھ شاہ خرم نے جو سفارشیں پیش کیں وہ سب منظور ہوئیں اور جب اس کامیاب مہم سے دربار آیا تو اس کی بہت ہی قدر و منزلت کی گئی۔ جہانگیر نے فتح دکن کی اعلیٰ و شائستہ خدمات سرانجام دینے کے صلے میں اسے تیس ہزاری (۳۰۰۰۰) پیادے اور بیس ہزار (۲۰۰۰۰) سوار کا منصب عنایت کیا اور "شاہ جہان" کا خطاب دے کر حکم دیا کہ آئندہ سے دربار میں اس کی زریں کرسی اس کے (جہانگیر) تخت کے پاس رکھی جایا کرے یہ ایک ایسی خاص الخاص عنایت ہے جو اس سے قبل تیموری گھرانے میں کسی حکمران نے نہیں کی تھی۔ اس کے علاوہ تحفے، تحائف انعام و اکرام بھی دیے گئے۔ ۲۳۵ھ

نور جہاں نے بھی اس عظیم الشان کامیابی پر جشن آرائی کر کے گراں بہا خلعت، ہیرے، جواہرات اور دیگر قیمتی تحائف پیش کیے۔ ۲۳۶ھ شاہ جہاں کی دکن کی کامیابی سے نہ صرف اس کی عسکری صلاحیت اور سیاسی فراست ظاہر ہوتی ہے بلکہ اس سے اس کے اعزاز، اقتدار میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ وہ امراء مملکت میں معزز و محترم ہوا اور صوبہ گجرات بطور جاگیر اس کو دیا گیا۔ ۲۳۷ھ

جہانگیر شاہ جہان کو کس عزت و احترام سے دیکھتا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ جب ایک واقعہ نویس نے جہانگیر کو اس کی تزک کے پچھلے بارہ سال کے حالات

ھ۲۳۴ تزک ۲۰۰ ۔ ۲۰۳ ص و اقبال نامہ جہانگیری ۱۰۰۔

ھ۲۳۵ تزک ۲۰۶ ۔ ۲۰۷ و اقبال نامہ جہانگیری ۱۰۲۔

ھ۲۳۶ تزک ۲۰۸ ۔ ۲۰۹ ۔ اقبال نامہ جہانگیری ۱۰۲ ۔ ۱۰۳ ص۔

ھ۲۳۷ تزک ۲۰۹ و اقبال نامہ جہانگیری ۱۰۵

نقل کرکے پیش کیے جو اس کتاب کا پہلا نسخہ تھا۔ تو جہانگیر نے اس کو شاہ جہان کو عطا کیا جو اس کے اپنے الفاظ میں :۔

"جیسے ہر بات میں اپنے بیٹوں پر فوقیت دیتا ہوں۔[۲۳۸]

جہانگیر شاہ جہان کی صلاحیتوں اور خوبیوں سے خود اس قدر متاثر ہے کہ وہ خود تحریر کرتا ہے کہ :۔

"میں ایک مرتبہ بھی اس کی رضا جوئی کا موقع ہاتھ سے نہیں دینا چاہتا اور وہ صحیح معنوں میں ان تمام عنایتوں کا سزاوار بھی ہے کیونکہ اس نے نوجوان ہونے کے باوجود جس مہم کی طرف بھی رخ کیا ہے۔ اسے میرے حسب منشاء سرانجام دیا ہے۔[۲۳۹]

فتح کانگڑہ :۔

جہانگیر کی فتوحات میں سے ایک بہت ہی اہم کانگڑہ کی فتح بھی ہے۔ اس قلعہ کو فتح کرنے کے لیے اکبر کے عہد سے کوشش ہو رہی تھی۔ لیکن کامیابی نہیں ہوئی تھی۔[۲۴۰] خود جہانگیر نے تخت نشین ہوتے ہی جن فتوحات کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس میں کانگڑہ بھی شامل تھا۔ چنانچہ مرتضیٰ خاں۔ سورج مل۔ راجہ بکرماجیت وغیرہ اس مہم پر روانہ کیے گئے تھے۔ لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ آخر کار شاہ جہان نے کانگڑہ فتح کرنے کی ذمہ داری قبول کر کے اس مہم کو سر کرنے کے لیے اقدامات کیے۔ شاہ جہان کی حکمت عملی اور عسکری قیادت کا نتیجہ تھا کہ قلعہ کانگڑہ جو اب تک کسی بادشاہ نے فتح نہیں کیا تھا۔ وہ شاہ جہان

---

۲۳۸ تزک ۴۹۹ ص۔

۲۳۹ تزک ۴۶۰ ص۔

۲۴۰ تزک ۶۵۵ ص۔

و اقبال نامہ جہانگیری۔ ۱۶۰-۱۶۱۔

کے ہاتھوں فتح ہوا۔[۲۴۱] جہانگیر اس فتح کو اللہ تعالیٰ کے خاص لطف و کرم سے تعبیر کرتا ہے کیونکہ ظاہری اسباب پر نظر رکھنے والے کم فہم لوگ اس قلعہ کی فتح کو بہت مشکل سمجھتے تھے۔ یہ قلعہ بہت ہی پرانا تھا اس قلعہ کی تعمیر کی تاریخ سے اللہ ہی آگاہ ہے اور جہانگیر کے اپنے الفاظ ہیں:۔

"جب سے دین مبین اسلام سرزمین ہند میں پہنچا ہے کسی ایک شان و شوکت والے مسلمان بادشاہ کو یہ فتح نصیب نہیں ہوئی تھی اس لیے جب اسے فتح کانگڑہ کی اطلاع ملی تو وہ نہ صرف بہت خوش ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سر نیاز جھکا کر شکرانہ ادا کیا اور فتح و شادیانے کے نقارے بجوائے" [۲۴۲]

عہد جہانگیری کی فتوحات میں قلعہ کانگڑہ کی فتح کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس قلعہ کی سیر کرنے جب جاتا ہے تو اس نے بہت سے ایسے اقدامات کیے ہیں جس سے ترویج شریعت اور احیاء اسلام کی تحریک کو بظاہر تقویت حاصل کرنے کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن جہانگیر نے اس کے بعد ہی جس سیاسی جتھابندی کا آغاز کیا ہے اس میں فاتح کانگڑہ (یعنی شاہ جہاں) کے بارے میں اولاً سرد مہری کا مظاہرہ کرتا ہے اور دو سال بعد ہی سیاسی محاذ آرائی سے آگے بڑھ کر شاہ جہاں کے خلاف فوجی اقدام کرتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قلعہ کانگڑہ کے فتح کے بعد اس کے اصلاحی انتظامات اس کی سیاست حکمت عملی کا نتیجہ ہیں جس کی پشت پر اس کی ذہن و فکر کی تبدیلی یا کسی اخلاص کا دخل نہیں تھا۔

---

[۲۴۱] اقبال نامہ جہانگیری۔ ص ۱۱۲ تا ۱۱۴۔ ۱۱۵۔ ۱۲۳۔ ۱۶۱ و
تزک جہانگیری۔ ۹۸ تا ۶۵۵ ص ص۔

[۲۴۲] تزک جہانگیری ۶۵۴ تا ۶۵۶ ص و
اقبال نامہ جہانگیری ۱۶۱ ص۔

نوٹ:۔ جہانگیر نے قلعہ کانگڑہ کو فتح کرنے کے لیے عملی اقدام اپنے تیرھویں سن جلوس میں کرتا ہے اور سن جلوس ۱۵ بمطابق ۵ محرم ۱۰۳۱ھ کو فتح کی خبر ملی ہے۔ اور شیخ احمد سرہندی رح کو سن جلوس ۱۴ میں قلعہ گوالیار میں قید کیا گیا اور جہانگیر نے ان کے خلاف غیظ و غضب سے (باقی بر صفحہ آیندہ)

شاہ جہان کے خلاف سیاسی محاذ:۔

جہانگیر کی ۱۶۰۵ء سے لے کر ۱۶۲۱ء تک کی فتوحات میں شاہ جہاں کی عسکری قیادت اور حربی صلاحیتوں کو بہت بڑا دخل تھا۔ یہ وہ دور ہے جب مملکت میں امن و سکون، خوشحالی کا دور دورہ ہے۔ مملکت کی خارجہ پالیسی کامیاب رہی ہے اور جہانگیر کی کامرانیوں میں شاہجہان برابر کا شریک ہے۔ لیکن قلعہ کانگڑہ کی فتح کے بعد ہی جس کو جہانگیر بہت ہی اہمیت دیتا ہے۔ اور اپنا ایک عظیم کارنامہ بناتا ہے اس کے اور شاہ جہاں کے تعلقات میں پہلی سی گرمجوشی باقی نہیں رہتی۔ فتح کانگڑہ کے ضمن میں بھی فاتح کانگڑہ کو وہ اہمیت و مقام نہیں دیا جاتا جیسا کہ اسے فتح میواڑ اور فتح دکن میں دیا گیا تھا۔ حالانکہ فتح کانگڑہ کو جہانگیر سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اور ایسی انتظامی اصلاحات کرتا ہے جس سے ترویج شریعت اور احیاءِ اسلام کے حامی خوش ہوں [۲۴۳]۔ لیکن اس کے باوجود وہ شاہ جہاں کے خلاف سیاسی جتھا بندی کا کیوں آغاز کرتا ہے؟ شاہ جہان ایسے لائق باصلاحیت اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) بھرے ہوئے ناشائستہ الفاظ تزک میں تحریر کیے ہیں اور سن جلوس ۱۵ میں انہیں رہا کر کے نظر بند کرایا جاتا ہے۔ اور شاہ جہاں کو دوبارہ دکن کی مہم پر روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اور باپ بیٹوں کے تعلقات میں سرد مہری کا آغاز ہوتا ہے۔ شاہ جہان کے خلاف شہزادہ پرویز، شہزادہ شہریار اور خسرو کے بیٹے داور بخش کی جہانگیر کی طرف سے سرپرستی کا آغاز ہوتا ہے۔ اور امراءِ مملکت میں مہابت خاں اور خان اعظم کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں اور سیاسی حالات ایسے پیدا کر دیے جاتے ہیں کہ شاہ جہان اور جہانگیر میں تین سال تک جنگ رہتی ہے۔ اور جہانگیر شاہ جہان کے خلاف نہ صرف فوجی اقدامات کرتا ہے بلکہ اپنی تزک میں اس کے خلاف شدید نفرت کا اظہار کرتا ہے۔

۲۴۳ تزک ہ ۶۵-۶۵۶-د

اقبال نامہ جہانگیری ۱۶۰-۱۶۱۔

با کہ دارا شہزادے سے مصالحت کیوں نہ ہو سکی ؟

شاہ جہاں کے خلاف جن شہزادوں کی اب سر پرستی کی جا رہی ہے ان کی خدمات و صلاحیت کیا ہے ؟ شاہ جہاں کے خلاف جن امراء مملکت کی خدمات حاصل کی گئیں، ماضی میں انہوں نے مملکت کی توسیع اور استحکام میں کیا خدمات انجام دیں ؟ اور شاہ جہاں سے جہانگیر کے بنیادی اختلاف کیا تھے جو روز بروز بڑھتے ہی چلے گئے یہاں تک کہ باپ بیٹوں میں تین سال تک طویل جنگ ہوتی رہی اور بے انتہا جانی و مالی نقصان ہی نہیں ہوا بلکہ قندھار کے نکل جانے سے مملکت کی عظمت اور وقار بھی متاثر ہوئی۔

تزک جہانگیری اور اقبال نامہ جہانگیری کے بین السطور کا مطالعہ کیا جائے اور شاہ جہاں اور جہانگیر کے ذہنی و فکری رجحان کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر اور شاہ جہاں کے مزاج اور پسند و ناپسند میں بہت بڑا فرق تھا۔ جہانگیر اپنے باپ یعنی اکبرؒ کی فکری تحریک کا حامی تو نہیں تھا بلکہ ایک غیر جانبدار شخص تھا۔ وہ حکمران ہونے کے بعد کسی خاص و متعین پالیسی پر یکجہتی سے عامل نہیں رہا۔ مثلاً تخت نشین ہونے کے بعد احیاء شریعت کے حامی امراء مملکت کو مطمئن اور عامۃ المسلمین کی حمایت حاصل کرنے کے لیے شراب اور دیگر تمام نشہ آور چیزیں بنانے اور فروخت کرنے پر پابندی عائد کرتا ہے۔ [۲۴۴] حالانکہ وہ خود کثرت سے شراب پیتا رہتا ہے۔ تزک کے صفحات میں کثرت سے اپنی محفل شراب نوشی کے تذکرے کیے ہیں۔ اس کے برعکس شاہ جہاں شراب نہیں پیتا جس کی شکایت خود جہانگیر کرتا ہے اور تلقین کرتا ہے کہ جشن کے ایام، نوروز کے دنوں اور بڑی بڑی مجلسوں میں شراب پی لیا کرو اور خود پلاتا ہے اور حکیم بوعلی کی ایک رباعی سے اس کے لیے جواز فراہم کرتا ہے۔ [۲۴۵]

بظاہر شراب پینا یا شراب ترک کرنا ایک معمولی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر مسلم رائے عامہ کے مزاج و نفسیات کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ شراب نوشی کو ہمیشہ

۲۴۴۔ تزک ۱۴۔ بارہ قوانین پر مشتمل دستور العمل کی چوتھی شق۔

۲۴۵۔ تزک ۳۲۵۔

ناپسندیدگی، نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور ترک شراب نوشی کو یا امتناع شراب کو پسندیدگی و احترام کی نگاہ سے ۔۔۔۔۔۔۔۔ اکبر کے عہد حکومت میں (۱۶۰۵ء-۱۵۵۶ء) شراب نوشی کی بہت ہی حوصلہ افزائی کی گئی اور شاہی مجالس میں شراب کو جزو لاینفک قرار دیا گیا اکبر کے دو لڑکے عین عنفوان شباب میں اس کی زندگی میں انتقال کرتے ہیں لیکن ترویج شریعت کے حامی امراء مملکت جہانگیر کی محض اس لیے حمایت کرتے ہیں کہ اس نے شراب کی تیاری اور فروخت پر پابندی لگانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ حالانکہ وہ خود پیتا رہتا ہے۔ اور شاہی مجالس میں کثرت سے مے نوشی ہوتی رہی ہے لیکن شاہ جہاں شراب نہیں پیتا تھا۔ شاہ جہان کا شراب نہ پینا اپنے عہد کے شاہی مجالس کے آداب کے خلاف تھا۔ ایسے ماحول میں شراب سے وہی پرہیز کر سکتا تھا جس کے ذہن و فکر پر شریعت کی گرفت مضبوط ہو اور وہ لوگوں کے طنز و استہزاء کی پرواہ نہ کرتا ہو یا جس میں عام روش کے خلاف چلنے اور عمل کرنے کا جذبہ اور داعیہ ہو۔

جہانگیر اور شاہ جہان کے مزاج و کردار میں یہ بنیادی فرق تھا۔ جس نے ابھی اختلاف کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ لیکن شاہ جہان کی پیہم کامیابیاں عروج و ترقی ان لوگوں کو ضرور ناپسند رہی ہوں گی جو شریعت کی بالادستی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اور یہی وہ دور ہے جب شیخ احمد سرہندی کی ہمہ تن کوششوں اور جدوجہد سے مسلم رائے عامہ میں احیاء شریعت کی تحریک نے ایک مؤثر قوت حاصل کر لی تھی۔ اس تحریک کو روکنے کے لیے سن جلوس ۱۴ میں جہانگیر سے انہیں قلعہ گوالیار میں قید کرایا جاتا ہے۔ جہاں آپ ایک سال قید میں رہتے ہیں۔ بعد میں رہا کر کے نظر بند کر کے شاہی رکاب میں رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

لیکن حضرت مجدد کی قلعہ گوالیار میں قید و بند سے نظریات اور فکر کی دنیا میں ایک نئی ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ آپ کا قلعہ گوالیار میں قید کرنا محض ایک شخص کا قید کرنا نہ تھا بلکہ یہ دو طرز فکر اور دو نظریات کا ٹکراؤ تھا۔ پہلا تو یہ کہ جہانگیر کے دور میں جو سیاسی، سماجی اور مجالسی آئین تھے وہی چلتے رہیں اُن میں کوئی تبدیلی نہ ہو لیکن جو لوگ شریعت کے حامی اور احیاءِ اسلام اور نفاذ شریعت کے علمبردار تھے وہ اس صورت حال سے مطمئن نہ تھے۔ اور

روز بروز انہیں عامۃ المسلمین کی حمایت حاصل ہو رہی تھی اور وہ قوی سے قوی تر ہو رہے تھے اس لیے اول الذکر گروہ جو اقتدار پر فائض اور سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ اس نے طاقت، جبر اور قوت کے بل بوتے پر احیاء شریعت کی سرخیل شیخ احمد سرہندی کو راہ میں رکاوٹ سمجھا۔

اس گروہ نے اپنی دانست میں آپ کو قید کرا کر آزادیٔ عمل سے محروم کر دیا۔ لیکن احیاء شریعت کی ہمہ گیر، موثر قوت پابند قید نہ ہو سکی۔ جبر۔ دھونس۔ بے بنیاد پراپیگنڈا ظلم و تشدد ضمیر کے خرید و فروخت کے ادلہ جاہ پرست علماء دین اور مشائخ کے تند و تیز حملے احیاء شریعت کے حامیوں کے سیلاب پر بند نہ باندھ سکے۔ یہ تحریک روز بروز طاقتور اور مؤثر ہوتی گئی اور اس نے اپنا راستہ خود بنانا شروع کیا۔

شاہ جہان اور حضرت مجددؒ:۔

شاہ جہان کے کردار اور فکر کی سلامت روی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ حضرت مجدد رح کی احیاء شریعت کی تحریک سے ضرور متاثر تھا۔ وہ پاکیزہ کردار اور صاف ستھرے ذوق کا حامل بنا۔ اپنے عہد کے شہزادگان اور امرائے مملکت کے برعکس وہ شراب نہیں پیتا تھا ؎ اپنی اعلیٰ صلاحیت، کارکردگی، استعداد کی وجہ سے مملکت میں اسے بلند ترین مقام حاصل تھا۔ جہانگیر خود اپنے سن جلوس ۱۲ کے آخری ماہ اسفندار میں اس کی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ایک مرتبہ بھی اس کی (شاہ جہاں) کی رضا جوئی کا موقع ہاتھ سے نہیں دینا چاہتا اور وہ صحیح معنوں میں ان تمام عنایتوں کا سزاوار بھی ہے کیونکہ اس نے نوجوان ہونے

؎ شاہ جہان کے چچا شاہ مراد و شاہ دانیال ۳۳ اور ۳۱ سال کی عمر میں کثرت شراب نوشی سے مرتے ہیں اور اس کا باپ جہاں گیر اپنی کثرت شراب نوشی کا تذکرہ خود کرتا ہے اور متعدد امراء مملکت صرف کثرت شراب نوشی سے انتقال کرتے ہیں۔ شاہ جہان کا بھائی شاہ پرویز کثرت شراب نوشی ہی سے ۳۸ سال کی عمر میں جہانگیر کی زندگی میں انتقال کرتا ہے اور شہریار ۲۳ سال کی عمر میں ایسی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے جس سے اس کے تمام بال گر جاتے ہیں اور آتشک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

کے باوجود جس مہم کی طرف بھی رخ کیا ہے اسے میرے حسب منشاء انجام دیا ہے[۲۴۶] غالباً اسی اعتماد کی بنا پہ شاہ جہاں نے افضل خاں اور خواجہ عبدالرحمان مفتی کی معرفت حضرت مجدد رح کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ آپ رح بھی بادشاہ کو سجدہ کر لیں تو میں اس کا ذمہ لیتا ہوں کہ آپ کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا[۲۴۷] لیکن حضرت مجدد رح جو عزیمت اور حوصلہ کے کوہ گراں تھے انہوں نے اس مشورہ پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور قلعہ گوالیار میں قید ہونا منظور کر لیا اس واقعہ سے عہد جہانگیری کی نظریاتی سیاست اور فکری رجحانات متاثر ہونا شروع ہوتی ہے۔

ترک شراب کا واقعہ:۔

جہانگیر خود چونکہ شراب کا عادی تھا اور الناس علی دین ملوکھم کے مصداق اس کے مصاحب بھی کثرت سے شراب پیتے تھے۔ اس نے ان افراد و امراء مملکت کا بھی تذکرہ کیا ہے جو کثرت شراب نوشی سے انتقال کر گئے ہیں اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس عہد میں مے نوشی کس قدر عام تھی اور صاحب اقتدار حضرات کے مجالس میں کس کثرت سے استعمال ہوتی تھی۔[۲۴۸] لیکن حضرت مجدد رح کی قلعہ گوالیار سے بظاہر رہائی کے چند دنوں کے بعد سن جلوس ۱۵ میں خان جہاں کا بیٹا یک لخت شراب ترک کر دینے کا اعلان کرتا ہے۔ اس واقعہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جہانگیر اسے مشورہ دیتا ہے کہ یک دم چھوڑ دینا مناسب نہیں ہے بلکہ طبی نقطہ نگاہ سے دھیرے دھیرے ترک کرنا چاہیئے۔ لیکن توفیق الٰہی سے وہ یکدم اپنے آپ کو سنبھال لیتا ہے اور عہد کیا کہ آئندہ کبھی نہیں پئے گا۔[۲۴۹]

---

۲۴۶ تزک - ۶۰۴ ص - سن جلوس ۱۲ - ماہ اسفندار

۲۴۷ حیات مجدد رح ص ۲۲ - ۲۳ ورود کوثر - ص ۲۲۴ -

۲۴۸ تزک جہانگیری - ص ۶۳ - ۶۴ - ۱۵۶ - ۱۷۱ - ۳۹۹ - ۵۱۶ - ۶۹۱ - ۸۳۳ - ۸۳۸ ص -

۲۴۹ تزک جہانگیری ۶۳۷ -

تزک میں اس ایک واقعہ کے علاوہ کوئی دوسرا واقعہ ترک شراب کا نہیں ملتا۔ یہ بظاہر ایک فرد کا واقعہ ہے جس کا تعلق مملکت کے ایک بااثر امیر کے بیٹے سے ہے لیکن یہ ایک طرز فکر ہے جو ایک خاص رجحان کی تائید و غمازی کرتی ہے۔ اور ترک شراب کا اعلان عہد جہانگیری کی شاہی مجالس کی تفریحات پر ایک زبردست احتجاج ہے سن جلوس ۱۵ ہی میں شاہ جہاں جب دوبارہ تسخیر دکن کی مہم پر جاتا ہے تو دریائے چنبل پر تیسویں سالگرہ (قمری) کا جشن تلاوان منعقد کیا اور شراب سے توبہ کی اور حکم دیا کہ شراب کو دریائے چنبل میں بہا دیں چاندی۔ سونے کے جتنے جام و سبو ساقی خانے میں تھے سبھوں کو حضرت کے سامنے توڑ کر محتاجوں میں تقسیم کر دیا گیا۔[۲۵۰]

شاہ جہان کا یہ اعلان ایک طرح سے عہد جہانگیری کے نظریات اور شاہی مجالس تقریبات کے خلاف ایک اعلان بغاوت تھا۔ کیونکہ جہانگیر تو محض اس وعدہ سے کہ شراب کی تیاری و فروخت پر پابندگی ہوگی احیاء اسلام کے حامیوں کی موثر حمایت و تائید حاصل کر لیتا ہے۔ اور انہیں کے تعاون سے تخت حاصل کرتا ہے لیکن اس کے بعد بھی نہ صرف خود شراب پیتا ہے۔ بلکہ شاہی مجالس میں کثرت سے شراب استعمال ہوتی ہے اور اس پر نہ کوئی پابندی ہے اور نہ ہی حالات جس رخ پر جارہے تھے اس میں شراب کی پابندی پر کوئی امکان تھا۔ سیاست کا یہی رخ ہے جس کے خلاف چلنے کا فیصلہ خاں جہاں کا بیٹا کرتا ہے اور شاہ جہان مملکت کے سب سے لائق اور مستقبل کے ایک دعویدار مملکت کی حیثیت سے شراب سے اعلانیہ اجتناب کا اعلان کرتا ہے۔ اس واقعہ نے جہانگیری عہد کے تاریخ کے دھارے کو ایک خاص سمت متعین کرتی ہے۔ ایک دعویدار مملکت از خود شراب اور نشہ آور اشیاء سے برآت کا اعلان کر کے نفاذ شریعت کی حامیوں کی موثر حمایت حاصل کر لیتا ہے۔ یہ شاہ جہاں کی محض رسمی اعلان نہ تھا بلکہ اس کی

---

[۲۵۰] عمل صالح المعروف بہ شاہجہان نامہ جلد اول مصنفہ محمد صالح کنبوہ۔ ترجمہ ڈاکٹر ناظر حسن زیدی۔ ص ۱۳۱۔

ماضی کی زندگی بھی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ اس کی زندگی پاک، صاف وستھری تھی۔ اکبر کے زیر سایہ تربیت پانے اور جہانگیر کے عہد کے سب سے لائق و باصلاحیت اور اب تک اس کے نائب سلطنت ہونے کے باوجود شراب کی لعنت میں گرفتار نہیں ہوا تھا باپ کے اصرار پر اور اس کے پلانے پر سن جلوس ۱۰ (دس) میں شراب چکھنے کا تذکرہ تو ملتا ہے لیکن از خود نہیں پیتا اور پانچ ہی سال بعد شراب نہ پینے کا اعلان کر کے جہانگیر کے عمل کے خلاف بغاوت کا اعلان کرتا ہے ۔شاہ جہان کا یہ اعلان جہانگیر اور اس کے دربار کے مقتدر اور حامی امراء مملکت کے خلاف ایک نظریاتی ــــ اعلانِ بغاوت تھا جسکے نتیجے میں ذہن فکر، نظریات، رجحان، طرز زندگی کھل کر ایک دوسرے کے خلاف آجاتے ہیں۔

جہانگیر کی نئی بساط سیاست:۔

سن جلوس ۱۵ میں جہانگیر اور شاہ جہان کے تعلقات میں جس سرد مہری کا آغاز ہوتا ہے۔ اس میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے اور جہانگیر ان شہزادوں اور امراء مملکت کی سرپرستی شروع کرتا ہے جنہوں نے ۱۶۰۵ء سے لے کر ۱۶۲۱ء تک کوئی نمایاں، اہم اور قابل قدر خدمت انجام نہیں دی تھی۔

سلطان پرویز جو شاہ جہان سے بڑا تھا اور اہلیت وصلاحیت کے لحاظ سے کسی طرح ہمسر نہ تھا اور جس نے ۱۶۰۵ء سے لے کر ۱۶۲۱ء تک کوئی اہم خدمت انجام نہ دی تھی اور نہ ہی کسی مہم میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ تزک جہانگیری میں یکم سن جلوس سے تیرھویں سن جلوس تک اس کی کسی اہم خدمت اور کارنامے کا تذکرہ نہیں ملتا۔ گیارھویں سن جلوس میں جہانگیر سلطان پرویز کو صوبہ الہ آباد کی جاگیر عطا کرتا ہے اور خود یہ اعتراف کرتا ہے کہ سلطان پرویز سے کوئی نمایاں خدمت انجام نہ پاکر واپس بلایا اور خرم بیٹے کو جس کے احوال سے مہارت و تجربہ کاری کے آثار نمایاں ہیں، دکن روانہ کیا ہے[۲۵۱]۔ خرم اس مہم کو کامیابی

---

۲۵۱ تزک ۷۴۳۔

سے ہمکنار کرتا ہے اور اسے شاہ جہان کا خطاب اور تیس ہزاری ذات و بیس ہزاری سوار کا منصب ملتا ہے)۔ لیکن اس کے باوجود سن جلوس ۱۴ میں جہانگیر کے طلب کرنے پر جب سلطان پرویز دربار میں حاضر ہوتا ہے تو جہانگیر پہلی بار پرویز کے لیے "سعادتمند فرزند شاہزادہ سلطان پرویز"، کے القاب و آداب استعمال کرتا ہے[۲۵۲]۔ اور اسے انعام واکرام بھی دیتا ہے۔ پندرہویں سن جلوس میں پرویز کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ البتہ سن جلوس ۱۶ کے پہلے ہی ہفتہ میں صوبہ بہار پرویز کو بطور جاگیر عنایت کیا جاتا ہے اور تحفے، تحائف، انعام واکرام و اعزازہ وغیرہ اس کے علاوہ ہیں[۲۵۳]۔

چند ہی ماہ بعد جہانگیر کی بیماری کی اطلاع پا کر سلطان پرویز طلبی کے بغیر بیتابانہ بہار سے یلغار کرتے ہوئے دربار میں آتا ہے اور جہانگیر سے اپنی محبت و خلوص کا اظہار کرتا ہے اور جہانگیر اس سے خوش ہو کر شفقت و محبت کے ساتھ اپنی آغوش میں لے کر اپنی انتہائی التفات سے نوازتا ہے اور دعا دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے لمبی عمر اور سلطنت سے بہرہ ور کرے[۲۵۴]۔

پرویز ایک ماہ قیام کرنے کے بعد تحفے، تحائف، انعام واکرام کے ساتھ اپنی جاگیر پر واپس جاتا ہے[۲۵۵]۔ سن جلوس ۱۷ کے ابتدا ہی میں جہانگیر شہزادہ پرویز کو طلب کرتا ہے اور چند ہی ماہ بعد راجہ اقردں کو ڈاک چوکی کی رسم کے مطابق روانہ کیا تا کہ "لشکر ظفر آثار"، کے ہمراہ جس قدر جلد ہو سکے شہزادہ پرویز دربار میں حاضر ہو جائے

---

[۲۵۲] تزک ۵۶۵۔

(تین دن پہلے شیخ احمد سرہندی رح دربار میں پیش ہو چکے تھے اور انہیں قلعہ گوالیار میں قید کرنے کا حکم ہوا تھا)۔ تزک جہانگیری ۵۶۳ ص۔

[۲۵۳] تزک ۶۷۱۔

[۲۵۴] تزک ۶۸۸۔ ۶۹۰ ص۔

[۲۵۵] تزک ۶۹۰۔

تاکہ "بے دولت" کو (شاہ جہان کو بے دولت کا نام دیتا) کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے مہم پر روانہ کیا جائے ۔[۲۵۶]

سن جلوس ۱۸-۱۱- ماہ اردی بہشت کو "فرزند اقبال مند شاہزادہ پرویز شرف حضوری کا خواستگار ہوتا ہے تو جہانگیر حکم دیتا ہے کہ امرائے نامدار اور دوسرے جاں نثار ملازمین شاہی جوق در جوق اور فوج در فوج اس کے استقبال کے لیے جائیں اور اسے شایان شان طریقے سے ہمراہ لے کر آئیں چنانچہ جہانگیر نہایت ہی عزت و احترام اور محبت و شفقت سے اسے اپنی آغوش عزت میں لے کر اس پر اپنی انتہائی عاطفت و مہربانی کا اظہار کرتا ہے - اور "فرزند سعادتمند شاہ پرویز کو چالیس ہزار پیادوں اور تیس ہزار سواروں کے منصب پر فائز کرتا ہے -[۲۵۷]
یہ منصب و اعزاز پرویز کو اس لیے دیا گیا تاکہ بد عاقبت، بے دولت، (شاہجہان) کے خلاف مہم کی قیادت کرے ۔[ع۵]

---

۲۵۶ تزک ۷۲۴-۷۲۶-
۲۵۷ تزک ۷۳۷-

نوٹ :- شہزادہ پرویز کے لیے "سعادتمند یا اقبال مند فرزند شاہ پرویز" کے معزز الفاظ کے لیے ملاحظہ کیجئے - تزک ص ص ۵۶۵-۵۷۸-۶۷۱- ۶۹۰- ۷۲۲-۷۲۶- ۷۳۶- ۷۳۷- ۷۴۰ وغیرہ -

ع۵ - شاہ جہان نے میواڑ- دکن اور کانگڑہ کی اہم ترین جنگی مہمات میں کامیابی حاصل کی تھی جس کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اعتراف خود جہانگیر نے کیا ہے اور اس کے منصب میں وقفہ وقفہ کے بعد اس کی کارکردگی، خدمات، صلاحیت اور استعداد میں روز افزوں ترقی کو دیکھنے کے بعد تیس ہزار ۳۰۰۰۰ پیادے اور بیس ہزار ۲۰۰۰۰ سوار کا منصب عطا کیا گیا تھا- پرویز کا معاملہ اس کے برعکس ہے اس نے کوئی اہم جنگ نہیں لڑی کوئی اہم خدمت انجام نہیں دی نہ ہی کسی کارکردگی، استعداد کا ثبوت دیا- لیکن اس کے منصب میں اس قدر اضافہ محض اس لیے کیا گیا تاکہ وہ شاہ جہان کے خلاف مہم کی قیادت کرے- یہ امتیاز اور شاہ جہان کی مخالفت کیوں ؟-

مہابت خان:۔

مہابت خاں عہد جہانگیری کا ایک جرأتمند، باصلاحیت اور لائق امیر مملکت تھا جو اپنی صاف گوئی اور بیباکی کے لیے بھی مشہور تھا۔ جہانگیر نے تخت نشین ہوتے ہی اسے مہابت خاں کا خطاب (اصلی نام زمانہ بیگ تھا) دیا اور ۱۵۰۰ کے عہدے پر تقرر کیا۔ ۱۶۰۶ء میں اس کا منصب ۲۰۰۰ پیادوں اور ۱۳۰۰ سوار قرار پایا اور ۱۶۱۰ء میں اس کے منصب میں ترقی ہوئی اور ۴۰۰۰ پیادے اور ۳۵۰۰ سوار کا منصب عطا ہوا۔ اس کے بعد ۱۶۲۲ء تک مہابت خاں کے منصب میں کوئی ترقی نہیں ہوئی اور دارالخلافہ سے اس اثنا میں دور دراز علاقوں میں ہی خدمت انجام دیتا رہا لیکن جب شاہ جہان سے اختلاف ہوا تو نورجہاں نے جہانگیر کو آمادہ کیا کہ مہابت خاں کی خدمات حاصل کی جائیں۔

چنانچہ مہابت خاں اپنی شرائط کے ساتھ دربار میں آیا تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور سن جلوس ۱۷ میں اس کے ۶ ہزار پیادوں اور ۵ ہزار سوار کا منصب عطا

نوٹ :۔ مہابت خاں کو ۱۶۱۰ء سے لے کر ۱۶۲۲ء تک منصب میں کوئی ترقی نہیں ملی بلکہ اس اثناء میں اسے دارالخلافہ سے ہمیشہ دور دراز علاقوں ہی میں رکھا گیا۔ مہابت خاں اپنے ساتھ اس ظلم و بربادی کی وجہ نورجہاں اور اس کے خانوادہ کو قرار دیتا ہے کیونکہ ۱۶۱۱ء میں نورجہاں کی جہانگیر کے ساتھ شادی ہونے پر عملاً اس کے باپ اور بھائی ہی حکمران تھے۔ اور اس میں شاہ جہان بھی شریک تھا کیونکہ شاہ جہان کی شادی ۱۶۱۲ء میں ارجمند بانو بیگم (ممتاز محل) بنت آصف خاں سے ہوتی ہے جو نورجہاں کی حقیقی بھتیجی اور اعتمادالدولہ کی پوتی تھی لیکن جب اس سیاسی جتھابندی میں شگاف پڑتا ہے اور نورجہاں کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ شاہجہان کا زور توڑا جائے تو اس کی نظر انتخاب مہابت خاں پر پڑتی ہے اور اس نے اپنا دستخط شدہ خط مہابت خاں کو بلانے کے لیے بھیجا۔ مہابت خاں اپنی شرائط پر دربار میں آتا ہے تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے اور فوراً ہی اس کا منصب ۶۰۰۰ ہزار پیادوں اور ۵ ہزار سوار مقرر کیا جاتا ہے اور شاہجہان کے خلاف فوج کی قیادت اس کو سپرد کی جاتی ہے۔

کیا گیا[۲۵۸] اور چند ماہ ہی بعد اسے موتمن الدولہ القاہرہ کا خطاب دیا اور فرزند اقبال مند شاہزادہ پرویز اور بہت سے دیگر نامور اور معروف امراء مملکت کے ساتھ "بدعاقبت" "بے دولت" (شاہ جہاں) کے تعاقب و بیخ کنی کے لیے مامور کیا جاتا ہے[۲۵۹]۔ اور آصف خاں کو جو شاہ جہان کا خسر تھا اس کو صوبہ بنگال و اڑیسہ کا صوبہ دار مقرر کیا جاتا ہے[۲۶۰]۔ اس طرح شاہ جہان کے خلاف شاہزادہ پرویز اور اس کی اعانت کے لیے مہابت خاں کو کثیر لشکر، مال و دولت، انعام و اکرام، تحفے تحائف کے ساتھ متعین کیا جاتا ہے۔

داور بخش:۔

داور بخش خسرو کا بیٹا تھا۔ خسرو نے جہانگیر کے خلاف تخت نشینی کا دعویٰ کیا تھا۔ اور مملکت میں اس کے حامیوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی اس لیے جہانگیر کے نزدیک معتوب رہا لیکن سن جلوس ۸ میں جہانگیر نے خسرو کو دربار میں حاضر ہو کر کورنش بجالانے کی اجازت دی تھی (تزک ۱۲۷ سن جلوس ۸) ماہ شہر یور) لیکن چند ہی ماہ بعد دربار میں حاضر ہونے اور کورنش بجالانے سے منع کر دیا (۲۸ سن ۹ - ۱۸ اردی بہشت)۔

خطاؤں کو معاف کرتے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت دے دی تھی[۲۶۱]۔ جہانگیر نے جب شاہ جہان کو دکن کی مہم سر کرنے کے لیے متعین کیا تو اس کے اطمینان خاطر کے لیے خسرو کو اس کے حوالہ کیا[۲۶۲]۔ خسرو بدنصیب کو (جسے جہانگیر نے شراب کی مدہوشی میں شاہجہان

---

۲۵۸ تزک ص ۱۵، ۷۔ سن جلوس ۱۷، ماہ آبان۔

۲۵۹ تزک سن جلوس ۱۸ - ۲۵ - ماہ اردی بہشت ص ۳۸۷

۲۶۰ تزک سن جلوس ۱۸ ماہ خرداد ص ۳۸۰۷۔

۲۶۱ تزک ۸۷۵۔ سن جلوس ۱۴ ماہ آبان الٰہی ۔ پانچ ماہ قبل اسی سال شیخ احمد سرہندی کو قلعہ گوالیار میں قید کیا گیا تھا۔

۲۶۲ تزک - ص ۲۶۱ و عمل صالح (اردو) ص ۱۲۹ - اقبال نامہ جہانگیری ۱۶۴ ص تزک میں خسرو کو شاہ جہان کے حوالے کرنے کا تذکرہ نہیں کرتا۔

کے حوالہ کیا تھا)۔ ۲۸ مارچ ۱۶۲۲ء کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ جہانگیر کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملتی ہے تو کسی رنج و غم کا اظہار نہیں کرتا۔ اور نہ ہی کسی پر ہلاک کرنے کا شک کرتا ہے۔[۲۶۳] لیکن چونکہ خسرو شاہجہان کی نگرانی میں تھا۔ اس لیے خسرو کے حامیوں کو فطری طور پر یہ شک تھا کہ خسرو کے مروانے میں شاہ جہان کا ہاتھ ہے۔ دوسرے خسرو جہانگیر ہی کے مقابلے میں تخت کا دعویدار تھا۔ اسی لیے طرح طرح کے مشکلات و مصائب میں مبتلا رہا ہے اور اس اثناء میں شاہ جہان جہانگیر کا حامی و منظور نظر تھا اور خود اس نے بھی جہانگیر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خسرو کی ہمیشہ مخالفت کی تھی اس لیے خسرو کے حامی تو شاہ جہان کے خلاف ہی تھے اب خسرو کے انتقال کے بعد شاہ جہان کی مخالف طاقتوں کی حمایت کے لیے خسرو کے بیٹے داور بخش کو پانچ ہزار ذات + ۲ ہزار سوار کا منصب دیا جاتا ہے۔[۲۶۴] چند ماہ بعد خان اعظم کو سات ہزار پیادوں اور پانچ ہزار سوار کا منصب دیا گیا۔[۲۶۵]

---

۲۶۳ عمل صالح۔ ص ۱۵۱ و تزک ص ۳۰۲، سن جلوس ۱۶ ماہ اسفندار، خسرو کو شاہجہان کے حوالہ کرنا معنی خیز ہے کیونکہ خسرو جہانگیر کے مقابلہ ہی میں تخت کا دعویدار تھا۔ اس کے حمایتی بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔ وہ اپنے نظریات اور فکر کی وجہ سے ایک گروہ میں بہت مقبول تھا۔ اس کے معتوب ہونے ہی کی وجہ سے شاہ جہان کو اقتدار نصیب ہوا اور اب وہ منصب اعزاز و اکرام کے لحاظ سے جہانگیر کے بعد تھا۔ اس لیے خسرو کو شاہ جہان کے حوالہ کرکے جہانگیر نے شاہ جہان کو ایک طرح اطمینان دلایا کہ تمہاری پوزیشن کسی طرح خطرہ میں نہیں کیونکہ ابھی شاہزادہ پرویز اور شہریار کو کوئی اہمیت و مقام حاصل نہیں ہوا تھا۔ دوسرے پرویز میں اہلیت و صلاحیت بھی نہیں تھی کثرت سے شراب پیتا تھا اور مملکت میں کوئی حلقہ اثر بھی نہیں تھا۔ تیسرے ایک کنیز کے بطن سے ہونے کی وجہ سے بھی معاشرتی اعتبار سے کوئی اعزاز حاصل نہیں تھا۔ البتہ اب جہانگیر کی نظر التفات اس طرف متوجہ ہوتی ہے اور اسے آگے بڑھانا شروع کرتا ہے۔

۲۶۴ تزک ۳۱۳، سن جلوس ۱۷ ماہ مہر۔ ۲۶۵ تزک ۳۲۷، سن جلوس ۱۷ ماہ اسفندار۔

نوٹ:۔ خان اعظم کا (اصلی نام مرزا عزیز کوکہ تھا) اس نے جہانگیر کے مقابلے (باقی بر صفحہ آئندہ)

۸۰۰۰
تھوڑے عرصہ کے بعد داور بخش پسر خسرو کو صوبہ گجرات کا صوبہ دار مقرر کیا اور آٹھ ہزار پیادے اور تین ہزار سوار کے منصب پر فائز کر کے اس کے ہمراہی لشکر کے اخراجات کے لیے دو لاکھ روپے اور خان اعظم کو ایک لاکھ روپے بطور مدد عنایت کیے اور خان اعظم کو بطور اتالیق ۲۶۶؎ اعلیٰ و ممتاز منصب پر مامور کیا اور شاہزادے کو گھوڑا۔ ہاتھی۔ خلعت، خاص مرصع، خنجر، طوغ (علم) اور نقارہ عنایت کیا۔

داور بخش اور اس اتالیق خان اعظم کو شاہ جہان سے شدید مخالفت و نفرت تھی اس لیے کہ داور بخش کے باپ خسرو کو جہانگیر کے ہاتھوں ہمیشہ عتاب، تکلیف و مشکلات ہی آتی رہیں جبکہ شاہ جہان اس کی مخالفت کر کے جہانگیر کا منظور نظر تھا جس نے ہمیشہ عروج، اقتدار، اعزاز، منصب، عہدے، مرتبے حاصل کیے۔ اور آخر میں خسرو نے شاہ جہان ہی کی قید میں انتقال کیا۔ اس لیے داور بخش کے دل میں شاہ جہان کے لیے جو نفرت و عداوت کے جذبات موجزن ہوں گے وہ محتاج بیان نہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) میں اپنے داماد یعنی خسرو کی تخت نشینی کی حمایت کی تھی۔ اس نے جہانگیر کو گرفتار کرنے کی بھی سازش کی تھی لیکن شیخ فرید (حضرت مجدد الف ثانی کے مرید تھے جنھوں نے جہانگیر کی تخت نشینی میں اہم کردار ادا کیا تھا) وغیرہ کی کوششوں سے ناکام ہوا۔ اس نے ایک باغیانہ خط خاندیش کے راجہ علی خان کو لکھا تھا جو جہانگیر کے ہاتھ لگ گیا اس پر جہانگیر نے خان اعظم کی سخت سرزنش کی تھی اُسکے لیے نمک حرام، منافقت، منافقانہ اعمال، بد باطنی وغیرہ سخت الفاظ استعمال کیے ہیں (تزک ۱-۶) میواڑ کی جنگ میں شاہ جہان سے اختلاف ہوا تو شاہ جہان نے اس کی شکایت کی جس پر یہ واپس بلایا گیا اور قلعہ گوالیار میں آصف خان کی نگرانی میں قید بھی کیا گیا اور اسی جنگ میں شاہ جہان کو شہرت، عظمت ملی۔ اس کے منصب، جاگیر اور مراتب میں اضافہ ہوا۔ اب اسی خان اعظم کو جو عرصے سے گمنامی کی زندگی گزار رہا تھا۔ جو شاہ جہان کا ماضی میں شدید مخالف رہا تھا۔ اب اسے یہ موقع دیا گیا کہ وہ شاہجہان سے اپنی پرانی مخالفت و دشمنی کا بدلہ نکالے۔

۲۶۶؎ تزک جہانگیری ص ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ سن جلوس ۱۸ ماہ خرداد۔

خان اعظم کا معاملہ اس سے اور بھی زیادہ مختلف ہے۔ وہ اپنی نظریات طرزِ فکر رجحان طبع کی وجہ سے خسرو کو پسند کرتا تھا۔ وہ اس کا داماد بھی تھا۔ اس نے اس کو جہانگیر کے مقابلے میں بادشاہ بنانے کی خفیہ اور اعلانیہ دونوں طرح سے کوشش کی تھی اور ہمیشہ اس پر یہی الزام تھا کہ وہ خسرو کا حامی ہے۔ اس نے شاہ جہان کی کبھی حمایت نہیں کی تھی بلکہ میواڑ کی جنگ میں شاہ جہان ہی کی شکایت پر آصف خان کی نگرانی میں قید کیا گیا۔ جہانگیر کے عہد میں عرصہ سے گوشۂ گمنامی میں زندگی گزار رہا تھا اب جہانگیر نے اسے نہ صرف اعلیٰ ترین منصب دیا بلکہ صوبہ گجرات کے صوبہ دار کا اتالیق بنا کر موقع بھی دیا کہ شاہ جہان ایسے دیرینہ دشمن سے انتقام لے۔ اس لیے شاہ جہان اب اس مشکل دور میں پھنس گیا تھا۔

شہریار:۔

شاہ جہان کا تیسرا بھائی تھا جو ایک کنیز کے بطن سے تھا۔ اس کی منگنی کی رسم نور جہاں کی بیٹی لاڈلی بیگم (شیر افگن کے صلب سے تھی) سے ہوتی ہے جو اعتماد الدولہ کی نواسی تھی۔ جہانگیر خود اس موقع پر منگنی کی تقریب ادا کرنے کے لیے اہتمام کے ساتھ اعتماد الدولہ کے گھر گیا۔[۲۶۷] سولھویں جشن جلوس میں جہانگیر سب سے پہلے شہریار ہی کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس کے اپنے الفاظ ہیں:۔

---

۲۶۷ تزک جہانگیری۔ ص ۶۵۸۔ ۶۵۹ سن جلوس ۱۵۔ ۳ دی ماہ۔

نوٹ:۔ منگنی کی تقریب کے دوسرے ہی دن شاہجہان دکن کی مہم کے لیے روانہ کر دیا جاتا ہے۔ پھر زندگی ایں جہانگیر سے ملاقات نہیں ہوتی۔ (تزک ص ۶۶۱) ابتداء میں باپ بیٹے کے تعلقات میں سرد مہری کا پتہ چلتا ہے پھر شکوک و شبہات اور شکایت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جہانگیر شاہ جہان کے خلاف سیاسی جتھہ بندی شروع کرتا ہے اور شاہ جہان کا سیاسی محاصرہ مکمل ہو جاتا ہے تو سفارتی بنیاد پر مذاکرات ہوتے ہیں جو ناکام ہوتے ہیں اور جہانگیر شاہجہان کے خلاف فوجی اقدام کرتا ہے۔

"میں نے اس مسرت بھرے دن میں "سعادتمند فرزند شہریار" کو آٹھ ہزار پیادوں اور چار ہزار سواروں کا منصب عطا کیا اور اسے درازی عمر اور اقبال مندی کی دعا دی۔[268]

چند دنوں کے بعد اس کی شادی دھوم دھام سے ،   لاڈلی بیگم ——
—— سے ہو گئی۔ جہانگیر نے اس تقریب میں شرکت کی، تحفے، تحائف کے ساتھ دعا دی کہ اللہ تعالیٰ یہ ازدواج ہماری روز افزوں سلطنت کے لیے اور مبارک ثابت ہو۔[269]

اسی اثناء میں قلعہ قندھار کے معاملہ میں شاہ ایران سے اختلاف پیدا ہو گئے۔ مہم قندھار کے لیے شاہ جہان کو طلب کیا گیا۔ شاہ جہان نے اپنی کچھ معروضات پیش کیں جنہیں منظور نہ کیا گیا اور مہم قندھار کی قیادت شہزادہ شہریار (ناشدنی) کے حوالہ کر دی گئی اور اس کو دس ہزار ذات اور آٹھ ہزار سوار کے منصب پر متعین کر دیا گیا۔[270] اور خان جہاں کو ہدایت کی کہ جب تک "شہزادہ ظفر آثار" افواج کے ہمراہ ملتان نہ پہنچ جائے وہ ملتان میں حکم ثانی کا انتظار کرے۔[271] اس طرح شاہ جہان کے مقابلہ میں شہریار کو آگے بڑھایا گیا۔ جس کی حمایت اور پشت پناہی

---

۲۶۸ تزک جہانگیری ص ۲۷۰ و اقبال نامہ جہانگیری ۔ ۱۶۵ ۔

۲۶۹ تزک جہانگیری ص ۲۷۴ و اقبال نامہ جہانگیری ۔ ۱۶۶ ۔

۲۷۰ تزک جہانگیری ص ۲۱۳، سن جلوس ۱۷ ۔ ماہ شہر یور ۔ اقبال نامہ جہانگیری ص ۱۷۸ ۔

۲۷۱ تزک جہانگیری ص ۲۲۱ ۔ سن جلوس ۱۷ و اقبال نامہ جہانگیری ص ۱۸۰ ۔

نوٹ:۔ شہریار ۱۶۰۵ء میں ایک کنیز کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ تزک جہانگیری اور اقبال نامہ جہانگیری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنی پیدائش سے لے کر مہم قندھار کی قیادت و منصب پر نامزدگی تک کوئی خدمت انجام نہیں دی تھی بلکہ اپنی نالائقی، نااہلی، حماقت کی وجہ سے "ناشدنی" کے نام سے مشہور تھا۔ اب تک اس نے کسی جنگ میں نہ شرکت کی تھی نہ ہی کسی جنگی مہم کی قیادت کی۔ اس کی عسکری تربیت اور حربی صلاحیت کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ لیکن جہانگیر اس کی فوج (باقی بر صفحہ آئندہ)

نور جہاں کر رہی تھی۔ شہریار کم عمر، اور کمزور سیرت و کردار کا انسان تھا۔ لیکن اب نور جہاں کا داماد تھا اور اس کے ہاتھوں کا کھلونا بن گیا۔ نور جہاں اس کی مربّی اور سرپرست بن کر روز بروز اسے آگے بڑھا رہی تھی اس طرح شاہ جہان کے خلاف سیاسی ریشہ دوانیوں میں نور جہاں ہی پیش پیش تھی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) کے لیے "ظفر آثار افواج" کا خوش آیند اور بلند آہنگ لفظ استعمال کرتا ہے۔

دوسرے یہ اطلاع مل چکی تھی کہ شاہ عباس عراق و خراسان کے لشکروں اور قلعہ گیری کے آلات و اسباب کے ساتھ قندھار پہنچ کر قلعے کے محاصرہ میں مشغول ہے وہ اپنے عہد کا ایک بہترین جنرل اور طاقتور حکمران تھا جو اپنی تجربہ و صلاحیت کے اعتبار سے عظیم شہرت کا مالک تھا۔ اس کے مقابلے میں کسی اہل، آزمودہ اور تجربہ کار جنرل ہی کو بھیجا جانا چاہیئے تھا۔ شاہ جہان نے مہم قندھار پر جانے سے انکار نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس کام کی اہمیت، دوسرے سیاسی ریشہ دوانیاں جو دربار میں جاری تھیں اس کے حفظ ماتقدم کے لیے کچھ احتیاطی اقدام کے تحت چند مناسب شرائط پیش کی تھیں۔ لیکن جہانگیر ان شکوک و شبہات کو دور کرنے، صلح و صفائی سے پیش آنے کے بجائے شہریار (ناشدنی) کو قندھار کی مہم پر روانہ کر دیتا ہے اور شاہ جہان کو "بے دولت" سے منسوب کر کے اس کے خلاف فوجی اقدام کرتا ہے۔ جہانگیر کا یہ سیاسی فیصلہ بہت ہی اہم، معنی خیز اور ناقابل فہم ہے۔ اس نے ایک نالائق، کم تر درجے اور فروتر حیثیت کے شہزادے کو تو عزت، سربلندی کا تاج پہنایا اور اسے ایک ایسی اہم مہم سپرد کی جس سے مملکت کی سالمیت حکومت کا وقار اور عظمت کا انحصار تھا۔ اور اسی قلعہ قندھار کے تحفظ کی ناکامی پر عبدالعزیز خاں نقشبندی کو پہلے جلاوطنی پھر قتل کا حکم دیا تھا۔ (تزک ۸۹، ۷) لیکن "ناآزمودہ را کار بزرگ پسردن کار خردمنداں نیست" کے مصداق جہانگیر کا یہ فیصلہ ناقابل فہم ہے۔ دوسری طرف شاہ جہان تھا جس نے جہانگیر عہد حکومت کے تمام اہم اور بڑے کام انجام دیے تھے۔ جس کا جہانگیر نے خود بھی اعتراف کیا ہے۔ وہ ایک آزمودہ اور کامیاب جنرل ہی نہ تھا بلکہ ایک اچھا انسان بھی تھا جو اچھے کردار و اخلاق کا مالک ہے۔ جس کی حربی استعداد، عسکری صلاحیتیں سیاسی (باقی بر صفحہ آئندہ)

نور جہاں :-

جہانگیر ۱۶۰۵ء سے لے کر ۱۶۱۱ء تک (نور جہاں سے شادی سے قبل) معاملات مملکت میں اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ اس کے پیش نظر حکومت کا استحکام اور ان امراء مملکت کی خوشنودی و تعاون پیش نظر ہوتی تھی جو اسے اقتدار میں لائے تھے لیکن ۱۶۱۱ء میں جب اس نے نور جہاں سے شادی رچائی تو مملکت کی سیاست میں ایک نیا عنصر داخل ہوا اور رفتہ رفتہ اپنی مخصوص صفات کی وجہ سے موثر و طاقتور ہوتا گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ جہانگیر برائے نام بادشاہ رہ گیا اور جہانگیر کے اپنے الفاظ ہیں :-

"میں نے سلطنت نور جہاں بیگم کو بخش دی۔ مجھے ایک سیر شراب آدھا سیر گوشت کے سوا کچھ نہیں چاہیئے" ۲۷۲

یہ سیاسی گٹھ جوڑ جس میں اعتماد الدولہ (نور جہاں کا باپ) آصف خاں (نور جہاں کا بھائی)، شاہ جہاں (آصف خاں کا داماد، اعتماد الدولہ کی پوتی اور نور جہاں کی بھتیجی کا شوہر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) فراست روز روشن کی طرح بیاں تھیں۔ اس کے خلاف جہانگیر مملکت کے ایک بہادر جنرل کو فوج کشی کے لیے مقرر کرتا ہے اور حکومت کے وسائل، افواج، خزانہ تمام کا تمام شاہجہان کی سرکوبی اور بیخ کنی کے لیے صرف ہوتے ہیں۔ آخر شاہجہان ایسے لائق، ہونہار، کامیاب جنرل، عظیم سیرت و کردار کے مالک کے صلح کیوں نہ ہو سکی؟ مہابت خاں ایسے لائق جنرل کو قلعہ قندھار کی مہم پر کیوں نہ متعین کیا گیا؟ کوئی ایسی بات تو ضرور تھی جس کی وجہ سے شاہجہان سے صلح و صفائی نہ ہو سکی۔ اختلاف وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے گئے۔ اور نوبت جنگ کی پہنچی۔

یہ اختلاف نظریہ، عقیدہ، مسلک، طرز فکر، رجحان اور مستقبل میں مملکت کی سیاسی، سماجی، ثقافتی بنیادوں کے مسئلہ پر تھا۔ جیسا کہ بعد کے واقعات تصدیق کرتے ہیں۔

۲۷۲ اقبال نامہ جہانگیری ص ۲۴۶۔

شامل تھے ۔ بحسن و خوبی کام کرتا رہا۔ لیکن ۱۶۱۹ء میں شیخ احمد سرہندی کی دربار میں طلبی اور قلعہ گوالیار میں قید سے اس سیاسی جتھہ بندی کو جھٹکا لگتا ہے[ع] ۔ اس کے بعد ہی نور جہاں کی بیٹی لاڈلی بیگم کی منگنی اور چند ماہ بعد ہی جہانگیر کے بیٹے شہریار سے شادی ہو جاتی ہے[۲۷۳] ۔ اس سے فطری طور پر نور جہاں کی ہمدردی اور لگاؤ اپنے داماد شہریار سے ہو جاتی ہے۔ اور اس کو اپنے اثر و رسوخ سے آگے بڑھانے کی کوشش کرتی ہے۔

شہریار کی منگنی کے دوسرے ہی دن شاہ جہان کو دوبارہ دکن کی مہم پر روانہ کر دیا جاتا ہے[۲۷۴] ۔ شاہ جہان دکن جاتے ہوئے دریائے چنبل کے کنارے اپنے تیسویں قمری جلوس کی خصوصی تقریب میں شراب اور نشہ آور اشیاء سے توبہ کا اعلان کرتا ہے[۲۷۵] ۔ یہ ایک زبردست سیاسی دھماکہ تھا جو شاہ جہان نے انجام دیا۔ شاہ جہان کے اس اعلان سے نور جہاں کو یہ احساس ہوا ہو گا کہ اب شاہجہان نہ صرف اس کے دائرے اثر سے نکل گیا ہے بلکہ اس نے اپنی آزاد مرضی سے اپنے لیے الگ راستہ بھی متعین کر لیا ہے اس لیے یہ بساط سیاست ۱۶۲۱ء میں ختم ہو جاتی ہے اور ایک نئی بساط سیاست بچھائی جاتی ہے۔ جس میں نور جہاں ہی کو مرکزی مقام حاصل ہے ۔ وہی اپنے سیاسی غلبہ و اثر کو کام میں لا کر شہزادہ پرویز و مہابت خان کو آگے لاتی ہے ۔ داور بخش اور خان اعظم کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر صوبہ گجرات ایسے زرخیز اور دفاعی حیثیت سے اہم صوبہ پر

ع شاہ جہان ذہنی اور فکری طور پر حضرت شیخ احمد سرہندی سے متاثر تھا۔ اس نے شیخ کے پاس اپنے معتمد آدمی بھیج کر درخواست کی تھی کہ بادشاہ کو علماء نے سجدہ کرنے کی اجازت دے دی ہے ۔ اس لیے آپ اگر سجدہ کر لیں گے تو پھر میں آپ کی رہائی کا ذمہ دار ہوں۔ لیکن آپ سجدہ نہیں کرتے اور قید کر دیے جاتے ہیں۔

۲۷۳ تزک جہانگیری ص ۶۵۸ ۔ ۶۷ بمطابق دسمبر ۱۶۲۰ و اپریل ۱۶۲۱ء ۔

۲۷۴ تزک جہانگیری ص ۶۶۱ ۔ سن جلوس ۱۵ ۔ ۱۴ دی ماہ ۔

۲۷۵ عمل صالح حصہ اول ص ۱۳۰ و خافی خاں ۔

بٹھا کر شاہجہان کو محصور کرتی ہے۔

اسی زمانے میں جہانگیر شدید بیماری میں مبتلا ہوتا ہے۔ اپنے علاج کے معاملے میں حکیموں کی ناکامی اور معالج خاص کی سرزنہری کا تذکرہ تند و تیز الفاظ میں کرتا ہے۔ اسے حق ناشناس کہتا ہے اور حکیم ابوالقاسم کے متعلق تو کہتا ہے اسے دیکھتے ہی نفرت اور دکھ کا احساس ہوتا ہے۔[۲۷۶] اس بیماری میں نور جہاں تیمارداری اور جہانگیر کی بحالی صحت کے لیے جو خدمات انجام دیتی ہے اور تدابیر اختیار کرتی ہے اس سے جہانگیر بہت ہی خوش اور ممنون احسان ہوتا ہے۔ اس کی خدمات کا اعتراف اور اس کی تعریف و توصیف کرتا ہے۔ نور جہاں اپنی اس حسن خدمت کی وجہ سے جہانگیر کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے اور اب عملاً وہی حکمراں ہوتی ہے۔[۲۷۶ الف] اسی زمانے میں اس کی والدہ عصمت بیگم اور چند ماہ کے بعد والد اعتماد الدولہ کا انتقال ہو جاتا ہے۔[۲۷۷] اس سے نور جہاں عملاً بالکل آزاد ہو گئی۔ ماں اور باپ کا جو اخلاقی دباؤ رہا ہوگا وہ بھی ختم ہو گیا۔ اب اسے آزادانہ طور پر اپنی من مانی کرنے کا موقع مل گیا جہانگیر کچھ تو اپنی افتاد طبع۔ کچھ بیماری اور کچھ کثرت شراب نوشی سے عملاً بے دست و پا ہو چکا تھا اس لیے مکمل طور پر اپنے کو نور جہاں کے سپرد کر دیتا ہے۔ اعتماد الدولہ کی تمام جاگیر مال و متاع، ریاست و امارت نور جہاں بیگم کو عنایت کر کے حکم جاری کیا کہ آیندہ شاہی نوبت کے بعد اس کے لیے نوبت بجا کرے[۲۷۸] یعنی عملاً حکمراں وہی ہوگی۔

اس نئی بساط سیاست میں نور جہاں ہمہ مقتدر اور باثر ہوتی ہے بلکہ عملاً وہی حکمراں ہے اس نے شاہ جہاں کے خلاف سیاسی محاذ مستحکم کر لیا تھا۔ قندھار کی مہم نے

---

۲۷۶ تزک ص ۶۸۵ - ۶۸۶ سن جلوس ۱۶ -

۲۷۶ الف تزک ص ۶۸۵ - ۶۸۶ سن جلوس ۱۶ - اقبال نامہ جہانگیری ص ۱۷۰ - ۱۷۱ -

۲۷۷ تزک ص ۶۸۹ - ۶۹۵ -

۲۷۸ تزک ص ۷۰۱ سن جلوس ۱۶ -

نور جہاں کو شاہ جہان کے خلاف اقدام کرنے کا جواز فراہم کر دیا اور اپنے داماد شہر یار کو آگے بڑھا کر مہم قندھار اس کے سپرد کر دی۔

شاہ جہان کی مخالفت کیوں؟

شاہ جہان عہد جہانگیری کا سب سے لائق شہزادہ تھا۔ حسن سیرت حسن صورت اور حسن کردار کے ساتھ ساتھ عسکری صلاحیت حربی قیادت، سیاسی فراست اور اولوالعزمی میں ممتاز تھا۔ عہد جہانگیری کی تمام فتوحات شاہ جہاں ہی کی قیادت میں ہوئی تھیں جس کا اعتراف خود جہانگیر نے کھلے الفاظ میں کیا ہے اور اعتراف حقیقت ہی کے بنا پر شاہجہان کو معزز ترین خطاب اور اعلیٰ ترین منصب دیے تھے لیکن ہمعصر مورخین کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ بنیادی وجہ کیا تھی؟ جس سے شاہ جہان اور جہانگیر میں اختلاف پیدا ہوئے اور افہام تفہیم کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی اور جہانگیر کو اپنے سب سے لائق، وفاشعار، با صلاحیت بیٹے کے خلاف نہ صرف شکایت پیدا ہوئی اور اس کو "بے دولت" کا نام دینا پڑا بلکہ اس کے الفاظ میں اس جیسے "ناخلف اولاد" کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی۔[۵۲۷۹]

عہد جہانگیری کے نظریاتی۔ فکری اور ذہنی رجحان کی ارتقاء پہ اگر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں احیاء اسلام کی خواہش روز بروز قوی تر ہوتی جارہی تھی۔ شہنشاہ اکبرؔ نے (۱۵۵۶ء-۱۶۰۵ء) عقل، فلسفہ، مفاد حکومت، مصلحت ملکی اور ہندو ویدانت کی انجذابی فلسفہ کے تحت جو سیاسی نظام حکومت ترغیب۔ تحریص، جبر و تشدد اور اپنی ذات کو جو مرکزی اہمیت بنا کر پیش کیا تھا اس سے لوگ اس کی زندگی ہی میں بیزار تھے اور تمدن و ثقافت اور مشترک کلچر اور متحدہ قومیت کا جو نظام معاشرت قائم کیا تھا اس کو مسلمانوں کا سواد اعظم پسند نہ کرتا تھا۔ اس لیے

۵۲۷۹ تزک جہانگیری ص ۲۷۴-۲۷۵۔

امراء مملکت[ع] کا ایک گروہ جو احیاء شریعت کا حامی تھا اس نے جہانگیر کی محض اس لیے حمایت کی کہ وہ اسلام کے خلاف معاندانہ رویہ نہ رکھتا تھا اور تخت نشینی کے بعد بارہ قوانین پر جو دستور العمل جاری کیا تھا اس کی چوتھی شق یہ بھی کہ "شراب اور دوسری تمام نشہ آور چیزیں نہ بنائی جائیں اور نہ ہی فروخت کی جائیں۔"[۲۸۰]

جہانگیر نے اپنے دستور العمل میں شراب اور دوسری تمام نشہ آور چیزوں کو ممنوع تو قرار دیا لیکن وہ خود اور اس کے مقتدر امراء اس پر عمل نہیں کرتے بلکہ اس کی شاہی مجالس میں کثرت سے شراب پی جاتی تھی جو ایک کھلا تضاد تھا یعنی پالیسی اور عمل میں اختلاف یا منافقت کی نشاندہی کرتی ہے لیکن جہانگیر اپنے دستور العمل میں یہ شق محض مسلم رائے عامہ اور مسلمانوں کے مقتدر امراء مملکت جو شریعت کے حامی تھے ان کو مطمئن کرنے کے لیے رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ دستور العمل کے دوسرے نکات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ جہانگیر نے واضح طور پر نظم و نسق کی گاڑی ایسی سمت موڑ دی تھی جو اکبر کی پالیسی اور فلسفہ حکومت سے بالکل مختلف تھی۔ لیکن یہ گاڑی آگے نہ بڑھ سکی۔

شیخ احمد سرہندی رح (۱۵۶۴ء۔۱۶۲۴ء) اپنے رسالے "اثبات النبوۃ"، "رد روافض" اور مکتوبات کی معرفت۔ ذہن و فکر کی اصلاح۔ غلط عقائد۔ باطل نظریات کی تردید و بیخ کنی میں ہمہ تن مصروف نظر آتے ہیں اور روز بروز انہیں اس میں بہت کامیابی ہوئی۔ آپ مثبت اور موثر انداز میں احیاء سنت نبوی کا حیات افروز اور زندگی بخش مسلک کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کرتے ہیں اور جوں جوں ان کے نظریے اور تحریک کو مقبولیت حاصل

ع شیخ فرید بخاری جہانگیر کو تخت نشین کرانے میں بہت پیش پیش تھے آپ کو مجدد الف ثانی نے کل ۲۱ خطوط لکھے ہیں اور جس زمانے میں حصول تخت کے لیے کشمکش ہو رہی تھی اس اثنا میں آپ نے مسلسل خط و کتابت رکھی اور مکتوب جلد اول میں ۱۲ خطوط ترتیب سے مکتوب نمبر ۴۳ تا ۵۴ شیخ فرید ہی کے نام ہیں و تزک جہانگیری ص ۹۰۔۹۵۔

۲۸۰ تزک جہانگیری ص ۱۴۔

ہوتی ہے تو ان کے دائرہ اثر وسیع اور موثر ہوتا جاتا ہے تو حکومت کے اعلیٰ عہدے و منصب پر فائز کار پرداز مملکت و منافقین فی العمل امراء مملکت اپنے لیے دائرہ تنگ محسوس کرتے ہیں اس لیے یہ لوگ شیخ احمد سرہندی کی تحریک نفاذ شریعت کے خلاف سازش کرتے ہیں اور اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ آپ رح کو جہانگیر سن جلوس ۱۴ ار بمطابق ۱۶۱۹ء میں دربار میں طلب کرتا ہے اور قلعہ گوالیار میں قید کیا جاتا ہے اور آپ کے خلاف نازیبا اور رکیک الفاظ استعمال کرتا ہے۔ جہانگیر نے آپ کی ذات ہی کو قید نہیں کیا بلکہ اس کی معرفت آپ کی تحریک احیاء شریعت کو مقید کرنا چاہتا تھا لیکن حضرت شیخ احمد سرہندیؒ تو مقید ہو گئے لیکن احیاء شریعت کے جذبے اور تحریک کو قلعہ کی چہار دیواری میں قید نہ کر سکی بلکہ اس کی اثر آفرینی سے معاشرہ متاثر ہوتا رہا۔ اسی اثناء میں خان جہاں کا بیٹا جہانگیر کے سمجھانے کے باوجود ترک شراب نوشی کا اعلان کرتا ہے[۲۸۱] عامۃ المسلمین کے خواہش اور جذبہ کو تسکین دینے کے لیے جہانگیر سن جلوس ۱۵ اور ۱۶ میں قلعہ کانگڑہ کی سیر کے دنوں میں اسلامی و شرعی امور کو بجا لانے کا حکم دیتا ہے[۲۸۲] جہانگیر کے یہ احکام دراصل اس کی سیاسی حکمت عملی کا نتیجہ ہیں وہ عامۃ المسلمین کو باور کرانے کی کوشش تھی کہ وہ خود بھی احیاء شریعت کا حامی ہے ورنہ اس کے فکر و عمل میں کوئی تبدیلی نہیں آتی بلکہ مملکت کے اعلیٰ عہدے و منصب پر جن لوگوں کو آگے بڑھاتا ہے ان کی زندگیاں، عمل و کردار اور مشاغل شریعت کے خلاف ورزی پر تھی۔

سن جلوس پندرہ (۱۵) بمطابق یکم ربیع الثانی ۱۰۳۰ھ (۲۳ فروری ۱۶۲۱ء) شاہجہان نے ایک خصوصی تقریب میں ترک شراب نوشی کا اعلان کرتا ہے اور شراب نوشی کے تمام ظروف غریبوں میں تقسیم کرنے کا حکم دیتا ہے[۲۸۳] شاہ جہان کا یہ اعلان سیاسی و نظریاتی تھا جو

---

۲۸۱ تزک جہانگیری ص ۲۳۶۔

۲۸۲ تزک جہانگیری ص ۲۹۶-۲۹۷ و اقبال نامہ جہانگیری ۱۷۳-۱۷۴۔

۲۸۳ عمل صالح المعروف بہ شاہجہان نامہ جلد اول مصنفہ محمد صالح کنبو۔ اردو ترجمہ ڈاکٹر ناظر حسن زیدی ص ۱۳۱۔

جہانگیر کے طرزِ عمل۔ شاہی مجالس کے آداب کی سراسر بغاوت پر مبنی پر عمل تھا۔ اس لیے شاہ جہان اور جہانگیر میں اختلاف کھل کر واضح ہو گئے۔ اس اعلان سے شاہ جہاں نے اپنی راہ خود متعین کر لی اور یہ واضح کر دیا کہ اب وہ کیا چاہتا ہے اس کا اثر رائے عامہ پر پڑنا لازمی تھا۔ اس لیے جہانگیر اور شاہ جہان میں اختلاف وسیع ہونے شروع ہو جاتے ہیں جہانگیر نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ شاہ جہان کس سمت جا رہا ہے اب اس سے تعاون ممکن نہیں اور اس کی سیاست مختلف ہو گئی ہے۔ اس لیے جہانگیر اس کے خلاف اپنی سیاسی پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے نئی بساط سیاست ترتیب دیتا ہے۔ یہ اسی سیاسی حکمت عملی کا نتیجہ ہے کہ جہانگیر سن جلوس ۱۵ اور ۱۶ میں مختلف انتظامی فرمان کے ذریعہ ایک طرف تو احیاء شریعت کے حامیوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن دوسری طرف مملکت کے اعلیٰ عہدوں اور منصب پر شاہ جہاں کے مخالف لوگوں کو

ع۷ نوٹ:۔ شاہ جہان کی ترک شراب نوشی کا اعلان خصوصی تقریب میں اس شاہی مجالس کے آداب وپس منظر میں دیکھا جائے کہ اکبر کے آخری عہد حکومت میں کثرت شراب نوشی کا یہ عالم تھا کہ جہانگیر کے دو بھائی مراد و دانیال عین جوانی میں ۳۰ اور ۳۳ سال کی عمر میں کثرت شراب نوشی سے مرتے ہیں (تزک جہانگیری ص ۶۳ ۔ ۴۶) جہانگیر نے مسلم رائے کی حمایت حاصل کرنے کے لیے شراب نوشی اور نشہ آور اشیاء کی تیاری و فروخت پر پابندی عائد کرتا ہے لیکن شاہی مجالس میں کثرت سے شراب استعمال ہوتی ہے۔ شاہ جہاں کو بھی اصرار کر کے شراب پلاتا ہے۔ (تزک ۳۲۴-۳۲۵) لیکن شاہجہان اپنی شہزادگی ہی کے زمانے میں خصوصی تقریب میں ترک شراب نوشی کا اعلان کرتا ہے۔ جب کہ اس کے بھائی پرویز اور شہریار کثرت سے شراب پیتے ہیں۔ پرویز تو کثرت شراب نوشی سے ۳۸ سال کی عمر میں انتقال کرتا ہے۔ (تزک ۳۳۸-۳۳۸)۔ واقبال نامہ جہانگیری ص ۲۴۲-۲۴۶) و شہریار عین جوانی کے زمانے میں داء الثعلب کی مرض میں مبتلا ہوتا ہے۔ (تزک ص ۲۵۸) واقبال نامہ جہانگیری۔ ص ۲۵۷)۔ وعمل صالح ص ۱۹۰۔

متعین کرتا ہے تاکہ انتظامی معاملات میں اس کی سیاسی پوزیشن مستحکم ہو۔ شاہ پرویز اور مہابت خاں کو گوشہ گمنامی سے لاکر انہیں شاہ جہان کی سرکوبی کے لیے متحد اور تمام ساز و سامان اور فوج کرتا ہے۔ خسرو کے بیٹے داور بخش اور اس کے خسر خان اعظم جو شاہ جہاں سے سیاسی۔ ذاتی۔ نظریاتی و فکری اختلاف رکھتا تھا اس کو صوبہ گجرات میں متعین کرتا ہے۔ مہم قندھار کے بہانے شاہ جہان کے خلاف مہم کا جواز فراہم کرتا ہے اور مہم قندھار شہریار "ناشدنی" کے سپرد کرتا ہے۔

شاہ جہان کے خلاف جہانگیر کی نئی بساط سیاست جب مکمل طور پر بچھ جاتی ہے اور شاہ جہان سے گفت و شنید لاحاصل ہوتی ہے اور ایک دوسرے کو شک و شبہہ سے دیکھتے ہیں۔ جہانگیر یہ محسوس کرتا ہے کہ شاہ جہان سرکشی کا ارادہ کر رہا ہے۔ اور شاہ جہان یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کو نہ صرف تنگ کیا جا رہا ہے بلکہ اس کو محصور کیا جا رہا ہے اس کے مقابلے میں شاہ پرویز اور مہابت خان کو متحد کیا جاتا ہے اس کے ہمسایہ صوبہ گجرات میں داور بخش اور خان اعظم کو بٹھا دیا گیا ہے جن سے اس کے اختلاف و دشمنی روز روشن کی طرح عیاں تھے اور شہریار "ناشدنی" کو مہم قندھار سونپی جاچکی ہے اس نئی بساط سیاست کو ترتیب دینے میں نور جہاں اہم کردار ادا کرتی ہے بلکہ اسی کا دماغ اور خواہش سرگرم عمل تھی اس لیے شاہ جہان اور جہانگیر میں کوئی تعاون یا سمجھوتے کی صورت پیدا نہیں ہو سکی۔

شاہ جہاں اور جہانگیر میں کوئی فروعی سیاسی اختلاف یا کچھ کسی عہدے کا مسئلہ ہوتا یعنی کسی صوبہ کی صوبیداری یا جاگیر یا منصب میں کمی و بیشی کا مسئلہ ہوتا تو شاید مسئلہ حل ہو جاتا۔ لیکن جہانگیر کے پردہ میں جو اصل قوت حکمران تھی اس کی خواہش، نظریات، فکر و فلسفہ اور مستقبل کے لائحہ عمل میں اور شاہ جہان کے خواہش، فکر و فلسفہ و نظریات اور مستقبل کے لائحہ عمل میں شدید اختلاف و ٹکراؤ تھا۔ جس میں شک و شبہات اسی وقت پیدا ہو گیا جب فاتح کانگڑہ سے جہانگیر سرہندی سے پیش آیا اور شہریار کی نور جہاں کی بیٹی سے منگنی کے دوسرے ہی دن شاہ جہان کو دکن

روانہ کیا جاتا ہے اور اطمینان خاطر کے لیے خسرو کو شاہ جہان کے حوالہ کیا جاتا ہے۔ [۲۸۴]
شاہ جہان نے دکن جاتے ہوئے ہی ترک شراب نوشی کا اعلان کیا تھا۔ اس کے بعد ہی جس قدر ڈور کو سلجھانے کی کوشش کی گئی اسی قدر الجھ جاتی تھی اور تعلقات کشیدہ ہو رہے تھے۔ شاہ جہان نے محسوس کر لیا تھا کہ جہانگیر اپنی بیماری کثرت شراب نوشی کی وجہ سے عملاً بے دست و پا ہو چکا ہے اور اب صحیح معنوں میں نور جہاں ہی حکمران ہے وہ جو چاہتی ہے وہی کچھ ہوتا ہے اس کا اثر و اقتدار مسلم ہے اب وہ اس کے خلاف سرگرم عمل ہے اس کی تمام ہمدردیاں اپنے داماد شہریار ناشدنی سے ہیں اس لیے افہام و تفہیم کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی اس لیے ناچار ہو کر اپنی ناراضگی کا اظہار جہانگیر کے خلاف نہیں بلکہ نور جہاں اور شہریار کے خلاف کرتا ہے۔ [۲۸۵]

شاہ جہان کے خلاف ناراضگی کا اظہار:۔

شاہ جہان کے اس فعل کو جہانگیر گستاخی پر محمول کرتا ہے اور راجہ افروں کی معرفت باز پرس کے لیے روانہ کرتا ہے اور فرمان بھیجتا ہے کہ معقولیت و ادب کی حد سے قدم باہر نہ دھرے، اپنی جاگیر پر جو دیوان اعلیٰ سے بطور تنخواہ دی گئی ہے اکتفا کرے، ہرگز ہرگز حاضر خدمت ہونے کی کوشش نہ کرے، ان ملازمین شاہی کو جنہیں قندھار کی طرف یورش کرنے کے لیے طلب کیا گیا ہے فوراً دربار میں روانہ کرے اور اس حکم سے سرتابی کرنے کی کوشش نہ کرے ورنہ اسے پچھتانا پڑے گا۔ [۲۸۶] شاہ جہان نے اپنی عرضداشت اپنے دیوان افضل خاں کی معرفت جہانگیر کو پیش کی لیکن جہانگیر نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور

---

[۲۸۴] تزک جہانگیری ص ۶۵۸ - ۶۵۹ و اقبال نامہ جہانگیری ص - ۱۶۲ - ۱۶۳ - و عمل صالح جلد اول ص ۱۲۹ -

[۲۸۵] تزک جہانگیری ص ۱۰۷ - ۱۱۷ و اقبال نامہ جہانگیری ص ۱۷۸ -

[۲۸۶] تزک جہانگیری ص ۱۱۷ -

اس سے اظہار التفات ہی نہیں کیا۔[۲۸۷] شاہ جہان کی تمام کوششیں صلح صفائی کی ناکام ہوتی ہیں اور جہانگیر کی ناراضگی اور عتاب میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ جہانگیر شاہ جہان کی جاگیریں جو اسے بطور تنخواہ سرکار حصار فیروزہ اور دوآبہ کے علاقہ میں بقبض شہریار کو دے دی گئیں اور اس کے بدلے اسے صوبہ دکن، گجرات، مالوہ، خاندیس اسے دی گئیں حکم ہوا کہ ان محال میں سے جس جگہ چاہے قیام کرے اور ان ملازمین شاہی کو جو اس کے پاس ہیں فوراً دربار میں روانہ کرے اور آئندہ فرمان شاہی سے سرتابی کرنے کی کوشش نہ کرے۔ ورنہ اسے پچھتانا پڑے گا۔[۲۸۸] جہانگیر کی ناراضگی اور اس اشتعال آمیز فرمان میں نورجہاں پس پردہ کام کر رہی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ کس طرح باپ بیٹے میں ملاقات نہ ہو سکے اور نہ ہی صلح و صفائی ہو سکے اس لیے اس میں اس کا کھیل بگڑتے ہوئے نظر آتا تھا۔ شاہ جہاں اس صورتِ حال سے پریشان تھا اس لیے بہ نفس نفیس ملاقات کے لیے دکن سے روانہ ہوا۔[۲۸۹]

شاہ جہان اور جہانگیر میں جنگ:۔

جہانگیر بظاہر سمجھانے کے لیے اپنے خاص معتمد موسوی خاں کو شاہ جہان کے پاس روانہ کرتا ہے لیکن اس کا مقصد صلح صفائی یا شکایت یا ناراضگی کا دور کرنا نہیں ہے بلکہ جو بے اعتمادی باپ بیٹوں میں پیدا ہو گئی تھی اور جہانگیر کے اشتعال انگیز فرمان اور انتظامی اقدامات سے شاہ جہان کے ارادوں اور مقاصد سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے تھی۔ اس زمانے میں جہانگیر کو یہ اطلاع ملی کہ شاہ جہان آگرے کی طرف آرہا ہے۔ اس اطلاع کے ملتے ہی شاہ جہان کے خلاف فوجی اقدامات کرتا ہے اور باپ بیٹے میں

---

۲۸۷ تزک جہانگیری ۳۷۰۔ اقبال نامہ جہانگیری ص ۱۷۹ و عمل صالح جلد اول ص ۱۵۸۔ ۱۵۹۔

۲۸۸ تزک ۳۷۵ و اقبال نامہ جہانگیری ص ۱۷۹۔ ۱۸۳۔

۲۸۹ اقبال نامہ جہانگیری ص ۱۸۳ و عمل صالح ص ۱۵۷۔

جنگ شروع ہو جاتی ہے۔[۲۹۰]

فتح کانگڑہ کو جہانگیر اللہ تعالیٰ کا خاص لطف و کرم قرار دیتا ہے اور قلعہ کانگڑہ کی سیر کرتے ہوئے شرعی امور کو بجالانے کا حکم دیتا ہے۔[۲۹۱] لیکن فاتح کانگڑہ یعنی شاہ جہان کے خلاف سترھویں جلوس ماہ بہمن میں جنگ کا حکم دیتا ہے۔ اور فرمان جاری کرتا ہے کہ شاہ جہان کو "بے دولت" کے نام سے مخاطب کیا جایا کرے۔ اس کے بعد ہی جہانگیر نے شاہ جہان کے خلاف غیض و غضب نفرت و حقارت کے شدید ترین الفاظ استعمال کیے۔[۲۹۲]

اب باپ بیٹوں میں سن جلوس ۱۸ سے باقاعدہ جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ اور کم و بیش تین سال تک خانہ جنگی رہتی ہے۔ محترم خاں۔ خواجہ سرا اور خلیل بیگ کو جو شاہ جہان سے خط و کتابت رکھتے تھے انہیں قتل کا حکم دیا گیا۔[۲۹۳] جہانگیر کی بدگمانی اور نفرت دشمنی اور بھی زیادہ ہو گئی اس نے شاہ جہان کی سرکوبی کے لیے تمام انتظامات خود کیے۔ اور فوجیوں اور امراء مملکت کی بہ نفس نفیس قیادت کی اور جن امراء مملکت نے شاہ جہان کا ساتھ دیا ان کے خلاف سخت ترین الفاظ استعمال کیے مثلاً عبداللہ خاں کے لیے لعنت اللہ خاں کا خطاب تجویز کیا۔ سندر کا کٹا ہوا سر دیکھ کر "ہندو کتا" سے مخاطب کیا اور شاہ جہاں کو بد دعا دی کہ وہ اس کے انصاف سے ہرگز ہرگز نہ بچے اور اسے کبھی کبھی بھلائی نصیب نہ ہو اور جن لوگوں نے شاہ جہان کو شکست دینے میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں انہیں ان کے مرتبہ و حیثیت کے مطابق انعام و اکرام دیے۔[۲۹۴]

---

۲۹۰ تزک جہانگیری ص ۳۲۳ و اقبال نامہ جہانگیری ص ۱۸۱۔

۲۹۱ تزک جہانگیری ص ۳۵۴ تا ۳۵۶ و ۳۹۶۔ ۳۹۷ و اقبال نامہ جہانگیری ص ۱۶۱۔۱۷۳۔۱۷۴ وغیرہ۔

۲۹۲ تزک جہانگیری ۳۲۳۔ ۳۲۵۔

۲۹۳ تزک جہانگیری ۳۲۵ و اقبال نامہ جہانگیری ص ۱۸۲۔

۲۹۴ تزک جہانگیری ص ۳۳۳ ۔ ۳۳۴ ص۔

جہانگیر نے شہزادہ پرویز کو شاہی افواج کے ساتھ "بدعاقبت" "بے دولت شاہ جہان" کے تعاقب و بیخ کنی کے لیے مامور کیا اور اس کی رہنمائی و انتظام لشکر کے لیے مؤتمن الدولہ القاہرہ مہابت خان کے سپرد کی۔ اسے نور جہاں بیگم کی بھی حمایت و مدد حاصل تھی۔[۲۹۵] مہابت خان ترغیب و تہدید، تحریص، ڈپلومیسی اور جنگ کے ذریعہ شاہ جہاں کو شکست دیتا ہے۔ جب جہانگیر کو اس کامیابی کی اطلاع ملی ہے تو سلطان پرویز کے ملازم ابراہیم حسن کو "خوش خبر خاں" کا خطاب عنایت کیا اور مہابت خاں کے منصب کو سات ہزار ذات و سوار کے منصب پر بڑھایا اور مہابت خاں کے بیٹے خانہ زاد خاں کو پانچ ہزاری ذات و سوار کے منصب پر ترقی دی۔[۲۹۶]

شاہ جہان کا دکن میں قیام ممکن نہ رہا اور اسے یکے بعد دیگرے شکست ہوئی تو شاہجہان گوالکنڈہ۔ تلنگانہ ہوتے ہوئے اڑیسہ۔ بنگال۔ بہار۔ جونپور۔ الہ آباد اور دہ تک جا پہنچتا ہے جہانگیر کو جوں ہی اس کی اطلاع ملی اس نے شہزادہ پرویز اور مہابت خاں کو حکم دیا کہ فوراً الہ آباد پہنچیں۔[۲۹۷] یہاں بھی شاہ جہاں کو ناکامی ہوئی اور شکست کھا کر قلعہ رہتاس میں جا کر پناہ لی (بہار) جب جہانگیر کو اس فتح کی خبر ملی تو مہابت خاں کو "خان خانان سپہ سالار" کا خطاب دے کر سات ہزار پیادوں اور سات ہزار دو اسپہ و سہ اسپہ سواروں کے منصب پر ترقی دی اور اس کے علاوہ اسے تمن اور توغ عنایت کیا۔[۲۹۸] مہابت خاں کو یہ اعزاز بلند و بالا خطاب جہانگیر نے اس خدمت کے صلہ میں دیا تھا جو اس نے شاہجہان ایسے لائق۔ کامیاب جنرل کو شکست دینے میں تندہی۔ صلاحیت و جانفشانی دکھائی تھی۔

---

[۲۹۵] تزک جہانگیری ۳۸۷-۳۹۷۔

[۲۹۶] تزک جہانگیری ص ۴۰۷، ۳۰۶، ۵۷۔

[۲۹۷] تزک جہانگیری ص ۷۷۔

[۲۹۸] تزک جہانگیری ص ۷۹۷۔

شاہ جہان اس شکست و ناکامی کے بعد اسی راستے سے دکن واپس آیا جس راستے سے وہ گیا تھا۔ دکن پہنچنے کے بعد وہاں کے حالات سازگار نہ تھے۔ اس دوران میں بہت سے وفادار مخلص ساتھی جنگ میں کام آئے تھے۔ کچھ اس سے علیحدہ ہو کر شاہی فوج سے خوف یا انعام و اکرام کی لالچ میں مل گئے تھے اور بہتوں کی ہمتیں پست پڑ چکی تھیں۔ شاہ جہان کی فوج کا کافی حصہ کام آچکا تھا۔ اس کے وسائل جواب دے چکے تھے اسی زمانے میں وہ سخت بیمار بھی ہو گیا جس سے اس کے قویٰ بھی کمزور ہو گئے۔ جرأت و عزم و حوصلہ سے قسمت آزمائی کرنے کے بجائے شاہی افواج سے صلح و صفائی کی پیش کش کی اپنی غلطیوں۔ خطاؤں پر ندامت کا اظہار کیا اور اپنے ہاتھ سے جہانگیر کو معذرت نامہ لکھ کر روانہ کیا۔ جہانگیر نے اس کی درخواست منظور کی اور شاہ جہان نے اپنے بیٹے دارا شکوہ اور اورنگ زیب کو دربار شاہی میں بھیجنا منظور کیا اور قلعہ رُہتاس، اسیر گڑھ شاہی افواج کے حوالہ کیا۔[۲۹۹] خلاصہ یہ کہ شاہ جہان کو مکمل شکست سن جلوس ۲۰ کی ابتداء میں ہوئی۔ اس کی سیاسی ساکھ فوجی طاقت ختم ہو گئی اس کا حلقہ اثر منتشر ہو گیا۔ اور جن لوگوں نے شاہ جہان کا ساتھ دیا تھا اور اس سے توقعات قائم کی تھی بظاہر ناکام و نامراد ہو گئے۔

نورجہاں کے عزائم :۔

شاہ جہان کی شکست و ناکامی دراصل نورجہاں ہی کی کامیابی تھی اس نے مہابت خان کو گوشہ گمنامی سے نکال کر شہزادہ پرویز کی اعانت و مدد کے لیے مامور کیا تھا اور جب اس سے مطلوبہ مقصد حاصل ہو گیا تو اس نے فوراً مہابت خان کو شہزادہ پرویز سے علیحدہ کرا دیا اس طرح پرویز ایک لائق معتمد علیہ امیر سے محروم ہو گیا اور مہابت خاں کو ایک ایسے شہزادے کی اتالیقی سے محروم کر دیا گیا جو شاہ جہان کے بعد تخت کا وارث ہونے کا خواب دیکھ رہا تھا۔[۳۰۰]

---

[۲۹۹] تزک جہانگیری ص ۸۱۰۔

[۳۰۰] تزک جہانگیری ۸۱۱-۸۱۴۔

شیخ احمد سرہندی رح کی رہائی :۔

جہانگیر نے سن جلوس ۱۴ میں شیخ احمد سرہندی رح کا تذکرہ تحقیر آمیز انداز میں کیا ہے اور قلعہ گوالیار میں قید کرنے کا حکم دیتا ہے ٹھیک ایک سال بعد سن جلوس ۱۵ میں بظاہر رہائی کا تذکرہ کرتا ہے لیکن وہ دراصل نظر بند کیے جاتے ہیں کیونکہ اس دوران میں آپ جہانگیر کے ساتھ رہے ہیں۔ آزادانہ ملنے جلنے یا آنے جانے کی اجازت نہ تھی۔ جہانگیر اور اس کی فوجیں جہاں جاتی تھیں آپ بھی اسی کے ساتھ جاتے تھے۔ دفتر سوم میں آپ کے مکتوبات اس بات کے شاہد ہیں کہ لشکر میں قیام اختیاری نہ تھا۔ بلکہ بدرجہ مجبوری تھا۔ [۳۰۱]

جہانگیر نے سن جلوس ۱۸ ماہ شہر یور کے واقعات کے ضمن میں لکھا ہے کہ عمر کا پچپن واں مبارک سال شروع ہونے پر میرے وزن شمسی کا جشن آراستہ ہوا اور میں نے حسب سابق اپنے آپ کو سونا۔ چاندی اور مختلف اجناس میں تلوا کر مذکورہ اشیاء کو مستحق افراد میں تقسیم کیا اور اس تلادان میں سے "دو ہزار روپیہ شیخ احمد سرہندی رح کو عنایت کیے" [۳۰۲] اس طرح آپ تین سال تین ماہ تک نظر بند رہے۔ رہائی کے ایک سال تین ماہ آٹھ دن کے بعد یعنی ۲۸ صفر المظفر ۱۰۳۴ ھ مطابق ۱۶۲۴ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

آپ رح کی زندگی کا آخری دور بہت ہی پر آشوب تھا مملکت میں امن و سکون ختم ہو چکا تھا۔ بدنظمی۔ انتشار عام تھی سیاست کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ مملکت کے

۳۰۱۔ تزک جہانگیری۔ ص ۵۶۳ و ۳۶۳۔ و مکتوبات امام ربانی رح جلد سوم مکتوب نمبر ۔

۳۰۲۔ تزک جہانگیری ۵۸۷ سن جلوس ۱۸۔ ۲۲۔ ماہ شہر یور بمطابق ۲۰ ذی قعدہ ۱۰۳۲ ھ۔

نظم و نسق میں ان لوگوں کو عروج و اقتدار حاصل ہو گیا تھا جن میں اہلیت و صلاحیت نہ تھی اور نہ ہی اعلیٰ کردار کے مالک تھے۔ ان سب میں ہمہ مقتدر اور با اثر نور جہاں بیگم تھی جہانگیر تو برائے نام بادشاہ تھا۔ تقرری۔ تبادلے۔ برخواستگی۔ عہدے۔ خطابات۔ مناصب۔ انعام و اکرام۔ جاگیریں اسی کے مشورے اور حکم سے صادر ہوتے تھے اسی کی سیاسی حکمت عملی کے نتیجہ میں شاہ جہان کو شکست پر شکست ہوئی تھی۔ اور بظاہر اس کی قوت بالکل ٹوٹ چکی تھی شاہ جہاں کے آدمیوں کو جہانگیر نے ہاتھیوں کے پاؤں کے نیچے ڈلوا کر کیفر کردار کو پہنچایا[۳۰۳]۔ شاہ جہان سے جو خوف و خطرہ لاحق تھا وہ ختم ہو گیا۔ اس کی قوت ٹوٹ گئی۔ اس کی جمعیت منتشر ہو گئی شاہ جہاں کے قدم خود اکھڑ گئے وہ اپنے قدم جمانے کے لیے پناہ کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ جہانگیر کامیاب و سرخرو ہے۔ جہانگیر کی کامیابی کے معنی یہ تھے کہ نور جہاں اپنے عزائم و مقاصد میں کامیاب ہوتی ہے اور نور جہاں جو چاہتی ہے وہی ہو گا۔ مملکت کے سیاسی فلسفہ اور نظام حکومت کو جو شاہ جہان کے عزائم سے خطرہ لاحق ہو گیا تھا اب اس سے کوئی خطرہ نہیں اب مملکت کی سیاہ سفید کی مالک نور جہاں بیگم تھی جو مملکت کی اساسی تصورات میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں چاہتی تھی اس کے دست و بازو مہابت خاں و شاہ پرویز تھے۔ جو اسی کے بنائے ہوئے اور پیدا کردہ تھے اس لیے اس کو ان سے کوئی نظریاتی اختلاف نہ تھا۔

اس پس منظر میں شیخ احمد سرہندی رح کو رہا کیا جاتا ہے اس وقت آپ کی عمر شریف قمری سال کے مطابق ۶۲ سال کی ہوتی ہے۔ رہائی کے بعد صرف ایک سال تین ماہ آٹھ دن کے بقید حیات رہتے ہیں۔ یہ زمانہ بھی ضعف و بیماری کا ہے اور بظاہر احیاء شریعت کا کوئی کام نہیں ہوا اور جو حالات ہیں ان میں بظاہر توقع بھی نظر نہیں آتی کیونکہ شاہ جہاں جس سے توقعات تھیں یا جس نے اپنے عمل سے شریعت کی سربلندی کا اعلان کیا تھا اور جس

---

[۳۰۳] تزک جہانگیری ۷۵۸۔

کی سیرت و کردار اور عمل سے بھی توقع ہو سکتی تھی وہ ناکام ہو چکا تھا۔ اس لیے بظاہر حالات بہت ہی حوصلہ شکن اور مایوس کن ان لوگوں کے لیے تھے جو احیاء شریعت اور نفاذ شریعت کی آرزو و تمنا رکھتے تھے اس لیے کہ اس وقت جن لوگوں کے ہاتھوں میں زمام کار تھی ان میں اس کی اہلیت و صلاحیت نہ تھی اور نہ ہی ان کے کردار اور مشاغل اس قسم کے تھے جن سے توقع کی جاتی شاہ جہان نے قوت سے اس معرکہ کو سر کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس کی شکست اور فوجی ناکامی سے ان لوگوں کی ہمتیں ضرور پست ہوئی ہوں گی جو تحریک اسلامی کی قوت۔ اثر پذیری۔ ہمہ گیری اور مقالیت سے واقف نہیں تحریک کا خوف، جبر، ظلم، دھونس، ترغیب و تحریص کے ذریعہ وقتی طور پر اس کا راستہ روکا جا سکتا ہے لیکن یہ لوگوں کے ذہن و فکر کو بدلتی ہے۔ ان کے نقطہ نگاہ میں تبدیلی لاتی ہے۔ ان کے پسند و ناپسند کے معیار کو بدلتی ہے۔ زندگی میں ایک مقصدیت شعور جاذبیت و تڑپ پیدا کرتی ہے جو انسان کو بے چین و مضطرب رکھتی ہے۔ حالات کے تحت وہ خود اپنے لیے نئے نئے راہ خود پیدا کر لیتی ہے۔

چنانچہ حضرت مجددؒ کا انتقال تو ۱۶۲۴ء میں ہو جاتا ہے اور بظاہر انہیں زندگی میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی اس لیے کہ نہ تو کوئی تبدیلی آئی تھی نہ ہی بظاہر تبدیلی کے آثار تھے لیکن آپ کی تحریک سے لوگوں کے دلوں میں جو آرزو، تڑپ، خواہش، ولولہ اور پیاس پیدا ہو چکی تھی اور جوں جوں وقت گزرتا گیا اس میں قوت اور خواہش اور بھی تیز تر ہوتی گئی اس لیے جہانگیر کے مرنے کے بعد اور شاہ جہان کی تخت نشینی سے ۱۶۲۸ء میں تاریخ ایک نئے دور کی نشاندہی کرتی ہے۔ جو ماضی سے سراسر مختلف ہے۔

جہانگیر اور نقشبندی سلسلہ :۔

جہانگیر سن جلوس ۱۵ میں اپنی سیاسی حکمت عملی کے پیش نظر قلعہ کانگڑہ کے نواحی علاقوں کا فوجدار عبدالعزیز خاں نقشبندی کو دو ہزار[۲۰۰۰] پیادوں اور ڈیڑھ ہزار[۱۵۰۰] سواروں

کے منصب پر متعین کرتا ہے" چند ماہ بعد تبادلہ کرکے قندھار کا قلعہ دار مقرر کر دیتا ہے اور سن جلوس ۱۶ یکم امرداد ماہ الٰہی میں سہ ہزاری ذات و دو ہزار سوار کے منصب پر ترقی دیتا ہے۔[۳۰۴] سن جلوس ۱۷ کی ابتدا ہی میں شاہ عباس عراق و خراسان کے لشکر اور قلعہ گیری کے آلات و اسباب کے ساتھ قندھار کے قلعہ کا محاصرہ کرتا ہے اور خواجہ عبدالعزیز نقشبندی تین ہزار جوانوں کے ساتھ قلعہ بند ہو جاتا ہے[۳۰۵]۔ اس ضمن میں جہانگیر نے خود حاکم قلعہ عبدالعزیز نقشبندی کو حکم بھجوایا کہ برادر کامگار کی خواہش کے خلاف ورزی نہ کی جائے ابھی تک اخوت کا رشتہ قائم ہے۔ اس محبت و یگانگت کا درجہ و مرتبہ اتنا بلند ہے کہ ہم ساری دنیا کو بھی اس کی قیمت نہیں سمجھتے اور کسی بھی نعمت کو اس کے برابر نہیں گردانتے[۳۰۶]۔ لیکن سن جلوس ۱۹ ماہ خورداد کو جہانگیر نے سابق حاکم قندھار کو جس نے قلعہ قندھار پر شاہ عباس کے حملے کے دنوں میں کوئی کمک نہ پہنچنے پر ہتھیار ڈال دیے تھے۔ سیدو نامی منصب دار کے سپرد کر دیا کہ اسے سورت کی بندرگاہ سے جہاز میں بٹھا کر مکہ معظمہ کو روانہ کرے۔ اس فرمان کے بعد ہی دوسرا فرمان بھیجا کہ اسے قتل کر دے۔ چنانچہ سیدو نے حسب فرمان اس بدقسمت کو راستے میں ٹھکانے لگا دیا۔ معتمد خاں کے بیان کے مطابق خواجہ خندہ پیشانی، خوش مزاجی اور بے تکلفی کے صفات سے بہرہ ور تھا[۳۰۷]

---

۳۰۴ تزک جہانگیری ص ۶۵۶ - ۶۶۳ - ۶۸۳ -

نوٹ:۔ خرم کو سن جلوس ۱۵ھ دی ماہ کو دکن پر مہم پر روانہ کیا جاتا ہے۔ اور ۱۷ دی ماہ کو عبدالعزیز خان نقشبندی کو قندھار تبادلہ کیا جاتا ہے۔

۳۰۵ تزک جہانگیری ص ۷۰۳ - و اقبال نامہ جہانگیری ص ۱۷۶ - ۱۷۷ -

۳۰۶ تزک جہانگیری - ۷۲۱ - و عمل صالح المعروف شاہجہان نامہ حصہ اول ص ۱۵۴ و جلد دوم ص ۲۲۰ - ۲۲۱ -

۳۰۷ تزک جہانگیری ص ۷۸۹ -

نوٹ:۔ یہ وہ زمانہ ہے جب شاہ جہان کو مکمل شکست ہو چکی تھی اور (باقی بر صفحہ آئندہ)

جہانگیر سیاسی حکمت عملی کے پیش نظر عبدالعزیز نقشبندی کو قلعہ کانگڑہ کا فوجدار مقرر کرتا ہے جس کو فتوحات میں اہم ترین مقام دیتا ہے اور ترویج شریعت کا بھی اہتمام کرتا ہے لیکن فوراً ہی مملکت کے ایک دور دراز علاقے میں تبادلہ کر دیتا ہے جو ایک طرح سے جلاوطنی سے کم نہیں تھا اور ساتھ ہی منصب میں ترقی و اضافہ کر کے کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں دیتا۔ اسی زمانے میں شاہ ایران سے طویل گہری دوستی اور برادرانہ تعلقات کے بعد یکایک قلعہ قندھار کے متعلق کچھ بری خبریں ملتی ہیں تو قلعہ قندھار کے تحفظ کے لیے فوج، اسلحہ وغیرہ کا نہ تو کوئی معقول اہتمام کرتا ہے اور نہ ہی کسی آزمودہ لائق جنرل ہی کو متعین کرتا ہے اپنے اس کوتاہ اندیشی، غفلت شعاری کی سزا غریب عبدالعزیز نقشبندی کو دیتا ہے۔

ادھر مہابت خاں کو جہانگیر خانِ خانان سپہ سالار کا خطاب دے کر سات ہزاری پیادوں اور سات ہزار دو اسپہ و سہ اسپہ سواروں کے منصب پر ترقی دیتا ہے اس کے علاوہ اسے نمن اور تورغ عنایت کیا۔[۳۰۸] یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو جہانگیر نے اسے شاہ جہان ایسے باصلاحیت اور خطرناک دشمن کے شکست دینے پر دیا تھا۔ اس سے اس کے صلاحیت اثر و اقتدار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن پہلے مہابت خاں کو شہزادہ پرویز سے جدا کر کے بنگال بھیجا۔[۳۰۹] اس کے بعد اس کو حکم ہوا کہ وہ ہاتھی جو بنگال میں اس کے ہاتھ آئے تھے وہ دربار میں روانہ کرے اس کے علاوہ شاہی امراء کی جاگیروں کے تغیر و تبدل سے جو رقم اس کے ہاتھ لگی ہے اس کا حساب خود آ کر دے۔[۳۱۰] مہابت خان نے وہ تمام ہاتھی جو اس سے منگوائے گئے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) وہ دکن سے فرار ہو کر گولکنڈہ۔ تلنگانہ۔ اڑیسہ۔ بنگال وغیرہ میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ اب اس سے کوئی خطرہ نہیں رہ گیا تھا۔

۳۰۸ تزک جہانگیری ۷، ۹، سن جلوس ۱۹۔

۳۰۹ تزک جہانگیری سن جلوس ۲۰ ۔ ص ۔ ۸۱۱ ، ۸۱۴ ۔ و اقبال نامہ جہانگیری۔ ۲۲۰ ۔ ۲۲۱ ۔

۳۱۰ تزک جہانگیری ص ۸۱۴۔

بھیج دیے اور فیل خانے میں داخل کیے گئے۔[۳۱۱] اس کے بعد حسب حکم دربار میں حاضری دینے کے لیے پہنچا تو جہانگیر نے مہابت خان کے داماد پیرزادہ خواجہ برخوردار سے جواب طلب کیا کہ اس نے مہابت خان کی جو ایک سرکردہ شاہی ملازم ہے لڑکی سے شادی کیوں کی ہے؟ اس جرم پر جہانگیر نے اسے بید لگوائے اور خواری و بے عزتی کے ساتھ دست و گردن باندھ کر قید کرنے کا حکم دیا۔ اور ارشاد ہوا کہ اس کو (برخوردار) جو کچھ مہابت خان نے جہیز میں دیا ہے وہ بحق سرکار ضبط کر لیا جائے۔[۳۱۲] مہابت خاں انہیں حالات سے مجبور ہو کر حفظ ماتقدم میں جہانگیر کے خلاف سرکشی کرتا ہے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر کے آخری عہد حکومت میں کسی کو سزا دینے کے لیے یہ بات کافی تھی کہ اس کا تعلق نقشبندیہ سلسلے سے ہے۔ مہابت خاں تو شاہی ملازم تھا۔ شاہی احکام کی خلاف ورزی کرنے پر اس کی گرفت کی جا سکتی تھی لیکن خواجہ برخوردار تو شاہی ملازم نہ تھے تو آخر ان کی تذلیل و رسوائی کیوں؟ انہیں کیوں بید لگوائے گئے؟ اور قید کیا گیا۔ اور تمام جہیز بحق سرکار ضبط کیوں کیا گیا؟

مہابت خاں کہاں حکومت کا بہت ہی لائق اور معزز امیر قرار پاتا ہے اور اسے محض حکومت کے عین مرضی کو بحسن و خوبی پایہ تکمیل تک میں پہنچانے پر اعلیٰ ترین منصب و اعزاز دیا جاتا ہے۔ لیکن جب سیاسی مصلحت تقاضا کرتی ہے تو پہلے اسے شہزادہ پرویز کی اتالیقی سے الگ کر کے بنگال کے دور دراز علاقے میں تبادلہ کر دیا جاتا ہے اور اس کے بعد اُس سے ہاتھیوں اور محاصل کا حساب طلب کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ خود دربار میں حاضر ہو کر دیوانیان عظام کو مطمئن کرے۔ اور جب وہ حاضر ہوتا ہے تو اسے دربار میں حاضری سے روک دیا جاتا ہے۔ اور اس کے داماد کو ذلیل و رسوا کیا

۳۱۱؎ تزک جہانگیری ص ۸۱۷۔ اقبال نامہ جہانگیری ۲۲۵۔

۳۱۲؎۔ تزک جہانگیری۔ ص۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ و اقبال نامہ جہانگیری۔ ص۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔

جاتا ہے ۔جس کے قصوروں میں سے ایک ہی قصور تھا کہ اس نے نقشبندی سلسلے کا ہو کر ایک شاہی سرکردہ ملازم کی لڑکی سے شادی کیوں کی ؟

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر نقشبندیہ سلسلے کے لوگوں سے مطمئن نہیں تھا۔ سیاسی مصلحت اور حکمت عملی کے تحت ان لوگوں کو تو گوارا کیا اور ان سے کام بھی لیا لیکن اس کے دل میں ان لوگوں کے لیے کدورت اور نفرت تھی۔ اور اس کے آخری عہد حکومت میں بھی یہ لوگ معتوب تھے یا جن لوگوں سے کوئی شکایت یا دشمنی ہوتی ان پر یہ الزام لگایا کہ وہ نقشبندیہ سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ البتہ حضرت مجددؒ اس وقت بقید حیات نہ تھے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور حکومت اور معاملات مملکت میں نور جہاں اور اس کے ہمنواؤں کو مکمل ومقتدر حیثیت حاصل تھی اور وہی دراصل جہانگیر کے نام سے حکومت کرتی تھی۔

شریعت اور جہانگیر کا آخری دور حکومت :۔

شاہ جہان جو اپنی حربی صلاحیت۔ عسکری کامیابیوں، حسن سیرت اور حسن کردار کے لحاظ سے عہد جہانگیری کا سب سے ممتاز شہزادہ تھا۔ اس کو مکمل شکست ہو چکی تھی۔[۳۱۳] اس کے بعد ہی جہانگیر نے حضرت مجددؒ کو سن جلوس ۱۸ ماہ شہریور ۲۲ بمطابق ۲۰ ذیقعدہ ۱۰۳۲ھ کو اپنے تلادان میں سے دو ہزار روپیہ عنایت کیے۔[۳۱۴] یہ زمانہ حضرت مجددؒ کی عمر کا آخری دور ہے کیونکہ ۲۸ صفر المظفر ۱۰۳۴ھ کو آپ انتقال کر جاتے ہیں۔[۳۱۵] اس زمانے میں شاہ جہاں کو ناکامی ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ اپنی شکست تسلیم کرتا ہے اور جہانگیر کو نمایاں پیش کش کے ساتھ معافی کا خواستگار ہوتا ہے اور اپنے

۳۱۳ھ تزک ص ۷۵۱-۷۵۴-۷۵۵-۷۵۶-۷۵۷-۷۵۸ ص۔

۳۱۴ھ تزک ۷۵۸۔

۳۱۵ھ حیات مجددؒ۔ محمد فرمان ایم۔اے ص ۱۳۱۔

دو بیٹوں دارا شکوہ اور اورنگ زیب کو دربار میں بھیجتا ہے[۳۱۶]۔ شاہ جہان کی اس شکست و ناکامی سے دراصل اس کی ذات ہی کی ناکامی نہیں ہوئی بلکہ وہ تمام لوگ جو شاہ جہان کی ذات سے احیاءِ اسلام اور سنتِ نبوی کی نفاذ کی توقع رکھتے تھے ان کو بھی ناکامی ہوئی اور یقیناً ان کے بھی حوصلے پست ہوئے ہوں گے اور مایوسی بھی ہوئی ہو گی۔ اسی اثناء میں حضرت مجدد رح کا بھی انتقال ہو جاتا ہے۔ اس واقعہ سے بھی لوگوں پر طرح طرح کے اثرات مرتب ہوئے ہوں گے۔ جہانگیر اور اس کے ارد گرد جن لوگوں کو عروج و اقتدار حاصل ہوا اور جو لوگ سیاہ و سفید کے مالک و مختار ہوئے۔ ان کی ذاتی زندگی پسند و ناپسند کے معیار اور ان کے ذہنی رجحان اور کارکردگی سے نفاذ شریعت کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ اب وہ لوگ برسر اقتدار تھے جو مسلمان تو تھے لیکن ان کی عملی زندگیوں میں اسلام کا عمل دخل نہیں تھا بلکہ اپنی پوری زندگی میں اور ماضی میں ہمیشہ ان لوگوں کے ساتھ رہے ہیں جو اسلام کے محض نام لیوا تھے۔

شاہ جہاں کی شکست و ناکامی کے بعد دراصل نور جہاں کو ہمہ اقتدار و اختیار حاصل ہو گیا۔ جہانگیر اپنی بیماری، کثرتِ شراب نوشی اور ضعف کی وجہ سے نور جہاں کے ہاتھوں کا کھلونا بنا ہوا تھا۔ جس نے اپنی بیٹی لاڈلی بیگم کی شہریار کے ساتھ منگنی کے دوسرے ہی دن شاہ جہان کو دکن کی مہم کے لیے روانہ کرا دیا[۳۱۷]۔ اس دن کے بعد پھر باپ بیٹے میں زندگی بھر ملاقات نہ ہو سکی۔ دونوں میں شکوک و شبہات و اختلاف دن بدن بڑھتے گئے۔ افہام و تفہیم کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ نور جہاں نے شاہ جہان کے تمام ذاتی و نظریاتی مخالفوں کو جن کے خلاف وہ مملکت کے مفاد کے لیے جہانگیر کے حکم کے مطابق لڑتا رہا تھا۔ ان سب کو گوشہ گمنامی سے نکال کر اہم مناصب اور اہم عہدوں پر تقرر کرایا۔ ان سب لوگوں نے شاہ جہان کو شکست دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

---

۳۱۶ تزک ۷۹۵ - ۸۰۹ - ۸۱۰ وغیرہ۔

۳۱۷ تزک ص ۶۵۸ - ۶۶۱۔

شاہ جہان کی شکست و ناکامی کے معنی یہ تھے کہ نور جہاں ایک اہم طاقت ہو کر ابھری۔ اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ شریعت کے حامی ناکام ہوئے۔ جن لوگوں نے جوش، جذبہ، جرأت کے ساتھ شاہ جہان کا ساتھ دیا تھا۔ وہ قتل ہوئے۔ پھانسی پہ چڑھائے گئے۔ عہدے جاگیریں وغیرہ ختم ہوئیں بہت سے لوگ ہمت ہار کر گوشہ نشین ہو گئے اور حکومت میں وہ لوگ ابھر کر آگے آ گئے جن کی زندگیاں۔ عمل۔ کردار شریعت کے مطابق نہ تھیں یا جن سے شریعت کی سربلندی اور نفاذ کی توقع نہ کی جا سکتی تھی۔ جہانگیر کہنے کو تو حکمران تھا لیکن وہی کرتا تھا جو نور جہاں چاہتی تھی۔

شاہ پرویز اور مہابت خان کو بظاہر سب سے اہم پوزیشن و مرتبہ حاصل تھا کیونکہ انہیں دونوں نے شاہ جہان کو شکست دی تھی۔ جن کی حسن خدمت اور کارکردگی کا اعتراف جہانگیر نے بھی کیا تھا۔ لیکن ان دونوں کی زندگیاں شریعت کے مطابق نہ تھیں اور نہ ہی شریعت کے نفاذ و سربلندی سے انہیں دلچسپی تھی۔ دوسری اہم طاقت شہزادہ شہریار کی تھی جو نور جہاں کا داماد تھا جسے نور جہاں کی حمایت، تائید اور پشت پناہی حاصل تھی۔ جسے جہانگیر نے اعزاز منصب کے علاوہ اہم پوزیشن اور اہم جاگیریں بھی دے رکھی تھیں اس لیے بظاہر شریعت کی سربلندی چاہنے والوں کی پوزیشن بہت کمزور تھی بظاہر یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ مستقبل قریب میں انہیں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے ان حالات میں دینی عناصر کی صفوں میں قدرے بے چینی اور مایوسی کا پیدا ہونا عین ممکن تھا جنہیں مجدد نے پروان چڑھایا تھا۔

نور جہاں نے اپنی سیاسی حکمت عملی کے تحت مہابت خاں اور شہزادہ پرویز کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرا دیا۔ مہابت خاں کو پہلے صوبہ بنگال کا صوبہ دار مقرر کرایا۔ بعد میں مہابت خاں سے ہاتھیوں اور واجب الادا رقوم کا حساب طلب کیا۔ یہ حساب دے ہی چکا تھا کہ دربار میں حاضر ہونے کا حکم ہوا اور جب راستے ہی میں تھا کہ اس کے داماد پیر خواجہ برخوردار کو جو خواجہ عمر نقشبندی کا لڑکا تھا۔ اس جرم میں گرفتار کیا کہ اس نے سرکردہ شاہی عہدیلہ کی لڑکی سے بلا اجازت شادی کیوں کی؟

اس کو ذلیل کیا گیا اور بید بھی لگوائے گئے اور جو کچھ جہیز میں ملا تھا بحق سرکار ضبط کیا گیا۔ اس واقعہ سے مہابت خاں میں اشتعال پیدا ہونا لازمی تھا۔[۳۱۸] ابھی چند ماہ پہلے ہی اس کے منصب میں ترقی اور خطاب دے کر اس کی خدمت کا اعتراف کیا گیا تھا۔[۳۱۹] اب اس کے خلاف نہ صرف الزام لگائے گئے بلکہ اس کو ذلیل و رسوا کرنے کے لیے اقدامات کیے گئے اس لیے تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق اس نے جہانگیر کے خلاف بغاوت کی اور جہانگیر کو قید کیا۔ لیکن نور جہاں کی حسن تدبیر سے جہانگیر آزاد ہوا اور مہابت خاں معتوب ہوا اور اس کی سرکوبی کے لیے خان خاناں کو منصب و اعزاز کے ساتھ مقرر کیا۔[۳۲۰] اسی اثناء میں شہزادہ پرویز ۳۸ سال کی عمر میں کثرت شراب نوشی سے مر گیا۔[۳۲۱]

شہزادہ پرویز کے انتقال اور مہابت خاں کی بغاوت کی وجہ سے مملکت کے معاملات میں نور جہاں کو مکمل عروج و اقتدار حاصل ہو گیا۔ اس کا بھائی آصف خاں جو مہابت خاں کا قیدی اور معتوب تھا اس کو بھی آزادی ملی اسے دوبارہ ہفت ہزاری ذات

۳۱۸۔ تزک ص ۸۱۱ - ۸۱۳ - ۸۱۴ - ۸۱۷ - ۸۱۸ ص۔

۳۱۹۔ تزک - ۷۹۷ (مہابت خان کو خان خاناں سپہ سالار کا خطاب دے کر سات ہزار پیادوں اور سات ہزار دو اسپہ و سہ اسپہ سواروں کے منصب پر بڑھایا اس کے علاوہ اسے تمن توغ عنایت کیا۔

۳۲۰۔ تزک ص ۸۱۸ - ۸۱۹ - ۸۲۸ - ۸۳۴ - ۸۳۵ - ۸۳۸ -

(بادشاہ نے خان خاناں کو سات ہزار پیادوں اور سات ہزار دو اسپہ و سہ اسپہ سواروں کے منصب پر بڑھایا اور خلعت، تلوار، مرصع زین سمیت بنچاق گھوڑا اور خاص ہاتھی عنایت کر کے چند دوسرے امرائے سلطنت کی معیت میں مہابت خاں کا قلع قمع کرنے پر مامور کیا۔ ۸۳۸ ص۔

۳۲۱۔ تزک ۸۳۳ - ۸۳۸ -

اور ہفت ہزاری دو اسپہ وسہ اسپہ سوار کا منصب عنایت کیا گیا۔ صوبہ پنجاب کا حاکم اور وکیل السلطنت مقرر ہوا اور حکم ہوا کہ سر دیوان بیٹھ کر امور مالی وملکی سرانجام دے[۳۲۲]

اس سیاسی انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہابت خاں جس نے شاہ جہاں کو شکست دے کر اعلیٰ منصب اور اعزازہ حاصل کیے تھے۔ اب اس نے شاہ جہاں سے معافی طلب کی اور اس کا ہمنوا اور رفیق ہو گیا[۳۲۳] اور آصف خاں مہابت خاں کی قید سے آزاد ہو کر نور جہاں اپنی بہن کا ساتھی ہو گیا۔ اور اس کے منصب وعہدے بحال ہو گئے اور اسے جاگیر بھی ملی[۳۲۴]

جہانگیر کے آخری دور میں نور جہاں اور آصف خاں یعنی بہن و بھائی حکومت کے سیاہ و سفید کے مالک ہو گئے لیکن زیادہ دیر تک دونوں میں اتحاد و اتفاق برقرار نہ رہ سکا[۳۲۵]

جہانگیر ضعف اور بیماری کی وجہ سے کسی وقت بھی انتقال کر سکتا تھا اس لیے اس کی جانشینی کا اہم مسئلہ دونوں کے سامنے تھا۔ دونوں کی پسند میں اختلاف تھا۔ نور جہاں چاہتی تھی کہ اس کا داماد شہریار آیندہ تاج و تخت کا وارث ہو اس لیے مختلف حیلے و بہانے سے اس کے لیے راستہ صاف کر رہی تھی اس کے برخلاف آصف خان چاہتا تھا کہ اس کا داماد شاہ جہاں آیندہ جانشین ہو۔ اس نے جہانگیر کے انتقال کی خبر سنتے ہی خسرو کے بیٹے داور بخش کو چال کے طور پر تخت نشین کرایا اور شاہ جہاں کو اطلاع دے کر بعجلت تمام دارالخلافہ آنے کے لیے درخواست کی۔ اس نے دارا شکوہ اور اورنگ زیب کو شاہ جہاں کے پاس پہنچانے کا بھی اہتمام کیا۔ نور جہاں نے اپنے بھائی

---

۳۲۲ تزک - ۸۲۷ - ۸۲۸ - ۸۳۷ - ۸۴۲ ص -

۳۲۳ - تزک - ۸۴۸ -

۳۲۴ - تزک - ۸۴۲ -

۳۲۵ - تزک - ۸۵۴ -

آصف خاں کو اپنے پاس بہت بلایا لیکن وہ نہیں گیا بلکہ نور جہاں کو نظر بند کر دیا کیونکہ اس نے اپنے داماد شہریار کو تخت نشین کرانے کی کوششیں تیز کر دی تھیں ۳۲۶ھ

شہریار نے جب جہانگیر کی وفات کی خبر سنی تو اس نے فوراً بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ لاہور کے شاہی خزانوں پر قبضہ کر لیا۔ لوگوں کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے خزانہ کا منہ کھول دیا۔ ایک ہفتہ میں ۷۰ لاکھ روپیہ نئے اور قدیمی منصب داروں میں تقسیم کیے اور جاگیروں اور انعام کے وعدے پر آصف خاں اور داور بخش سے لڑنے کے لیے آمادہ کیا۔ ۳۲۷ھ

شہزادہ شہریار نے مرزا بایستغر ولد شہزادہ دانیال مرحوم کو اپنے لشکر کا سردار مقرر کیا۔ اس کو آصف خان نے شکست دی۔ شہزادہ شہریار گرفتار ہوا۔ قید کیا گیا اور اس کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا کر اسے اندھا کر دیا گیا۔ اس کے بعد آصف خاں نے فتح و کامیابی پر مشتمل عرضداشت شاہ جہان کو روانہ کرتے ہوئے اس سے درخواست کی کہ وہ جلد از جلد دارالسلطنت میں پہنچ جائے تاکہ ملک فتنہ و فساد اور شورش و انتشار سے نجات پائے ۳۲۸ھ۔

۲۲ جمادی الاول ۱۰۳۷ھ بمطابق ۲۹ جنوری ۱۶۲۸ء کو لاہور میں شاہ جہاں کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور اس کی تخت نشینی کا اعلان کیا گیا۔ اور ۲۵ جمادی الاول ۱۰۳۷ھ کو داور بخش۔ اس کے بھائی گرشاسپ۔ شہریار۔ طہمورث و ہوشنگ ولد دانیال کو سزائے موت دی گئی ۳۲۹ھ

۳۲۶ھ تزک ص ۸۵۴-۸۵۵-

۳۲۷ھ تزک ۸۵۵-

۳۲۸ھ تزک ۸۵۶-۸۵۷-

نوٹ:۔ حضرت مجدد رح کا انتقال ۲۸ صفر المظفر ۱۰۳۴ھ بمطابق دسمبر ۱۶۲۴ء کو ہوا تھا۔

۳۲۹ھ تزک ص-۸۶۱ و اقبال نامہ جہانگیری-ص ۲۶۷-

عمل صالح المعروف شاہ جہاں نامہ- صالح کنبوہ جلد اول ص ۲۰۳-۲۰۴-

جہانگیر کے آخری دنوں میں جو لوگ ابھر کر سامنے آ گئے تھے اور نور جہاں کی تائید و حمایت کی وجہ سے ان میں سیاسی و نظریاتی اتحاد ہو گیا تھا اور وہ شاہ جہان کے مقابلے میں تخت نشینی کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اگر صرف ان کے ناموں سے ان کے ذہنی رجحان پسند و ناپسند۔ سوچنے کا انداز۔ اور اپنے عمل و کردار سے لوگوں کو جو تاثر دینا چاہتے تھے تو اندازہ ہوتا ہے تو ان کے سوچنے اور عمل کا محور اسلام نہ تھا اور نہ ہی ان سے توقع کی جا سکتی تھی کہ حکمراں ہونے کے بعد شریعت کو نافذ کر سکیں گے۔

آصف خاں نے تو محض سیاسی حکمت عملی کے تحت داور بخش کو تخت نشین کرایا تھا۔ تاکہ نور جہاں کی سیاسی حکمت عملی کو ناکام بنائے تا کہ وہ کسی اور کو تخت نشین نہ کرا سکے۔ نور جہاں کا امیدوار شہر یار تھا جو نور جہاں کا داماد تھا۔ اس کی حمایت و تائید گرشاسپ۔ طہمورث۔ ہوشنگ کر رہے تھے۔ ان سب کے نام ایران کے مجوسی دور کے حکمرانوں کے نام پر ہیں[۳۳۰] جو اسلام سے قبل کے حکمران تھے۔ ان ناموں سے اندازہ

---

۳۳۰ طہمورث و ہوشنگ اکبر کے بیٹے دانیال کے لڑکے تھے جو جہانگیر کا بھائی تھا دانیال کی موت اکبر ہی کی زندگی میں کثرت شراب نوشی سے ۳۳ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ تزک ۶۴۔ جہانگیر نے سن جلوس ۲۰ ماہ اسفندار بمطابق ۱۰۳۵ھ میں اپنی لڑکی بہار بانو کو طہمورث اور ہوشمند بانو بنت خسرو کو ہوشنگ سے منسوب کیا۔ تزک ۸۱۵ و اقبال نامہ جہانگیری ص ۲۲۲)۔

نوٹ:۔ پاک و ہند کے مسلم حکمرانوں میں صرف غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶ء-۱۲۸۶ء) کے پوتوں کے نام کیقباد۔ کیخسرو و کیومرث تھے۔ یہ حکمران بہت ہی نالائق۔ نااہل پست کردار پست حوصلہ۔ عیاش۔ بد کردار تھے۔ ان میں کوئی اعلیٰ صفت و خوبی نہ تھی۔ انہیں نہایت ہی ذلت و رسوائی کے ساتھ قتل کیا گیا۔ اور ان کی جگہ جلال الدین خلجی (۱۲۹۰ء- ۱۲۹۶ء) تخت نشین ہوا تھا۔ جو سیرت و کردار، اخلاق و عادات کے لحاظ سے اسلام کے بہت قریب تھا۔

لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے نام رکھنے والے اور انہیں اعلیٰ عہدوں و منصاب پر فائز کرتے والوں کی نظریاتی۔ فکری و ثقافتی پسند کیا تھی اور ان ناموں سے کیا تاثر دینا چاہتے ہیں؟ ان ناموں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں وہی خوبی و صفت پیدا ہو جو ان حکمرانوں میں تھی اور ان کے آئیڈیل یہی حکمران تھے۔ نام کے علاوہ ان کی ذاتی زندگیاں عمل و کردار بھی ان کے مستقبل کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جہانگیر کے آخری دنوں میں جس گروہ کو اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ اسے شریعت کے نفاذ سے نہ کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی اس سے توقع کی جا سکتی تھی اس لیے بظاہر احیاءِ اسلام کے حامیوں کی سیاسی پوزیشن بہت کمزور تھی۔

لیکن نفاذ شریعت ایک تحریک تھی۔ اس کو قوت سے دبایا نہیں جا سکتا تھا۔ جہانگیر نے ۱۶۱۹ء میں حضرت مجدد رح کو قید کیا۔ ۱۶۱۵ء کو نظر بند کر کے ان کی عملی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی۔ شریعت کے حامیوں کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک طوفان کھڑا کیا گیا اور جن لوگوں نے شاہ جہان کی سرکردگی میں قوت کے بل بوتے پر حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ ان کے خلاف تمام مخالف قوتوں کو جہانگیر نے جمع کیا اور بزور شمشیر ان سب کو شکست دی ہزارہا جنگ میں قتل ہوئے۔ گرفتار ہوئے۔ اور پھانسیاں دی گئیں۔ معافی مانگ کر جانیں بچائیں۔ جاگیریں ضبط ہوئیں اور ہمت ہار کر گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے اور حضرت مجدد رح بھی اسی اثناء میں ۱۶۲۴ء انتقال کر گئے۔ بظاہر حالات بہت ہی مایوس کن تھے۔ کوئی امید کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ لیکن حضرت مجدد رح نے ۱۶۰۳ء میں احیاءِ اسلام کی جس تحریک کا آغاز کیا تھا۔ وہ ذہن و فکر کی اصلاح تھی۔ باطل نظریے اور عقائد کی تردید اور رد تھی۔ ان کی کتابیں "اثبات النبوۃ"، "رد روافض" نے جو ذہن و قلب کی اصلاح کرتی تھیں آج بھی موجود ہیں۔ ان کے مکتوبات نے لوگوں کے ذہن و فکر کی جو اصلاح کی اور حرکت و عمل پر آج بھی آمادہ کرتے ہیں ان کو نہ قید کیا جا سکا اور نہ ہی ظلم و تشدد اور قوت کے ذریعہ اُن کی اثر پذیری کو روکا جا سکا۔

جہانگیر کی اپنی کمزوری کی وجہ سے معاندین اسلام کو جو وقتی غلبہ حاصل ہو گیا تھا اس کی وجہ سے احیاء اسلام کے حامیوں کو قدرے صعوبتیں پیش آئیں۔ لیکن ان معاندین میں حکمرانی کی صلاحیت نہ تھی اور نہ ہی تدبر و فراست تھی اور نہ ہی تعمیری انداز فکر تھا۔ اس لیے شاہ جہان کے حامیوں نے انہیں جلد شکست دی اور ان کی ناکامی اور شاہ جہان کی کامیابی سے غیر اسلامی افکار۔ نظریات۔ ثقافت پر ایک کاری ضرب لگی اور احیاء اسلام کی گاڑی جو عرصہ دراز سے رکی ہوئی تھی وہ چل پڑی۔

اسلام میں عظمت کا تصوّر :۔

عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ کے انسانیت نواز۔ روح پرور اور عہد آفرین دور کے بعد ہی ملوکیت کا فاسد نظام حکومت و آئین مملکت مسلمانوں پر ترغیب۔ تحریص۔ خوف۔ مصلحت۔ جبر۔ دھونس۔ تشدد اور ضمیر کے خرید و فروخت کے ذریعہ مسلط کیا گیا۔ بیشتر بادشاہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ اسلام ان کے تابع ہو۔ ان کی زندگیاں مجالس اور نظام حکومت اسلام کے تابع نہ ہو۔ لیکن اسلام کا سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ اس نے ہر زمانے میں اور ہر دور میں ایسے لوگ پیدا کیے جنہوں نے "زمانہ بسانہ" کے فلسفہ حیات پر عمل نہیں کیا بلکہ انہوں نے "زمانہ بہ ستیز" اور "زمانہ دیگر بسانہ" کے فلسفہ حیات پر عمل کیا۔ ان کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہی میں مسلمانوں اور حیات انسانی کی نجات و فلاح و بہبود تھی اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اکمل اتباع سنّت ہی کا حیات آفرین نصب العین اور مقصد حیات پیش نظر رکھا۔ دنیا کی کوئی حرص۔ طمع۔ خوف۔ تشدد۔ مصلحت۔ جبر ان کو اپنے اس مقصد عظیم سے منحرف نہیں کر سکی۔ وہ حکومت وقت کے معتوب رہے۔ تکلیفیں اذیتیں۔ قید و بند کی تمام صعوبتیں اٹھائیں لیکن سنّت نبوی کے پرچم کو اٹھائے رکھا۔ بنو امیّہ کے آخری دور اور بنو عباس کے ابتدائی ہی دور میں حضرت امام ابو حنیفہ رح (۸۰ ھ تا ۱۵۰ ھ) سے حکمران خوش نہیں تھے۔ آپ رح نے حق کے مقابلے میں حکومت کی

ناخوشی مول لی۔ ان پر الزام واتہام لگائے گئے۔ طرح طرح کی ترغیب وتحریص دی گئی لیکن جب جادہ حق سے سرِمو انحراف نہ کیا تو انہیں قید وبند کیا گیا۔ اسی میں انتقال کر گئے۔ لیکن عامۃ المسلمین میں قبولیت کا یہ عالم تھا کہ نماز جنازہ میں کم وبیش پچاس ہزار افراد کا مجمع تھا۔ اس پر آنے والوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کم وبیش چھ بار نماز جنازہ پڑھی گئی۔ مورخ خطیب بغدادی کے بیان کے مطابق بیس[۲] دن نماز جنازہ پڑھی جاتی رہی۔ آج بھی کوئی مسلمان ایسا نہیں جو ان کے نام سے آشنا نہ ہو اس کے برعکس حکمران کو کوئی نہیں جانتا۔ زندگی میں عامۃ المسلمین سے دور رہا اور مرنے کے بعد عوام کے غیض وغضب سے بچنے کے لیے اپنی قبر کو بھی عوام سے چھپایا۔

امام مالک رح (۹۳ھ تا ۱۷۹ھ) کی "موطا" اہل علم کے حلقے میں "اصح الکتاب بعد کتاب اللہ" مانی جاتی ہے۔ جلال علم کا یہ عالم تھا کہ خلیفہ وقت بھی حلقہ درس میں ایک معمولی شخص کی طرح شریک ہوتا۔ لیکن حکمراں خوش نہ تھے۔ طلاق جبری کے خلاف فتویٰ دیا تھا جس سے حکومت خلاف ہو گئی۔ گرفتار ہوئے۔ محکمہ امارت میں گنہگاروں کی طرح لایا گیا۔ کپڑے اتارے گئے۔ کوڑے مارے گئے۔ تمام پیٹھ خون آلود ہو گئی۔ ہاتھ مونڈھے سے اتر گئے۔ اس پر بھی تسلی نہ ہوئی تو حکم دیا کہ اونٹ پر بٹھا کر شہر میں تشہیر کی جائے۔ امام صاحب بایں حال بازاروں وگلیوں سے گزرتے رہے اور زبان صداقت نشاں سے بآواز بلند کہہ رہے تھے کہ:۔

"جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے۔ جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں اور فتویٰ دیتا ہوں کہ طلاق جبری حرام ہے"

یہ تعزیر گو تحقیر کے لیے تھی لیکن اس نے امام کی عزت وعظمت کو اور بلند کر دیا۔ یہی حال امام شافعی رح (۱۵۰ھ۔ ۲۰۴ھ) کا ہے کہ ان سے حکومت ناخوش ہو گئی۔ انہیں بھی حق کے راستے میں مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ دکھ سہے۔ لیکن پیشانی پر بل نہیں آنے دیا۔

امام حنبل رح (۱۶۴ھ۔ ۲۴۱ھ) سے بھی حکمران خوش نہ تھے۔ خلق قرآن کے مسئلہ پر سر دربار کوڑے کھائے۔ جیل میں رہے۔ اذیتیں برداشت کیں۔ عسرت تنگدستی میں

رہے لیکن حرف شکایت کبھی زبان پر نہیں لائے۔ اس کے باوجود عامۃ الناس میں انہیں یہ مقبولیت اور عظمت حاصل تھی کہ ان کی نماز جنازہ میں ابن خلکان کی روایت کے مطابق آٹھ لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار عورتیں شریک تھیں۔ اور بیس ہزار عیسائی اور یہودی مسلمان ہوئے تھے۔

امام ابن تیمیہ (۱۲۶۳ء تا ۱۳۲۸ء) کا بھی یہی حال ہے ان سے حکمران خوش نہیں تھے وہ بیک وقت صاحب السیف اور صاحب قلم بھی تھے۔ انہوں نے بھی قید میں انتقال کیا ہے۔ تو دمشق میں ڈھائی لاکھ اور ایک دوسری روایت کے مطابق پانچ لاکھ آدمی ان کے جنازے کے ہمراہ تھے۔ ملک چین میں بھی مسلمانوں نے ان کی وفات کا حال سن کر نماز جنازہ غائبانہ ادا کی اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عامۃ المسلمین میں کس قدر مقبول تھے۔ ان کے علاوہ متعدد بزرگان دین ہر زمانے اور ہر دور میں ایسے ملیں گے جنہوں نے شریعت کی سربلندی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اکمل اتباع کا مقصد عظیم اپنایا ہو اور ان سے حکمراں خوش رہے ہوں؟ ان سب کا ایک ہی جرم تھا کہ انہوں نے اتباعِ سنّت نبوی کا علم بلند کیا اور مطالبہ کیا کہ حکومت اور حکمران دونوں شریعت کے تابع ہوں۔

یہ بزرگانِ دین اور مصلحین امت وہ تھے جو حکومت وقت کے معتوب تھے۔ حکمران ان سے خوش نہیں تھے۔ انہوں نے حکومت کی ناخوشی کی پرواہ نہیں کی بلکہ حق بات برملا کہی اور عمل کیا اور اسلام کی عظمت کے معاملہ میں کسی مصلحت یا خوف کو جائز نہیں سمجھا۔

کتابیات:- ۱- علامہ شبلی - سیرۃ النعمان۔

۲- مولانا مناظر حسن گیلانی - حضرت امام ابو حنیفہ رح کی سیاسی زندگی۔

۳- سید رئیس احمد جعفری - سیرۃ ائمہ اربعہ۔

۴- ابن خلکان - وفات الاعیان۔

۵- اکبر شاہ خاں نجیب آبادی - آئینہ حقیقت نما ص ۳۰۴۔

اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ حکومت وقت کے معتوب رہے - زندگی کی تمام آسائشوں و سہولت سے محروم کیے گئے - لیکن عامۃ المسلمین کے نزدیک ہمیشہ سربلند رہے اور آج بھی لوگ برضا و رغبت ان کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں لیکن جن دربار پرست علماء نے مخالفت کی اور جن حکمرانوں نے انہیں تکلیفیں دیں اور ذلیل کرنے کی کوشش کی ان سے تاریخ کے طالب علم تو شاید واقف ہوں لیکن عام مسلمان تو ان کے کارناموں سے درکنار ان کے نام تک سے آشنا نہیں ہیں - اپنے زمانے میں بھی ان کی قدر و منزلت انہیں لوگوں تک محدود تھی جو ان کے دست نگر تھے - انہوں نے جسم و جان پر ضرور ترغیب تحریص - جبر و تشدد اور خوف کے زور سے حکومت کی لیکن اپنے عہد میں عوام کے غیض و غضب سے ڈرتے تھے اور مرنے کے بعد بھی عوام سے اپنی قبریں تک چھپاتے تھے - اس کے برخلاف جن بزرگوں نے سنّت نبوی کا پرچم بلند کیا - ان سے حکمراں ضرور ناخوش تھے لیکن عامۃ المسلمین خوش تھے بلکہ آج بھی لوگ انہیں عزت و احترام سے یاد کرتے ہیں -

ملوکیت کے فاسد نظام حکومت میں ایسے بزرگان دین - عافیت کوش - گوشہ نشین مصلحین امت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا اور حاکمان وقت نے ان پر عقیدت و عظمت کے پھول نچھاور کیے جن کی زندگیاں - عزم و حوصلے - جرأت و استقامت سے خالی تھیں جو کبھی غلبہ حق کے لیے سینہ سپر نہیں ہوئیں - اپنے وقت کے جابر - ظالم - فاسق اور سفّاک حکمرانوں کو ٹھنڈے پیٹ برداشت کیا - بلکہ "زمانہ ساز" فلسفہ حیات پر عامل رہے -

ایسے بزرگان دین جنہوں نے اسلام کے معاملہ میں عزم و حوصلہ کا ثبوت دیا اور احیاء اسلام و سنت نبوی کے معاملہ میں مشکلات و مواقع کا مقابلہ کیا - حالات کے سامنے سرنگوں نہیں ہوئے انہیں نہ صرف نظر انداز کیا گیا بلکہ بھلا یا گیا بلکہ ان کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں - شکوک و شبہات و غلط فہمیاں پیدا کی گئیں - ان کے خلاف نفسیاتی جنگ بھی لڑی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرے میں بعض مخلص - خدا ترس - متقی - سادہ لوح و

دینداد حضرات بھی یہ سمجھتے ہیں کہ بزرگان دین اور مصلحین امت کی عظمت کے لیے یہ ضروری ہے کہ حکمران ان سے عقیدت رکھتے ہوں۔ احترام کرتے ہوں۔ حکومت کے ایوانوں میں ان کی پہنچ بھی ہو اس طرز فکر کا نتیجہ ہے کہ سادہ لوح معتقدین حضرات، حضرت مجدد رح کی عظمت کے لیے یہ بیان کرتے ہیں کہ جہانگیر ان کی گرفتاری کے بعد ان کا معتقد ہو گیا۔ ان کے گھر گیا۔ دعوت کھائی۔ کھانے کی تعریف کی۔ شراب و کباب سے توبہ کی اور غلام ہو گیا۔ اور جہانگیر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ وہ آپ کی بے گناہی کے ثبوت دے رہے ہیں۔ یہ سب باتیں محض خوش فہمی۔ خوش عقیدگی۔ سادہ لوحی اور اسلام میں عظمت کے تصور سے ناواقفیت کا نتیجہ ہیں۔ جہانگیر کی بقیہ زندگی اور بعد کے دور حکومت میں اس کے کردار۔ عمل اور پالیسی میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں آئی جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے کہ وہ حضرت مجدد رح سے کسی طور متاثر تھا یا متاثر ہوا۔

حضرت مجدد رح سے متاثر یا معتقد ہونے کے سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے کہ جہانگیر نے حضرت مجدد رح کو ہزار روپیہ و خلعت عطا کیا تھا۔ اور دوسری بار دو ہزار روپیہ عنایت کیے [۳۳۱] اگر یہ جہانگیر کی حضرت مجدد رح سے عقیدت و احترام کے بنا پر تھا تو گستاخی معاف جن لوگوں کو اس کے بعد جہانگیر نے اس رقم سے کہیں زیادہ رقم بطور انعام و اکرام دیے ہیں ان کے متعلق کیا خیال ہے؟ اس اصول کی بنا پر کیا وہ جہانگیر کے نزدیک زیادہ معزز و محترم نہیں تھے؟ اس زمانے میں جہانگیر نے جوتک رائے منجم کو زر میں تولنے کا حکم دیا۔ چھ ہزار پانچ سو روپیہ (۶۵۰۰ روپیہ) تول میں پڑے جو اسے بطور انعام عنایت کیے۔ چند ماہ ہی کے بعد پھر اسی کو مہر و روپیہ میں تلوا کر سات سو مہریں و ہزار روپیہ بطور انعام دیے [۳۳۲] بشن داس مصور کو ہاتھی بطور انعام دیا۔ (تزک ص ۵۸۵)۔

---

[۳۳۱] تزک ص ۶۳۳-۷۵۸۔

[۳۳۲] تزک ص ۶۷۴-۶۷۵-۶۸۷- (سن جلوس ۱۶- یہ انعام حضرت مجدد رح کی بظاہر رہائی کے بعد کے ہیں۔

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جہانگیر حضرت مجدد رح کے گھر گیا۔ مہمان رہا۔ کھانا کھایا کھانے کی تعریف کی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ گھر گیا ہو۔ کھانا بھی کھایا ہو۔ کھانے کی تعریف بھی کی ہو۔ تزک میں سرہند جانے اور سرہند سے گزرنے کا تذکرہ ضرور ملتا ہے[۳۳۳]۔ لیکن تزک میں یا اقبال نامہ جہانگیری میں کہیں اس بات کا ذکر نہیں ملتا کہ وہ آپ کے گھر گیا ہو۔ مہمان رہا ہو۔ اگر بفرض محال یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ آپ کے گھر گیا اور دعوت بھی قبول کی تو اس نے اس واقعہ کو اتنی اہمیت نہیں دی کہ وہ اس کا تذکرہ اپنی خود نوشت سوانح حیات میں کرتا۔ اس کے برعکس جن لوگوں کے گھر گیا۔ ان کی دعوت۔ تحفے، تحائف قبول کیے ان سب کا تذکرہ تفصیل سے کرتا ہے[۳۳۴]۔

یہ خیال رہے کہ جہانگیر نے شراب و کباب سے توبہ کی اور آپ رح کا غلام ہو گیا تو یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ تزک سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس نے شراب سے توبہ کی ہو۔ وہ حضرت مجدد رح کے قید و بند کے زمانے میں مے نوشی کی محفل اور مقربین کو جام عنایت کرنے کا تذکرہ کرتا ہے۔ شاہ عباس کو بطور تحفہ مرغ کی شکل کی مرصع صراحی جس میں روزانہ کی مقدار شراب سما جاتی ہے۔ روانہ کرتا ہے اور خواص خاں کو شاہی افیون رکھنے کی خدمت سپرد کرتا ہے۔ اسی زمانے میں اپنی بیماری کے تذکرے میں لکھتا ہے کہ چونکہ شراب کے نشہ کی وجہ سے تکلیف میں تخفیف ہو جاتی تھی اس لیے مقررہ مقدار سے زیادہ اور

---

۳۳۳ تزک ص ۵۸۵ (حضرت مجدد رح کو قلعہ گوالیار میں قید کرنے کے تقریباً ساتویں ماہ سرہند سے گزرا۔ اس نے باغ کی سیر کی اور سرہند کی زراعت۔ عمارتوں کی مرمت۔ نئی عمارتوں کی تعمیر مثلاً حمام وغیرہ تعمیر کرنے کا حکم دیا۔

ص ۶۷۴۔ سرہند سے گزرا۔ ایک دن قیام کیا اور باغ کی سیر سے محظوظ ہوا۔

ص ۶۹۳۔ دو دن قیام کر کے سیر و تماشا سے خوب محظوظ ہوا۔

ص ۷۱۷۔۷۲۸۔ سرہند سے گزرتا ہے۔

۳۳۴ ص ۵۷۲۔۵۸۳۔۶۰۴۔۶۲۵۔۶۴۰۔۶۵۸۔۶۷۳۔۶۷۴ وغیرہ۔

اپنے اصول کے خلاف دن کے وقت بھی پینے لگا تھا۔ اس کثرت مئے خوری سے نقصان ضعف اور نقاہت کی صورت میں ہوا اس لیے نورجہاں کے مشورہ سے شراب کی مقدار کم کی۔ زندگی کے آخری ایام میں خدمت پرست خاں روزانہ کی شاہی شراب اور پیالہ خاصہ کی خدمت پر مامور تھا اس سے زندگی کے آخری لمحہ میں آخری غذا شراب کا پیالہ منگوا کر منہ سے لگاتا ہے لیکن طبیعت مالش کرنے لگتی ہے اور انتقال کر جاتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ شراب سے توبہ کر لی تھی۔ صحیح نہیں ہے البتہ کم ضرور کرتا ہے تو طبی نقطہ نگاہ سے نہ کہ شریعت کی بنا پر[۲۳۵] اس نے طبی نگاہ سے خان جہاں کے بیٹے کو شراب کم کرنے کی تلقین بھی کی تھی[۲۳۶]

یہ خیال کہ جہانگیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ حضرت شیخ احمد سرہندی رح کی بے گناہی کی شہادت دے رہے ہیں اور رہائی کے لیے سفارش کر رہے ہیں اس لیے آپ رح کو رہا کیا۔ یہ بات بھی قرین قیاس نہیں اور نہ عقل باور کرنے کو تیار ہے اس لیے کہ اگر جہانگیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھتا تو یہ ایک بہت ہی اہم اور غیر معمولی واقعہ اس کی زندگی کا ہوتا۔ اس کا تذکرہ اپنی تزک میں ضرور کرتا جیسا کہ اس نے اپنے باپ اکبر کو خواب میں دیکھنے کا تذکرہ کیا ہے اور اس کی سفارش پر ہی خان اعظم کی (مرزا عزیز کوکہ) کی باغیانہ حرکت اور سازش کے باوجود معاف کر دیا[۲۳۷] ہے۔ اس لیے یہ محض مفروضہ اور خوش فہمی اور خوش عقیدگی ہے کہ جہانگیر آپ کا معتقد ہو گیا تھا یا متاثر تھا یا اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھ کر حضرت مجدد رح کو رہا کیا تھا۔

---

۲۳۵ – تزک – ص – ۲۰۲ – ۵۷۵ – ۶۴۸ – ۶۵۱ – ۶۸۶ – ۷۱۲ – ۸۲۲ – ۸۵۳ وغیرہ –

۲۳۶ تزک – ص ۶۳۶ –

۲۳۷ تزک ص – ۲۸۷ –

حضرت مجددؒ کی عظمت و سربلندی اس بات میں نہیں کہ جہانگیرؔ نے ان کو روپے و خلعت دیے۔ ان کے گھر گیا۔ کھانا کھایا۔ کھانے کی تعریف کی۔ ان کا معتقد ہو گیا۔ شراب و کباب سے توبہ کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ کی بے گناہی کی گواہی دے رہے ہیں بلکہ حقیقی عظمت و سربلندی یہ ہے کہ اکبرؔ کی (۱۵۵۶ء۔ ۱۶۰۵ء) نصف صدی کی جابرانہ و مطلق العنان عہد حکومت میں ترغیب تحریص۔ جبر و تشدد اور ابن الوقت۔ خوشامد پرست حضرات کی منافقانہ اور خوشامدانہ طرز عمل سے غیر اسلامی افکار کو جو غلبہ سیاست۔ تہذیب و تمدن۔ معاشرت اور ثقافت میں حاصل ہو گیا تھا اور اہلِ کفار جس قدر جری۔ نڈر۔ اور بیباک ہو گئے تھے کہ اعلانیہ کفر کے احکام بجالاتے تھے اور اسلام اس قدر ضعیف و کمزور ہو گیا تھا کہ دیندار حضرات یا تو گوشہ نشین ہو گئے تھے یا مراقبہ میں مجاہدہ نفس۔ ریاضت۔ چلہ کشی۔ قلب کی صفائی ہی کو اسلام سمجھ لیا تھا۔ یا حالات سے بیزار ہو کر ہجرت کی کوشش کی تھی یا محض وعظ و تلقین اور درس و تدریس ہی پر اکتفا کر لیا تھا اور اسی کو عین اسلام سمجھا اور دنیا معاملات و امور دنیا ان لوگوں کے سپرد کیا جو دنیا پرست، اخلاق و کردار سے عاری عقل و خواہش نفس کے غلام بدترین قسم کے ابن الوقت۔ خوشامد پرست۔ شکم پرست۔ قلم فروش۔ و بے ضمیر لوگ تھے کے خلاف کھُل کر اتباعِ سُنت اور نفاذِ شریعت کے لیے جہاد کیا۔

ہمعصر تاریخ کی کتابیں:۔

"اخبار الاخیار"۔ مصنفہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (۱۵۵۱۔ ۱۶۴۲ء)۔

"طبقات اکبری"۔ مصنفہ نظام الدین احمد بخشی (۱۵۹۳ء) و

"منتخب التواریخ" مصنفہ (ملا عبدالقادر ملوک شاہ بدایونی ۱۵۹۵ء)۔

کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں پاک و ہند کی سرزمین پر بزرگان دین صوفیاء کرام و مشائخ کثرت سے ہیں جنہوں نے مراقبہ۔ ریاضت۔ عبادات۔ رشد و ہدایت اور چلہ کشی کا عمل جاری کر رکھا ہے جو نفس کشی، عبادات۔ ریاضت میں کوئی ثانی نہیں رکھتے۔ کرامات اور معجزے کے مالک ہیں۔ ترکِ دُنیا کیے ہوتے ہیں۔ جنگلوں و بیابانوں۔ غاروں

میں عبادات میں مصروف ہیں - درخت کی پتیوں پر گذر اوقات کرتے ہیں - برسوں نماز عشاء ہی کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتے ہیں - سالوں انہیں غسل جنابت کی ضرورت نہیں ہوتی - شہوانی خواہش کو مارنے کے لیے طرح طرح کے طریقہ اختیار کرتے ہیں - دینداری اور مذہبیت کا یہ تصور پندرہویں، سولھویں اور سترہویں صدی کے ربع اول میں عام تھا - مسلمان اسی کو اسلام سمجھتے تھے - انہیں بزرگوں کو ـــــ اسلام کا نمائندہ تصور کرتے تھے - ان کی ریاضت ، نفس کشی سے متاثر تھے - لیکن ان لوگوں کا عمل و دینداری شریعت اسلامیہ کے مطابق نہ تھی اور نہ ہی اسلام نے اس طرح کی دینداری و مذہبیت کی تعلیم دی ہے - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کی تعلیم اور عمل اس کے برعکس ہے -

بزرگوں کی اس کثرت اور اس قسم کی دینداری کے باوجود اس دور کی سیاست معاشرت - تمدن - تہذیب و ثقافت میں شریعت مغلوب تھی - زندگی اور معاملات مملکت کے کسی گوشہ میں شریعت رہنما نہیں تھی - کفر کے طور طریقے غالب تھے - معاشرت سیاست - تمدن میں کفر ہی کو غلبہ حاصل تھا خود اکبر جو بزرگوں کا معتقد تھا - ان کی خانقاہ مزارات پر پا پیادہ جاتا تھا - ان سے اپنی آرزوں کی تکمیل کے لیے دعا کا طالب ہوتا تھا - اس کے کوئی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی اس لیے شیخ سلیم چشتی رح کی خدمت میں حاضر ہوا اور فرزند کے دعا کے لیے التجا کی - ان کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے اسے تین بیٹے عطا کیے -

بزرگوں سے عقیدت و احترام کا معاملہ یہ تھا کہ اس نے اپنی حاملہ بیوی کو شیخ سلیم ہی کے مکان پر بھیج دیا - شیخ سلیم کے گوشہ عافیت میں جہانگیر پیدا ہوا اور اسی مناسبت سے اس کا پیدائشی نام سلطان سلیم تھا - اور اس نے شیخ سلیم ہی کی لڑکی کا دودھ پیا تھا - اس کے دوسرے دو لڑکے شاہ مراد اور سلطان دانیال تھے - مؤخر الذکر کی پیدائش چونکہ خواجہ معین الدین چشتی رح کے روضہ کے ایک مجاور شیخ دانیال کے گھر میں ہوئی تھی - اس مناسبت سے شیخ دانیال اس کا نام رکھا ۳۳۸ - لیکن بزرگوں کے اس احترام و عقیدت اور اس

---

۳۳۸ تزک ص ۳۶ - ۶۳ ، سفینۃ الاولیاء مصنفہ دارا شکوہ (اردو) نفیس اکیڈمی کراچی ص ۱۴۱ - ۲ -

مذہبیت و دینداری کے باوجود اکبر ان تینوں بیٹوں کی تعلیم و تربیت اس طرح کرتا ہے کہ اسلام کا ان کے عمل و کردار اور ذہن و فکر میں کوئی اثر نہیں ہے۔ سلطان سلیم جو شیخ سلیم رح کے گھر میں پیدا ہوا۔ ان ہی کی بیٹی کا دودھ پیا اور انہیں کے نام پر اس کا نام رکھا گیا۔ لیکن اس کے مزاج و کردار اور پسند و ناپسند میں شیخ سلیم رح کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ نہایت ہی مغلوب الغضب اور سنگدل انسان تھا۔ اس نے ایک واقعہ نویس کی معمولی غلطی پر کھال کھنچوائی۔ دو آدمیوں کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے کچلوا دیا۔ حسین بیگ کو گائے کی کھال اور عبدالرحیم کو گدھے کی کھال میں سلوا دیا[۳۳۹] اس کے علاوہ شراب اور افیون تو بہت کثرت سے استعمال کرتا ہے۔ تزک میں شراب کی محفلوں کو بہت مزے لے کر بیان کرتا ہے۔ دوسروں کو بھی شراب پینے کی تلقین کرتا ہے اور اس کے عہد میں شراب کی اس قدر ہمت افزائی کی جاتی ہے کہ بہت سے امراء کثرت شراب نوشی سے مر جاتے ہیں[۳۴۰]

اکبر کے دو بیٹے اور تھے ایک کا نام سلطان مراد اور دوسرے کا نام سلطان دانیال تھا۔ دونوں میں کسی قابل ذکر اہلیت و صلاحیت کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ دونوں کثرت سے شراب پیتے تھے اور عین عنفوان شباب میں کثرت شراب نوشی ۳۳ و ۳۰ سال کی عمر میں اکبر ہی کی زندگی میں انتقال کر جاتے ہیں[۳۴۱]

اکبر جن پیروں۔ بزرگوں و مشائخ یا جن کو وہ ولی اللہ تصور کرتا تھا۔ ان کا بہت معتقد تھا۔ ان کے خانقاہوں۔ مزاروں پر پا پیادہ سفر کرتا تھا اس کے عہد میں بزرگوں اور مشائخ کی بڑی کثرت تھی۔ لیکن اس کے ذہن و فکر پسند و ناپسند کے معیار میں ان بزرگوں کا کوئی اثر و دخل نہیں تھا۔ ان بزرگان دین کی موجودگی۔ ان کی صحبت۔ تربیت۔ عقیدت و احترام ان کی چلہ کشی۔ مراقبہ۔ ریاضت وغیرہ اس کی عملی

---

[۳۳۹] تزک جہانگیری ص ۲۲۔ ۸۸۔ ۹۴۔ اقبال نامہ جہانگیری۔ ص۔ ۳۰۔

[۳۴۰] تزک ص۔

[۳۴۱] تزک ۶۳۔

زندگی و کردار میں کوئی تعمیری و مثبت تبدیلی نہیں پیدا کر سکیں۔ بڑی دعاؤں کے بعد اس کے تین لڑکے پیدا ہوئے۔ لیکن اکبر ان کی تربیت نہ کر سکا۔ انہیں اچھا انسان نہ بنا سکا۔ ان میں صحیح و غلط۔ نفع و نقصان کی تمیز نہ پیدا کر سکا۔ اور وہ بزرگ دیندار حضرات باوجود اپنی شرافت۔ نیک نفسی۔ زہد و تقوی کے اکبر کے ذہن و فکر کی اتنی تربیت نہ کر سکے کہ وہ کم از کم اپنی بڑی آرزوں و تمناؤں سے پیدا شدہ اولاد میں اچھی بری کا تمیز پیدا کرنا۔

نام انسان کی شخصیت۔ ذہن و فکر۔ رجحان۔ پسند و ناپسند معیار عز و شرافت کو ظاہر کرتے ہیں اس لحاظ سے اکبر کے ذہن و رجحان کا مطالعہ بہت ہی دلچسپ اور معنی خیز ہے اس سے اکبر کے ذہنی رجحان اور ثقافتی پسند کا پتہ چلتا ہے۔ اکبر نے اپنے پوتوں یعنی جہانگیر کے بیٹوں کا نام خسرو۔ پرویز۔ خرم۔ شہریار رکھا تھا۔ دوسرے بیٹے دانیال کے لڑکوں کے نام طہمورث۔ ہوشنگ۔ بالیسغر رکھے تھے اور خسرو کے ایک بیٹے کا نام گرشاسپ تھا۔ یہ نام سراسر ایران کے اسلام سے قبل کے حکمرانوں کے نام پر ہیں۔ ان ناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایران کے اسلام سے قبل کے حکمرانوں سے بہت متاثر ہے۔ اس کے آئیڈیل وہی حکمراں تھے جو ایران میں قبل اسلام حکمران تھے۔ وہی صفات اپنے پوتوں میں بھی دیکھنا چاہتا ہے۔

جہانگیر کے بڑے لڑکے کا نام خسرو تھا جو راجہ اودے سنگھ کی لڑکی کے بطن سے تھا۔ اس کا نام خود اکبر نے خسرو رکھا تھا اس کی تاریخ پیدائش ۲[۴۲] امرداد ۹۹۵ھ بمطابق ٦ اگست ۱۵۸۷ء ہے جس نے تخت نشینی کے حصول کے لیے جہانگیر کے مقابلے میں سخت جدوجہد کی تھی اور اس کے حامیوں کی اچھی خاصی تعداد بھی تھی۔ خسرو کا ہمنام ایران کا اسلام سے قبل کا حکمران تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمعصر تھا جس نے ۵۹۰ء تا ٦۲۸ء تک ایران پر حکومت کی تھی۔ اسی کے نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۷ ہجری بمطابق ٦۲۸ء کو ایک نامہ مبارک لکھا تھا۔ خسرو نے جب یہ خط دیکھا تو غصہ میں

---

[۴۲] تزک ص ۱۰۔

آگیا اور نامہ مبارک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اس نے یمن کے گورنر باذان کو لکھا کہ مدینہ پر فوج کشی کرو اور جو پیغمبری کا دعویٰ کر رہے ہیں انہیں یہاں لاؤ"[۳۴۳] یہ تھا خسرو جو ایران کا بادشاہ تھا یہ واحد سربراہ مملکت تھا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ مبارک کے متعلق تحقیر آمیز سلوک کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کرنے کا حکم دیا ــــ اکبر نے یہ نام اپنے پوتے کے لیے کیوں پسند کیا؟ تاریخ کی کتابوں میں تو اس کا جواب نہیں ملتا۔ البتہ اگر اکبر کے فلسفہ حکومت اور اسلام و اسلامی علوم و تعلیمات کے متعلق اس کی پالیسی کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ اکبر کے ذہن و فکر پر اسلام کی تعلیمات کا کوئی اثر باقی نہیں رہ گیا تھا۔

خسرو ایران کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمعصر حکمراں ضرور تھا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ مبارک کو چاک کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ لیکن کامیاب اور عوام میں مقبول نہ تھا اس کی رعایا اس سے خوش نہ تھی۔ اس کے خلاف بغاوت ہوئی۔ اس کو اسیر کر کے "قلعہ فراموشی" میں قید کر دیا گیا۔ جہاں اسے روٹی اور پانی کے سوا کچھ مہیا نہ کیا جاتا تھا۔ اس کے سامنے سترہ[۱۷] بیٹوں میں سے سولہ[۱۶] بیٹے قتل کیے گئے اور اسے بھی چند دنوں کے بعد قید میں مروا دیا گیا۔[۳۴۴] اس طرح اس کا انجام بہت ہی برا ہوا۔ اور جس گورنر کو اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ خود مسلمان ہو گیا۔ خسرو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیر (نعوذ باللہ) اور ظلم و تعدی کے علاوہ کوئی ایسی صفت نہیں جس کی تقلید کی جائے۔ اگر اکبر کے دل میں ذرہ برابر اسلام اور تاریخ اسلام کے مجاہدوں کا احترام ہوتا۔ یا ظلم و تعدی سے نفرت

---

۳۴۳ تاریخ ایران حصہ اول ص ۵۰۶-۵۰۷ از پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی مجلس ترقی ادب کلب روڈ۔ لاہور۔

سیرۃ النبی حصہ اول شبلی نعمانی ص ۴۶۷ تا ۴۷۰ مطبع اعظم گڑھ ۱۳۶۴ھ۔

۳۴۴ تاریخ ایران حصہ اول ص ۵۲۰۔

ہوتی یا حکمران میں جو اعلیٰ صفت و کردار ہیں جو بلندی و اعلیٰ حوصلگی ہوتی ہے وہ ہوتی یا اپنے عہد کے بزرگان دین و مشائخ کا تعمیری اثر ہوتا تو کبھی خسرو نام کو پسند نہ کرتا۔

اکبر کا بھی پوتا تھا جس کو اکبر کی جانشینی کے لیے خان اعظم (مرزا عزیز کوکہ) اور راجہ مان سنگھ نے پسند کیا۔ یہ دونوں اکبر کے عہد کے بہت ہی معزز محترم اور با اثر امیر مملکت تھے اور اکبر ہی کی پالیسی کے سرگرم حامی اور علمبردار تھے۔ خسرو، خان اعظم کا داماد اور راجہ مان سنگھ کا بھانجا بھی تھا۔ یہ قریبی رشتہ داری بھی انہیں حمایت پر مجبور کر رہی تھی لیکن خسرو اور اس کے حامیوں کی کوششیں ناکام ہوئیں۔ اس کو ناکام کرنے میں شیخ فرید بخاری نے بہت ہی سرگرم حصہ لیا تھا۔

شیخ فرید بخاری رح نہ صرف حضرت مجدد رح کے پیر بھائی تھے بلکہ جس زمانے میں تخت نشینی کے لیے جدو جہد ہو رہی تھی۔ حضرت مجدد رح نے مسلسل یکے بعد دیگرے ۱۲ خطوط آپ ہی کو لکھے ہیں جو مکتوبات جلد اول میں نمبر ۴۳ تا ۵۴ پر مشتمل ہیں۔ خسرو اس ناکام بغاوت کے بعد زندگی بھر جہانگیر کا معتوب رہا اور ۱٦۲۲ء میں شاہ جہان کی قید میں انتقال کیا۔ خسرو محض پوتے کا نام ہی نہیں تھا بلکہ ایک ذہن۔ فکر۔ رجحان۔ پسند و ناپسند اور نقطہ نظر کی غمازی کرتا ہے۔

اکبر نے جہانگیر کے دوسرے لڑکوں کے نام پرویز۔ خرم۔ شہریار رکھے تھے۔ پرویز بھی ایرانی حکمران کا اسلام سے قبل حکمراں تھا بلکہ خسرو کا پورا نام خسرو پرویز تھا۔ پرویز میں کوئی اہلیت و صلاحیت و استعداد نہ تھی اس نے جہانگیر کے عہد میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا البتہ جب شاہ جہان سے جہانگیر ناخوش ہوا تو مہابت خاں کی معیت میں اس نے شاہ جہان کو شکست دینے میں اہم حصہ لیا تھا۔ وہ کثرت سے شراب پیتا تھا اس لیے کثرت شراب نوشی سے ہی ۳۸ سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔

شہریار کا نام بھی ایرانی حکمراں کے نام پر تھا۔ وہ خسرو کا بھائی اور ہرمز کا بیٹا تھا۔ شہریار میں کوئی اہلیت۔ صلاحیت نہ تھی اس کی نالائقی کی وجہ سے لوگ اسے ناشدنی بھی کہتے تھے۔ وہ بھی کثرت سے شراب پیتا تھا۔ ۲۳ سال کی عمر میں مرض

داء الثعلب میں گرفتار ہوا۔ ابروٗں۔ داڑھی۔ مونچھ کے بال گر گئے۔ آتشک کی وجہ سے سارے جسم میں پھوڑے نکل آئے۔

دانیالؔ کے بیٹوں کا نام طہمورث۔ ہوشنگؔ۔ بایسنغر اور خسرو کے ایک بیٹے کا نام گشتاسپ تھا۔ یہ سب کے سب نام ایران کے افسانوی دور کے حکمرانوں کے نام پر تھے ان کی مستند تاریخ نہیں ملتی۔ ان کا شمار ایرانؔ کے خرافاتی دور کے حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ یہ تمام نام اکبرؔ کے پوتوں کے ہیں جو اس نے خود رکھے ہیں۔ ان کے کردار و عمل سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس قسم کے انسان تھے۔ ان کا تعلق اپنے کردار و عمل کے لحاظ سے اسلام سے تو نہ تھا۔ ان ناموں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بزرگان دین تو بہت تھے لیکن ان کا معاشرے کے سب سے باثر گروہ پر کوئی اثر نہ تھا۔

اکبرؔ کے ان پوتوں کے نام و کردار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اکبرؔ نے جب اپنے بیٹوں اور پوتوں کی کوئی تعمیری تربیت نہ کر سکا اور نہ ہی ان میں کوئی صحت مند تعمیری رجحان۔ فکر و عمل پیدا کر سکا تو معاشرہ کو کس سمت پہنچانے کی کوشش کی ہو گی۔ پوتوں کے جو نام رکھے اور جن کردار اور عمل کا مظاہرہ ان لوگوں نے کیا اس میں اسلامیت کی کوئی رمق نہ تھی اور نہ ہی اپنے عمل و کردار سے کسی اعلیٰ کارکردگی و ذہانت کا ثبوت دیا تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا حکمران ہو جس کے اپنے بیٹے اس کی ہی زندگی میں کثرت شراب نوشی سے عین جوانی میں انتقال کیے ہوں۔ جو اپنے بیٹوں میں نفع و نقصان کی تمیز نہ پیدا کر سکا ہو۔ پوتے جن کا نام ہی ان حکمرانوں کے نام پر رکھے جائیں جو اسلام سے قبل کے حکمراں ہیں ان میں بھی کسی تعمیری صلاحیت و رجحان کا پتہ نہیں چلتا اور دنیا کی کوئی ایسی خرابی نہیں جو ان میں موجود نہ ہو۔ اکبرؔ جو اپنے بیٹوں اور پوتوں کی تعمیری تربیت میں اس قدر ناکام ہو جس کی کوئی مثال تاریخ کے دوسرے حکمران میں نہیں ملتی لیکن اس کے باوجود اسے عظیم کہا جاتا ہے۔ لکھا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے۔ اس کے دور میں تو وہ لوگ عظیم کہنے تھے جو اس کے دست نگر تھے۔ اس کے ملازم تھے۔ انہیں اعلیٰ عہدے۔ منصب۔ جاگیریں، خطابات چاہئے تھے۔ جو اپنی عادات کے اعتبار سے خوشامد پرست، مصلحت کیش۔ بے ضمیر، شکم پرست۔

قلم فروش اور کردار سے عاری تھے یا علمائے دین اور صوفیائے خام تھے جن کا علم محدود اور اسلام اُن کے لیے ذریعۂ شہرت تھا۔ جن میں عزم و حوصلہ و جرأت کی کمی تھی اور بصیرت سے محروم تھے۔ جو ہر طاقت سے سمجھوتہ کے لیے تیار رہتے ہیں۔

ان کے لیے اسلام وہی ہے جو حکومت وقت کہے یا کرے۔ حکومت وقت کے خلاف تنقید کرنا یا متبادل رائے پیش کرنا اسلام کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اسلام ان کے نزدیک محض چند رسموں۔ طور طریقوں۔ رسمی عبادات کا نام ہے۔ اس لیے ہمیں اس دور میں تو کثرت سے بزرگان دین و مشائخ کبار ملتے ہیں لیکن اسلامی شریعت کہیں نہیں ملتی۔

اکبر ہی (١٥٥٦ء-١٦٠٥ء) پاک و ہند کا واحد مسلمان حکمران ہے جس کے مرنے کے ٨٦ سال بعد (١٦٩١ء) "لوگ اس کے مقبرہ کو لوٹ کر تباہ کرتے ہیں اس کے صدر دروازے کو توڑ ڈالتے ہیں۔ سونے۔ چاندی کے زیورات اور تمام قیمتی اشیاء و پتھر اٹھا لے جاتے ہیں اور ان کی ناراضگی و برہمی اسی پر ختم نہیں ہوتی بلکہ آپ کی قبر کھود کر ہڈیوں کو نکال کر غصہ کی حالت میں آگ میں جلا دیتے ہیں" ٣٤٣

حضرت مجدد رح کی (١٥٦٤ء-١٦٢٤ء) حقیقی عظمت اس میں ہے کہ جب آپ رح نے اللہ کا نام لے کر کام کا آغاز کیا ہے تو معاشرہ بہت ہی ناگفتہ بہ حالات میں تھا۔ آپ حالات سے مایوس نہیں ہوئے۔ مشکلات۔ نامساعد حالات اور حکومت وقت کی پرواہ نہ کی۔ اس صورت حال کے خلاف عملاً جدوجہد کا آغاز کیا۔ غیر اسلامی نظریے۔ باطل عقائد اور فاسد تصورات کے خلاف قلمی جنگ کی اور احیاء اسلام کے لیے فضا کو سازگار بنایا۔ لوگوں میں اسلام کی پیاس و تڑپ پیدا کی اور عامۃ المسلمین میں سُنّتِ نبویؐ کی عظمت کو بحال کیا۔ لوگوں کو نفاذ شریعت کے لیے آمادہ کیا اور ان میں نفاذ شریعت کی خواہش و آرزو روز بروز موثر و

٣٤٣ـ

قوی ہوتی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے سوچنے اور سمجھنے کے انداز بدل گئے۔ ان کے سامنے شریعت یا سنت نبوی کے قیام و نفاذ کا مسئلہ بطور ایک مقصد و نصب العین کے آیا اور عامۃ المسلمین کی خواہش اور آرزو اس نقطہ پر مرکوز ہو گئی کہ مملکت کا اصل مقصد نفاذ شریعت ہے۔ سنت نبوی کے اتباع پر ہی دین و دنیا دونوں کی بھلائی مضمر ہے۔ اکبر نے اپنی پچاس سالہ دور حکومت میں "عقل و فلسفہ، مصلحت ملکی و تجربہ کو جو آئین مملکت کے طور پر نافذ کیا تھا۔ وہ تصور و فکر و فلسفہ نہ صرف ناکام ہوا بلکہ اس کی جگہ عامۃ المسلمین کا یہ پختہ ایمان ابھر کر پوری قوت کے ساتھ سامنے آیا کہ مملکت کی اساس اسلام پر ہو اور آئین مملکت شریعت اسلامیہ ہو اور حکومت کا مقصد شریعت نبوی کا نفاذ ہے۔ عامۃ المسلمین میں جب یہ فکر رچ بس گیا اور روز بروز موثر اور قوی تر ہوتا گیا تو حکومت کے لیے اس کا نظر انداز کرنا ناممکن ہو گیا۔ آپ رح کی اصل عظمت یہ ہے کہ آپ نے فکر کے دھارے کو اسلام کی طرف موڑ دیا۔ لوگوں کے سوچنے سمجھنے اور عمل کے انداز اور طور طریقے بدل دیے۔ گو آپ کا انتقال ۱۶۲۴ء میں ہو گیا اور جہانگیر نے قوت کے بل بوتے پر شاہ جہاں کو شکست دے کر پیش رفت کو روکا اور وہ لوگ اقتدار پر قابض ہو گئے جنہیں شریعت سے کوئی ہمدردی یا لگاؤ نہیں تھا۔ لیکن جس رجحان۔ طرز فکر۔ مقصد۔ نظریات۔ طور طریقے اور مسلک کے لیے آپ رح نے تمام عمر جدوجہد کی تھی وہ دب نہیں سکی۔ ۱۶۲۸ء میں شاہ جہان کی تخت نشینی سے وہ فکر و نظریہ جس کی آپ رح نے تخم ریزی کی تھی اور جس نے آپ رح ہی کی حیات میں جڑ پکڑ لی تھی۔ وہ بار آور ہونا شروع ہو گئی چنانچہ ۱۶۲۸ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی تخت نشینی کے بعد پاک و ہند میں تاریخ و سیاست کا ایک ایسا دور شروع ہوتا ہے جو اکبری عہد سے بالکل مختلف ہے۔

شیخ احمد سرہندی رح اس دور کے واحد بزرگ ہیں جن سے حکمراں خوش نہیں ہے۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں بہت سے بزرگوں کے حالات نہایت ہی عقیدت و احترام سے لکھے ہیں۔ لیکن جس بے ادبی۔ گستاخی اور غیر شائستگی سے آپ رح کا تذکرہ کیا

ہے وہ کسی اور کا نہیں کرتا۔ جہانگیر کی یہ ناراضگی ہی آپ کی عظمت کی دلیل ہے۔ آپؒ نے شریعت کے نفاذ اور سنّت نبوی کے اتباع کے سلسلے میں کسی کی خوشی یا ناخوشی کی پرواہ نہیں کی۔ اس راہ میں جو بھی مشکلات و تکالیف پیش آئیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔ حکمت۔ جرأت اور خود اعتمادی کے ساتھ اتباعِ سنّت نبوی کے اعلیٰ مقاصد کی تبلیغ کی۔ یہ آپ ہی کی برپا کی ہوئی تحریک کا اثر تھا کہ شاہ جہان نے (۱۶۲۸ء تا ۱۶۵۸ء) اور اورنگ زیب عالمگیر نے (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) آئین مملکت۔ سیاست۔ تمدن و ثقافت میں اسلام کے اصولوں کو جاری و ساری کیا۔

شیخ احمد سرہندی رحؒ اپنے ہی دور کے حکمران کے معتوب نہ تھے بلکہ سامراج کی علمبردار طاقتیں۔ سامراجی نظام کے کل پرزے۔ سامراج پرست۔ ابن الوقت۔ بے ضمیر۔ خود غرض سیاستداں۔ شکم پرست۔ قلم فروش۔ خوشامد پرست۔ دانشور آج بھی شیخ احمد سرہندی رحؒ کو ہدف تنقید بناتے ہیں اس لیے کہ ان کے فکر و فلسفہ کی موجودگی میں مسلمانوں کو کسی دام فریب میں نہیں پھانسا جا سکتا۔ یہ واحد بزرگ ہیں جنھوں نے اپنے عہد کے تاریخ کے فکر کے دھارے کو موڑ دیا۔ آپ زمانہ سازی کسی قسم کی غلامی یا محکومی یا مصلحتِ بینی کے فلسفہ کو قبول نہیں کرتے۔ ان کا ایک ہی نعرہ تھا کہ "بمصطفیٰ برساں کہ دین ہمہ اوست"۔ یہ ایک ایسا پیغام ہے یا نعرہ جس سے سامراج کی علمبردار طاقتیں خوش نہیں۔ اس میں انہیں موت کا پیغام نظر آتا ہے اس لیے وہ آج بھی آپ سے خوش نہیں ہیں۔ آج بھی جو متحدہ قومیت۔ جغرافیائی قومیت و وطنیت سیکولر نظام۔ جمہوریت۔ مشترک کلچر۔ مشترک ثقافت۔ وحدت دین۔ علاقائی ثقافت یا کسی اور چلتے پھرتے غالب نظام حیات کے ساتھ اسلام کو نتھی کرنا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کی انفرادیت۔ علیحدہ تشخص و امتیازی حیثیت کو ختم کرنا چاہتے ہیں انہیں بزرگان دین میں سے سب سے زیادہ خوف یا خطرہ یا بغض حضرت مجدد رحؒ سے ہے اس لیے کہ ان کا نعرہ "اسلام اسلام است، کفر کفر است" آج بھی اپنی جاذبیت و کشش رکھتا ہے جس طرح سے کل رکھتا تھا۔ کل جب اس نعرہ نے تمام ظلم۔ جبر۔ تشدد۔ قوت۔ بے بنیاد پروپیگنڈہ اور مطلق العنانیت کو

پاش پاش کیا تھا تو آج بھی اس میں یہ قوت ہے کہ باطل کے تمام بتوں کو اس ضرب سے پاش پاش کر دے۔ اس لیے مسلمان کی انفرادیت کے دشمن اور سنّت نبوی کی مخالف طاقتیں آج بھی شیخ احمد سرہندی رح سے خوش نہیں ہیں جس طرح جہانگیر اور اس کے ہمنوا خوش نہیں تھے۔

اکبر اور شیخ احمد سرہندی رح دو افراد کے نام نہیں ہیں بلکہ یہ دو طرز فکر دو طرز حیات کے ترجمان ہیں جو طاقتیں مسلمانوں کو محکوم، اسلام کو مغلوب، مسلمانوں کی انفرادیت کو ہندوؤں کی انجذابی فلسفہ میں جذب اور الحاد و کفر کی گرداب میں مسلمانوں کو ڈبونا چاہتے ہیں وہ نہایت ہی خوش کن اور دلفریب الفاظ میں مسلمانوں کے ہمدرد۔ بہی خواہ بن کر اکبر کی ذہانت ۔ سیاسی فراست ۔ روشن خیالی ۔ وسیع المشربی لبرل ازم ۔ وسیع الخیالی ۔ صلح کل ۔ عالی ظرفی ۔ ترقی پسندی ۔ عقلیت پسندی کے خوشنما الفاظ میں عظمت کے تاج پہناتے ہیں ۔ اس کے برعکس جو لوگ اسلام کی عظمت ۔ سربلندی ۔ احیاء اسلام کے لیے جدوجہد کفر و الحاد کو مغلوب کرنے کی سعی کرتے ہیں ان پر رجعت پسند ۔ قدامت پرست ۔ تنگ نظر ۔ ترقی کا دشمن ہونے کی پھبتی کستے ہیں ۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں حضرت مجدد رح آمادہ عمل و جہاد کرتے ہیں ۔ اس لیے حضرت مجدد رح کی اصل عظمت یہ ہے کہ کفر و الحاد اور ظلمت و تاریکی کے اتھاہ سمندر میں ہمیں تیرنا سکھاتے ہیں ۔ مصائب و مشکلات کے سامنے سرنگوں نہیں بلکہ کشمکش کا درس دیتے ہیں "زمانہ سازی" کے فلسفہ پر نہیں بلکہ "بد زمانہ نبیز" اور "زمانہ دلگیر کبا" کا عملاً کامیاب راستہ دکھاتے ہیں ۔ کفر و الحاد پر مبنی نظام حیات و معاشرت و ثقافت کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے کا پیغام دیتے ہیں ۔

دوسرا حصّہ

فتح باب:-

حضرت مجددؒ کا انتقال تو ۱۶۲۴ء بمطابق ۱۰۳۴ھ ہجری کو ہو گیا تھا اور آپ کے بعد بظاہر کوئی قدآور و بلند و بالا شخصیت آپ کے جانشین نہیں تھی۔ ان دنوں سیاسی انتشار، خلفشار، بدنظمی، خانہ جنگی کی کیفیت اور طوائف الملوکی بھی عام تھی۔ حکومت کے تمام کلیدی عہدے و منصب اور جانشینی کے تمام دعویدار اور جنہیں اثر و اقتدار حاصل تھا وہ سب احیاء شریعت کے مخالفوں کے قبضے میں تھے اس لیے بظاہر یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ احیاء اسلام کی تحریک برگ و بار لائے گی۔ اس پر آشوب ماحول اور مشکل حالات میں سطح بیں حضرات احیاء اسلام کی تحریک سے مایوس ہو سکتے ہیں۔ لیکن حضرت مجددؒ نے ترویج شریعت اور احیاء اسلام کے لیے عامۃ المسلمین میں خواہش، شعور، تڑپ اور جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ آپؒ نے لوگوں کے ذہن و فکر کی تطہیر، ایمان و عقائد کی درستگی، فرائض و سنن کی پابندی کے اہتمام کے ساتھ اسلام کے غلبے۔ نفاذِ شریعت کے اصل و اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے سرگرم عمل۔ اقتدار اور حکومت کو اسلام کے زیر اثر لانے کا جو نقطہ نظر یا طریقہ اختیار کیا تھا وہ آپ کے معتقدین اور متاثرین سے اوجھل نہ تھا بلکہ اسی طرزِ فکر کا نتیجہ تھا کہ حکومت کی تبدیلی کے مواقع پر وہ زیادہ فعال ہو کر موثر رول ادا کرنے پر کمربستہ تھے اور مسلم رائے عامہ کی یہی بیداری اور شعور کا نتیجہ تھا کہ جہانگیر کے انتقال کے بعد حکومت کی کوششوں کے علی الرّغم شاہ جہاں کامیاب ہوتا ہے اور مسلم رائے عامہ کی خواہش اور آرزوں کا احترام کرتے ہوئے حکومت کی پالیسی میں انقلابی تبدیلی کا اعلان کرتا ہے۔

اکبر تو اسلام کے معاملے میں عناد رکھتا تھا اور کفر کو اسلام کے نام پر نافذ کرتا تھا۔ جہانگیر اس معاملے میں غیر جانبدار تھا اور صرف اپنی حکومت اور اقتدار کا خواہشمند تھا۔ لیکن شاہ جہاں اس معاملے میں دونوں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ مثبت طور پر اسلام کا حامی تھا اس لیے اس کے دورِ اقتدار میں مملکت کی پالیسی میں نمایاں تبدیلی

اور ستھری ہو جس میں حرم و کنیزوں کا تذکرہ نہ ہو۔ یہ سب تبدیلیاں اس میں ذہنی و فکری انقلاب ہی کی بدولت پیدا ہوئیں۔ یہ اپنے ماحول، شاہی مجالس آداب و آئین کے خلاف تھیں اس لیے اس کی تخت نشینی محض جہانگیر کی جگہ ایک فرد یا محض جہانگیر کے ایک بیٹے کی تخت نشینی نہیں تھی بلکہ اس کی تخت نشینی سے نظریہ اور مملکت کی پالیسی میں انقلابی اور مثبت تبدیلی آئی ۔ جو جہانگیر اور اکبر کے بالکل برعکس تھی

شاہ جہاں کی تخت نشینی انقلابی تبدیلی :۔

شاہ جہاں کی تخت نشینی سے پہلے خدائے پاک کی حمد اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت بیان کی گئی ۔ اور اس کے بعد شاہ جہاں کا خطبہ پڑھا گیا۔ شاہ جہاں کے لیے خلافت و نیابت الٰہی کا لفظ استعمال کیا گیا ۔ اور جس دن کو یہ تخت نشین ہوا اس کو جناب خاتم الانبیاء کا یوم پیدائش ہونے سے مبارک دن قرار دیا[۱]۔ اس کے برعکس جہانگیر جب تخت نشین ہوتا ہے تو اللہ تعالےٰ کا ذکر تو کرتا ہے لیکن رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا[۲]۔ اس طرح یہ انقلاب اور مثبت تبدیلی تھی۔ شاہ جہاں نے اپنی حکومت کی ابتداء کو مزید واضح اور مسلمانوں میں مقبول کرنے کے لیے اس موقع پر سکے تیار کرنے کا حکم دیا۔ اس سکے کے ایک طرف لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ اور دوسرا کلمہ اَشْہَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ط کندہ تھا اور ساتھ ہی خلفاء راشدین حضرت ابوبکر صدیق رضؓ، حضرت عمر فاروق رضؓ، حضرت عثمان رضؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نام بھی کندہ تھے۔ سکے کے دوسری طرف شاہ جہاں کی کنیت ابوالمظفر اور لقب شہاب الدین محمد صاحب قران ثانی لکھا

۱۔ عمل صالح المعروف شاہ جہاں نامہ (جلد اول) محمد صالح کنبوہ (اردو ترجمہ) ص ۲۰۹ تا ۲۱۰

۲۔ تزک جہانگیری ص ۳۶۔

ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ ایک راجپوت[1] شہزادی کے بطن سے تھا اور اس کے باپ جہانگیر کی ماں بھی ایک راجپوت شہزادی تھی اس طرح اس کے رگ و پے میں راجپوت ہندو خون کا حصہ زیادہ تھا۔ لڑکپن میں اپنے دادا اکبر کا بہت ہی منظور نظر تھا۔ اور اس کی تعلیم و تربیت اسی کے مقرر کردہ استاد کے تحت ہوئی تھی[2] لیکن ان تمام حالات کے باوجود وہ اپنے نظریہ اعتقاد۔ دلچسپیوں۔ قول و عمل۔ صلاحیت۔ استعداد کے لحاظ سے اپنے خاندان کے تمام شہزادوں سے مختلف تھا اس نے اس ماحول میں آنکھ کھولی اور شاہی آداب مجلس میں پروان چڑھا۔ جہاں کثرت سے شراب پی جاتی ہو[3] اور اس کے دو چچا عین جوانی میں کثرت شراب نوشی سے مرے ہوں[4]۔ اور باپ نہ صرف کثرت سے شراب پیتا ہو بلکہ شراب پینے کی تلقین و ترغیب بھی دیتا ہو[5]۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ شراب نہیں پیتا اور تیس سال کی عمر میں باقاعدہ ایک جشن منعقد کر کے شراب نہ پینے کا اعلان کرتا ہے[6]۔ اکبر اور جہانگیر یعنی دادا اور باپ دونوں داڑھی منڈاتے ہوں[7] اور اس کے برعکس اس کے چہرے پر شرعی داڑھی ہو[8]۔ جس کی عائلی زندگی پاکیزہ

۱؎ تزک ص ۱۰ (راجہ اودھے سنگھ کی لڑکی کے بطن سے تھا) تزک جہانگیری ص ۱۰۔

۲؎ تزک جہانگیری۔ ص ۹۔ ۱۰۔ ۲۸۔

۳؎ بدایونی ص ۲۹۷ (دربار کے دروازے پر شراب فروش کی ایک دکان کھولی گئی۔ جس کی منتظم دربان کی بیوی تھی۔ اکبر خود شراب کا نرخ متعین کرتا تھا۔

۴؎ تزک جہانگیری ص ۶۴۔

۵؎ تزک۔ ص ۷۷۔ ۳۲۵ و عمل صالح حصہ اول ۱۳۱۔

۶؎ عمل صالح حصہ اول ص ۱۳۱۔

۷؎ بدایونی ۴۹۸ داڑھی منڈوانے کا جواز۔ بدایونی ۴۴۵، ص ۵۵۸۔ داڑھی منڈوانے کا عام رواج۔

۸؎ عمل صالح حصہ اول ص ۲۱۹۔

بادشاہ غازی درج ہوا۔[۱] یہ ایک بہت ہی انقلابی تبدیلی کا اعلان تھا۔ سکہ اس زمانے میں ایک اشتہار بھی تھا۔ جو عام لوگوں تک پہنچتا تھا اس کی معرفت شاہ جہاں عام لوگوں تک یہ بات پہنچانا چاہتا تھا کہ اس کی حکومت کی اساس اسلام کے فلسفہ سیاست یعنی "قرآن و سنت" پر مبنی ہے یعنی حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں یہ محض ایک اعلان ہی نہیں کیا بلکہ یہ اقرار بھی کیا کہ اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔

یہ اعلان واقرار اس پس منظر میں دیکھا جائے کہ اکبر نے (۱۵۵۶ء۔۱۶۰۵ء) اپنی حکومت کی بنیاد "عقل، فلسفہ، تجربہ، مصلحت ملکی کے فلسفہ سیاست پر رکھی تھی اور اسی فلسفہ حکومت پر اپنے عہد حکومت میں معاشرہ کو تعمیر کیا تھا اور شریعت نبوی کو محکوم اور تابع کیا تھا اور کفر کو غالب کیا۔ جہانگیر کے عہد حکومت (۱۶۰۵ء۔۱۶۲۷ء) میں اسی فلسفہ سیاست پر حکومت قائم تھی لیکن جہانگیر کے عہد میں رفتہ رفتہ اس کی بنیادیں ہل رہی تھیں۔ حضرت شیخ احمد سرہندی (حضرت مجدد الف ثانیؒ (۱۵۶۴ء۔۱۶۲۴ء) ابتدا ہی سے غیر اسلامی نظریات پر سخت حملے کر رہے تھے اور اپنے ایک رسالہ "اثبات النبوۃ" میں اپنے عہد کے فلسفہ سیاست کے کھوکھلا پن کو طشت از بام کیا اور مثبت اور دلنشین انداز میں "نبوت" کی اہمیت و ضرورت اور افادیت کو پیش کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صاحب عقل و فہم حضرات "نبوت" کے نہ صرف قائل ہو گئے بلکہ یہ "فکر" تصور اتنا قوی اور موثر ہو گیا کہ شاہ جہاں تخت نشین ہوتے ہی ۱۳ فروری ۱۶۲۸ء بطابق ۷ جمادی الثانیہ ۱۰۳۷ھ کو لوگوں کو یہ یقین دلایا کہ اس کی حکومت کی اساس و حاکیت اللہ تعالےٰ کی حاکیت اور آنحضرتؐ کی شریعت پر مبنی ہو گی۔ سکے پر پہلے دو کلمہ اور خلفاء راشدین کا نام تحریر کرنا بھی ایک خاص ذہنیت طرز فکر کے غلبہ کو ظاہر کرتا ہے۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں ۱۶۱۹ء میں حضرت مجددؒ کی دربار میں طلبی اور قلعہ گوالیار میں قید کی

---

[۱] عمل صالح حصہ اول ص ۲۱۱-۲۳۸۔

وجہ یہی بتائی گئی تھی کہ آپؒ نے اپنے مکتوب یا نہ دہم میں خلفاء کی شان میں گستاخانہ باتیں تحریر کی ہیں حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ اکبر اور جہانگیر کے عہدِ حکومت میں مختلف وجوہات کی بنا پر خلفاء راشدین کے خلاف بے سرو پا باتیں لکھی اور کہی جاتے لگیں تو حضرت مجددؒ نے ان باطل نظریات ۔ فاسد عقائد اور گمراہ کن تصورات و خیالات کی تردید اور صحیح باتوں سے روشناس کرنے کے لیے باقاعدہ ایک رسالہ "ردّ روافض" لکھا اور نہایت ہی دل آویز پیرایہ میں اپنے مکتوبات نمبر ۱۹۲-۲۰۲-۲۵۱-۲۶۶ جلد اول و مکتوبات نمبر ۱۵-۳۶-۲۷-۹۶ میں مثبت انداز میں قرآن و حدیث و تاریخ اور بزرگانِ دین کے اقوال اور عقل کی روشنی میں خلفاء راشدین کی عظمت کو ثابت کیا ہے ۔ جن کے مطالعہ سے قاری کے تمام شکوک و شبہات اور اعتراضات نہ صرف دور ہو جاتے ہیں بلکہ ان کی عظمت و تقدیس و اشرف المخلوق بعد از انبیاء پر یقین کامل ہو جاتا ہے ۔ لیکن آپؒ پر یہی الزام و اتہام لگایا گیا کہ آپ نے خلفاء کے خلاف گستاخانہ باتیں لکھی ہیں ۔ آپ کی گرفتاری کے آٹھ سال اور انتقال کے تین سال بعد جب شاہ جہاں تخت نشین ہوتا ہے تو عوام کو یقین دلانے کے لیے خلفاء راشدین کا نام سکہ پر کندہ کرنے کا حکم دیتا ہے ۔

شاہ جہاں کا یہ حکم اس کی سیاسی حکمت عملی کا نتیجہ تھا ۔ وہ اس کی معرفت عام لوگوں کو یہ یقین دلانا اور اعتماد میں لینا چاہتا تھا کہ اس کی حکومت اللہ کی حاکمیت ، شریعت کی بالادستی اور خلفاء راشدین کے احترام و تقدیس پر قائم ہے ۔

خلفاء راشدین کے نام لکھوانے پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی عہدِ حکومت میں وارن ہسٹنگز (۱۷۷۲ء - ۱۷۸۴ء) کے ایما پر سید غلام حسین طبا طبائی نے سیر المتاخرین نام کی کتاب لکھی اور اسی وارن ہسٹنگز کے نام سے منسوب کی ہے اور جب ہسٹنگز کی بدعنوانی کے خلاف برک (BARK) نے برٹش پارلیمنٹ میں مواخذہ پیش کیا تو وارن ہسٹنگز نے اسی کتاب کی مدد سے اپنی صفائی پیش کی تھی اور اس کتاب کا ۱۷۸۳ء میں انگریزی ترجمہ کرایا تھا ۔ سب سے پہلے اسی "بزید پرست دانشور" نے لکھا کہ "مذہب الٰہی کہ آسائش غیر متناہی خلق دراں بود در عہد جہانگیری

رواج داشت۔ یا زعہد شاہ جہاں تعصب شروع شد در عہد عالمگیر شدت پذیرفت (مذہب الٰہی جس میں خلق اللہ کے لیے بے شمار فائدے تھے، جہانگیر کے زمانے تک اس کا چرچا اور رواج رہا پھر شاہ جہاں کے زمانے سے تعصب شروع ہوا اور عالمگیر کے عہد میں اس نے شدت اختیار کر لی۔ (سیر المتاخرین ص ۴۴ جلد اول بحوالہ علماءِ ہند کا شاندار ماضی جلد اول ص ۱۷، ا محمد میاں ۱۳۵۸ھ ھجم)

اسی "زیدیہ پرست دانشورہ" کی تحریر کو ملت میں تفریق ڈالنے والے دانشوروں نے استعمال کیا اور انگریزوں نے اپنے سامراجی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے اس تفریق کو خوب ہوا دی اور خوب فائدہ اٹھایا اور انگریزی عہد میں باقاعدہ دو متحارب فرقے وجود میں آ گئے جن کا مقصد ہی ایک دوسرے کی مخالفت و مخاصمت کرنا تھا۔ اس لیے بعض مؤرخین نے شاہ جہاں پر "سنّی العقیدہ" اسلام اپنانے کا الزام عائد کیا۔ حالانکہ یہ اعتراض محض ایک اعتراض ہے۔ جس کی کوئی تاریخی حقیقت نہیں ہے۔ کیونکہ جب شاہ جہاں نے سکّے پر خلفاء راشدین کا نام لکھوایا تھا تو اس کے قریب ترین اور معتمد افراد شیعہ ہی تھے اس کی چہیتی بیوی ارجمند بانو (ممتاز محل بقید حیات تھی وہ ماں و باپ دونوں کی طرف سے شیعہ تھی۔ شاہ جہاں کے جشن میں شرکت کے بعد جب حرم میں گیا تو سب سے پہلے دو لاکھ اشرفیاں اور دو لاکھ روپیہ ممتاز محل ہی کو دیے اور سالانہ وظیفہ دس لاکھ روپیہ مقرر کیا[۱]۔

آصف خان جس نے شاہ جہاں کو تخت دلانے میں اہم رول ادا کیا تھا وہ بھی ماں باپ دونوں کی طرف سے شیعہ تھا۔ اور خواجہ محمد شریف کا پوتا تھا۔ جو شاہ ایران در طہماسپ صفوی کا پوتا تھا۔ اس کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے شاہ جہاں نے آصف خان کو یمین الدولہ کا خطاب اور نہایت ہی معزز القابات استعمال کیے اور اس کے منصب میں ایک ہزار ذات، ایک ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ کا

۱ے عمل صالح حصہ اول ص ۲۱۴

اضافہ کر کے سرفراز کیا۔[۱]

ایک دوسرا بہت ہی معزز اور سربرآوردہ عہدیدار مہابت خان تھا جس نے نور جہاں کے ایما پر جہانگیر کے حکم سے شاہ جہاں کو شکست دی تھی لیکن بعد میں اس نے بھی شاہجہاں کی تائید و حمایت کی۔ وہ بھی "ذخیرۃ الخوانین" کے مصنّف فرید بھکری کے بیان کے مطابق اثناء عشریہ مذہب کا حامل تھا۔[۲] اس کو شاہ جہاں نے خانخاناں کا خطاب، سپہ سالار کا عہدہ، ہفت ہزاری سوار و دو اسپہ و سہ اسپہ کا منصب دیا۔ اس کے علاوہ انعام واکرام الگ تھا۔[۳]

یہ تمام افراد جو شاہ جہاں کے قریب ترین اور معتمد ترین افراد تھے وہ عقیدے اور مسلک کے اعتبار سے شیعہ تھے وہ اسلام ہی کے حامل تھے اس لیے انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ شاہ جہاں کی حمایت کی اور اس کو تختِ حکومت دلایا اور جب شاہ جہاں تخت حکومت کا مالک ہوا تو اس نے ان حضرات کی خدمات کو سراہا اور انہیں معزز ترین اور بلند ترین عہدے پر سرفراز کیا۔ اس لیے یہ اعتراض و شبہ کہ شاہ جہاں نے سنّی العقیدہ اسلام کو اپنایا حقیقت کے خلاف ہے۔ یہ ایک سراسر الزام ہے جس کی کوئی تاریخی صداقت نہیں۔ البتہ انگریز سامراج اور سامراج پروردہ دانشور اتحاد بین المسلمین کے دشمن اور شکم پرست دانشوروں نے اپنے سفلی عزائم کے تحت مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں اختلاف کو ہوا دینے کی کوشش کی ہے جس سے انگریزوں کو مسلمانوں کو غلام بنانے میں مدد ملی ہے۔ اس لیے یہ تفریق حقیقی نہیں۔ تاریخ تو یہ بتلاتی ہے کہ شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) کے علمی و فکری جہاد سے یہ تفریق ختم ہوئی اور شاہ جہاں اور عالمگیر نے اس پر ایک وسیع و شاندار عمارت قائم کی اور تقریباً ڈیڑھ سو سال تک مسلمان متحد

۱۔ عمل صالح ص ۲۳۹ تا ۲۴۱۔
۲۔ ذخیرۃ الخوانین جلد دوم ص ۱۷۱۔
۳۔ عمل صالح جلد اول ص ۲۴۴۔

اور متفق رہے۔

شاہ جہاں کی اس انقلابی تبدیلی سے شعراء کرام عام لوگوں کو متعارف کراتے ہیں۔ اس موقع پر تاریخ جلوس کے لیے جو اشعار لکھے گئے ہیں وہ بہت ہی معنی خیز اور ذہن و فکر و رجحان کی تبدیلی کے آئینہ دار ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عامۃ المسلمین حکمران میں کس صفت کو پسند کرتے ہیں۔ یا حکمران اپنے کو کس صفت کے ساتھ عامۃ المسلمین میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً سعیدائے گیلانی کا یہ مصرعہ "جلوس شاہ جہاں دادہ زیب ملّت و دین" دوسرے "زینتِ شرع" اور "خدا حق بہ حقدار" سے شاہ جہاں کی تخت نشینی کی تاریخ نکلتی ہے[1]۔ ان الفاظ میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ شاہ جہاں کی تخت نشینی "ملّت و دین" دونوں کو زینت دیتی ہے۔ دوسری تاریخ میں اس خواہش کا اظہار یا یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ شاہ جہاں کی حکومت سے "شرع" کو زینت ہوگی اور اسے جو حکومت ملی ہے تو اسے یہ حق حکومت اللہ تعالیٰ نے حقدار ہی کو عطا کیا ہے ان تاریخوں میں حکومت کا خاص نقطہ نظر اور حکمران سے ایک خاص توقع کا اظہار کیا گیا ہے۔

شاہ جہاں اپنے عزائم ہی بتانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس نے اپنے حلیہ سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ "احسن تقویم" کا بہترین نمونہ ہے۔ عمل صالح کے مصنف نے اس کے خط و خال کو تفصیل سے پیش کیا ہے تاکہ جن لوگوں نے دیکھا نہیں اس کے جسمانی خط و خال سے اس کی خصلت و طینت کے بارے میں اندازہ کر سکیں۔ اس کے قد و قامت بھنویں۔ آنکھ۔ تل جس کو نبی کریمؐ کی پشت مبارک کی مہر نبوت سے اور چہرہ مبارک کی رنگت کو حضرت رسالت پناہ کے مشابہ قرار دیا ہے۔ دہن مبارک ہونٹ۔ دانت آواز۔ گفتگو۔ تحریر۔ تقریر سبھی کی تعریف کی ہے۔ ڈاڑھی اور مونچھ سنّت سید المرسلین کی تقلید کے مطابق رکھتے ہیں۔ لبوں کو کترواتے اور ڈاڑھی ایک مشت کی رکھتے ہیں

---

[1] عملِ... ج ۱ ص ۲۱۲۔

غرضیکہ شاہ جہاں کے حلیہ کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے جس سے اس کی ظاہری شکل و شباہت بالکل ایک مسلمان کی سی نظر آتی ہے اور اس کے پیش نظر مثال شکل و شباہت اور حلیہ مبارک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ [۱]

شاہ جہاں کا ڈاڑھی رکھنا اور اسے سنّت سید المرسلین قرار دینا ایک بہت ہی انقلابی اور جرأتمندانہ قدم تھا۔ اکبر کے عہدِ حکومت میں جب شعائر اسلام کا انہدام شروع ہوا تو ڈاڑھی منڈوانے کا عام رواج ہو گیا تھا۔ [۲] اکبر کے سینتیسویں سال (۳۷ ویں سال) حکومت میں درباریوں نے بڑے اہتمام سے اپنی ڈاڑھیاں منڈوائیں۔ شعرا نے اس کی تاریخ کی "بگفتہ ریشہا بہ باد دادہ مفسدے چند" [۳] اکبر نے اس کی ہمت افزائی کی اور اس کو پسند کی نگاہوں سے دیکھا اس لیے "جن لوگوں نے مراتب چہار گانہ" کو قبول کیا ان کو ایک صدی سے پانچ صدی تک کا منصب حاصل ہوا اور بڑی عقیدت سے ڈاڑھی منڈوائی۔ ان کی تاریخ موتراش چند" سے نکلتی ہے۔ اکبر نے ڈاڑھی منڈانے کو رواج دیا۔ اور اس کی سرپرستی، ہمت افزائی اور قدر دانی کی۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں جاری رہی لیکن شیخ احمد سرہندی نے اتبّاع سنت نبوی کی ترویج و غلبہ کا جہاد کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا اکبر کا پوتا اور جہانگیر کا بیٹا شاہ جہاں ڈاڑھی رکھتا ہے اور سنت سیّد المرسلین قرار دیتا ہے۔

شاہ جہاں اپنے شب و روز کے پروگرام سے لوگوں کو یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ ایک مسلمان کی طرح اپنی زندگی گذارنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ سورج نکلنے سے دو گھنٹہ پہلے اٹھ جاتا ہے۔ وضو کر کے خلوت گاہ کے متصل مسجد میں نماز سنت اور

---

[۱] عمل صالح ص ۲۱۵ - ۲۲۲۔

[۲] بدایونی۔ ص ۴۹۸۔

[۳] بدایونی ص۔ ۵۴۴۔

[۴] بدایونی ص۔ ۵۵۸۔

فرض ادا کرتا۔ پھر دعائیں، وظیفے پڑھتا اور تسبیح خوانی کے بعد حرم سرا میں جایا کرتا تھا اور امور مملکت میں مصروف رہتا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد قیلولہ کر کے ظہر کی نماز ادا کرتا اور اس کے بعد ممتاز محل کے ذریعہ بیوہ۔ نادار عورتوں کو نقد و جنس سے مدد کرتا۔ غریب لڑکیوں کی شادی کے لیے زیور پارچہ جات اور زر و گوہر سے مدد کرتا تھا۔ نمازِ عصر و نمازِ مغرب باجماعت ادا کرتا اور عشاء کی نماز باجماعت ادا کر کے محلسرا میں تشریف لے جاتا۔ تفریح طبع اور تقویت حواس کے لیے ہندی گویوں اور عراقی مطربوں کا گانا بھی سنتا تھا۔ قیلولے کے وقت یا رات کے آرام کے وقت فصیح بیاں شیریں زبان اشخاص سے مستند تاریخوں اور سوانح عمریوں سے زمانہ گذشتہ کے ناموروں کے واقعات انبیاء کرام کے قصے اولیاء کے تذکرے۔ وزیروں۔ بادشاہوں کے تذکرے، طور و طریقے عالموں، فاضلوں اور حکماء کے دستور سنتا تھا جو عاقلوں کے لیے گفتار و کردار کا قانون ہیں اور ارباب بصیرت کے لیے ہوشمندی و عبرت کا سرمایہ ہیں۔ مزاج و طبیعت میں نفاست لطافت۔ پاکیزگی۔ شائستگی تھی۔ روح افزا عطریات اور خوشبوؤں کے استعمال سے رغبت تھی۔ ؎۱

سجدہ تعظیمی کی ممانعت:۔

شہنشاہ اکبر (۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء) نے اپنے لیے سجدہ تعظیمی تجویز کیا اور اس کا نام زمین بوس رکھا گیا اور اس کے ادب و احترام کو اتنا بڑھایا گیا کہ اسے فرض عین اور چہرہ شاہی کو کعبہ مرادت و قبلہ حاجات قرار دیا گیا۔ ؎۲ جہانگیر کے عہد حکومت (۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء) میں بھی یہ قبیح اور سراسر غیر اسلامی رسم جاری رہی جس کو شاہ پرست خوشامد پرست۔ شکم پرست دانشور۔ علماء دنیا و مشائخ نے رخصت کا سہارا لے کر

؎۱ عمل صالح ص ۲۲۲ - ص ۲۳۰۔

؎۲ بدایونی ص ۴۶۹۔

جائز قرار دیا تھا اور اس پر عمل پیرا تھے۔ جہانگیر کے عہد میں حضرت مجددؒ الف ثانی نے اس قبیح رسم و رواج پر بھی شریعت کے نقطہ نگاہ سے مکتوب نمبر ۹۲ جلد دوم میں سجدہ صرف اللہ تعالیٰ کو کرنا چاہیے کی تلقین کی ہے۔ آپ کو جب ۱۰۲۸ھ میں جہانگیر نے دربار میں طلب کیا تو آپؒ نے سجدہ تعظیمی اور زمین بوسی سے انکار کیا اور آپؒ کے اس عمل سے غالباً جہانگیر بہت برہم ہوا اور آپؒ کے خلاف "بے عقل و کم فہم ہونے کے علاوہ مغرور اور خود پسند" ہونے کا الزام لگایا اور قلعہ گوالیار میں قید کرنے کا حکم دیا۔[۱] ——— حضرت مجددؒ الف ثانی کی دربار میں طلبی کے ٹھیک نو سال اور انتقال کے تین سال بعد اس مذموم اور انسانی شرف و وقار سے گری ہوئی غیر اسلامی رسم کو شاہ جہاں نے تخت حکومت پر بیٹھتے ہی ممنوع قرار دیا۔[۲] شاہ جہاں نے حکم کے ذریعہ شریعت محمدی کی طرف پہلا قدم اٹھایا اور اس کے بجائے چار تسلیمات کا حکم دیا۔ سادات، عارفوں، خدا رسیدہ درویشوں، علماء فضلا کو ان چار تسلیمات سے بھی معاف کیا تاکہ ان کا وقار برقرار رہے اور حاضری کے وقت محض سلام کا اور وداع کے وقت سورہ فاتحہ پڑھنے کا حکم ہوا۔[۳]

سن ہجری کا رواج:۔

اکبر کے عہد حکومت میں سن ہجری کی جگہ شمس الٰہی سن کو جاری کیا گیا اور اس کے ساتھ جلوس اکبری کے سن کی قید بھی لگی ہوئی تھی اور اس نئی تقویم میں سال اور مہینوں کو سن الٰہی اور ماہ الٰہی کہا جاتا تھا اور تنکہ اور مہر پر تاریخ الف ثبت کرائی گئی۔ تاکہ عام لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ ایک ہزار سال پر دین محمدی کی

ھ۱ تزک جہانگیری ص ۵۶۳۔

ھ۲ عمل صالح جلد اول ۲۳۶ ص و خافی خان حصہ دوم ص ۱۹۔

ھ۳ عمل صالح جلد اول ص ۲۳۷ جلد دوم ص ۱۸۱ و خافی خان حصہ دوم ص ۱۹۔

مدت ختم ہو چکی ہے۔ ؎۱ اور عملاً سن ہجری کی ہمت شکنی کی گئی تھی۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں (۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء) یہی طریقہ جاری رہا لیکن شاہ جہاں نے اس طریقہ کو تبدیل کیا۔ اس نے تمام قوموں اور ہندوستان میں ماقبل اسلام کے مروّجہ سنوں کا تفصیلی مطالعہ کر کے رد کیا اور اپنے تخت نشین ہوتے ہی "سنِ الٰہی" کو منسوخ کیا اور اپنے سنِ جلوس پر "ہجری سن" کو مقدم رکھنے کا حکم دیا اور الٰہی مہینوں کو ہجری سن کے مطابق کرنے کا انتظام کیا اور اپنے فیصلہ کا جواز رسولِ کریم کی سنّت سے دیا۔ ؎۲ شاہ جہاں نے یہ قدم بھی اسلام کی احیاء کی طرف اٹھایا۔

مسلم تہواروں کی سرپرستی:۔

اکبر اور جہانگیر کے عہد حکومت (۱۵۵۶ء تا ۱۶۲۷ء) میں سرکاری سرپرستی میں ہندؤں اور زرتشتیوں (پارسیوں) کے تہوار منائے جاتے تھے اور اکبر نے زرتشتیوں (پارسیوں) کی طرح سال میں چودہ عیدیں مقرر کر رکھی تھیں اور مسلمانوں کے تہواروں کی اس قدر ہمت شکنی کر رکھی تھی کہ مسلمانوں کی عیدوں کی رونق جاتی رہی ؎۳ جہانگیر کے دور میں بھی کم و بیش یہی سلسلہ جاری رہا۔ لیکن شاہ جہاں نے تخت نشین ہوتے ہی اس پالیسی کو تبدیل کر دیا اور حکومت کی سرپرستی میں مسلم تہواروں کو منانے کا فیصلہ کیا۔ جس سے ان کی قدر و قیمت اور اہمیت کا ____ اندازہ ہوتا ہے چنانچہ تخت نشینی کے پہلے ہی سال ۱۴ شعبان المبارک ۱۰۳۷ھ مطابق ۱۹ اپریل ۱۶۲۸ء کو "شب برات" منانے کا حکم دیا۔ دیوانِ خاص و عام میں اور سارے قلعہ کے در و دیوار پر چراغاں کیا ____ "شب برات" کی اہمیت و عظمت بیان

؎۱ بدایونی۔ ص ۵۰۰۔

؎۲ عملِ صالح جلد اول ص ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ و خافی خان حصہ دوم ص ۱۹۔

؎۳ بدایونی ص ۵۰۰۔

کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ بڑی برکت والی رات ہے۔ اس رات کو دعائیں مقبول ہوتی ہیں اور کارکنانِ قضا و قدر دنیا والوں کی عمر اور رزق کی مقدار مقرر کرتے ہیں۔ اور دیندار لوگ اسے "لیلۃ القدر" کہتے ہیں۔ سحر خیز پارسا اور شب زندہ دار عابد اس مبارک رات میں صبح تک عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ شاہ جہاں اس مبارک رات کو محتاجوں میں بڑی رقم خیرات کرتا ہے اس طرح مسلمانوں کا یہ تہوار سرکاری سرپرستی میں منایا جانے لگا جس سے معاشرے میں اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا اور مسلمانوں کا انفرادی تشخص ابھرنے لگا۔[۱۵]

رمضان المبارک:۔

رمضان المبارک مسلمانوں کے نزدیک ایک مقدّس ماہ ہے جس میں اللہ تعالےٰ کے حکم سے دن میں روزہ رکھتے ہیں اور رات میں عبادت الٰہی کرتے ہیں۔ قرآن پاک میں اس کے احکام ہیں اور حدیث پاک میں اس کی بڑی فضیلتیں بیان کی گئی ہیں۔ اکبر و جہانگیر کے زمانے میں انفرادی طور پر مسلمان ضرور روزہ رکھتے رہے ہیں لیکن حکومت کی طرف سے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی اس طرح معاشرہ کی اجتماعی اصلاح و خیر و برکت کے لیے شریعت نے جو حکم دیا تھا اس کو یکسر نظرانداز کیا گیا تھا۔ اس لیے شاہ جہاں اپنے جلوس کے پہلے ہی سال رمضان المبارک کا ایک مقدّس اور خیر و برکت کے مہینہ کی حیثیت سے خیر مقدم کرتا ہے۔ اور مسلمانوں کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ دن میں روزے رکھیں اور رات میں عبادت گزاریں اور غربا، فقراء، مساکین۔ مستحقوں کو صدقات خیرات اور زکوٰۃ ادا کریں۔ شاہ جہاں خود خزانہ عامرہ سے عالموں۔ پارساؤں اماموں کو اراضی اور وظیفہ وغیرہ تقسیم کرنے کا حکم دیتا ہے اس نے اس قدر رقم کار خیر میں تقسیم کی کہ ہندوستان کے مالیہ کا دسواں حصہ صرف ہوگیا۔ اس کے علاوہ صدر الصدور

---

[۱۵] عمل صالح جلد اول ص ۲۶۴-۳۹۲-۵۸۶ و جلد دوم ۳-۶۰۳-۶۳۹۔

موسوی خان کو حکم دیا کہ ہمیشہ فقیروں مسکینوں اور مستحقوں کو پیش کیا جائے تاکہ ان کے حسب حال ان کا روزینہ بطور مدد معاش مقرر کر دیا جائے۔ اور کوئی پریشان حال محرومی کی وجہ سے پریشانی میں مبتلا نہ ہو۔ لوگوں کے حسب حال نقد روپیہ روزینہ سالیانہ یا اراضی بطور مدد معاش مقرر کر دیا جائے۔ جمعے کی رات شکستہ حال لوگوں کے درمیان تیس ہزار روپیہ تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ اسی طرح محرّم الحرام، عید میلاد النبی، شب برات اور شب معراج کے موقع پر بارہ بارہ ہزار روپے محتاجوں میں تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ [۱] شاہ جہاں کی حکومت کے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں اپنی انفرادیت اور تشخص کا احساس اور بھی گہرا ہوا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کی زندگی میں مرکزی اور بنیادی اہمیت حاصل ہے اس لیے شاہ جہاں نے حضرت رسالت مآب سرور کائنات کی سالانہ عید میلاد النبی کا اہتمام کیا اور اس مبارک موقع پر از روئے احترام تخت سلطنت پر بیٹھنے کے بجائے مسند پر بیٹھا۔ تمام رات ذکر الٰہی میں گذارنا۔ صبح دم عالموں، فاضلوں، عابدوں اور پارسوں کو خلعتیں درشالیں دینا اور بیس ہزار روپیہ علماء، محتاجوں اور مسکینوں میں تقسیم کرنا۔ [۲] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرکزی اہمیت و حیثیت کو اجتماعی زندگی میں تسلیم کیا گیا۔

عید الفطر:۔

رمضان المبارک کے روزے رکھنے کے بعد مسلمانوں کو اجتماعی بنیاد پر

---

۱ عملِ صالح جلد اول ۲۶۶-۲۶۷ ، ۵۸۰ و جلد دوم ۱۲۱ ، ۴۰ ۶ ص ،

S.R. SHARMA - THE RELIGIOUS POLICY OF THE MUGHAL EMPERORS PP- 80.

۲ عملِ صالح جلد اول ص-۵۸-

عید الفطر منانے کی تاکید کی گئی ہے۔ جس کو اکبر اور جہانگیر کے عہد میں نظر انداز کیا گیا تھا۔ شاہ جہاں جناب رسالت مآب۔ خلفاء راشدین اور ائمہ اطہار کی پیروی کرتے ہوئے نماز ادا کرنے کے لیے عید گاہ جاتا۔ راستہ بھر غریبوں اور محتاجوں میں درہم و دینار لٹاتا جاتا اور نماز ادا کرنے کے بعد درہم و دینار بکھیرتے ہوئے واپس آتا۔[1] شاہ جہاں کے اس عمل سے مسلمان نہ صرف عبادت کی طرف مائل ہوئے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ معاشرے کے ضرورت مندوں کی ضروریات بھی پوری کرتے۔

رمضان کے روزے ترک کرنا۔

شریعت نے تمام مسلمانوں پر مقدس ماہ رمضان المبارک کے روزے فرض قرار دیے ہیں۔ شاہ جہاں نے تمام عمر اس کی پابندی کی لیکن جب اس کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ ہو گئی اور نقاہت و کمزوری میں اضافہ ہو گیا تو اس نے شریعت ہی کی رو سے روزہ رکھنا موقوف کیا اور اس کے بدلے صدقے ادا کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ ارباب شریعت کی تجویز کے مطابق محتاجوں اور مسکینوں میں ساٹھ ہزار روپیہ تقسیم کیے جانے کا حکم ہوا۔ اس کے علاوہ باورچی خانے کے مہتمم کو ہر شام کے وقت طرح طرح کے کھانے، میوے، مٹھائیاں، خوشبوئیں ترتیب دے کر خواص و عام کو شاہی دستر خوانوں پر آنے کی دعوت دینے کا حکم ہوا۔[2]

عید الاضحیٰ :-

مسلمانوں کے تہواروں میں سے یہ ایک اہم تہوار ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] عمل صالح جلد اول ص ۲۲۸-۳۰۶-۴۰۰-۴۵۴-۵۱۶ و جلد دوم ص ۳-۶-۷۴-۱۸۳-۳۲۹-۵۷۳-۶۴۰-۶۵۸-۶۷۷۔

[2] عمل صالح جلد دوم ص ۵۷۳-۶۴۰-۶۵۸-۶۹۱ و خافی خان حصہ دوم ۲۶۳۔

نے اپنے آخری حج کے موقع پر ایک سو اونٹوں کی قربانی دی تھی اس لیے مسلمان اس سنت ابراہیمی کی رسم کو زندہ رکھنے کے لیے عید گاہ میں دوگانہ پڑھتے ہیں اور جانوروں کی قربانی کرتے ہیں۔ چنانچہ شاہ جہاں مسلمانوں کی اس آرزو اور خواہش کو پورا کرنے کے لیے حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم و اصحابہ اور خلفاء راشدین کی سنت کے مطابق عید گاہ میں دوگانہ ادا کرنے کے لیے جاتا اور آمد و رفت دونوں موقع پر درہم و دینار بکھیرتا حاجتمندوں اور محتاجوں کی ضرورتیں پوری کرتا اور واپسی کے بعد قربانی کی سنت ادا کرتا اور خطیب کو خلعت عطا کرتا تھا ۔[۱]

تعمیراتِ مساجد :۔

اسلام میں مسجد کو بنیادی اور مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ آنحضرتؐ نے ہجرت کے بعد مدینہ میں سب سے پہلے زمین کا ایک ٹکڑا خرید کر مسجد کی بنیاد رکھی اور اس کی تعمیر میں آپ خود بہ نفس نفیس شریک رہے اور مدینہ ہی میں پہلا حکم مسلمانوں کو باجماعت مسجد میں نماز ادا کرنے کا دیا۔ اور مسجد نبوی ہی آپ کی تمام سرگرمیوں کا مرکز رہی۔

مسجد اسلام کی علمی بنیاد اور عروج و غلبہ کی ایک ظاہری شکل ہے۔ اور مسلم معاشرہ میں اجتماعیت کی مظہر ہے۔ مسجد کی یہ اہمیت۔ عظمت۔ تقدس اور مرکزیت اکبر و جہانگیر کے عہدِ حکومت میں ختم ہو چکی تھی۔

شاہ جہاں جیسے ہی جہانگیر کے انتقال کی خبر سن کر عنانِ حکومت سنبھالنے کے لیے دارالخلافہ کی طرف روانہ ہوا اور اجمیر سے گزرا تو سب سے پہلے اجمیر میں سنگِ مرمر کی ایک عالی شان مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ یہ عالی شان مسجد چالیس ہزار کی لاگت سے تعمیر ہوئی اور شاہ جہاں نے یکم دسمبر ۱۶۳۶ء کو نماز ادا کر کے افتتاح کیا اور

---

[۱] عملِ صالح جلد اول ص ۲۸۸ - ۳۱۳ - ۶۲ھ و جلد دوم ۱۱۹ - ۵۷۶ - ۵۸۹ - ۶۵۹ - ۶۷۸ -

عبادت اور زیارت دونوں کے تقاضے پورا کیے۔ بے بدل خان گیلانی نے مسجد کی تیاری کی تاریخ۔

"قبلۂ اہلِ زماں شد مسجد شاہ جہاں" سے نکالی۔[۱]

شاہ جہاں پاک و ہند کا واحد حکمران ہے۔ جس نے کثرت سے مساجد تعمیر کروائیں۔ اس نے ہندوستان ایسے وسیع ملک میں ہر جگہ مسجدیں تعمیر کرائیں۔ اس کا حکم یہ تھا کہ جہاں مسجدیں نہ ہوں وہاں مسجدیں تعمیر کی جائیں۔ قرآن پاک و حدیث شریف کے بموجب مسجدوں کی تعمیر سب سے اچھا صدقہ جاریہ ہے۔ جس سے ایمان کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے اور بہشت میں جگہ ملتی ہے۔ قرآن پاک کی تعلیمات کی رو سے جو شخص اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے وہ مسجدیں بناتا ہے اور آباد کرتا ہے۔ چنانچہ شاہ جہاں نے اپنے دورِ حکومت کا آغاز ہی مسجد کی تعمیر سے کیا اور اپنے تیس سالہ دورِ حکومت (۱۶۲۸ء تا ۱۶۵۸ء) میں اس نے کثرت سے بہت سی عالی شان مسجدیں تعمیر کرائیں جو اپنی وسعت۔ کشادگی نفاست اور حسن اور پائیداری کے اعتبار سے آج تک مشہور ہیں اور ساڑھے تین سو سال گزرنے کے باوجود آج تک موجود ہیں اور خلقِ خدا آج تک اس میں نمازیں ادا کرتی اور عبادت کرتی ہے۔

شاہ جہاں نے آگرہ کے لال قلعہ میں سنگ مرمر کی مسجد ۱۰۶۳ھ بمطابق اکتوبر ۱۶۵۳ء میں تیار کرائی۔ یہ مسجد بہت ہی عالی شان و دلکش و خوش وضع ہے۔ یہ بہت ہی پاکیزہ۔ دلفریب اور حسین عمارت ہے۔ شاہ جہاں نے قرآن پاک کے اس اصول کے مطابق تعمیر کرائی ہے کہ "بے شک مسجدوں کو وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ تعالےٰ اور روز جزا پر ایمان رکھتے ہیں"۔ یہ مسجد جمال و جلال کا حسین امتزاج ہے اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔

شاہ جہاں نے ۱۰ شوال ۱۰۶۰ھ بمطابق ۶ اکتوبر ۱۶۵۰ء کو ایک عالی شان

---

[۱] عمل صالح جلد اول ص ۲۰۵ و جلد دوم ۱۷۲، ۱۷۳ ص۔

جامع مسجد کی بنیاد رکھی۔ یہ پاکیزہ اور حسین مسجد چھ سال کی مدت میں دس لاکھ روپے کی لاگت سے بن کر تیار ہوئی۔ مسجد بہت ہی کشادہ اور رفیع ہے۔ سنگِ مرمر، سنگ سرخ اور سنگ موسیٰ اس کی تعمیر میں استعمال ہوا ہے۔ ان پتھروں کے متناسب استعمال سے مسجد بہت ہی حسین و دلکش نظر آتی ہے۔ اس کی تعمیر میں نفاست، حسنِ ذوق اور شائستگی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسی پاکیزہ خوش منظر اور خوشنما مسجد ہے کہ روئے زمین پر ایسی دل آویز اور دلفریب مسجد نہیں ہوگی۔ سنگِ مرمر میں سنگ موسیٰ کی پچی کاری سے خوشنما لکیریں اور قرآن شریف کی آیتیں وغیرہ اس طرح نمودار کی ہیں جو آنکھوں کو بہت ہی حسین و دلکش لگتی ہیں۔ یہ مسجد آج بھی موجود ہے جو عبادت کے علاوہ مرجعِ خاص و عام ہے۔

شاہ جہاں کی یہ مسجد بہت ہی بلند و بالا ہے۔ اس سے اس کی علو ہمتی اولالعزمی اور بلند حوصلگی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی وسعت و کشادگی کو دیکھ کر بنوانے والے کی عالی ظرفی ظاہر ہوتی ہے۔ صحن کے وسط میں سنگِ مرمر کا حوض ہے۔ اس پر بہت ہی حسین نقش و نگار کے ساتھ دالانوں کی پیشانی پر کلام اللہ کی آیتیں جو سنگ موسیٰ کی پچی کر کے نقش ہیں وہ اتنی مستحکم اور پائیدار ہیں کہ انہیں پتھر کی لکیر کہنا چاہیے۔ اور خوبیوں سے قطع نظر نقطہ حرفوں کی خوشنمائی ان کے متناسب دائروں کشش اور مد کا حسن اتنا دلکش ہے کہ "الخط نصف العلم" (یعنی تحریر آدھے علم کے برابر ہے) کا مقولہ سمجھ میں آجاتا ہے یہ مسجد محض ایک عبادت گاہ اور اپنی حسنِ تعمیر سے عجوبہ روزگار ہی نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ سرکاری شفاخانہ بھی تھا جو عام لوگوں کے امراض و بیماریوں کے علاج و معالجہ کے لیے تھا اور اس سے ملحق ایک مدرسہ بھی تھا جہاں طالب علموں کو تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اس طرح اس مسجد کے پاس یہ دو عمارتیں (شفاخانہ و مدرسہ) نہایت ہی پاکیزہ اور خوشنما بنی ہوئی تھیں۔ خلاصہ یہ کہ روحانی بالیدگی کے ساتھ جسمانی علاج و معالجہ کے علاوہ ذہن و فکر کی تطہیر کا بھی ایک ہی جگہ انتظام تھا اور یہاں کی ساری فضا روئے حسیناں کی طرح دلکش معلوم ہوتی تھی۔

اس مسجد کے جمال و جلال سے اور روحانی و مادی تقاضوں کی افادیت و مرکزیت سے لوگ بہت ہی متاثر اور خوش تھے۔ اور دعا دیتے تھے کہ جس طرح کعبہ مسلمانوں کا قبلہ ہے خدا کرے شاہ جہاں کی درگاہ بھی اہلِ علم کا قبلۂ امید بنی رہے لہٰذا اس کی تاریخ بھی۔ "قبلہ حاجات آمد مسجد شاہ جہاں"، ہے۔

شاہ جہاں نے کثیر تعداد میں مسجدیں تعمیر کرائیں جن میں مسلمان عام نمازیں ادا کرتے تھے لیکن ایک بہت ہی وسیع و کشادہ عیدگاہ بھی تعمیر کرائی جس میں وہ خود بقرعید کی نماز پڑھنے بھی گیا تھا۔ یہ بہت ہی وسیع۔ کشادہ۔ بلند وارفع عیدگاہ ہے۔ اس میں سنگِ سرخ استعمال کیا گیا ہے۔

مسجدوں میں قرآن پاک کی آیتوں کے علاوہ شاہی احکام جن کا تعلق عوام کے فلاح و بہبود اور سرکاری عمال کے فرائض و ذمہ داری سے ہوتا تھا ——— لکھوانے کا حکم دیا تاکہ سرکاری حکام اور عوام دونوں اپنے حقوق و فرائض سے واقف ہوں سرکاری حکام اپنی ذمہ داریاں پوری کریں اور عوام پر زیادتیاں نہ کر سکیں اور عوام اپنے حقوق سے واقف رہیں اور سرکاری حکام سے اپنے حقوق طلب کر سکیں اور اپنے فرائض پورے کریں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دونوں نہ صرف عبادت کے لیے مسجدوں میں آتے تھے بلکہ دنیاوی حقوق کی طلبی اور فرائض کی تکمیل کے لیے ایک دوسرے کے سامنے جواب دہی کے لیے بھی مسجدوں میں آنا پڑتا تھا۔ اس طرح مساجد کو مرکزی اہمیت، اور حیثیت حاصل ہو گئی۔ [1]

شاہ جہاں کی تعمیر مساجد سے شغف اور دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ سرکاری حکام و اعمال نے بھی کثرت سے مسجدیں تعمیر کرائیں۔ اس کی بڑی صاحبزادی جہاں آرا بیگم نے بھی تعمیرِ مسجد

---

[1] عملِ صالح جلد اول ص ۲۰۵ - ۴۲۰ - ۵۱۲ - ۵۱۳ - ۵۶۸ - ۶۵۹ - جلد دوم ص ۱۷۲ - ۱۷۳ - ۱۸۹ - ۴۶۶ - ۵۱۲ تا ۵۱۶ - ۵۱۹ - ۶۲۸ - ۶۲۹ - ۶۴۳ - ۶۴۴ - ۶۵۹ - خافی خان حصہ دوم ص ۲۶۶ - ۲۸۴ - ۳۰۶ -

میں دلچسپی لی۔ اس نے اپنے پیرو مرشد ملا شاہ بدخشی کی عبادت کے واسطے ایک مسجد بنوائی جس کی تعمیر میں چالیس ہزار روپیہ صرف ہوئے تھے اور درویشوں کے قیام کے لیے حجرے تعمیر کیے جن پر بیس ہزار روپیہ صرف ہوئے۔[1]

اسلام کے نام سے کفر کی تبلیغ کرنے والے گروہ کا خاتمہ :۔

اکبر کے اسلام سے عناد اور جہانگیر کی بے پرواہی اور غفلت کی وجہ سے ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا تھا جو نہ صرف خلاف شریعت عقائد رکھتا تھا بلکہ افعال شنیعہ کا مرتکب بھی ہوتا تھا اس سے معاشرے میں ہیجان و اضطراب بھی تھا۔

شاہ جہاں تخت نشین ہونے اور ابتدائی حکومت قائم کرنے کے بعد نومبر ۱۶۲۹ء کو اس گروہ کی طرف متوجہ ہوا۔ سرحد کے علاقے میں بایزید نامی ایک شخص تھا جس کے مرید اسے "یزداں شناس" کہتے تھے۔ اس کے مرید اس کی پیروی راہِ مستقیم سے ہٹ کر کرتے تھے یہ لوگ احکامِ شریعت پر عمل نہیں کرتے تھے بلکہ جہالت کی وجہ سے دین و دنیا کا مدار باطل عقیدوں پر رکھتے تھے۔ حرام خوری والحاد پر مبنی اور دورِ جہالت کے عقائد کے مشابہ ان کے عقائد تھے۔

ان کے عقائد و رسوم میں ایک یہ تھا کہ نکاح کے بغیر عورتوں کے ساتھ ہم بستری جائز سمجھتے تھے۔ محفل آراستہ کر کے گائے ذبح کر کے حاضرین کو کھلاتے تھے۔ اور نکاح کے ایجاب و قبول کیے بغیر زوجہ پر تصرّف کرتے تھے۔ طلاق کا دستور یہ تھا۔ کہ سنگریزہ اٹھا کر عورت کے ہاتھ میں دے دیتے تھے۔ بیوہ کو شوہر کی وراثت سے محروم رکھتے تھے۔ بلکہ خود اس کو ترکہ سمجھ کر زوجیت میں لیتے تھے یا روپیہ لے کر کسی اور کے حوالہ کر دیتے تھے اس معاملہ میں بیوہ یا ولی کو مطلق اختیار نہیں تھا جب کسی کے گھر میں بیٹا پیدا ہوتا تھا تو گدھے کا کان کاٹا کہ خون کے قطرے بچے کے

---

[1] عملِ صالح جلد دوم ص ۵۸۳۔ ۵۸۴۔

منہ میں ڈالتے تھے تاکہ بڑا ہو کر خونخواری اور گدھے پن میں کامل ہو۔ اجنبی آدمی کو جبراً پکڑ لیتے اور غلام بنا کر اس کی خرید و فروخت جائز سمجھتے۔ ترکہ بیٹوں کو دیتے تھے اور بیٹیوں کو محروم رکھتے تھے۔ خونخواری کا یہ عالم تھا کہ جس قبیلے پر قابو پا لیتے تھے اس کو تباہ کر ڈالتے تھے قبیلے کا کوئی زبردست اگر ان کے حقوق (فرض و تجربہ) ادا نہ کرے تو اس قبیلے کے کسی اور شخص کے مال پر قبضہ کر لیتے تھے اور اپنا مال سمجھ کر کام میں لاتے تھے۔ بیہودگی کا یہ عالم تھا کہ جس شخص پر قابو پا لیتے تھے اس کا مال چھین کر اسے قتل کر دیتے تھے اور یہ تصور رکھتے تھے کہ فلاں شخص جوان کے ہاتھ سے قتل ہوا ہے اس نے شہادت کا درجہ پایا ہے۔ لہٰذا قیامت میں اپنے مال کا مواخذہ نہ کرے گا۔ اس عقیدے کے لوگ قلاش کے سوا کسی مالدار کو زندہ نہیں چھوڑتے تھے۔ نادار کو غلام بنا لیتے تھے۔ ان حضرات کے عقائد بہت ہی گمراہ کن۔ باطل اور فاسد تصورات تھے جو معاشرہ کے لیے تباہ کن تھے اس لیے شاہ جہاں تخت نشین ہوتے ہی نومبر ۱۶۲۹ء میں اس طرف متوجہ ہوا۔ اور فرمان جاری کیا کہ تمام سرکاری اہل کار ان گمراہوں کو خلافِ شریعت، خلافِ عقل حرکتوں کے ارتکاب سے روکیں۔ ان کو ڈرا دھمکا کر ان لغو اور فاسد اعتقادات کی اصلاح کریں۔ اگر کوئی شخص ان افعال شنیعہ کا مرتکب ہو تو سخت سزا دیں یعنی حکم شریعت کے مطابق درّے لگائیں یا قتل کریں۔ اس احتساب کی وجہ سے اصولِ اسلام کا رواج ہوا۔ دین اسلام کا جھنڈا بلند ہوا۔ شریعت اسلامی کا رواج ہوا۔ ملحدوں بے دینوں کا خاتمہ ہوا اور جو بچ گئے گوشہ گمنامی میں چلے گئے۔ تمام گمراہ کن عقائد، فاسد تصورات، بدعتیں خرافات دم توڑ گئیں۔ متقی۔ پرہیزگار مسلمانوں کو امن وامان نصیب ہوا۔ اور تمام کام دین محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مطابق انجام پانے لگا اور شریعت اسلامی کا رواج ہوا۔[۱]

عمّال کی تقرری اور شریعت:۔

اکبر اور جہانگیر کے دورِ حکومت میں عمّال کی تقرری میں شریعت کا لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا

---

۱ عملِ صالح جلد اول ص ۳۴۳ تا ۳۴۶ و خافی خان حصہ دوم ۲۶، ۲۷ ص۔

محض حکمران کی شخصی وفاداری مطلوب ہوتی تھی۔ اور شریعت کے معاملہ میں لاپرواہی اور غیر جانبداری مطلوب ہوتی تھی۔ شاہ جہاں نے اس معیار اور نقطہ نظر کو تبدیل کر دیا۔ اس نے ہر معاملہ میں شریعت کو رہنما بنایا اس لیے عمّال کی تقرری میں بھی "دیوانی کے تمام عہدوں پر دیانت دار کفایت شعار مسلمان فائز کرنے کا حکم دیا۔ ملکی و مالی امور بالخصوص عظیم مہمیں ہندوؤں کے سپرد نہ کرنے کا حکم دیا تاکہ عام مسلمان بالخصوص سادات و مشائخ و پرہیزگار و متقی جاجا کر انہیں سلام کرنے کی ذلّت سے محفوظ رہیں۔ لہٰذا دفتر تن کا انتظام رائے مالی داس سے لے کر ملا عبد اللطیف لشکر خانی کے سپرد کر دیا جو دین دار، معاملہ داں اور منتظم ہونے کے علاوہ حساب و کتاب میں بقدرِ ضرورت ماہر تھا۔"[۱]

احکامِ شریعت:۔

اکبر کے عہدِ حکومت میں شریعت کے احکام کی اعلانیہ خلاف ورزی کی گئی، بلکہ حکومت کی پالیسی شریعت کی خلاف ورزی پر مبنی تھی۔ جہانگیر کے عہدِ حکومت میں شریعت کے خلاف گرفت ڈھیلی ضرور ہوئی لیکن اب بھی شریعت کو عمل کی دنیا میں اہمیت و عظمت حاصل نہیں تھی۔ البتہ حضرت مجدد نے (۱۵۶۴ء تا ۱۶۲۴ء) اسی زمانے میں اپنے مکتوبات میں شریعت کی اہمیت، عظمت اور تقدس اور ضرورت کو دلنشین پیرائے میں استدلال کے ساتھ پیش کیا تھا اور سوچنے سمجھنے والوں کو شریعت کی عظمت و حقانیت پر مطمئن کر دیا تھا۔ نفاذِ شریعت کی طلب اس قدر شدید تھی کہ اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ۱۲ ربیع الاول ۱۰۴۳ھ بمطابق ۱۶ ستمبر ۱۶۳۳ء) کو حضرت رسالت مآب سرورِ کائنات کی عید میلاد النبیؐ کے موقع پر شرعِ متین اور سنت سید المرسلین کو رواج دینے کے لیے ممالک محروسہ کے تمام حکام اور صوبیداروں کو از سر نو نہایت تاکید سے فرمان بھجوایا کہ شریعت محمدی علیٰ صاحبہا

---

[۱] عمل صالح جلد اول ص ۴۸۲۔

پر عمل کیا جائے اور اس کے مطابق سزائیں دی جائیں۔ شرعی سیاست کا خصوصیت سے خیال رکھا جائے۔ نئے بت خانے تعمیر نہ کیے جائیں۔ جو بت خانے بوسیدہ ہو کر ڈھینے والے ہوں ان کی مرمت نہ کی جائے۔ شراب اور دیگر منشیات کے کھانے پینے اور بیچنے کی خواہ خفیہ یا خواہ علانیہ ممانعت کر دی جائے۔ اگر کوئی کافر مسلمان ہونا چاہے تو دوسرے کافر اس پر جبر نہ کریں۔ ہندوؤں کو مسلمانوں کے قبرستان کے پاس مردے جلانے سے روک دیا جائے۔ ہندو مردوں کی راکھ پر مٹھ نہ بنائیں۔ ہندو سرکشوں کے علاقوں میں اتفاقاً جو مسلمان قید ہو جائیں ان کے بال بچوں کو ایذا نہ پہنچائی جائے۔[۵۱] شاہ جہاں کے ان احکامات سے احیاء شریعت کی تحریک کو تقویت حاصل ہوئی اور کفر و الحاد و بے دینی کی تحریک کمزور ہوئی۔

رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے احکام :۔

شاہ جہاں نے محض تعزیری احکام ہی جاری نہیں کیے بلکہ اسے عام رعایا کی مادی فلاح و بہبود کا بہت ہی خیال تھا اس نے حکومت کی پالیسی عدل و انصاف پر رکھی۔ اسے جب کشمیر کے پرچہ نویسوں سے معلوم ہوا کہ اب تک سرکاری کارپردازِ کشمیر کے باشندوں بالخصوص ضعیف مسکین، بیواؤں اور کم عمر یتیم بچوں سے زعفران کے پھول چننے کا کام بلکہ بیگار لیتے ہیں۔ حکم دیا کہ آئندہ ان لوگوں کو تنگ نہ کیا جائے جو اشخاص یہ کام کریں انہیں سرکار شاہی سے باقاعدہ اجرت دی جائے۔ علاوہ ازیں زمانہ قدیم سے یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ دھان کی ایک خروار پر ڈھائی ٹکے مالیانہ وصول کیا کرتے تھے۔ شاہ جہاں نے اس پر چوتھائی ٹکے (¼ ٹکہ) مقرر کیا۔ یہ حکم بھی دیا کہ حکومت میں زکوٰۃ اور راہداری کے بطور لاکھوں روپیہ خزانہ عامرہ میں داخل ہوتا ہے۔ اس لیے چھوٹے اور حقیر معاملوں میں کسی سے ایک کوڑی وصول نہ کریں۔ یہ بھی دستور تھا کہ ہر موضع جاتا ہے سو خروار دھان پر کسانوں سے دو منڈھے وصول کیا کرتے تھے کچھ عرصے سے صوبہ داروں نے یہ زیادتی شروع کر رکھی تھی کہ منڈھوں کے

---

[۵۱] عمل صالح جلد اول ۵۸۰۔

بجائے فی راس چھیاسٹھ ٦٦ ٹکے وصول کرتے تھے جو تین منڈھوں کی قیمت کے برابر تھا، حکم دیا کہ یہ زیادتی فوراً موقوف کردی جائے۔ یہ بھی دستور ہو چکا تھا کہ ایک گاؤں میں کئی کئی قانون گو پہنچ جایا کرتے اور ہر ایک اپنی قانون گوئی کا حق وصول کیا کرتا تھا جس سے کسانوں اور جاگیرداروں کو نقصان پہنچتا تھا اس لیے حکم دیا کہ صرف ایک قانون گو اپنا حصہ وصول کیا کرے دوسروں کو دخل نہ ہو۔ ملّاح فی کس (چھوٹا ہو یا بڑا) ۷۵ ٹکے میر بحری کا محصول لینے لگے تھے، ہدایت کی یہ طریقہ ختم کردیا جائے اور پرانے دستور کے مطابق عمل کیا جائے یعنی بوڑھوں سے بارہ ٹکے نوعمروں سے چھتیس ٣٦ ٹکے اور جوانوں سے ساٹھ ٹکے لیا کریں۔ صوبہ دار کو حکم دیا کہ ضعیفوں اور مسکینوں کو بیگار سے اور بے اندازہ ٹیکسوں کے بوجھ سے آزاد کرے۔ شاہجہاں کے ان احکامات سے کشمیر کے باشندوں کو ظالمانہ قاعدوں سے نجات ملی۔ عام لوگوں کی ان احکامات سے واقفیت کے لیے حکم دیا کہ ان احکامات کی عبادت پتھر کی سل پر کھدوا کر جامع مسجد میں لگوادی جائے تاکہ حکام اور عوام دونوں حقوق اور فرائض سے واقف ہو جائیں اور عوام کی بے خبری سے حکام عام رعایا پر ظلم و زیادتی نہ کریں اور عوام اپنے حقوق سے بے خبر نہ ہوں۔ عدل و انصاف اور رعایا پروری کے ان احکامات سے عام لوگوں کو فائدہ پہنچا۔[1] ظلم و جبر کے دروازے بند ہوئے۔ شاہی سواری جب کسی سفر، شکار یا لشکر کشی کے لیے روانہ ہوتی تھی تو کثرتِ تعداد کی وجہ سے راستہ کے کھیتوں میں سے گزرنا ناگزیر ہو جاتا تھا اس سے کسانوں کو نقصان ہوتا تھا اس لیے شاہجہاں نے رعایا کے نقصان کی تلافی کیلئے تاکیدی احکام جاری کیے۔ حکم دیا کہ اگر کسی بھی شخص نے راستہ میں کھیتی باڑی سے ایک خوشہ بھی توڑا تو اس کا ہاتھ قطع کر دیا جائے اور کھیت والے کو اس کی دوگنی قیمت ادا کی جائے۔ جن مقامات پر راستہ کی تنگی کی وجہ سے فوج اور بار بردار دستوں کا کھیتوں سے گزرنا ناگزیر ہوتا۔ وہاں جتنی اراضی لشکر سے تباہ ہو اس کی باقاعدہ پیمائش کرکے اس کی تلافی خزانہ عامرہ سے کر دی جائے۔ اس کام کے لیے دیانتدار، خدا ترس افراد کو تعینات کیا تاکہ رعایا کی فلاح کی نگہداشت کر سکیں۔ سفر میں اسی ضابطہ پر عمل ہوتا تھا[2] شاہجہاں کے ان ضوابط و احکامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے عام رعایا کی فلاح و بہبود اور خوشحالی سے کس قدر دلچسپی تھی وہ چاہتا تھا کہ رعایا پر کسی قسم کا ظلم نہ ہو اور لوگ امن و امان کی زندگی بسر کریں۔

١ عمل صالح جلد اول ص ۵۱۲-۵۱۳

۲ عمل صالح جلد اول ص ۵۸۵ و خافی خان حصہ دوم ۹۱-۹۲ ص۔

۱۰۷ کفر والحاد کے مراکز کو تباہ کرنا۔

اکبر و جہانگیر کی الحاد اور شرک آمیز اسلام کی سرپرستی کی وجہ سے معاشرہ میں کفر والحاد کے بہت سے مراکز قائم ہو گئے تھے۔ جہانگیر کا ایک دوست بیر سنگھ بندیلہ نے MATHRA جہانگیر ہی سے انعام میں پائی ہوئی رقم سے متھرا میں ایک عالی شان مندر تعمیر کرایا تھا۔ جو دوبارہ ویشنو "vaislmavas" کی پوجا کے لیے ایک اہم مقام بن گیا تھا۔ ؎۱ اسلامی شریعت کے رو سے یہ بت پرستی ہی کے مرکز نہ تھے بلکہ گمراہی، ضلالت اور سرکشی کے مراکز بھی بن گئے تھے۔ بت پرست اتنے جری اور سرکش ہو گئے تھے کہ شاہ جہاں کے تخت نشین ہونے کے بعد بھی بلا اجازت بت خانے تعمیر کر رہے تھے۔ شاہ جہاں تخت نشین ہوتے ہی مملکت کی پالیسی کو شریعت اسلامی کے تحت رنگ دینے کی کوشش کی تھی اور بہت سے ایسے احکام جاری کیے تھے جو شریعتِ اسلامی کے مطابق تھے۔ اسلامی شریعت کی رو سے کفر، شرک کی تبلیغ گناہ کبیرہ ہے۔ یہ مذہب کے نام سے بت پرستی کے مراکز ہی نہ تھے بلکہ باغیانہ سرگرمیوں امن و امان کو تباہ کرنے اور مسافروں کو لوٹنے کے مراکز بھی بن گئے تھے۔ اس لیے امن و امان کے قیام اور فتنہ و فساد کی روک تھام کرنے کے لیے شاہ جہاں نے حکم دیا کہ باغیوں اور سرکشوں کے خلاف فوج کشی کی جائے اور انہیں شکستِ فاش دی جائے اور ان کے عالی شان بت خانوں کو مسمار کر کے بتوں کو آگ میں جھونک دیا جائے۔ بت خانوں کی جگہ مسجدیں خانقاہیں تعمیر کر کے شعائرِ اسلام کا رواج دیا جائے اور اذان اور اللہ اکبر کا نعرہ زور و شور سے بلند کیا جائے۔ تاکہ بت پرستی اور کفر و شرک کی تاریکی دور ہو۔ ؎۲

؎۱ S-R. SHARMA- THE RELIGIOUS POLICY OF THE MUGHEL EMPERORS - PP 62-

؎۲ عملِ صالح جلد اول ص ۳۹۵ ، ۳۹۷-

مذہب کے نام پر کثرت سے بلا اجازت بہت سے نئے مندر تعمیر ہوئے تھے جو کفر و شرک کی ترویج کرتے تھے اس لیے علماء دین نے شریعت کے مطابق یہ فتویٰ دیا کہ جہاں کہیں کوئی نیا بت خانہ تعمیر ہوا ہے اس کو برباد کیا جائے۔ چنانچہ شاہ جہاں کے حکم سے شہر بنارس کے ۷۶ بڑے بڑے بت خانے تباہ کر دیے گئے اور تمام احکام اور شرعی معاملات کے کارپردازوں کو ہدایت کی گئی کہ خوب تحقیق و تفتیش کر کے جہاں کہیں کوئی نیا بت خانہ تعمیر ہوا ہو اسے تباہ و برباد کر دیں۔ ان کے ملبہ کا پڑا رہنا باعث فتنہ و فساد ہو سکتا ہے اس لیے دینِ اسلام کی رونق کے لیے مسجدیں وغیرہ تعمیر کریں۔ البتہ وہ بت خانے جو میرے عہدِ سلطنت سے پہلے تعمیر ہوئے انہیں نہ چھیڑا جائے۔ لے

کشمیر سے واپسی کے راستہ موضع اجھول میں قیام ہوا۔ یہاں بہت سے بت خانے تھے جہاں دور دور سے ہندو آکر ان میں پوجا کرتے تھے۔ یہ کفر و شرک اور گمراہی کے مرکز تھے اس لیے شاہ جہاں کے حکم سے انہیں جڑ بنیاد سے اکھیڑ پھینکا گیا اور اس کفر آباد کا نام اسلام آباد رکھا گیا۔ ٢ے

جھجار سنگھ بندیلہ نے بغاوت کی اس لیے اس کی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے شاہ جہاں نے لشکر کشی کی جب شاہی فوجیں تعلہ کے میدان کے قریب پہنچیں تو سب سے پہلے بت خانے کی چھت پر اذان دی اس روز سے پہلے کسی مسلمان کا قدم تو کیا مسلمانی کا نام تک نہ آیا تھا۔ پہلی بار اس کفرستان میں اذان بلند ہوئی تھی لشکرِ اسلام نے جمعے کی نماز باجماعت ادا کی اور بادشاہ دین پناہ اسلام پرور (شاہ جہاں) کی درازیٔ عمر کی دعا مانگی اس کے بعد جھجار سنگھ کے باپ نرسنگھ دیو کے محل میں آرہے اور حکم دیا کہ وہ عالی شان بت خانہ جو نرسنگھ دیو نے اپنے محل کے پاس بڑی لاگت سے بنوایا ہے اسے ڈھا دیا جائے۔ ٣ے

لے عملِ صالح جلد اول ص ۱۹۴ رخافی خان حصہ دوم ص ۶۷

٢ے عملِ صالح جلد دوم ص ۳۳۔ ٣ے عملِ صالح جلد دوم ص ۹۷ تا ۱۰۱ خافی خان ص ۲۶۔

نوٹ بر صفحہ آئندہ

شاہ جہاں نے شریعتِ اسلامی کو اپنی مملکت کی پالیسی قرار دیا تھا اور شریعتِ اسلامی اللہ تعالےٰ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معرفت عطا کردہ قانون ہے۔ یہ کسی ایک فرد یا کسی گروہ یا کسی قوم کا قانون نہیں ہے جو جبر۔ دھونس۔ تشدد یا قوت سے کسی قوم پر ٹھونس دیا جائے اس لیے شریعت اسلامی کا نفاذ اور اس کی اطاعت۔ فرمانبرداری کسی فرد قوم۔ گروہ کی غلامی نہیں بلکہ اللہ تعالےٰ کی اطاعت اور غلامی ہے۔ جو سب کا خالق اور مالک ہوتا ہے اس لیے شاہ جہان نے شریعت اسلامی کے خلاف جو طاقتیں تھیں اور جن کو انسانیت کے لیے وہ ضلالت و گمراہی اور فتنہ و فساد کی جڑ سمجھتا تھا۔ ان کے خلاف اس نے فوجی اقدامات کیے تھے پھر انہیں بت خانوں کو تباہ کیا گیا تھا جو اس کے عہدِ حکومت میں بلا اجازت تعمیر کیے گئے تھے اور سرکشی۔ بغاوت اور فتنہ و فساد کے مرکز بن گئے تھے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ شاہ جہاں نے ہندوؤں کی عام مذہبی آزادی ختم کر دی تھی۔ عام ہندوؤں کو مذہبی آزادی حاصل تھی۔ وہ اپنے مندروں میں پوجا پاٹ کرتے اور امن و امان سے رہتے تھے۔ اس نے خود متھرا میں کیشو رائے (KESHO RAI) کا مندر تعمیر کرنے کے لیے پتھر کے تحفے دیے تھے۔ جے سنگھ والئ راجہ جے پور کو ۱۶۴۳ء بمطابق ۱۰۵۳ھ اس بات کی مکمل آزادی دی کہ وہ بندر ابن کے مندر کے لیے کسی پروہت کو مقرر کرے۔ اس مندر کو راجہ مان سنگھ نے تعمیر کرایا تھا۔ راجہ مان سنگھ کی ماں جب بنگال میں مر گئی تو اس کے مقبرہ کے اخراجات کے لیے شاہ جہاں نے اگست ۱۶۳۹ء میں ذوکسو۔ بیگہ زمین عطا کی۔ گجرات کے ہندوؤں کو ان کے مندر ۱۶۴۷ء میں واپس کیے[1] شاہ جہاں کی یہ امداد اور رویہ ظاہر کرتا ہے

نوٹ بر صفحہ سابقہ:۔ راجہ نرسنگھ دیو نے جہانگیر کے حکم سے شیخ ابو الفضل (ابو الفضل) کو قتل کر کے اس کا سر ۱۶۰۲ء میں جہانگیر کے پاس الہ آباد بھجوایا تھا۔ جہانگیر نے تخت نشین ہو کر اسے انعام و اکرام کے علاوہ سہ ہزاری منصب سے سرفراز کیا۔ نرسنگھ دیو نے اسی رقم سے بہت سے مندر تعمیر کیے تھے۔ تزکِ جہانگیری ص ۵۴

[1] SR. SHARMA - THE RELIGIOUS POLICY OF THE MUGHAL EMPERORS PP 87

کہ وہ مذہب کے نام پر باغیوں، مفسدوں کے خلاف تھا۔ اور ان کے مراکز کو تباہ کرنا چاہتا تھا تاکہ شر و فساد اور برائی کے اڈے تباہ ہوں۔ اس کے علاوہ عام رعایا پر مذہب کی بنا پر کوئی پابندی نہیں تھی وہ امن و امان سے رہتے تھے۔ ان کے جان و مال عزت و آبرو سبھی محفوظ تھے اور اس کی حکومت سے قبل جو بت خانے تعمیر ہوئے تھے۔ ان کو باقی رہنے دیا گیا تھا۔

نوٹ:۔ شاہ جہاں کے عہد میں نئے تعمیر شدہ بت خانوں کو تباہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس پر عہدِ جدید کے مؤرخین شاہ جہاں پر مذہبی تعصّب، تنگ نظری۔ ہندو دشمنی اور رجعت پسندی کا الزام دھرتے ہیں۔ عہدِ جدید میں چونکہ ریاستیں "عقل، فلسفہ، تجربات اور مصلحتِ ملکی" کے نام پر قائم ہیں اور شریعت کو یکسر نظر انداز کرتی ہیں اور خود اپنی طرف سے ایک مذہب کا تصور تخلیق کرکے نام نہاد مذہبی آزادی، ضمیر و ایمان کی آزادی۔ آزادیٔ تحریر و تقریر۔ آزادیٔ اجتماع۔ مذہب رنگ و نسل کی عدم تفریق اور قانون کی بالادستی کا دعویٰ کرتی ہیں۔ لیکن عہدِ جدید کی حکومتوں کا محض کاغذی دعویٰ اور ان کا عمل ان دعوؤں کے قطعی برعکس ہوتا ہے۔ انیسویں[19] صدی کے نصفِ آخر کو انگریز مؤرخین "ERA OF LIBERALISM" روشن خیالی کا دور کہتے ہیں لیکن پاک و ہند میں ۱۸۵۷ء میں مکمل قبضہ کے بعد اپنے سے اختلاف کرنے والوں کو طاقت، تشدد۔ جبر و قوت سے نیست و نابود کرنے کے بعد انبالہ، پٹنہ، مالدہ راج محل کی خصوصی عدالتوں کے ذریعے پھانسیوں۔ سزائیں حبسِ دوام۔ جائیداد کی قرقیاں و نیلام کرواتے ہیں اور اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ علماءِ صادق پور (پٹنہ) کے قبرستان کو کھدوا ڈالتے ہیں اور اسی جگہ پٹنہ میونسپلٹی تعمیر کرتے ہیں۔ ان مرے ہوئے لوگوں کا آخر کیا قصور تھا، جو انہیں تشدد و بربریت کا اور سفّاکی کا نشانہ بنایا گیا۔ کیا یہی تہذیب تھی جس سے انگریز پاک و ہند کو روشناس کرانا چاہتے تھے؟ کیا یہی آزادی و انسانی جان و مال کا احترام ہے؟ کیا یہی لبرل ازم ہے جس کا وہ دعویٰ کرتے ہیں؟ کیا یہی رواداری۔ اور وسیع النظری ہے؟ کیا یہی انسان دوستی "HUMANISM" ہے؟ سوڈان

حاشیہ صفحہ سابقہ

میں مہدی سوڈانی کا مقبرہ تباہ کرتے ہیں تو آخر یہ کونسی انسان دوستی ہے؟

۱۹۱۷ء میں روس میں کمیونسٹ حکومت قائم ہوئی۔ جو عہدِ جدید کی عوام دوست حکومت ہونے کی دعویدار ہے۔ لیکن اس نے عوام پر انسانیت سوز مظالم کیے۔ تمام آزادیوں کو سلب کر لیا گیا۔ عبادت گاہوں کو بند کر دیا گیا۔ جبر تشدد اور قوت کے بل بوتے پر لوگوں کے جان و مال پر قبضہ کیا گیا۔ انسان سے شعور، ارادہ، امتیاز، پسند و ناپسند کے تمام حقوق چھین لیے گئے۔ ان کی حیثیت محض "شتر بے مہار" کی ہے یعنی جن کی نکیل حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ آدمی وہی کھا سکتا ہے۔ پہن سکتا ہے۔ پڑھ سکتا ہے۔ لکھ سکتا ہے جو حکومت چاہے اپنی خواہش مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا۔ وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں میں ایک زمانے میں مسلمانوں کے بڑے بڑے تعلیمی ادارے بڑے بڑے علماء و مشائخ پیدا ہوئے لیکن آج کل ان میں نہ تو کوئی ادارے ہیں اور نہ ہی علماء و مشائخ کے نام ملتے ہیں۔ ان کی مذہبی آزادی روح کو بالکل بے جان مردہ کر دیا گیا ہے۔ کیا یہ ظلم و زیادتی۔ تنگ نظری۔ تعصب۔ تشدد نہیں؟ یہ سب کچھ عوام دوستی اور ہر قسم کی آزادی کے نام پر کیا گیا۔

بیسویں صدی کے نصفِ اول میں جو جمہوریت کا دور کہلاتا ہے جس میں عوام کی مرضی و منشا ہی کو حکومت کے معاملات میں دخل ہوتا ہے جمہوریت ہی کے خوش کن اور دلفریب نام سے ایک حکومت برسر اقتدار آئی اور جدید ترکی کی تعمیر و تشکیل جمہوریت۔ قومیت۔ سیکولرازم EHATISM POPULISM اور انقلابیت کے فلسفہ پر کرنا شروع کی تو باوجود یہ کہ ترکی کی عظیم الشان اکثریت مسلمان تھی لیکن تمام شرعی عدالتوں کو ختم کر دیا گیا۔ محکمہ اوقاف اور دینی مدارس کو ختم کرایا گیا۔ ترکی ٹوپی اور عورتوں کے لیے پردہ ختم کیا گیا۔ ۱۹۲۶ء کو اسلامی کیلنڈر ختم کر کے یورپین کیلنڈر رائج کیا گیا۔ دارالخلافہ انقرہ تبدیل کیا گیا۔ جہاں جدید علاقہ میں کوئی مسجد تعمیر نہیں کی گئی۔ جمعہ کی تعطیلات ختم کر کے اتوار کو عام تعطیل کی گئی۔ ۱۹۲۸ء میں دستور میں تبدیلی کر کے اسلام کو سرکاری مذہب سے ختم کیا گیا اور اس کی جگہ نام نہاد ضمیر کی مکمل آزادی کا اضافہ کیا گیا۔ جو صفحۂ قرطاس پر تو تھا۔ لیکن عمل کی دنیا میں کہیں نظر نہ آتا تھا۔

حاشیہ صفحہ سابقہ

انہی اصلاحات پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ عدالتی نظام کو یکسر تبدیل کیا گیا۔ تمام وہ قوانین جو ترکیہ میں جاری تھے ان کی جگہ سوئیٹزرلینڈ SWIYERLAND - فرانس۔ جرمنی اور اٹلی کے قوانین مستعار لیے گئے اور جبراً ترکی کے عوام پر ٹھونس دیے گئے۔ مزید اصلاح کے نام پر جو سب سے اہم تبدیلی کی گئی وہ ترکی کے عربی رسم الخط کو تبدیل کر کے لاطینی رسم الخط کو اختیار کیا گیا اور بیک جنبشِ قلم ترک مسلم عوام کو ان کے صدیوں سے جمع شدہ علمی سرمایہ سے محروم کر دیا گیا۔ اس کا خوب زور شور سے ترقی اور اصلاح کے نام پر پروپیگنڈا کیا گیا۔ کیا یہی ضمیر کی مکمل آزادی تھی جو ترک مسلم پر تھوپی گئی۔

یہ سب کچھ بیسویں صدی کے نصفِ اول میں کیا گیا اور جمہوریت کے اس دور میں عوام کے مفاد آزادی ضمیر۔ افکار کے بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ ترکیہ میں ۲۸ سال تک مارشل لاء (سنہ ۱۹۲۲ء سے سنہ ۱۹۵۰ء) مسلط رہا۔ جہاں آبادی کی عظیم الشان اکثریت مذہب کے اعتبار سے اسلام پر ایمان رکھتی ہو اس پر جبر و تشدد کے ذریعہ سے یورپ کی ذہنی فکری معاشرتی غلامی مسلط کی گئی اور اسے باور کرایا جاتا رہا ہو کہ یہی ترقی ہے۔ یہی روشن خیال و لبرل ازم ہے۔ کیا اس صورت حال کو جو ترکیہ میں مسلط رہی ہے۔ اس کو جمہوریت کہہ سکتے ہیں؟ کیا اس عمل کو لبرل ازم کہا جا سکتا ہے؟ کیا اسی کو ترقی۔ رواداری۔ وسیع النظری اور وسیع الخیالی اور آزادئ عمل کہہ سکتے ہیں۔ کیا یہ ظلم و زیادتی۔ تنگ نظری و تعصّب نہیں ہے؟

کیا پاکستان کے ایک حصہ میں تشدد۔ لوٹ مار۔ قتل و غارتگری و راہزنی کو بھارت اور روسی سوشل سامراج کی حمایت حاصل نہیں تھی؟ کیا بنگلہ دیش کی حکومت بھارت اور روس کے معاہدہ کے بعد ان کے جارحانہ حملے کی حمایت کی وجہ سے عمل میں نہیں آئی تھی بنگلہ دیش نے جب بھارت اور روس کی سرپرستی میں بنگلہ لسانی قومیت۔ سیکولرازم جمہوریت اور سوشلزم کے سیاسی فلسفہ کو اختیار کیا تو کیا اس نے مشرقی پاکستان میں تشدد بربریت۔ سفاکی۔ رہزنی۔ قتل و غارت گری۔ لوٹ مار اغوا اور زنا بالجبر کا بازار گرم نہیں کیا؟ کیا یہ عدم تشدد کا مظاہرہ تھا؟ کیا یہ انسانی جان و مال و عزت و آبرو کا احترام تھا؟ کیا یہ اقوام متحدہ کے منشور کا احترام تھا؟ کیا یہی آزادی۔ وسیع النظری و وسیع الخیالی تہذیب و تہذیب یافتہ

حاشیہ صفحہ سابقہ

و متمدن قومیں بیسویں صدی کے ثلث آخر میں انسانیت اور عوام کے نام پر عوام کے مفاد میں عوام کو دے رہی ہیں۔؟

عہدِ جدید کے مورخین شاہ جہاں کی شریعت اسلامی کے نفاذ اور مندروں کے سلسلہ میں اس کی پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے ـــــ انگریزوں کی پالیسی اور ان کے نقطہ نظر اور انکی حمایت کردہ حکومتوں کی پالیسی پر بھی ایک طائرانہ نظر ضرور رکھیں۔ کہ آج بلند بانگ دعوؤں کے باوجود عام انسانوں کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔

آج کی غالب متمدن اور ترقی یافتہ قوموں کے بلند بانگ دعوؤں کے برعکس اسلام نے انسانی جان و مال کے احترام کا سبق ہی نہیں دیا بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل کر کے دنیا کے لیے ایک مثال بھی قائم کر دی ہے۔

۶۳۰ء بمطابق ۸ ہجری میں جب آپؐ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو اہل مکہ کے ساتھ جو فیاضی کا سلوک کیا۔ وہ تاریخ عالم میں اپنی قسم کی واحد مثال ہے۔ یہ مکہ وہی ہے جہاں آنحضرتؐ پیدا ہوئے اور زندگی کی (۵۳) ترپن بہاریں گذاریں۔ لیکن جب آپؐ نے اسلام کی دعوت پیش کی تو لوگ آپؐ کے اور مسلمانوں کے خون پیاسے ہو گئے اور آپ کو مع اپنے ساتھیوں کے گھر سے بے گھر اور وطن سے بے وطن ہو کر مدینہ میں آنا پڑا۔ یہاں بھی انہیں امن وامان سے نہ رہنے دیا گیا۔ جنگ بدر، جنگِ اُحد میں اہلِ مکہ نے ابوسفیان کی قیادت میں حملہ کیا۔ اور ابوسفیان کی بیوی ہندہ حضرت امیر حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبا جاتی ہے۔ لیکن جب ۸ ہجری یعنی ۶۳۰ء میں آپ غالب ہوتے ہیں اور فاتح ہو کر مکہ میں داخل ہوتے ہیں تو ابوسفیان کو کمال فراخ دلی اور عالی حوصلگی سے معاف کر دیتے ہیں اور ابوسفیان کے گھر کو دارالامن قرار دیتے ہیں۔ کیا تاریخ عالم سے اس فراخ دلی اور عالی حوصلگی کا کوئی اور واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے؟ کیا جان، مال عزت و آبرو کے تحفظ کا اس طرح کا کوئی واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے، دراصل اسلام نے آزادی۔ انسانی مساوات، انسانی عظمت، عزتِ نفس، خودداری کا درس دیا ہے اور یہ وہ درس ہے جو اللہ تعالےٰ نے آنحضرتؐ کی معرفت تمام بنی نوع انسان کو دیا ہے جس نے رنگ، نسل، زبان، امیر غریب جائے پیدائش کی کوئی قید نہیں اس کو کوئی حکومت سلب

۱۰۸۔ مسلمانوں پر مظالم کا خاتمہ :۔

اکبر کے عہد میں الحاد و بے دینی کی جو سرپرستی ہوئی اور جہانگیر کے عہد میں جو چشم پوشی ہوئی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمانوں اور شعائر اسلامی کے دشمن اس قدر جری اور نڈر ہو گئے تھے کہ وہ اعلانیہ مسلمانوں کے عزت و آبرو پر حملہ کرتے تھے۔ گجرات میں کچھ بت پرست مسلمان عورتوں اور کنیزوں کو اپنے تصرف میں رکھے ہوئے تھے اور بعض کفار نے تو اس سے بڑھ کر مسجدوں کو اپنے گھروں میں شامل کر لیا تھا۔ چنانچہ شاہ جہاں کے پاس اس کی شکایت پہنچی تو اس معاملہ کی تحقیقات کے لیے اس نے شیخ محمود گجراتی کو مقرر کیا اور حکم دیا کہ اگر یہ شکایت درست ہو تو مسلمان عورتوں اور کنیزوں کو ان کے گھروں سے مسجدوں کو ان کے گھروں سے جدا کیا جائے۔ چنانچہ بکثرت مسلمان عورتوں اور کنیزوں کو کافروں کے تصرف سے نکال کر پرہیزگار اور پارسا اشخاص کے سپرد کیا گیا اور کئی مسجدیں جو ان کے قبضہ میں تھیں ان سے واگذار کرائی گئیں۔ [1]

معلوم ہوا کہ یہ صورت حال گجرات ہی میں نہیں، پنجاب میں بھی ہے اس پر یہ حکم دیا کہ جہاں جہاں یہ صورت ہو شرعی معاملات کے کارپرداز اور ملکی و مالی امور کے کارکن خوب تحقیق و تفتیش کے بعد مسلمان عورتوں اور مسجد کی اراضی کو کفار کے قبضہ سے نکال کر مسلمانوں کے حوالے کریں۔ اس فرمان کے نتیجہ میں چار سو ہندو بخوشی

---

[1] عمل صالح جلد دوم ص ۵۲۔

حاشیہ صفحہ سابقہ :۔ نہیں کر سکتی، کیونکہ یہ اللہ تعالے کا عطیہ ہے۔ یہ کسی حکومت کسی شخص کا عطیہ نہیں ہے۔ اسلام سے زیادہ تو درکنار اسلام سے قریب تر بھی کوئی اور دوسرا فلسفہ حیات انسان کو آزادی، مساوات اور اخوت کا عملی سبق پیش نہیں کرتا۔ شاہ جہاں جو پیدائش کے اعتبار سے ایک ہندو راجپوت شہزادی کے بطن سے تھا، جب اسلام کی تعلیمات سے اس کے دل و دماغ میں جلا پیدا ہوئی تو اس نے اپنی حکومت کی پالیسی اسلام کی سمت موڑی اور عوام کو اسلام کی برکات سے آگاہ کرنا شروع کیا۔

مسلمان ہو گئے اور کلمہ طیبہ پڑھا۔ کفار کے قبضہ سے تین مسجدیں واگذار کر کے ان میں اذان اور نماز کو رواج دیا گیا اور تین بت خانوں کو ڈھا کر ان کی جگہ مسجدیں و خانقاہیں تعمیر کی گئیں لے

سرہند (جون ۱۶۳۷ء) سے شکایت آئی کہ ایک ہندو دلیپ نے نشۂ دولت اور خمارِ کفر کے جوش میں ایک مسلمان مرد اور چھ مسلمان عورتوں کو اپنے گھر میں قید کر رکھا ہے ان کے ہندوانی نام رکھ دیے ہیں اور جبراً ان سے بت پرستی وغیرہ کرواتا ہے۔ ان بدنصیبوں میں ایک عورت زینب تھی جس کا نام گنگا رکھ دیا تھا۔ اس سے ایک لڑکا بھی تھا۔ تحقیق سے یہ شکایت ثابت ہو گئی۔ اس کو عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا اور اس سے کہا گیا کہ وہ اسلام لائے تو اس کے تمام جرم معاف ہو سکتے ہیں۔ ورنہ بصورت دیگر سزا کا مستحق ہو گا۔ وہ اسلام نہیں لایا اس لیے اس کو عبرتناک سزا دی گئی۔ ایک اور شخص جس نے کلام اللہ کی بے حرمتی کی تھی۔ ثبوت ملنے پر اس کو سزا دی گئی۔ ۲ے

یہ تمام اقدامات تادیبی کارروائی کا نتیجہ تھے۔ شاہ جہاں نے جب شریعتِ اسلامی کو اپنی مملکت کی پالیسی قرار دیا تو وہ حضرات جنہیں اکبر اور جہانگیر کے عہد میں مسلمانوں کی آبرو اور شریعتِ اسلامی کی توہین کرنے کی کھلی آزادی حاصل تھی وہ شاہ جہاں کے سخت خلاف ہوئے اور انہوں نے اپنے غیض و غضب اور نفرت و دشمنی کا نشانہ عام مسلمانوں کو بنایا۔ ان کی عورتوں کی بے حرمتی کی۔ مسجدوں کو گھر بنایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اشتعال انگیز الفاظ استعمال کر کے مسلمانوں کی دل آزاری کو شعار بنا رکھا۔ شاہ جہاں کو ظالمانہ حرکتوں سے باز رکھنے کے لیے ان کے خلاف سخت تادیبی اقدام کرنے پڑے۔

لے عملِ صالح جلد دوم ص ۵۲۔

۲ے عملِ صالح جلد دوم ص ۵۲۔ ۲۰۰۔ ۲۰۱۔

۱۰۹۔ اسلام قبول کرنے کی ترغیب دینا۔

شاہ جہاں خود ایک ہندو راجپوت شہزادی کے بطن سے تھا۔ اور اس کے باپ کی ماں بھی ہندو راجپوت شہزادی تھی اس لیے اس نے ہندو ماں کی آغوش میں آنکھ کھولی آنکھ کھولتے ہی اکبر کے الحادی اور کافرانہ ماحول و فضا میں اس کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ جوانی میں جہانگیر اور نور جہاں کا منظور نظر رہا جس کو صرف شراب اور اپنی ذات سے دلچسپی تھی۔ اس لیے شاہ جہاں پیدائش، ماحول، فضا و تعلیم و تربیت سے اسلامی نظریات کا حامل نہیں ہوا۔ بلکہ اپنے عہد کی احیاءِ اسلام، احیاءِ سنت نبوی علی صاحبہا کی تحریک سے متاثر ہوا جس کے روح رواں شیخ احمد سرہندی (حضرت مجدد الف ثانی) ۱۵۶۴ء تا ۱۶۲۴ء بمطابق ۹۷۱ھ تا ۱۰۳۴ھ) تھے۔ اس کے ذہن و فکر اور تصورات میں انقلابی تبدیلی نظر آتی ہے۔ جو اکبر و جہانگیر کے فکر و نظر اور تصورات سے قطعی مختلف ہیں۔ اس کا عمل و کردار، مشاغل، صورت و شکل تبدیل ہو جاتی ہے حکمران ہونے کے بعد یکسر اپنی مملکت کی پالیسی اسلام کے تابع کرنا چاہتا ہے اس لیے اسلام کی دولت جو اس نے محض پیدائش کی بنا پر حاصل نہیں کی تھی بلکہ اپنی سلامتی فکر اور شعور کے نتیجے میں اسے صراطِ مستقیم سمجھ کر اپنایا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس "حق اور صراطِ مستقیم" سے دوسروں کو بھی روشناس کرے۔ چنانچہ بادشاہ ہونے کے بعد تبلیغ و ترغیب کے ذریعہ عام لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتا تھا۔ یہاں تک کہ جو کفار اپنے جرم کی وجہ سے واجب القتل ہوتے انہیں بھی اسلام کی دعوت دیتا اگر وہ اسلام قبول کر لیتے اور دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاتے تو نہ صرف ان کے جرائم معاف کر دیتا بلکہ انہیں انعام و اکرام بھی دیتا تھا۔ اس طرح کثرت سے کفار مسلمان ہوتے۔

شاہ جہاں کی ترغیب سے راجہ راج سنگھ کا بیٹا راجہ بختاور مسلمان ہو گیا تو اس کی تالیفِ قلب کے لیے اسے خلعت اور دس ہزار روپیہ کے انعام سے سرفراز کیا۔ [۱]

---

[۱] عمل صالح حصہ اول ص ۵۸۱۔

اسی زمانے میں راجہ رام سنگھ کا پوتا پرشوتم سنگھ ہدایتِ آسمانی و توفیقِ الٰہی کی بدولت وادیٔ گمراہی سے نکل کر شاہراہ ایمان پر آگیا۔ شاہ جہاں نے اس کا نام سعادت مند رکھا اور خلعتِ خاصہ اور ہزار روپیہ انعام دیا۔ ۱؎

راجہ جوکوئی جو بسنبر کا راجہ تھا وہ شاہ جہاں کی ترغیب سے اپنے تمام اہل و عیال اور قبیلے کے افراد کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوا جس کی تعداد تقریباً پانچ ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ اس سے شاہ جہاں بہت ہی خوش ہوا اور اسے راجہ دولت مند کا خطاب دیا ۲؎

ہگلی بندر کے فرنگی قیدیوں کو جو مرد ، بچے ، عورت مل کر تقریباً (چار سو) افراد تھے۔ انہیں قاضی اور میر عدل نے شاہ جہاں کے حسب الحکم کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت پڑھایا جن لوگوں نے خوشی خوشی سچے دل سے کلمہ پڑھا انہیں شاہ جہاں نے طرح طرح کی نوازشوں سے نوازا اور انہیں وظیفہ بھی دیا۔ ۳؎

صوبہ پنجاب میں شرعی معاملات کے کارپردازوں کی کوششوں سے تقریباً (چار سو) ہندوؤں نے بخوشی کلمہ طیبہ پڑھا اور سچے دل سے مسلمان ہو گئے۔ ۴؎

بکرماجیت (جنوری ۱۶۳۶ء) کا ولی عہد ہردجن سال اور اس کا چھوٹا بھائی درگ بھال بھی شاہ جہاں کی ترغیب سے مسلمان ہو گئے۔ شاہ جہاں نے اوّل الذکر کا نام علی قلی رکھ کر غلامان خاصہ کے ذیل میں فیروز خان کے سپرد کیا اور دوسرے کا نام اسلام قلی رکھا اور معتمد خان کے حوالہ کیا اور عورتوں کو کلمہ شہادت پڑھا کر شاہی محل میں جگہ دی گئی۔ ۵؎

۱۱۰۔ ہندو شہزادیوں کو مسلمان کر کے شادی کرنا۔

اکبر نے جنوری ۱۵۶۲ء میں راجہ بہاری مل کی لڑکی کو قبول کیا اور اس کو اپنے

۱؎ عمل صالح حصہ اول ۵۸۳ ۲؎ عمل صالح جلد دوم ص ۵۱

۳؎ عمل صالح حصہ اول ص ۵۰۵،۵۰۴ ۴؎ عمل صالح جلد دوم ص ۵۲

۵؎ عمل صالح جلد دوم ص ۱۲۴ ارخانی خان ص ۱۱۵۔

حرم میں رکھا جو مریم زمانی کے نام سے مشہور ہوئی اور اسی کے بطن سے جہانگیر پیدا ہوا۔ [1]
اور جہانگیر نے متعدد راجپوت شہزادیوں سے شادی کی۔ ان میں سے ایک جگت گوسائیں (جو دھابائی JODHABAi) جو راجہ اودے سنگھ کی لڑکی تھی اس کے بطن سے خرم (شاہ جہاں) ۵ جنوری ۱۵۹۲ء کو پیدا ہوا۔ خرم ہی شاہ جہاں کے نام سے ۱۶۲۸ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کی جہانگیر ہی نے اپنی مرضی سے یکے بعد دیگرے تین مسلمان لڑکیوں سے شادی کی تھی۔ اس کے حرم میں نہ تو کوئی راجپوت شہزادی تھی اور نہ ہی کنیزوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ [2] اس طرح اس کی عائلی زندگی بہت ہی پاک صاف تھی اکبر و جہانگیر کی تقلید کرتے ہوئے (۱۵۶۲ء تا ۱۶۲۸ء) مسلمان اور ہندوؤں میں کثرت سے شادیاں ہوتیں، جو شریعتِ اسلامی کی رو سے درست نہیں تھیں شاہ جہاں نے اس دستور کو ختم کیا اور جن ہندو شہزادیوں کی مسلمانوں سے شادیاں ہوئیں انہیں پہلے کلمہ طیبہ پڑھا کر مسلمان کیا گیا۔ اور بعد میں شادیاں کی گئیں۔ اس طرح یہ ایک بہت ہی انقلابی و اصلاحی قدم تھا جس سے معاشرہ میں پاکیزگی پیدا ہوئی۔ چنانچہ راجہ پرتاب محل جب بغاوت میں مارا گیا۔ اور اس کی رانی گرفتار ہوئی تو وہ کلمہ طیبہ پڑھ کر مسلمان ہو گئی تو عبداللہ فیروز جنگ نے اپنے پوتے کے ساتھ شادی کر دی۔ [3]

شاہ جہاں نے خود اپنی محلسرا میں بلا کر اپنی زبان سے راجہ امر سنگھ کی بیٹی کو کلمہ طیبہ پڑھوایا اور دو ماہ کے بعد ۱۳ مئی ۱۶۵۴ء کو شریعتِ اسلامی کے تمام اصول کے ساتھ دو لاکھ روپیہ کے مہر کے ساتھ اپنے پوتے سلیمان شکوہ کے عقد میں دے دیا۔ [4]

---

[1] S.R. SHARMA - THE ERESCENT IN 9NDIE - PP. ۳۲۶، ۴۲۴، ۴۲۷

[2] S.R. SHARMA - THE ERESCENT IN 9NDIE - PP ۴۲۴، ۴۲۷

[3] عملِ صالح جلد دوم ص ۱۹۵ ، خافی خاں حصہ دوم ص ۱۳۵۔

[4] عملِ صالح جلد دوم ص ۶۲۷۔

شاہ جہاں کا یہ عمل اور پالیسی اکبر و جہانگیر کے برعکس تھا اور ہندو شہزادیوں کو مسلمان کر کے شادی کرنا شریعت کے مطابق تھا۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو مسلم کی شادی کی ہمت شکنی ہوئی اور شریعت کے مطابق کی شادیوں کی ہمت افزائی ہوئی۔ اس طرح شریعت سے انحراف کی جس پالیسی پر اکبر اور جہانگیر کاربند رہے۔ شیخ احمد سرہندی رح کی تحریک احیاء شریعت کی جدوجہد کے نتیجے میں اکبر کے پوتے اور جہانگیر کے بیٹے کے ہاتھوں ختم ہوتی ہے اس طرح معاشرے میں پاکیزگی اور ستھرائی کا چلن شروع ہوتا ہے۔ اور شریعت سے انحراف کا دور ختم ہوتا ہے۔

۱۱۱۔ کافرانہ اور مشرکانہ رسوم کو ختم کرنا۔

بہت سے غیر مسلم اپنی سلامتی طبع کی وجہ سے مسلمان ہو گئے تھے لیکن اسلام اور سنّت نبوی کی تعلیمات سے ناواقف تھے اس لیے ان میں مشرکانہ عادتیں و رسوم عام تھیں۔ بھمبر اور اس کے نواح کے اکثر باشندے مسلمان ہو گئے تھے اور مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود کفار سے رشتے ناتے کرتے تھے۔ اب تک یہ دستور تھا کہ کفار کی جو لڑکیاں مسلمانوں کے عقد میں ہوتیں انہیں مرنے کے بعد اسلام کے طریقہ پر دفن کیا جاتا۔ لیکن جو مسلمان لڑکیاں ہندوؤں کے گھروں میں چلی جاتیں انہیں وہ مرنے کے بعد اپنے قاعدے کے مطابق جلاتے۔ یہ سراسر کافرانہ اور مشرکانہ رسم تھی جو صریحاً اسلام کے خلاف تھی۔ اس لیے شاہ جہاں نے حکم دیا کہ قرآن پاک کا حکم جو سرکار رسالت مآب کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے اس کو عام کیا جائے اور یہ فرمان نافذ کیا کہ اگر مسلمان عورت کسی کافر کے گھر میں ہو تو اس کافر کو مسلمان ہونے کی ترغیب دی جائے اور وہ مسلمان ہو جائے تو شریعت کے مطابق نکاح پڑھوا کر انہیں رہنے دیا جائے۔ اس نو مسلم کو دربار میں پیش کیا جائے تاکہ اس کو عنایتوں سے سرفراز کیا جائے۔ لیکن اگر وہ شخص اسلام لانے اور اس سعادت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو اس کی حیثیت کے مطابق جرمانہ کر کے مسلمان عورت کو اس کے گھر سے

نکال لیں۔ شاہ جہاں کے اس حکم سے لوگ اسلام کی تعلیم سے متعارف ہوئے اور ہزاروں کافر مسلمان ہو گئے۔ جن پر طرح طرح کی عنایتیں کی گئیں۔ یہ واقعہ سن کر راجا جوگو ہی نے بھی اسلام قبول کیا اور اپنے عقیدے سے تائب ہوا۔ اس کی دیکھا دیکھی اس کے رشتہ دار اور قبیلے کے لوگ بھی دین متین اور شرح متین کے دائرے میں داخل ہوئے۔ شاہ جہاں نے ان لوگوں کو اسلام کے عقائد اور روزے۔ نماز کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک عالم کو متعین کیا تاکہ وہ اسلام کی تعلیمات سے روشناس کرائے۔ [۵۱]

شاہ جہاں کے اس فرمان کے ذریعہ معاشرہ میں اسلامی تعلیمات کو فروغ ہوا۔ وہ رسوم و رواج جو کافرانہ تھیں ان کو تعلیمات اور قانون کے ذریعہ ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور اسلامی رسوم اور رواج کی ہمت افزائی کی گئی۔

۱۱۲۔ خلفاء راشدہ کا احترام :۔

شاہ جہاں نے تخت نشین ہوتے ہی اشرفی کے جو سکّے جاری کیے تھے اس پر خلفاء راشدین کے نام درج تھے[۵۲]۔ یہ اس بات کا اقرار، اظہار اور اعلان تھا کہ شاہ جہاں اور اس کی حکومت ان بزرگان دین کا احترام کرتی ہے۔ اور ان کی عظمت و بلندی کو تسلیم ہی نہیں کرتی بلکہ اپنے عمل کے جواز میں خلفائے راشدین کے اتّباع کو بطور سند پیش کرتی ہے اور انہیں بزرگان دین کی سنّت کو حاکمیت حاصل ہے اور حکومت اس کے نفاذ کی ذمہ دار ہے۔ چنانچہ جب شاہ جہاں کو یہ اطلاع ملی کہ والی بیجاپور اور گولکنڈہ دونوں نے ہی ایسے طریقے اور پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ جس سے فتنہ پردازیاں عام ہو رہی ہیں اور سب سے بری حرکت جو ان سے سرزد ہو رہی ہے کہ وہ بدزبان اور بیہودہ لوگوں کو بدزبانی اور بدکلامی کی اجازت دے رہے ہیں۔ ان کی مسجدوں میں خطبات میں اصحاب کبار کا نام نہیں پڑھا جاتا۔ بلکہ انہیں برا بھلا کہا جاتا ہے اس لیے

---

۵۱ عمل صالح جلد دوم ص ۵۱۔۵۲ و خافی خان حصہ دوم ص ۹۹۔

۵۲ عمل صالح جلد اول ص ۲۱۱ تا ۲۳۸ و خافی خان حصہ دوم ص ۱۹۔

شاہ جہاں نے کرامت خاں کو عادل خان والئ بیجاپور اور عبداللطیف کو قطب الملک والئ گولکنڈہ کے پاس روانہ کیا۔

شاہ جہاں نے (۱۲ ربیع الاول ۱۰۴۶ھ بمطابق ۱۴ اگست ۱۶۳۶ء) ایک فرمان والئ گولکنڈہ کے نام ارسال کیا جس میں نہایت ہی عزّت۔ احترام و محبّت سے مخاطب کر کے عزم و یقین و کامل کے ساتھ اپنی پالیسی، مسلک اور مقاصد و نصب العین کی وضاحت کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "ما بدولت بادشاہِ اسلام ہونے کی حیثیت سے حضرت سیّد المرسلین علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے دینِ متین کو رواج دینے والے اور مذہب اہل سنّت والجماعت کی تائید کرنے والے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمارا فرض ہے کہ اپنی قلمرو میں شریعتِ اسلام کے احکام جاری کریں اور بدعت و گمراہی کا خاتمہ کریں۔ اطلاع ملی ہے کہ ریاست میں اعلانیہ خلفاء راشدین کو برا بھلا کہا جا رہا ہے۔ حالانکہ صحاح ستّہ اور تاریخ کی کتابیں ان بزرگانِ دین (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کی شان اور مرتبے کی بلندی کی شہادت دیتی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بزرگ رسولِ پاکؐ کے رشتہ دار ہونے کی بدولت ظاہری و باطنی خوبیوں کا مجموعہ ہیں۔ افسوس کہ شوکت پناہ ان بدعتوں کو نہیں روکتا اور بدگوئیوں کی سزا نہیں دیتا۔ لہٰذا از راہِ ہدایت ہم یہ حکم دیتے ہیں کہ جس طرح ممکن ہو اپنے ملک سے اس بیہودہ رسم کو اٹھا دیں۔ کوئی بدبخت اس امرِ قبیح کا مرتکب ہو تو اسے لازماً سزا دیں۔ اگر امارت پناہ نے ایسا نہ کیا تو ہم سمجھیں گے کہ وہ ان باتوں سے خوش ہیں۔ اس صورت میں ہم پر واجب ہو گا کہ آپ کی ریاست پر قبضہ کر لیں۔ باشندوں کا مال چھین لیں اور ان کا خون بہانا جائز سمجھیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ شاہِ ایران کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا ہے۔ جب آپ ہماری مریدی کا دعویٰ کرتے ہیں تو شاہِ ایران سے آپ کا کیا واسطہ مناسب یہ ہے کہ بعد ازاں خطبے میں شاہِ ایران کا نام نہ لیا جائے۔ بلکہ ہمارے نام نامی اور القاب گرامی کا خطبہ پڑھا جائے۔

والئ گولکنڈہ قطب الملک نے شاہ جہاں کے سفیر کا شاندار استقبال کیا۔ فرمان

اور تبرک کو سر پر رکھا اور ملا لطیف کی بہت تعظیم کی ضیافت اور سواری کا اہتمام کر کے عزت افزائی کی۔ ابتدا میں تو امیروں، سرداروں کے صلاح کے مطابق احکام شاہی کی اطاعت بد عنوانیوں کو چھوڑنے اور اپنے اسلاف کرام کے طریقے اختیار کرنے سے گریز کرتا رہا۔ لیکن غور و فکر کے بعد اطاعت و وفاداری کا اظہار کیا۔ پر وقار القاب و آداب کے ساتھ کمال عقیدت کے ساتھ یہ اقرار کیا کہ۔

"اپنے ملک میں تمام عیدوں پر خطبے میں خلفائے راشدین ائمہ طاہرین اور حضرت خلافت پناہی کا نام نامی پڑھا جائے گا۔ سابقہ دستور ہرگز جاری نہیں رہے گا۔

روپے اور اشرفی پر ہونے کے مطابق ظل سبحانی کے نام کا سکہ ثبت کیا جائے گا اس قول و اقرار اور وعدہ کو ایفا کرنے کے لیے مولانا عبداللطیف کے سامنے کلام اللہ پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ اس وعدہ اور قول و اقرار کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کرے گا[1]

گولکنڈہ اور بیجاپور کے والی چونکہ شیعہ تھے۔ اس لیے شاہ جہاں کے حملہ کو افتراق بین المسلمین کے حامی شیعہ و سنی مسئلہ قرار دیتے ہیں اور شیعہ و سنی میں اختلاف پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ شیعوں اور سنیوں کے بنیادی تصورات اور عقائد میں کوئی اختلاف نہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے اور قرآن شریف کے کلام اللہ ہونے اور روز آخرت پر اتفاق ہے اس لئے شاہ جہاں کو تمام اتحاد بین المسلمین کے حامی سنیوں اور شیعوں کی حمایت حاصل رہی ہے اس کے سب سے مقتدر و باثر امرا آصف خان اور مہابت خان دونوں شیعہ مسلک ہی کے حامل تھے اور روز اول سے شاہ جہاں کے ساتھ تھے بلکہ تخت و تاج دلانے میں سب سے اہم رول ادا کیا تھا اس لیے شاہ جہاں نے ان دونوں کے منصب و اعزاز میں اضافہ۔ گراں قدر القاب و خطاب دیے[2]۔ دوسری اہم مہم میں جن امراء نے

[1] عمل صالح جلد دوم ص ۱۲۱ تا ۱۵۵ اور عیز و خافی خان حصہ دوم ص ۱۱۲ تا ۱۲۹ و غیر

[2] عمل صالح جلد اول ص ۱۸۳۔ ۱۹۲۔ تا ۲۰۵۔ ۲۳۹۔ ۲۴۴۔ و خافی خان حصہ دوم ص ۱۹

شجاعت و دلیری دکھائی ان میں سید خاں جہاں و سپہدار خان امراء شریکِ جنگ تھے۔ ان لوگوں کی بہادری۔ شجاعت اور دلیری کی "شاہ جہاں نامہ" المعروف عملِ صالح کے مصنف نے ان الفاظ میں تعریف کی ہے۔ اوّل الذکر چونکہ "شیر خدا۔ علی مرتضیٰ کی نسل سے تھا۔ اس لیے شجاعت و دلیری ورثے میں پائی تھی۔ مولا علیؓ کی دلاوری کا نمونہ تھا ثانی الذکر یعنی سپہدار خان کے بارے میں یہی مصنف کہتا ہے کہ مولائے علی مرتضیٰ شیرِ خدا شاہ لافتیٰ کی نسل سے تھا اور ان کی مروّت اور جوانمردی کا وارث ہے۔[۱] اس لیے یہ کہنا اور الزام عائد کرنا کہ شاہ جہاں نے دکن پر اس لیے حملہ کیا کہ وہ شیعوں کا مخالف تھا۔ اور کٹر سنی العقیدہ مسلمان حکمران تھا۔ تاریخی واقعات و حقائق کے خلاف ہے وہ صرف ایک مسلمان حکمران تھا۔ جو الحاد و کفر کا دشمن تھا۔ اور مسلم قومیت کا علمبردار تھا۔ جس کے اتحاد و اتفاق کی بنیاد شریعتِ اسلام کا نفاذ اور غلبہ تھی۔

۱۱۳۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ :۔

بعض لوگ اپنی کمزوریوں۔ کوتاہیوں۔ لغزشوں اور خود غرضیوں اور حق کے ساتھ باطل کے امتزاج کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ منسوب کرتے ہیں اور حضرت علی رضی ہی کی آڑ لے کر خود وہ کچھ کرتے ہیں جو حضرت علیؓ کی عظمت پر ایک دھبہ ہے۔ ایک بار علماء۔ فضلاء۔ شاعرانِ باکمال شاہ جہاں کے ساتھ مختلف موضوعات پر گفتگو کر رہے تھے اس وقت ایک خدا رسیدہ عارف نے جو صاحب علم و فضل بھی تھے کہا کہ "جناب علی مرتضیٰ کا قول ہے کہ دنیا دو ستونوں پر قائم ہے۔ ایک حق، دوسرا باطل۔ دونوں کے امتزاج سے دنیا کے کام چلتے ہیں۔ میں نے چاہا تھا کہ دنیا کے کام صرف حق پر ہوں اور حق پرستی کے ذریعہ انجام دوں لیکن معاملہ ٹھیک نہیں ہوا۔ حضرت علیؓ کے اس قول کی معرفت باطل کی آمیزش کے لیے ایک جواز پیدا کیا گیا اور بعض لوگ تو اپنے مسلک اور عمل کا حضرت علیؓ کے اس قول ہی سے جواز پیدا کرتے ہیں۔ لیکن شاہ جہاں اس سے متفق

---

[۱] عملِ صالح جلد دوم ص ۴۴۱-۶۴۱-۹۷۱-

نہیں ہوا اور کہا کہ مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ کے اس قول سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السّلام کے زمانے سے لے کر جناب علی مرتضیٰ کے وقت تک حق کے ساتھ باطل کا وجود بھی شامل رہا ہے۔ لیکن یقیناً ان حضرات کی مراد ہرگز یہ نہ ہوگی۔ حاضرین سے بعض دانشوروں نے اس مقولہ کی مختلف تاویلیں پیش کیں۔ شاہ جہاں نے کہا کہ میرے نزدیک اس کی تاویل یہ ہے کہ حضرت خاتم النبیینؐ کے زمانے میں سب کاموں کی بنیاد صداقت پر تھی تمام امور حق کے مطابق انجام پاتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ سرکارِ رسالت کی ذات بابرکت کو قدم قدم پر پروردگار کی حمایت حاصل تھی۔ ان کی ذاتِ والاصفات کے سبب ہر شخص سچائی اور حق پرستی و حق اندیشی پر مائل تھا۔ باطل سے سروکار ہی نہ تھا حضرت کی صفائے فطرت اور پاکیزہ باطنی کے سبب ہر مسلمان کا دل نورانی تھا۔ صدق و خلوص سے آشنا تھے۔ باطل سے گریزاں تھے۔ لہٰذا تمام باتوں کی بنیاد حق پر قائم رہتی تھی۔ ان کی برکت سے یہ صورت خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی قائم رہی۔۔۔۔۔۔

۔۔۔ جب حضرتؐ نے اس دنیا سے پردہ فرمایا تو جوں جوں وقت گذرتا گیا۔ باطل کا اثر بڑھتا گیا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ بعض ظالموں نے حضرت ذوالنورینؓ کو شہید کیا۔ حق کی بنیاد میں خلل آگیا اسی لیے جناب امیرؓ جو چاہتے تھے وہ پورا نہ ہوا اور نہ ان کی تجاویز بروئے کار نہ آسکیں[۱]۔ شاہ جہاں کی حضرت امیرؓ کے بارے میں اس تاویل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حق کے ساتھ باطل کی آمیزش کو پسند نہیں کرتا اور کوئی ایسی بات حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منسوب کرنا پسند نہیں کرتا۔ جس سے ان کی عظمت و بزرگی میں ذرہ برابر بھی فرق آتا ہو اور ان تمام لوگوں کے لیے اعتدال و حق کی تعلیم دیتا ہے۔ جو افراط و تفریط سے دامن بچا کر اسلام کی صراطِ مستقیم پر چلنا اور خلفاءِ راشدہ کی اتباع کرنا چاہتے ہیں۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب تک حکمرانوں میں خود اعتمادی جرأت، عزیمت رہی ہے۔ وہ حضرت علیؓ کے نقش قدم پر چلتے رہے ہیں۔ اور یہ ان کے مقدس اور محترم نام کو اپنی کوتاہیوں، کمزوریوں کے لیے بطورِ ڈھال استعمال

---

[۱] عملِ صالح جلد دوم ص ۱۹۰-۱۹۱ و خافی خان حصہ دوم ص ۱۲۳۔

نہیں کیا۔

۱۱۴۔ سکندر اعظم :۔

ایک بار محفل خاص میں جس میں ہر ملک کے دانشور موجود تھے اور ہر شخص اپنے علم وفضل کے مطابق مختلف موضوعات پر گفتگو کر رہا تھا۔ دوران گفتگو ایک امیر نے سکندر اعظم کی تعریف میں بہت مبالغہ کیا۔ یہاں تک کہا کہ سکندر کو وفات پائے سینکڑوں سال گزر چکے ہیں، آج تک کسی عاقل و دانش مند کو اس کے کسی قول و فعل پر اعتراض کرنے کی مجال نہیں ہوئی۔ شاہ جہاں نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور کہا کہ سکندر ابن فیلقوس یونانی جسے بعض اشخاص پیغمبر سمجھتے ہیں اس کی نبوت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ معتبر تاریخ دانوں کے نزدیک سکندر ذوالقرنین مختلف شخص ہے۔ شاہ جہاں نے احترام کے ساتھ سکندر فیلقوس کی گفتار و کردار پر دو اعتراض کیے۔ ایک تو جب دارا کا قاصد اس کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ اپنے والد مرحوم فیلقوس کی طرح آپ بھی سالانہ خراج طلائی بیضوں کی شکل میں ادا کریں تو سکندر نے جواب دیا کہ سونے کے انڈے دینے والی مرغی تو رخصت ہوئی۔ یہ واقعہ معتبر تاریخوں اور سیرتوں میں درج ہے اور زبان زد خاص و عام ہے۔ ہمارے نزدیک سکندر نے یہ بات کہہ کر اپنے باپ کی سخت بے ادبی کی۔ کیونکہ مرغی بہت ادنیٰ مخلوق ہے۔ اور بیضہ (انڈہ) دینا مادین (مادہ) کا کام ہے نر کا نہیں۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ سکندر کا سفیر کے بھیس میں نوشابہ کے دربار میں جانا حزم واحتیاط کے طریقے کے خلاف تھا۔ داناؤں کو ایسے فعل کا ارتکاب ہرگز زیب نہیں جس سے پشیمانی حاصل ہو اور تدارک نہ ہو سکے۔[۵۱]

شاہ جہاں کے یہ دو اعتراض بہت ہی معنی خیز اور وزنی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و خلفائے راشدین کی اتباع و اطاعت نے اسے تقلیدی ذہانت اور مرعوبانہ تصورات سے آزاد کرایا تھا۔ وہ یونان کے فکر و فلسفہ اور سکندر اعظم کے قول و فعل

---

۵۱ عمل صالح جلد اول ص ۴۸۴ و خافی خان حصہ دوم ص ۱۳۲۔

کا ذہنی و فکری غلام نہیں تھا۔ اس میں تخلیقی ذہانت۔ آزادانہ فکر و نظر کا داعیہ موجود تھا جس کا اظہار حکومت کے معاملات میں ہوتا ہے۔ یہ دراصل حضرت شیخ عبدالحق محدث (۱۵۵۱ء تا ۱۶۴۲ء) کی درس و تدریس اور قلمی جہاد اور حضرت شیخ احمد سرہندی (۱۵۶۴ء تا ۱۶۲۴ء) کی علمی و عملی تحریک احیاءِ شریعت کا لازمی نتیجہ تھا۔ کہ اکبر و جہانگیر (۱۵۵۶ء تا ۱۶۲۷ء) کے دور کی تقلیدی ذہانت اور فکری مرعوبیت دم توڑ رہی تھی اور شاہ جہاں کی شکل میں خود اعتمادی و فکری آزادی جنم لے رہی تھی۔ اور یہی فکری و علمی تحریک تھی جو عالمگیر کے دور میں (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) کر اپنے عروج کو پہنچی۔ لیکن جب اٹھارویں صدی میں زوال شروع ہوا تو سیاسی ہزیمت کے ساتھ فکری مرعوبیت بھی پیدا ہوئی۔ نظام دکن نے جب ۱۷۹۷ء میں لارڈ ولزلی کے ہاتھوں SUBSIDIARY SYSTEM قبول کیا اور اپنی آزادی عزتِ نفس۔ خودداری فروخت کر کے پروانہ غلامی خرید اور اپنے نفس کو تسکین دینے کے لیے بلند بانگ خطاب "ارسطو جاہ۔ افلاطونِ زماں۔ سکندرِ دوراں اور حشمت دارا"، کا خطاب حاصل کیا تو سیاسی اور ذہنی مرعوبیت کے دور کا آغاز ہوا۔

۱۱۵۔ قحط اور نمازِ استسقاء:۔

برسات کے موسم میں وقت پر بارش نہ ہونے سے غلّہ بہت گراں ہو گیا تھا۔ اس لیے خاص و عام سبھی اس خوف میں مبتلا تھے کہ کہیں قحط نہ پڑ جائے۔ چنانچہ اسلام کی ہدایت کے مطابق عالموں۔ فاضلوں۔ عابدوں اور زاہدوں کے مشورے سے نمازِ استسقاء کے لیے جنگل میں گئے اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں دعا کی۔ اللہ تعالےٰ نے اس نیک کردار بادشاہ اور حضرت محمد مصطفیٰؐ کی امّت کے عالموں اور فاضلوں کی دعا قبول کی۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے خوب بارش ہوئی۔ قحط کا خوف جاتا رہا اور لوگوں کو اچھی فصل کی امید بندھی اور شاہ جہاں کی دینداری کا رتبہ ہندوستان کے کافروں تک معلوم ہو گیا کہ بادشاہ کس قدر دیندار ہے اور اس کی دعائیں بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہیں۔[۱]

۱؎ عملِ صالح جلد دوم ص ۲۰۴ و خافی خاں حصہ دوم ص ۱۳۵-۲۶۵۔

۱۱۶۔ دن رات کی گھڑیوں کے تعیّن کا نیا آئین :۔

شاہ جہاں کی تخلیقی ذہانت اور اجتہاد پسند طبیعت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ ہندی منجم داں کی وضع کردہ گھڑیوں کو جاری رکھا جائے۔ چنانچہ اس نے اس کو ترک کیا اور الہام ربانی کے بموجب ایک اور قاعدہ مرتّب کیا جس سے نمازِ فجر اور نمازِ مغرب کا وقت بھی سنّت کے مطابق مقرر ہوا۔ اس مقصد کے لیے یہ طے کیا کہ طلوعِ آفتاب سے پہلے کی ڈیڑھ گھڑی اور غروبِ آفتاب کی نصف گھڑی کو ہندی نجومیوں کی طرح رات میں شمار کرنے کے بجائے دن کی گھڑیوں میں محسوب کیا جائے۔ اس سے شاہ جہاں نے دن رات کے تعیّن میں ہندو نجومیوں کے جو اثرات و غلبہ تھا اس کو دور کیا۔ اس طرح دن رات کے تعیّن میں ایک نیا آئین مقرر کیا جو مسلمانوں کا اپنا اخذ کردہ آئین تھا[۱]

۱۱۷۔ عورت اور قرآن پاک :۔

عورت تاریخ میں بہت مظلوم رہی ہے۔ ہمیشہ دلفریب اور خوش کن لغزوں سے اسے "رنا عورت" بنانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اکبر نے مینا بازار کے نام سے اس مشغلے کو فروغ دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے عورت کو ایک صحیح، جائز اور متوازن مقام دیا تھا اور مسلمان عورت اسی پر فخر کرتی رہی ہے چنانچہ نفیس تحفوں کے ساتھ شاد ملک خانم کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن پاک کا تحفہ بھی ملا تو شاہ جہاں بہت خوش ہوا اور اپنے ذاتی کتب خانہ میں داخل کیا۔

اس قرآن پاک کو شاد ملک خانم نے خود لکھا تھا۔ اوّل سے آخر تک اتنی یکسانیت اور پختگی سے دلفریب خطِ ریحان میں لکھا گیا تھا۔ کہ آنکھیں روشن ہوتی تھیں۔ آخر میں ان عصمت مآب خاتون سے اپنے نام و نسب کے متعلق چند سطریں خطِ رقاع میں اس خوبی سے لکھی تھیں کہ ان کی تحریر پر مسلّمہ استادوں کے

---

[۱] عمل صالح جلد دوم ص ۳۲۳ - ۳۲۴۔

خط کا دھوکا ہوتا تھا۔ ؎۱

۱۱۸۔ بچوں کی تعلیم و تربیت:۔

بچوں کی اچھی تعلیم و تربیت کو ہمیشہ ہی پسندیدہ فعل سمجھا گیا ہے اور آج کل تو عالمی پیمانے پر باقاعدہ ایک دن بہبودِ اطفال منایا جاتا ہے اور ہر ملک کی حکومتیں باقاعدہ بچوں کی صحت اور تعلیم پر خصوصی توجہ دیتی ہیں۔ اس نقطہ نگاہ سے دیکھیں تو اکبر اور جہانگیر کی کارکردگی سے بہت مایوسی ہوتی ہے۔ اکبر کی بہت دعاؤں۔ بزرگانِ دین کے مزاروں کی پیدل زیارت اور سال کی دعاؤں کے بعد ۲۸ سال کی عمر میں اس کی تین اولادیں پیدا ہوئیں۔ عقیدت احترام اور خیر و برکت کے لیے بزرگان دین ہی کے نام پر ان کے نام سلیم (بعد میں جہانگیر کے نام سے موسوم ہوا۔) مراد اور دانیال رکھے۔ ان کی تعلیم و تربیت بھی بہر حال اچھی ہی کی ہوگی لیکن انسان کی حیثیت سے انسانیت کا یہ عالم تھا کہ جہانگیر نے شہزادگی کے زمانے میں ایک واقعہ نگار کی کھال کھنچوالی۔ بادشاہ ہوتے ہی خسرو کے دو ملازموں کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے کچلوا دیا اور حسین بیگ کو گائے کی کھال اور عبدالرحیم کو گدھے کی کھال میں بند کر دیا اور ان کی شہر کرائی جس سے حسین بیگ دم گھٹنے سے مر گیا۔ ؎۲

شراب نوشی اور شراب کی محفل جمانے کا تذکرہ تو خود ہی تزک میں کھل کر کرتا ہے۔ اکبر کے دوسرے دو بیٹے مراد اور دانیال جو دعاؤں اور بزرگوں کی بشارت کے بعد پیدا ہوئے تھے ان کا حال یہ تھا کہ باپ کی زندگی ہی میں تیس اور تینتیس ۳۳ کی عمر میں کثرتِ شراب نوشی سے انتقال کر جاتے ہیں۔ ؎۳

جہانگیر کا رنگ ڈھنگ نرالا ہی تھا۔ اس نے اپنے لائق ترین بیٹے شاہ جہاں کو سنِ جلوس ۱۷ میں "بے دولت"، کا خطاب دیگر کرانا شروع کیا جس نے بقول

؎۱ عملِ صالح جلد دوم ص ۵۹۔

؎۲ تزکِ جہانگیری ص ۲۲۔ ۸۸۔ ۹۵۔

؎۳ تزکِ جہانگیری ص ۶۳۔ ۶۴

جہانگیر کبھی شراب چکھی نہ تھی۔[1] اور شہزادہ پرویز کو سن جلوس ۱۴ سے خطابات اور منصب دے کر بڑھانا شروع کرتا ہے جو کثرتِ شراب نوشی سے جہانگیر کی ہی زندگی میں ۳۸ سال کی عمر میں انتقال کر جاتا ہے۔[2] جہانگیر کا چوتھا بیٹا شہریار جس کی شادی نورجہاں کی لڑکی سے ہوتی ہے اور جلوس ۱۶ سے ترقی پر ترقی شروع کرتا ہے۔ لیکن عوام میں ناشدنی کے نام سے مشہور ہوتا ہے۔ اور ۲۲ سال ہی کی عمر میں جہانگیر کی زندگی میں ہی ایسی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے جس سے اس کی بھنوئیں، مونچھیں اور پلکیں جھڑ جاتی ہیں۔ آتشک کی وجہ سے سارے جسم پر پھوڑے نکل آتے ہیں اور اس ہیئت کذائی کی وجہ سے چہرے پر نقاب ڈال کر نکلنا پڑتا ہے۔[3] لیکن شاہ جہاں اکبر و جہانگیر دونوں سے مختلف ہے، اس کی تخلیقی اور تعمیری صلاحیتیں بچوں کی پیدائش اور تعلیم و تربیت میں بھی نمایاں نظر آتی ہیں۔ اس کی ایک ہی بیوی کے بطن سے چودہ ۱۴ بچے پیدا ہوئے سات بچے یعنی ۴ لڑکے اور تین لڑکیاں بقیدِ حیات رہیں۔ جن کی تعلیم و تربیت پر اس نے خصوصی توجہ دی۔ اس نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ اس کے بچے شریعت اسلامی کی نہ صرف تعلیم حاصل کریں بلکہ اس کے مطابق اپنی زندگیاں بھی سنواریں۔[4]

شاہ جہاں کا بڑا لڑکا دارا شکوہ اپنے علمی شغف اور تصنیف و تالیف کی وجہ سے عظیم شہرت کا مالک ہے، اس کی تصانیف سے مذہبی اعتقادات اور صوفیانہ خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کی تصانیف کی تاریخ وار ترتیب سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ صحیح اور خالص اسلام سے ہٹ کر تصوف اور پھر ہندو مذہب کی طرف مائل ہو گیا تھا اس لیے اس طرزِ فکر کے لوگوں کیلیے دارا شکوہ کی یہ علمی کتابیں مستقل قدر و قیمت کی مالک ہیں۔[5]

۱؎ تزکِ جہانگیری۔ ص ۲۴، ۷۲، ۳۲۵۔

۲؎ تزکِ جہانگیری ص ۵۶۵، ۸۲۳، ۸۳۸۔

۳؎ تزکِ جہانگیری ص ۸۵۲، عملِ صالح جلد اول ص ۱۹۰۔

۴؎ مقدمہ رقعاتِ عالمگیری۔ سید نجیب اشرف ندوی ص ۳۵۵ تا ۳۶۶۔

۵؎ بزمِ تیموریہ۔ سید صباح الدین عبد الرحمٰن ص ۳۹۷ تا ۴۱۷۔

شاہ جہاں کا تیسرا لڑکا اورنگ زیب عالمگیر اپنی شہزادگی کے زمانے سے ہی علم و عمل کے اعتبار سے شریعت پر عامل تھا۔ ہمت جراءت اور عزیمت اس کی رہنما تھی۔ انشاپردازی خطوط نگاری، شریعت کی پاسداری۔ شریعت کی پابندی۔ شریعت کے غلبے کے لیے جہاد اور ان تمام مخالفین پر کامیابی اس کی اہلیت و صلاحیت پر کھلی دلیل ہے اس نے اپنے پچاس سالہ دورِ حکومت میں حکومت کو شریعتِ اسلامی کے مطابق چلانے کی کوشش کی اور اس کی خود اپنی زندگی اور روزمرہ کے معمولات شریعتِ اسلام ہی کے تابع تھے۔[۱]

شاہ جہاں کے دوسرے دو بیٹے شاہ شجاع اور مراد کو وہ مقام حاصل نہیں ہو سکا جو دارا اور عالمگیر کو ہوا۔ لیکن ان میں بھی بہت سی خوبیاں تھیں۔ شجاع اورنگ زیب اور مراد تینوں بھائی ایک دوسرے سے قریب تھے۔ داراشکوہ کے خلاف اتحاد بھی کیا تھا۔[۲] مراد شجاعت اور مردانگی میں یکتا تھا اور سازش سے زیادہ تلوار پر بھروسہ کرتا تھا۔ سموگڑھ میں داراشکوہ سے اس ثابت قدمی سے جنگ کی کہ اس کے ہاتھی کا ہودہ تیروں سے چھلنی ہو گیا اور خود لہولہان ہو گیا تھا تاہم پہاڑ کی طرح ڈٹا رہا۔ اور تیر برساتا رہا۔ یہ ہودہ فرخ سیر کے زمانے تک یادگار کے طور پر قلعہ میں محفوظ رہا۔ اور جب بارہ کے سیدوں نے سرکشی کی تو بادشاہ بیگم (عالمگیر کی بیٹی) نے اس ہودے کو دکھلا کر کہا کہ یہ تیموری نسل کی یادگار ہے۔[۳]

شاہ جہاں کی لڑکیاں بھی دیندار اور اچھی صفات کی مالک تھیں۔ بڑی لڑکی جہاں آرا بیگم کو تصوّف سے شغف تھا۔ میاں میر اور ملّا شاہ بدخشی کی معتقد تھی اور تصوّف پر "مونس الارواح" کی مصنفہ ہے اور اپنے پیر و مرشد کے لیے ایک مسجد اور خانقاہ تعمیر کرتی ہے۔[۴] روشن آرا بیگم اورنگ زیب سے زیادہ مانوس تھی۔ اورنگ زیب کے دو خطوط سے

۱؎ مقدمہ رقعاتِ عالمگیری۔ سید نجیب اشرف ندوی۔

۲؎ مقدمہ رقعاتِ عالمگیری ص ۲۷۸،۲۷۸، ۳۸۸ ۔ سید نجیب اشرف ندوی و بزم تیموریہ ص ۱۸ا

۳؎ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۱۴۵-۱۴۶ شبلی نعمانی آئینِ ادب لاہور۔

۴؎ عملِ صالح حصہ دوم ص ۵۸۳ و بزم تیموریہ ص ۱۴۴ تا ۱۵۵ سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔

پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں بھائی بہنوں میں سب سے زیادہ محبت تھی۔ اورنگ زیب نے اس کی قدر کی اور آخر تک اس کو نبھایا۔[۱]

۱۱۹۔ حج پر سے پرتگالیوں کی مزاحمت ختم کرنا:۔

۱۴۹۲ء میں اسپین (SPAIN) میں مسلمانوں کا مکمل طور پر صفایا کر دیا گیا۔ تمام مسلمان قتل کر دیے گئے اور جو باقی بچے انہیں جبراً عیسائی بنا لیا گیا اور جو کچھ باقی رہ گئے انہیں عدالتِ تفتیش کے ذریعہ (INQUISITION COURT) ختم کر دیا گیا۔ اسپین اور پرتگال کے عیسائیوں کے اس کارنامے سے خوش ہو کر پوپ الگزنڈر ششم، (POPE ALEXANDER VI) نے ۱۴۹۳ء میں مشرقی دنیا کے تمام ممالک پرتگال کو دیے تھے۔ پرتگالی ۱۴۹۸ء میں مشرقی جنوبی ہند میں کالی کٹ کے مقام پر تاجروں کے بھیس میں آئے۔ ایک عرصہ تک عیسائی دنیا اور عیسائی عوام کی انہیں حمایت حاصل رہی۔ وہ عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت جبر و تشدد کے ہتھکنڈوں سے کرتے رہے۔ رواداری تحمل۔ انسانی جان و مال کا احترام کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔ چنانچہ نصف صدی میں گوا۔ ڈامن۔ ڈیو۔ بیسن۔ سالسٹ۔ بمبئی۔ چال۔ کوچین اور ہگلی کے آس پاس، (GOA - DAMAN - DIU - BASSEIN - SALSETTE - BOMBAY - CHAUL - COCHIN - & HUGLI) اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کر کے ان علاقوں پر قابض ہو گئے۔ اور اپنی مضبوط اور طاقتور بحری چھاونیاں قائم کر لیں۔ جہاں سے ساحلی علاقوں میں لوٹ مار، قتل و غارتگری اور آتش زنی کرتے رہتے۔ سمندری علاقے میں حاجیوں کے جہازوں کو لوٹتے اور حاجیوں کو گرفتار کر کے انہیں لونڈی غلام بنا کر یورپ کی منڈیوں میں فروخت کرتے تھے۔ ان کی دیدہ دلیری اور حوصلے یہاں تک بڑھے کہ ۱۵۷۵ء (1575 AD) میں گلبدن بیگم (اکبر کی پھوپھی، ہمایوں کی بہن اور بابر کی بیٹی اور ہمایوں نامہ کی مصنفہ تھی) اور یہ

---

[۱] مقدمہ رقعاتِ عالمگیری ص ۳۸۷۔

شاہی خاندان کی بیگمات کو حج پر جانے سے روک دیا اور مطالبہ کیا کہ (B U L S A R) بلسر کا (دمن کے قریب) کا علاقہ دے دیا جائے تو حج پر جانے کی اجازت ہو گی۔ اکبر نے ان کی یہ شرط پوری کی تو اس کے بعد ہی انہیں پروانہ راہ داری دیا گیا۔ تب یہ کہیں جا کر حج پر جا سکیں۔

اکبر نے پرتگیزیوں کی جارحانہ عزائم۔ حاجیوں کے جہازوں کی لوٹ مار ان کے ساتھ ناروا سلوک اور حج پر رکاوٹ کو نہ صرف نظر انداز کیا بلکہ ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کیے اور پرتگیزیوں کی سفارت اور عیسائی مبلغین کے یکے بعد دیگرے تین جماعتوں کو ۱۵۷۹ء دوسری ۱۵۹۰ء اور تیسری ۱۵۹۴ء کو اپنے دربار میں آؤ بھگت کی اور انہیں ہر قسم کی سہولت اور مراعات دیں۔ یہ لوگ اکبر کی موجودگی میں اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہایت ہی ناشائستہ غیر شریفانہ اور اشتعال انگیز الفاظ استعمال کرتے اور اکبر کو ذرہ برابر حرکت نہ ہوتی تھی۔

پرتگیز مبلغین کی اس دیدہ دلیری اور ظلم کے باوجود اکبر خاموش تھا اور دوست تعاون بڑھا رہا تھا۔ اسلام کے اہم رکن حج کی رکاوٹ کے سلسلے میں اکبر کی سرد مہری سے اقتدار پرست درباری عالم مخدوم الملک نے فتویٰ دے رکھا تھا کہ ان دنوں حج پر جانا فرض نہیں بلکہ ایک طرح سے گناہ ہے جب لوگ وجہ دریافت کی تو اس نے یہ دلیل دی کہ حج کے لیے خشکی کا راستہ تو ایران و عراق ہے جو قزلباشوں کے پروانہ راہ داری لینے کی ذلت اٹھانی پڑتی ہے۔ ان کے پروانہ راہ داری پر حضرت عیسیٰؑ اور بی بی مریمؑ کی تصویریں چھپی رہتی ہے جو بت پرستی کی ایک شکل ہے اس لیے یہ دونوں راستے حج کے لیے بند ہیں۔[1]

اکبر کی نام نہاد رواداری، مداہنت اور حکومت پرست علماء کی حج ایسے اہم رکن پر پابندی اور رکاوٹ پر شرعی تاویل سے پرتگیز عیسائیوں کے حوصلے اور بڑھے اور ان کی جارحانہ سرگرمیوں کو عروج حاصل ہوا۔ ان کی تجارتی آبادیاں مزید

---

[1] بدایونی ۳۵۔۲۳۶ ص۔

مستحکم ہوئیں اور قلعہ بند چھاؤنیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ جہانگیر (۱۶۰۵ء سے ۱۶۲۷ء) کے عہد میں پرتگیز عیسائیوں کو فروغ ہی حاصل ہوا وہ کسی احسان و شرافت و رواداری کے قائل ہی نہیں تھے۔ عمل صالح المعروف شاہ جہاں نامہ کے مصنّف محمد صالح کنبوہ کے بیان کے مطابق "پرتگالی عیسائیوں نے ہگلی (راج محل کے قریب) سوداگر کے بھیس میں طرح طرح کے حیلوں سے حکام سے نہ صرف رہنے کی اجازت حاصل کی پہلے وہاں تھوڑے سے گھر تعمیر کیے پھر اس مقام کو اپنے واسطے دوامی پناہ گاہ سمجھ کر مضبوط مکانات بنائے اور رہنے لگے رفتہ رفتہ ان فرنگیوں نے اپنے مکانوں کے گرداگرد نہایت مستحکم دیوار تیار کر لی۔ ہر مکان قلعہ اور ہر دیوار ایک فصیل ثابت ہوئی۔ ان کے برجوں پر توپیں اور بندوقیں چڑھائیں، بندرگاہ کے تین جانب ایسی گہری اور چوڑی خندقیں کھودیں اور قلعہ بند مسلّح ہو گئے۔ بعض فرنگی سرداروں نے جو وہاں مقیم ہو گئے تھے آس پاس کے دیہات اور پرگنوں کو اس صوبے کے حکام سے ٹھیکے پر لے لیا اور حسب دلخواہ حکومت کرنے لگے ان لوگوں کا جہاں تک بس چلا آس پاس کے علاقوں کی رعایا کو دیا کہ جبریہ عیسائی بناتے رہے جن پر داؤں چلا انہیں جہازوں میں بھر بھر کر اپنے وطن پرتگال میں پہنچا دیا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ ان اعمالِ بد کے باوجود خدا سے ثواب کی امید رکھتے تھے۔"[۱]

جہانگیر کے اسی عہدِ حکومت میں جہاں پرتگیزوں کو سرِ دست اقتدار حاصل رہا تو اس زمانے میں شیخ احمد سرہندیؒ (۱۶۰۳ء تا ۱۶۲۴ء) کی تحریک احیاءِ سنّت نبوی کو بھی مسلمانوں میں مقبولیت حاصل ہوئی اور وہ ایک مؤثر اور فعّال قوت بن گئی، چنانچہ جب شاہ جہاں تخت نشین ہوا اور اسلامی شریعت کے نفاذ اور غلبہ کو اپنی حکومت کا بنیادی مقصد قرار دیا تو دیگر بہت سے اسلامی احکامات کے ساتھ ۱۳ فروری ۱۶۲۸ء کو قاسم خان کو صوبہ بنگال کا گورنر مقرر کیا تا کہ کفر و الحاد کی بنیاد ڈھائے اور اسلامی شعائر کو رائج کرے۔

قاسم خان بنگال پہنچ کر فوراً اس علاقے کے باشندوں اور پرتگالی فرنگیوں کے

---

[۱] عمل صالح جلد اول ۴۶۴ تا ۴۶۶ دخافی خان حصہ دوم ۷۳، ۷۴، ص۔

تمام ملکی و مالی امور بخوبی معلوم کیے اور معلومات حاصل کرنے کے بعد اس نے فہم کو سر کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا اور مارچ ۱۶۳۲ء کو پرتگالیوں کو محصور کرلیا اور یہ محاصرہ ۳½ ماہ تک جاری رہا۔ محاصرے سے مجبور ہوکر پرتگالی صلح کی گفتگو بھی کرتے تھے اور امان بھی مانگتے تھے ان کی تعداد ۶ - ۷ ہزار کے درمیان تھی۔ پرتگالی محاصرے سے تنگ آکر بغاوت و سرکشی چھوڑ کر اطاعت و انکساری کا طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے۔ اور اپنی غلطیوں۔ کوتاہیوں پر معافی مانگ کر امان طلب کرنے لگے۔ اس عرصہ میں "حق الامان" کے طور پر ایک لاکھ روپیہ بھی بھیجے۔ ان کا گمان تھا کہ اس "ستار عیوب" اور "قاضی الحاجات" کی بدولت جو بہترین سفارش ہے امان مل جائے گی اور ہم جان بچالیں گے۔ محصور پرتگیزی بظاہر اطاعت کا اظہار کر رہے تھے لیکن درپردہ کمک کے انتظار میں تھے اس لیے قلعہ ہگلی فتح کرنے میں مزید تاخیر مناسب نہ سمجھی۔ اس نے محاصرہ سخت کر دیا۔ سخت جنگ ہوئی اور پرتگیزیوں کو ناکامی ہوئی اور ان کے ۶۴ بڑے جہاز ۵۶ کشتیاں اور ۱۹۶ ڈونگے شاہ جہاں کے سپاہیوں کو بطور غنیمت ملے۔

بندرگاہ گوا (۵۸ ع) سے بھی پرتگیزیوں کے لیے مدد آئی لیکن پرتگیز اس جنگ میں ناکام رہے اور پرتگیزیوں کے دس ہزار (۱۰،۰۰۰) آدمی جن میں مرد۔ عورت۔ چھوٹے بڑے سب شامل تھے۔ ہلاک ہوئے۔ بعض جنگ میں کام آئے۔ کچھ پانی میں ڈوب کر ہلاک ہوئے اور کچھ آگ میں جل کر مرے۔ چار ہزار چار سو (۴۴۰۰) آدمی گرفتار ہوئے جن میں پرتگیز ان کے غلام کنیزیں اور دوسرے اشخاص جو مجبوراً عیسائی بن گئے تھے شامل تھے پرگنوں اور گرد و نواح کے دس ہزار (۱۰،۰۰۰) باشندے جو بے گناہ ان فرنگیوں کے پنجے میں پھنسے ہوئے تھے۔ قید سے آزاد ہوئے۔ اس معرکہ میں اول سے آخر تک لشکر شاہی کے ایک ہزار سعادت مند سپاہی درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

ہگلی کے یہ تمام فرنگی قیدی مرد اور عورت شاہ جہاں کے سامنے پیش کیے گئے قاضی اور میر عدل نے شاہ جہاں کے حکم کے مطابق انہیں کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت پڑھوایا جس نے خوشی خوشی سچے دل سے کلمہ پڑھا وہ طرح طرح کی شاہی عنایتوں سے کامیاب

ہو کر وظیفہ پانے لگا بعض ایسے بھی تھے جو ازلی بدنصیبی کے سبب یہ سعادت حاصل کرنے سے محروم رہے۔ شاہ جہاں نے انہیں ایک امیر کے سپرد کیا کہ قید خانے میں بند رکھے۔ ان لوگوں کے پاس جو بت تھے شاہ جہاں نے انہیں ملاحظہ کیا۔ انبیاء علیہم السلام کے جو بت تھے انہیں شاہ جہاں کے حکم سے دریائے جمنا میں ڈال دیا گیا۔ باقی کو توڑ کر پھینک دیا گیا۔ ؎۱

اکبر کی تقلیدی ذہانت اور اسلام کے خلاف معاندانہ پالیسی کی وجہ سے یورپ کی پہلی سامراجی طاقت کو اثر و اقتدار حاصل ہوا۔ اور حج ایسے اہم فریضہ پر رکاوٹ پیدا کی گئی۔ علماء دنیا نے اس کو قبول کیا اور حج کو ساقط کر دیا۔ بظاہر علماء کی یہ رائے اسلام کی محبت کے معاملہ میں بہت ہی دقیع اور قابل قدر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کی بنیاد سراسر بزدلی، پست حوصلگی اور مشکلات اور مواقع کے مقابلے میں سپردگی پر ہے اس طرز فکر سے اسلام کو غالب نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی مسلمانوں اور اسلام کے دشمنوں سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حضرت مجددؒ نے اپنی زندگی میں عمل میں فکر و فلسفہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق "گر تو زمانہ نہ سازد تو زمانے دیگر بسازنہ" کا علم بلند کیا۔ احیاء اسلام، ترویج شریعت اور غلبہ شریعت کا نعرہ بلند کیا۔ حکومت وقت حرکت میں آئی اور انہیں نظر بند رکھا گیا۔ ان کی سرگرمیوں پر پابندی لگائی گئی لیکن فکر و نظر میں آپ نے جو انقلاب پیدا کیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ جہاں نے جہاں احیاء شریعت اور غلبۂ اسلام کے لیے بہت سے احکام جاری کیے۔ پرتگالیوں کی معاندانہ اسلام سرگرمیوں کو ختم کرنے اور حرمین شریفین کی زیارت کے لیے راستہ اور ماحول محفوظ کرنے کے لیے پہلے ہی دن مہم کا آغاز کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف چار سال کی مدت میں یعنی ۱۶۳۲ء تک پرتگالیوں کی ہگلی میں قلعہ بند کوٹھیاں بالکل تباہ و برباد کر دی گئیں اور ان کی سمندری رہزنی ختم ہو گئی۔ حرمین شریفین کی زیارت اور حج کے لیے سمندری سفر

؎۱ عمل صالح حصہ اول ص ۲۵۱ - ۴۶۴ تا ۴۷۲ - ۵۷۴ تا ۵۷۵ - خافی خان حصہ دوم ۱۹ - ۷۳ - ۷۴ - ۹۰

محفوظ اور مامون ہو گیا۔ عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت اور مسلمانوں کی تبدیلی مذہب پر پابندیاں لگا دی گئیں۔

۱۲۰۔ شریفِ مکّہ اور شاہ جہاں :۔

اکبر اور جہانگیر کے دورِ حکومت میں شریفِ مکہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن شاہ جہاں کی تخت نشینی سے جب حکومت کی پالیسی شریعتِ اسلام کی احیاء کی ہوئی تو اس کے اثرات کو عالم اسلام میں بھی محسوس کیا گیا۔ چنانچہ مکہ معظمہ جسے عالم اسلام میں ایک خاص مقام و اہمیت حاصل ہے اس کے شریف نے ۲۷ فروری ۱۶۴۳ء کو شیخ عبد الصمد عمودی کو بطورِ سفیر شاہ جہاں کے دربار میں بھیجا اور ساتھ ہی خانہ کعبہ کی کنجی بھی بھیجی۔ اس سے شاہ جہاں بہت ہی خوش ہوا۔ اور اسے ہفت اقلیم کی فتح کا شگون سمجھ کر قبول کیا۔ سفیر کی بڑی قدر کی اس کو نقد رقم، خلعت، تحفے، تحائف اور منصب عطا کیے[۱] شاہ جہاں کو یہ اعزاز و مرکزیت اس لیے حاصل ہوئی کہ اس نے اپنی حکومت کی اساس و پالیسی کو شریعت اسلام کے مطابق وضع کرنے کی کوشش کی تھی اور مقصدِ حکومت میں انقلابِ عظیم پیدا کیا تھا۔ شاہ جہاں شریفِ مکہ کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس کو تحفے تحائف کے علاوہ نقد رقم بھیجتا رہتا تھا۔ ستمبر ۱۶۵۴ء میں قحط و مہنگائی کا حال معلوم ہوا تو بطورِ امداد کے شریفِ مکہ کو رقم ارسال کی تھی۔[۲]

۱۲۱۔ حرمین شریفین کے لوگوں کی امداد :۔

شاہ جہاں کا چونکہ زندگی کا مطمح نظر یکسر بدل گیا تھا اور عامة المسلمین میں بھی اسلام کی بیاس شدّت سے پیدا ہو گئی تھی اس لیے شاہ جہاں کچھ تو اپنی روحانی تسکین کے لیے اور کچھ عام مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے جلوس مبارک ہی کے

---

[۱] عملِ صالح جلد دوم ص ۳۲۰-۳۲۱-۵۷۱-۵۸۹۔

[۲] عملِ صالح جلد دوم ص ۳۵۱-۹۰-۴۸-۵۷۲-۶۴۲

وقت یہ منت مانی تھی کہ حرمین شریفین کے باشندوں کو پانچ لاکھ روپیہ بھیجے گا۔ چنانچہ ۱۶ ستمبر ۱۶۴۳ء کو میرزا ابراہیم صفدر خان کے ہاتھوں یہ رقم مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے لوگوں میں تقسیم کرنے کے لیے بھیجی جس میں چار لاکھ روپیہ نقد تھا اور ایک لاکھ کا سامان تھا جس کو فروخت کر کے تمام رقم مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے باشندوں میں تقسیم کر کے ۲۳ اکتوبر ۱۶۴۴ء کو واپس ہوا[۱]۔ ۱۹ اکتوبر ۱۶۴۷ء کو سید احمد سعید نے ۳ لاکھ کی رقم مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے مستحق افراد میں تقسیم کی۔ اس طرح شاہ جہاں نے نیازمندی کے تقاضے سے اپنی سلطنت کی مدت میں دس لاکھ روپیہ کا سامان مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے مستحق افراد کے لیے بھیجا جو وہاں دگنی قیمت میں فروخت ہو کر غریبوں میں تقسیم ہوا۔[۲]

۱۲۲۔ سرکارِ دو عالم کے لیے قندیل روانہ کرنا۔

شاہ جہاں کی سب سے بڑی بیٹی جہاں آرا بیگم آگ سے بری طرح جل گئی تھی اس لیے شاہ جہاں نے اس کی صحت یابی پر پانچ لاکھ روپیہ کی منت مانی تھی۔ چنانچہ جب یہ صحت یاب ہو گئی تو عقیدت و ارادت کے طور پر سرکارِ دو عالمؐ کے روضۂ انور کے لیے نایاب تحفوں میں ایک قندیل روانہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہوشیار زرگر اور مینا کار سونے کی جالی دار چادر اس پر چڑھا کر دلفریب نقش و نگار اور نزاکت بھرے بیل بوٹے بنائے۔ قیمتی جواہرات کی مرصع کاری کر کے الماس کو اس خوبصورتی کے ساتھ نصب کیا کہ آفتاب و مہتاب کی آب و تاب ماند پڑ گئی۔ اس قندیل پر ۲½ لاکھ لاگت آئی تھی اور اس کا نام "گلِ محمدی" رکھا گیا اور سید احمد سعید کو جو دو بار حج کر چکا تھا اس کی معرفت مدینہ منورہ قندیل روانہ کی گئی تاکہ سرکارِ دو عالم جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس

۱۔ عمل صالح جلد دوم ص ۳۰۹ - ۳۴۴۔

۲۔ عمل صالح جلد دوم ص ۴۷۸ - ۴۹۰ - ۵۲۸ - ۵۸۸ - ۵۸۹ - ۶۴۲ - ۶۴۵۔

پر قندیلِ مرصّع چڑھائے تاکہ روضۂ منورہ پر روشنی ہوا کرے اور ساتھ ہی پچاس ہزار کا سامان شریفِ مکہ کے لیے اور اتنی ہی رقم وہاں کے محتاجوں غریبوں اور اتنی ہی رقم مدینہ منورہ کے درویشوں اور فقیروں کے لیے ارسال کی[1]۔ شاہ جہاں خود تو مملکت کی مصروفیتوں کی وجہ سے حج نہیں کر سکا۔ لیکن حج کے لیے بحری سفر کے خطرے کو ختم کیا۔ حج کے لیے افراد روانہ کیے۔ شریفِ مکہ سے دوستانہ نیازمندانہ اور عقیدت مندانہ تعلقات استوار کیے۔ مکہ معظّمہ اور مدینہ منوّرہ کے محتاج و فقراء کا ہمیشہ خیال رکھا اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے روضۂ اقدس کے لیے نہایت ہی خوشنما قندیل روانہ کی جو اس کے خیالات۔ فکر۔ عمل اور ترجیحات کو ظاہر کرتی ہیں

۱۲۳۔ اقلیت و اکثریت کا فلسفہ :۔

شاہ جہاں کلام اللہ کی تعلیمات پر کامل و پختہ ایمان رکھتا تھا۔ اس کی مملکت کی پالیسی اور تمام احکام و قوانین کی اساس قرآن پاک اور حضور پاک ہی کی سنّت کی روشنی میں تھی۔ اس نے شہزادگی کے دور میں بڑی بڑی مہمات میں حصہ لیا تھا جس میں وہ ہمیشہ کامیاب و سرخرو ہوا ہے۔ بادشاہ ہونے کے بعد بھی اپنے دشمنوں کی کثرت تعداد کو خاطر میں نہیں لایا۔ لیسا اوقات ایسا ہوا کہ دشمن اپنی کثرتِ تعداد کی وجہ سے بہت بھاری، طاقتور اور قوی نظر آتا تھا۔ بظاہر اس سے خوف آتا تھا۔ اس لیے ایسے موقعوں پر خوف دہراس دور کرنے کے لیے اور سپاہیوں میں خود اعتمادی۔ جرأت عزم اور یقین کامل پیدا کرنے کے لیے کلام اللہ کی یہ آیت سنا کر ان کے حوصلوں کو کو بڑھایا جاتا تھا چنانچہ قرآن پاک کی یہ آیت "کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ ط" بارہا ایسا ہوا کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا"۔ بڑے اطمینان و ثابت قدمی کے ساتھ ہنگامہ جدال و

---

[1] عمل صالح جلد دوم ص ۳۵۱ - ۴۹۰ - ۵۲۸ - ۵۸۸

شال گرم کرتا۔ حوصلہ مندی اور عزم مصمم کو اپنی سپر بنا کر بدعہدوں، دغابازوں کو شکست دینے کے لیے مستعد ہو جاتا۔ پے در پے حملہ کر کے ان بزدلوں کا قلع قمع کرتا[1]۔ کلام پاک کی یہ آیت اگر دل و دماغ کی یکسوئی اور صمیم قلب کے ساتھ ذہن نشین کیا جائے تو سکونِ قلب و اطمینان ہی نہیں پیدا ہوتا بلکہ بے انتہا عزم و حوصلہ و بے پناہ جراءت بھی پیدا ہوتی ہے۔ جو ایک مومن کو کامیابی و سرخروئی سے دوچار کرتی ہے۔ مسلمان حکمرانوں کا جب تک قرآن کی تعلیمات پر دل و دماغ کی یکسوئی کے ساتھ ایمان رہا ہے انہیں کامیابی و سرخروئی حاصل ہوتی رہی ہے۔ پاک و ہند میں مسلمان، اقلیت و اکثریت کے فلسفہ پر نہیں بلکہ شریعت کی حقانیت اور عظمت پر ایمان رکھتے تھے اور انہوں نے اس کی سربلندی کا عزم کیا تو انہیں کامیابی ہوئی۔ اکبر و جہانگیر کے (۱۵۵۶ء۔ ۱۶۲۷ء) کے دور میں شریعت مغلوب تھی۔ اکثریت طریقت بے شریعت کی حامل تھی اور اُن بزرگانِ دین کو قدر و منزلت حاصل تھی جو طریقت بے شریعت کے علمبردار تھے لیکن حضرت مجدد جو اس عہد میں (۱۵۶۴ء ۱۶۲۴ء) شریعت کی عظمت و حقانیت کے سب سے بڑے علمبردار تھے اور احیاء شریعت کے لیے کوشاں رہے ہیں وہ اپنی کثرت تعداد پر نہیں بلکہ شریعت اور سنت نبوی کی حقانیت اور قوت کے بل پر باطل فلسفوں اور افکار کو شکست دے کر کامیاب ہوتے ہیں۔ اور شاہ جہاں احیاء سنت نبوی اور نفاذِ شریعت ہی کی پالیسی کو اپناتا ہے۔

---

[1] عملِ صالح جلد اول ص ۵۵۷۔

اشارہ ہے سورہ البقرہ آیت نمبر ۲۴۸۔ داؤد علیہ السلام نے فلسطینیوں کی فوج کا گراں ڈیل پہلوان جالوت (جولیت) بنی اسرائیل کی فوج کو دعوتِ مبارزت دے رہا تھا اور اسرائیلیوں میں سے کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس کے مقابلے کو نکلے۔ حضرت داؤد علیہ السلام یہ رنگ دیکھ کر بے محابا اس کے مقابلے کو میدان میں جا پہنچے۔ اور اس کو قتل کر دیا۔ اس واقعہ نے انہیں تمام اسرائیلیوں کی آنکھ کا تارا بنا دیا۔ طالوت نے اپنی بیٹی ان سے بیاہ دی آخر کار وہی اسرائیلیوں کے فرمانروا ہوئے[عہ]

[عہ] مولانا مودودی۔ تفہیم القرآن سورہ بقرہ ۲ ص ۱۹۰-۱۹۱

۲۴۔ اتحادِ اسلامی :۔

اکبر بادشاہ نے ۱۵۵۶ء میں زمامِ اقتدار سنبھالا اور ۱۶۰۵ء تک حکومت کی۔ اس کے پچاس سالہ دورِ حکومت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں تو اس نے توسیعِ مملکت اور استحکام سلطنت کی طرف خاطر خواہ توجہ دی جس میں وہ کامیاب ہوا۔ لیکن دوسرے حصے دورِ حکومت میں اس نے ہندویت، جین مت، بدھ مت، عیسائیت، یہودیت، مجوسیت و دیگر مذاہب کے امتزاج سے اسلام کا ایک نیا ایڈیشن بنانے کی کوشش کی اس کے پسند دناپسند کے معیار پر ایران کے اسلام سے قبل کا دورہ حاوی تھا۔ اپنے پوتوں کا نام خسرو، پرویز، طہمورث، ہوشنگ وغیرہ رکھے جو ایران کے اسلامی دورہ کے قبل کے حکمرانوں کے نام تھے۔ بدایونی کے الفاظ میں وہ ایرانی فکر و فلسفہ، تہذیب و تمدن طور طریقہ سے بہت متاثر ہوا اور اسلام سے منحرف ہوا "وہاں (ایران) کی بے دینی ہندوستان میں سرایت کر گئی"[۱] اس سے اکبر کا سلاطینِ ترکیہ سے کسی قسم کے ربط و تعلق کا پتہ نہیں چلتا۔ اکبر نے جب اسلام کے خلاف طور طریقے نافذ کرنے شروع کیے تو قطب الدین محمد خاں نے کہا کہ شاہانِ ولایت خلیفہ روم وغیرہ ان باتوں کو سنیں گے تو آخر کیا کہیں گے وہ سب بہر حال اسی اسلام پر ایمان رکھتے ہیں خواہ تقلیدی ہو یا کچھ اور۔" اکبر نے اس پر چڑ کر کہا۔ تو روم کے فرمانروا کی خاطر ہمارے ساتھ اس درشتی سے بات کر رہا ہے تو اس طرح ان کے پاس ٹھکانا بنانا چاہتا ہے کہ یہاں سے نکلنا پڑے تو وہاں جا کر اعزاز و مرتبہ حاصل کرے[۲]۔ اکبر کے ایران سے بہت ہی اچھے و گہرے روابط رہے ہیں۔ اور پرتگال کے عیسائی مبلغین کو بھی عیسائیت کی تبلیغ کی اجازت دی تھی باوجودیکہ وہ حاجیوں کے جہازوں کو لوٹتے اور مسلمانوں کے

---

[۱] بدایونی ص ۴۵۷

[۲] بدایونی ص ۴۸۰

کے خلاف جارحانہ کاروائیاں کرتے۔ اکبر نے اس کے خلاف کسی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا جہانگیر کے (۱۶۰۵ء - ۱۶۲۷ء) عہدِ حکومت میں سلاطینِ ترکیہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جہانگیر اپنے سنِ جلوس ۳ (تین) میں خود اپنی تزک میں لکھتا ہے "کہ امیر تیمور نے روم فتح کرنے اور روم کے بادشاہ یلدرم کو زندہ پکڑنے کے بعد تحفے، تحائف اور ملک کا سال بھر کا محصول وصول کرنے کے بعد سلطان بایزید کو حسبِ سابق اس ملک کا بادشاہ بنا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ زبردست احسان کے باوجود اس زمانے سے لے کر آج کے دن تک روم کے قیصروں کی طرف سے کوئی بھی قاصد ہمارے گھرانے کے کسی بھی بادشاہ کے دربار میں نہیں آیا اور نہ کسی کو ایلچی بھیجا گیا۔ اب کیسے یہ یقین کیا جائے کہ یہ شخص جو ماوراءالنہر کا رہنے والا ہے، شہنشاہ روم کا بھیجا ہوا ایلچی ہے"۔[1]

جہانگیر کو حکومت ترکیہ کے بارے میں یہ احساس تھا کہ اس کے بزرگ امیر تیمور نے سلطان بایزید یلدرم کو شکست دی تھی اور پھر ایک سال کا محصول وصول کرنے کے بعد سلطان بایزید کو حسبِ سابق بادشاہ بنایا تھا اس حیثیت سے ترکیہ کی حکومت اس کے بزرگ کا عطیہ ہے دوسرے وہ اس کے بزرگ کی محکوم ہے۔ اور اسی کے عطا کردہ حکمرانوں کی حکومت ہے۔

جہانگیر کو اس بات کی بھی شکایت تھی کہ اس کے بزرگوں نے سلطان روم کے ساتھ جو زبردست احسان کیا تھا اس کے باوجود بھی سلطان روم نے آج تک کسی بھی دربار میں کوئی ایلچی نہیں بھیجا تھا۔ اور ہم نے بھی کوئی ایلچی نہیں بھیجا ہے اس لیے یہ کیسے یقین کر لیا جائے کہ یہ شخص جو ماوراءالنہر کا رہنے والا ہے وہ شہنشاہِ روم کا بھیجا ہوا قاصد ہو سکتا ہے اس طرح جہانگیر کے عہدِ حکومت میں سلطان ترکی سے کوئی ربط و تعلق نہیں تھا اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کی گئی۔ البتہ جہانگیر کے شاہِ ایران سے بہت ہی اچھے اور گہرے روابط تھے۔ تزکِ جہانگیری میں تحفے، تحائف کا لین دین

---

[1] تزکِ جہانگیری ص ۱۶۵، ۱۶۶۔

اور سفراء کے تبادلے اور ایک دوسرے کے لیے نیک جذبات کے اظہار کا پتہ چلتا ہے۔
لیکن حضرت مجدّد کی تحریک احیاءِ شریعت سے جب سوچنے سمجھنے کے انداز میں تبدیلی آئی تو غور و فکر کا محور بدلا۔ ترجیحات اور تعلّقات کی نوعیت اور مقاصد بھی بدلے۔ آپ کی قلعہ گوالیار میں قید سے ملک کے امن و سکون میں بھی خلل آیا۔ قندھار کے معاملہ سے جہانگیر اور شاہ ایران کی دوستی میں فرق آیا اور قندھار ہی کی مہم کے سلسلے میں شاہ جہاں معتوب اور شہریار منظورِ نظر ہوا۔ جہانگیر کے انتقال کے بعد شاہ جہاں اپنے تمام مخالفوں کو قتل کر کے ۱۲ فروری ۱۶۲۸ء میں تخت نشین ہوتا ہے تو مملکت کی پالیسی اور مقاصدِ حکومت میں انقلابِ عظیم رونما ہوتا ہے۔ تعلّقات کی نوعیت بھی تبدیل ہوتی ہے۔ چنانچہ داخلی اصلاحات کے نفاذ میں شریعت کو اہم مقام دیتا ہے اور استحکامِ مملکت کے بعد خارجی تعلقات میں سلطانِ ترکی سے تعلّقات استوار کرنے کے لیے سفیر روانہ کرتا ہے۔

سلطانِ ترکی کو ۱۵۱۷ء سے عالمِ اسلام میں ایک اہم مقام حاصل ہو گیا تھا۔ اب وہ ایک ملک کا حکمران ہی نہیں تھا بلکہ عالمِ اسلام کی سیادت اور قیادت بھی اس کے سپرد تھی۔ مقاماتِ مقدّسہ (مکّہ۔ مدینہ اور بیت المقدس) پر جب اس کا قبضہ ہو گیا تو مکّہ معظّمہ میں خطبہ میں اس کے نام کے ساتھ خادم الحرمین الشریفین" کے لقب کا اضافہ کیا گیا۔ جو ایک مسلمان حکمران کے لیے سب سے زیادہ معزّز لقب ہے اور یہ اعلان اس وقت کیا گیا جب دنیائے اسلام کے مسلمان حج کے لیے اکٹھا ہوتے تھے اس لیے عالمِ اسلام میں اس کی اطلاع ہو گئی "حرمین شریفین" کی خدمت کا شرف سلطان سلیم کے بعد تمام عثمانی سلاطین اپنے لیے باعثِ عزّت سمجھتے رہے اور ان کے اس شرف یا حق کو کسی دوسرے مسلمان حکمران نے جنگِ عظیم اوّل تک چیلنج نہیں کیا تھا۔

منصبِ خلافت پر فائز ہو جانے اور "خادم الحرمین الشریفین" کے معزّز لقب سے سلطانِ ترکی کو عام مسلمانوں میں ایک بلند مقام حاصل ہو گیا تھا۔ حکومت کے علاوہ اب اسے اپنی مسلمان رعایا کی مذہبی پیشوائی و سیادت بھی حاصل ہو گئی تھی اور

اس کے دینی اقتدار و پیشوائی کا دائرہ صرف سلطنت عثمانیہ کے مسلمان باشندوں تک محدود نہ رہا بلکہ اس کے اندر تمام دنیائے اسلام کے باشندے آگئے خواہ وہ کسی قوم اور ملک کے ہوں۔

سلاطین ترکیہ کے اس اعزاز اور مقام کو جیسا کہ اوپر دیکھا گیا کہ اکبر و جہانگیر نے (۱۵۵۶ء سے ۱۶۲۷ء) تک تسلیم نہیں کیا تھا۔ لیکن شاہ جہاں (۱۶۲۸ء سے ۱۶۵۸ء) اس صورت حال کو تبدیل کرتا ہے اور عام مسلمانوں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اپنا سفیر سلطان ترکیہ کے پاس روانہ کرتا ہے۔

۱۲۵۔ پہلا سفیر برائے ترکیہ:۔

شاہ جہاں نے ۴ر ذی الحجہ ۱۰۴۹ھ بمطابق ۲۷ر مارچ ۱۶۴۰ء حضرت علامہ افضل خان وزیر اعظم کو حکم دیا کہ سلطانِ ترکیہ کے نام ایک مراسلہ لکھے جس میں دوستی و خیر خواہی کا تذکرہ ہو اور خالی خط بھیجنا آدابِ شاہی کے خلاف تھا اس لیے اس خط کے ساتھ ایک بیش قیمت مرصّع پیٹی بھی روانہ فرمائی۔

شاہ جہاں کے حسب الحکم علامہ افضل خان نے خط لکھا اور اپنی طرف سے بھی ترکیہ کے وزیر اعظم کو چند سطریں لکھیں اور میر ظریف کو بطور سفیر کے ترکی سلطان کے دربار میں روانہ کیا۔ میر ظریف بندرگاہ لاہری سے (ٹھٹھہ کے قریب) جہاز میں بیٹھ کر عرب پہنچا۔ حج اور مدینہ منورہ کی زیارت سے فارغ ہو کر موصل پہنچا اور ترکیہ کے وزیر اعظم کو علامہ افضل خان وزیر اعظم کا خط دکھایا اور اس کی وساطت سے سلطان مراد خان کی خدمت میں دربار پہنچا۔

سلطان مراد نے سفیر کے ہاتھ سے شاہ جہاں کا خط بڑی تعظیم و تکریم سے لیا اور یہ سوال کیا کہ اتنی دور دراز سفر کا کیا مقصد ہے۔ میر ظریف (سفیرِ شاہ جہاں) نے اس سفارت کا مقصد بیان کیا اور شاہ جہاں کا تحفہ جو طلائی صندوقچہ جس میں مرصّع پیٹی تھی سلطان کو پیش کیا۔ مراد اس سے بہت خوش ہوا۔ اور اس کو نیک شگون پر محمول کیا اور

فرمایا کہ اس وقت جب ہم تسخیر بغداد کے لیے جا رہے ہیں، شاہ جہاں کی طرف سے ایلچی آنا اور یہ تحفے و تحائف کا ملنا در اصل فتح کا شگون ہے۔ اگلے دن سفیر نے اپنی طرف سے ہزار پارچے بطور پیش کش گزارے۔ سلطان نے ہندوستان کے اسلحہ کے متعلق معلومات کیں۔ اس کے بعد سلطان نے سلطنتِ مغلیہ کا حال دریافت کیا اور سفیر کو دس ہزار قرش عنایت کیے جو بیس ہزار روپیہ کے برابر تھا۔ اس کے بعد سلطان نے فرمایا کہ بغداد کی مہم کے بعد روانگی کی اجازت دی جائے بلکہ ہم اپنا ایلچی بھی تمہارے ہمراہ ہندوستان بھیجیں گے۔

۱۲۶۔ ترکی سفیر شاہ جہاں کے دربار میں۔

شاہ جہاں نے ترکی سلطان کے دربار میں پہلے اپنے سفیر کی معرفت اتحاد و دوستی کا پیغام بھیجا۔ سلطان اس سے متاثر ہوا اور اس کی قدر کی اور اب خود سلطان مراد بغداد کا قلعہ فتح کرنے کے بعد موصل آیا اور میر ظریف کو رخصت ہونے کی اجازت دی۔ شاہجہاں کے خط کا جواب ارسلان آقا کی معرفت روانہ کیا اور ساتھ ہی شاہ جہاں کے لیے صبا رفتار عربی گھوڑے معہ مرصع زین، نیز ترکی عبا جو موتیوں سے آراستہ تھیں بطور تحفے ارسال کیے۔ ارسلان آقا اور میر ظریف سمندر کے راستے سے ٹھٹہ میں آکر اترے اور شاہ جہاں کو اپنے آنے کی اطلاع دی۔ شاہ جہاں نے دونوں کو خلعت اور فرمانِ عنایت جاری کیا اور حکم ہوا کہ قیصرِ روم کے ایلچی کو دس ہزار روپیہ سرکاری خزانہ سے دے جائیں۔ اور صوبہ دار ٹھٹہ اور ملتان دونوں چھ چھ ہزار روپیہ بطور ضیافت ادا کریں۔ اور اسی طرح سرکار سیوستان اور بھکر بھی چار چار ہزار روپیہ برسم ضیافت پیش کریں۔ لاہور پہنچنے کے بعد ارسلان آقا یہیں مقیم ہوا۔

شاہ جہاں کے سفیر میر ظریف نے سلطان مراد خان کی فتح یابی اور اس کے ارادوں سے آگاہ کیا۔ فتح بغداد کی تفصیل اور ایرانیوں کی شکست کی روداد پیش کی۔ البتہ سفیر کو جو بات سب سے ناگوار گزری وہ سلطان مراد خان کی شراب نوشی تھی۔

ترکی کا سفیر ارسلان آقا جو لاہور آچکا تھا اس کو محمد حسین لاہور سے کشمیر لایا۔ شاہ جہاں کے حکم سے نواحِ شہر سے استقبال کر کے دربار میں لائے۔ اس نے تسلیم و کورنش بجا لانے کے بعد سلطان مراد کا مراسلہ، منت نام گھوڑا جس کا زین مرصع تھا نیز موتیوں سے آراستہ شاہی عبا جو سلطان نے بطور تحفہ بھیجی تھی، پیش کی۔ شاہ جہاں نے اس کو قبول کیا اور سفیر کو خلعت خاصہ، خنجر مرصع اور پندرہ ۱۵ ہزار روپیہ نقد انعام سے سرفراز کیا۔ اپنے اکیاون (۵۱) قمری سال کے جشن تلادان کے موقع پر سلطان روم کا بھیجے ہوئے تحفے تحائف پورے ساز کے ساتھ شاہزادے دارا شکوہ کو عطا کئے اور ترکی کے سفیر ارسلان آقا کو خلعت اور چغہ مرصع عطا فرمایا۔ یکم شعبان سنہ ۱۰۵۰ھ ۶ نومبر سنہ ۱۶۴۰ء کو شاہ جہاں کشمیر سے دار السّلطنت لاہور آیا تو ترکی کے سفیر ارسلان آقا کو خلعت اور پندرہ ہزار روپے دیے۔ ۲۹ شعبان سنہ ۱۰۵۰ھ بمطابق ۴ دسمبر سنہ ۱۶۴۰ء کو ترکی سفیر ارسلان آقا کو خلعت، شمشیر طلائی پھولوں والی سپر، سو ۱۰۰ تولے وزن کے طلائی اور نقرئی دائرے اور بیس ۲۰ ترکی گھوڑے عطا کیے۔ اور واپسی کی اجازت دی۔ [۱۷]

شاہ جہاں اور سلطانِ ترکی میں باقاعدہ سفیر کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ ایک دوسرے کے حالات اور معاملاتِ حکومت سے آگاہ ہو چکے تھے۔ دونوں حکمرانوں نے ایک دوسرے کو تحفے تحائف پیش کیے اور سفراء کی قدردانی کی۔ دونوں حکمران ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں ایک ایسی قدرِ مشترک پیدا ہو گئی تھی کہ ان تعلقات کو مزید استوار اور گہرا کرنا چاہتے تھے۔

۱۲۷۔ سلطانِ ترکی کا دوسرا سفیر:۔

۱۰ ذی الحجہ سنہ ۱۰۶۰ھ بمطابق ۴ دسمبر سنہ ۱۶۵۰ء کو شاہ جہاں کو بندرگاہ سورت سے اطلاع ملی کہ سلطانِ روم کے فرمانروا سلطان محمد خان نے سیّد محی الدّین کو

---

۱۷ عملِ صالح ص ۲۶۳، ۲۶۴ تا ۲۶۹ - ۲۷۵ - ۳۰۱ - وخافی خان حصہ دوم ص ۱۵۸ - ۱۶۰ -

اپنا خط دے کر بھیجا ہے۔ اس لیے اس کو شاہ جہاں نے خلعت اور فرمان بھیجا اور سورت اور دوسرے صوبوں کے حکام کو ہدایت کی کہ سفیر مذکور کی خزانہ عامرہ سے تواضع کریں۔ بندر سورت کا متصدی دس ہزار روپیہ دے، برہان پور، مانڈو کا ناظم، مالوہ کا صوبہ دار اور دہلی میں خلیل اللہ خان دس دس ہزار روپیہ پیش کریں۔ ۲ اکتوبر ۱۶۵۱ء کو شاہ جہاں کے حسب الحکم تربیت خان قیصر روم کے ایلچی سید محی الدین کی پیشوائی کے لیے گیا اور حاضر بارگاہ کیا۔ سید محی الدین نے آستانہ بوسی کے بعد قیصر (سلطان روم) کا مراسلہ شاہ جہاں کو پیش کیا۔ دو گھوڑے جو سلطان نے تحفے میں بھیجے تھے وہ پیش کیے جس میں سے ایک گھوڑے کا زین مرصع تھا سفیر نے پانچ گھوڑے اپنی طرف سے بھی پیش کیے۔ شاہ جہاں نے اس پیش کش کو قبول کیا اور اپنی طرف سے سفیر کو پندرہ ہزار روپے مرحمت فرمائے۔ اور ۲۱ ذیقعدہ ۱۰۶۱ھ مطابق ۵ نومبر ۱۶۵۱ء کو چار ہزار روپے محی الدین سفیر روم کو مرحمت کیے۔ ۱۵ نومبر ۱۶۵۱ء مطابق یکم ذی الحجہ ۱۰۶۱ھ سفیر روم سید محی الدین کو تحفے تحائف انعام و اکرام اور پندرہ ہزار روپے نقد دے کر واپسی کی اجازت دی۔[۱]

۱۲۸۔ شاہ جہاں کا ترکی کو دوسری بار سفیر روانہ کرنا۔

اتحاد و اتفاق اور بادشاہوں کی دوستی ہی پر امن و امان اور رعایا کے احوال کی درستی منحصر ہے سا در شاہ جہاں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی "کہ ہمعصر فرمانرواں سے دوستانہ تعلقات قائم رکھے"۔ اس لیے یکم ذی الحجہ ۱۰۶۱ھ مطابق ۱۵ نومبر ۱۶۵۱ء حاجی احمد سعید میر عدل کو ترکیہ کی سفارت پر نامزد کیا۔ حاجی احمد سعید اس سے پہلے دو مرتبہ حج کر چکا تھا۔ سن ۲۲ جلوس میں کارخانہ خاص میں تیار شدہ قندیل "گل محمدی" رسول کریمؐ کی روضہ مبارک پر چڑھا چکا تھا۔ اس کو منصب کی ترقی خلعت اور بارہ ہزار روپے

---

[۱] عمل صالح حصہ دوم ص ۵۷۶ تا ۵۷۷ - ۵۸۶ - ۵۸۹ وغیرہ خافی خان حصہ دوم ۲۶۴-۲۶۸-

عنایت کر کے سرفراز کیا اور قیصرِ روم کے لیے انواع و اقسام کے قیمتی تحائف ارسال کیے اس کے علاوہ علامہ سعد اللہ خان کا انشا کردہ مراسلہ حاجی احمد سعید کو دیا تاکہ مدارِ محبت کا رشتہ قائم ہو۔

حاجی احمد سعید کو ہدایت کی کہ وہ سید محی الدین سفیر ترکی کے ہمراہ روانہ ہو۔ پہلے حج اور زیارت کے فریضے سے فارغ ہو کر دستورِ قدیم کے مطابق مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے غریبوں، محتاجوں اور مستحق افراد کو روپیہ تقسیم کر کے سلطانِ روم کے دربار میں حاضر ہو۔ احمد سعید ترکی سے رخصت ہو کر مصر پہنچا۔ اور وہاں سے مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ زیارت کرتے ہوئے ۲۵ ذی الحجہ ۱۰۶۴ھ بمطابق ۶ نومبر ۱۶۵۴ء کو بندرگاہِ سورت واپس ہوا اور دربار میں حاضر ہوا۔[1]

۱۲۹۔ سلطان ترکی کا سفیر ذوالفقار آقا۔

سلطان محمد خان (قیصر روم سلطانِ ترکیہ) —————— نے اپنے باپ کے وزیرِ اعظم صالح پاشا کے بھائی ذوالفقار آقا کو بطورِ سفیر شاہ جہاں کے دربار میں بھیجا۔ ذوالفقار آقا ۲۹ محرم ۱۰۶۴ھ بمطابق ۲۰ دسمبر ۱۶۵۳ء کو سورت کی بندرگاہ پر اترا۔ شاہ جہاں نے حکم دیا کہ حافظ ناصر سفیرِ مذکور کو بارہ ہزار روپیہ خزانہ شاہی سے مدد خرچ کے طور پر دے۔ روشن بیگ گرزدار فرمانِ شاہی اور خلعتِ فاخرہ لے کر جائے اور سفیر کو اپنے ساتھ لائے۔ راستے میں مندرجہ ذیل امراء ضیافت کے بطور مختلف رقمیں اسے ادا کریں۔ سلطان پور میں نذر خاں پانچ ہزار روپیہ دے۔ برہانپور میں سلطان اورنگ زیب بہادر کا نوکر محمد طاہر ان کی سرکار سے بارہ ہزار روپے تواضع کے لیے دے۔ اجین میں شاہزادہ مراد بخش کا دیوان پانچ ہزار روپے دے اور آگرے میں قلعدار بارہ ہزار روپے خزانہ شاہی سے اور تین ہزار روپے اپنی طرف

---

[1] عملِ صالح جلد دوم ص ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۶۷۵۔

سے ادا کرے۔ اس طرح سفیر کو کل پچاس ہزار روپے دیے جائیں۔ ۱؎

۷ رجمادی الاولیٰ ۱۰۶۴ھ بمطابق ۲۶ مارچ ۱۶۵۴ء کو شاہ جہاں کو اطلاع ملی کہ سلطانِ ترکی (قیصرِ روم) کا سفیر ذوالفقار آقا دہلی کی نواح میں آکر قدم بوسی کا منتظر ہے۔ شاہ جہاں عزت واحترام سے سفیرِ مذکور کو خوش آمدید کہنے کے لیے لشکر خاں بخشی روم طاہر خاں۔ قباد خاں اور تربیت خاں کو استقبال کرنے کے لیے بھیجتا ہے۔ قیصرِ روم کے سفیر ذوالفقار آقا نے دربار میں پہنچ کر کورنش تسلیم کے بعد قیصر روم کا سلام پہنچایا اور مراسلہ پیش کیا۔ اس کے ساتھ مرصع پٹی۔ مرصع خنجر ایک سرخ رنگ کا رومی گھوڑا مرصع زین اور دو عدد چار چاپول سمیت جو موتیوں سے آراستہ تھے۔ دوسرا گھوڑا سبزہ رنگ جو قیصر نے بطور تحفہ روانہ کیا تھا۔ نیز ایک مرصع گرز جو قیصر نے ترکوں کے دستور کے مطابق بھیجا تھا۔ شاہ جہاں کو پیش کیا۔ شاہ جہاں نے سفیر کو خلعتِ خاصہ، خنجر مرصع پٹی اور تیس ہزار روپے مرحمت فرمائے اور اس کے قیام کے لیے ایک مکان تجویز کیا گیا جو چاندی، سونے کے متعدد برتنوں رنگین فرشوں اور مختلف اشیاء سے اس طرح آراستہ تھا کہ اربابِ دولت دیکھ کر فخر کریں۔ اس میں سفیر کو ٹھہرایا۔ ۲۷ مارچ ۱۶۵۴ء کو دارا شکوہ کی ملاقات کی تاریخ تھی ذوالفقار آقا نے اس موقع پر نو گھوڑے اور کچھ متفرق اشیاء اپنی طرف سے پیش کیں۔ شاہ جہاں نے سفیر کو خلعت ارگجے سے بھرے ہوئے طلائی برتن، پاندان اور خوانچہ عنایت کیے۔ ۲؎

۱؎ عملِ صالح حصہ دوم ص ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ خافی خان حصہ دوم ص ۲۸۶۔ ۲۸۷۔

لشکر خان	ڈھائی ہزار ذات، ڈیڑھ ہزار سوار	عملِ صالح دوم ص ۸۷۷
طاہر خان	تین ہزار ذات ڈیڑھ ہزار سوار	" " " ۸۷۶
قباد خان	ڈھائی ہزار ذات۔ ہزار سوار	" " " ۸۷۷
تربیت خان	دو ہزار ذات۔ ڈیڑھ ہزار سوار	" " " ۸۷۹

۲؎ عملِ صالح جلد دوم ص ۶۳۶ تا ۶۴۱

شاہ جہاں نے یکم جمادی الثانیہ ۱۰۶۴ھ مطابق ۱۹؍اپریل ۱۶۵۴ء کو اپنے جلوس (تخت نشینی) کا اٹھائیسواں (سنِ جلوس ۲۸) جشن منایا۔ اس موقع پر سفیر ترکی ذوالفقار آقا کو طلائی ساز کا ترکی گھوڑا اور تیس ہزار ۳۰ روپے مرحمت کیے۔ شاہزادہ بلند اقبال داراشکوہ کی سرکار سے خلعتِ مرصع، چیغہ، نقرئی زین کے دو گھوڑے اور بیس ہزار ۲۰ روپے عطا ہوئے سلطان سلیمان شکوہ نے پانچ ہزار روپے عنایت کیے۔ شام کے وقت ذوالفقار آقا نواب قدسی القاب جہاں آرا بیگم صاحب کی کورنش کے لیے حاضر ہوا۔ ان کی سرکار سے خلعت فاخرہ اور پندرہ ہزار (۱۵،۰۰۰) روپے عطا ہوئے اور علامہ سعد اللہ خان سفیر مذکور کو پندرہ ہزار (۱۵،۰۰۰) روپے عنایت کرتے ہیں۔ مزید شاہ جہاں نے ذوالفقار آقا کو چار تسع تولے سونے کی مہر اور اتنے ہی وزن کا نقرئی روپیہ عطا کیا۔ یکم شوال ۱۰۶۴ھ مطابق ۱۵؍اگست ۱۶۵۴ء کو اکبر آبادی محل کی مسجد میں عید کا دوگانہ پڑھنے کے لیے شاہجہاں گیا۔ اس موقع پر ذوالفقار آقا سفیر ترکی کو پانچ ہزار روپے عنایت کیے۔[۱]

شاہ جہاں نے یہ بھی سنا تھا کہ قسطنطنیہ میں طاعون کی وبا شدت سے پھیلی ہوئی ہے اس لیے بہی خواہی و دوستی کی بنا پر اصلی زہر مہرہ کا جو طاعون کی مرض کے علاج کے لیے بہت ہی مفید اور کار آمد ہے۔ ایک قطعہ سلطان روم کے لیے سفیر ذوالفقار آقا کو عنایت کیا کہ وہ پہنچ کر سلطان کو بطور ہدیہ عطا کرے۔ سفیر کو بیش قیمت خلعت، مرصع چیغہ، میناکار طلائی ساز کی ڈھال تلوار طلائی ساز کا ایلق گھوڑا اور تیس ہزار (۳۰،۰۰۰) روپے مرحمت کر کے واپسی کی اجازت دی۔

ذوالفقار آقا کو جو سوغات دی گئی ان کی مجموعی قیمت ڈھائی لاکھ روپیہ تھی اور حاضری سے روانگی کے وقت تک پونے تین لاکھ روپے عنایت ہوئے تھے جس میں ایک لاکھ پچاس ہزار روپے شاہجہاں کی سرکار سے اور نوے ہزار روپے شاہزادوں اور امرائے نامدار کی جانب سے ملے تھے۔[۲]

۱۔ عملِ صالح جلد دوم ص ۳۸-۶ تا ۱۴۱-۶۔

۲۔ عملِ صالح حصہ دوم ص ۳۸-۶ تا ۱۴۱-۶۔

۱۳۰۔ شاہ جہاں کا ترکی کے لیے تیسری بار سفیر روانہ کرنا۔

شاہ جہاں نے سفیرِ ترکیہ ذوالفقار آقا کے جواب میں قائم بیگ کو اپنا سفیر بنا کر سلطان ترکیہ کے دربار کے لیے بھیجتا ہے۔ قائم بیگ پہلے لشکرِ شاہی کا کوتوال تھا۔ اس کے منصب میں اضافہ کیا۔ اسے خلعت، مرصّع چغہ، مینا کار جمدھر معہ پھول کٹارہ مینا کار ساز کی تلوار، سپر، مطلّا زین والا گھوڑا اور ایک لاکھ روپیہ دے کر سرفرازی بخشی اور علامہ سعد اللہ خان کا انشا کردہ مراسلہ اس کے ساتھ ارسال کیا۔ قیصرِ روم کے لیے یاقوت اور ہیروں سے مرصّع خنجر موتیوں اور زمرد کا ہار جو شاہی کارخانے میں ایک لاکھ روپے کی لاگت سے تیار ہوا تھا۔ ہیرے اور یاقوت کی مرصّع پیٹی کہ چالیس ہزار (۴۰۰۰۰) قیمت تھی۔ جہانگیری عطر سے بھرا ہوا بڑا بلوری کنستر جیسے ہندوستان کے چابک دست کاریگروں نے مدتوں محنت کر کے تیار کیا تھا۔ گجراتی اور کشمیری پارچوں کے دو ہزار تھان بطور ہدیہ ارسال کیے۔ جس کی مجموعی قیمت دو لاکھ روپے تھی۔

۲۸ ذی الحجہ ۱۰۶۵ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۶۵۵ء کو قائم بیگ جس کو شاہ جہاں نے ترکی کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ اس کی عرضداشت سے معلوم ہوا کہ قیصرِ روم کا سفیر ذوالفقار آقا جو بندرگاہِ سورت سے روانہ ہوا تھا اس کا سامان معہ جہاز طوفان میں ٹکرا کر غرق ہو گیا۔ اور خود جو پہلے سے بیمار تھا اس صدمے سے مر گیا۔

۲۰ ستمبر ۱۶۵۷ء بندرگاہِ سورت کے وقائع نگار سے معلوم ہوا کہ قائم بیگ سلطان روم کی سفارت انجام دینے کے بعد حلب پہنچا۔ حاکمِ حلب مرتضیٰ پاشا سے قائم بیگ کی ایسی گہری دوستی ہو گئی کہ وہ دونوں ہم نوالہ و ہم پیالہ ہو گئے۔ دونوں ایک دوسرے کے مسکن پر آتے جاتے تھے اور کوئی پردہ باقی نہ رہا۔ [۱]

اکبر و جہانگیر کے دور میں (۱۵۵۶ء تا ۱۶۲۷ء) تک سلطان ترکی سے کوئی تعلق

---

[۱] عمل صالح حصہ دوم ص ۶۶۰ - ۷۰۶ -

نہیں تھا۔ لیکن شاہ جہاں (۱۶۲۸ء - ۱۶۵۸ء) کے دورِ حکومت میں "اسلام" کو بطور رہنما قوت کے اختیار کیا گیا۔ اور مملکت کے ہر شعبہ میں اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں اصلاحات کی گئیں۔ خارجی تعلقات میں ترکیہ کو اس لیے اہمیت دی گئی کہ سلطان ترکی کو سیاسی و مذہبی حیثیت سے ۱۵۱۷ء سے ایک خاص اعزاز حاصل ہو گیا تھا۔ شاہجہان نے از خود سلطانِ ترکیہ کے پاس اپنا سفیر روانہ کیا اور اس کے جواب میں سلطان ترکی نے اپنا سفیر شاہ جہاں کے دربار میں روانہ کیا۔ سفراء کو دونوں حکمران خوش آمدید کہتے ہیں ان کی عزت و تکریم کرتے ہیں۔ قیمتی تحفے تحائف پیش کرتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے لیے نیک جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ اتحاد محض حکومتوں ہی کی سطح پر نہیں ہوتا بلکہ اس اتحاد سے عام مسلمان مطمئن اور خوش ہوتے ہیں۔ اور اتحاد اسلامی کی تحریک کو تقویت ہوتی ہے۔

تیسرا حصّہ

متبادل شریعت کی تلاش :

اسلام کے متعلّق اکبر کی معاندانہ اور جہانگیر کی (۱۵۵۶ تا ۱۶۲۷ء) منافقانہ پالیسی کو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی (۱۵۶۴ تا ۱۶۲۴ء) علمی۔ فکری اور عملی تحریک اتباع سنّت نبوی نے بے دست و پا کر دیا تھا اور اب اسلام کے خلاف تحریک میں کوئی قوت اور جان نہیں رہ گئی تھی۔ اس لیے شاہ جہان جب فروری ۱۶۲۸ء مطابق ۱۰۳۷ھ میں جانشین ہوا تو مثبت طور پر مملکت کی پالیسی کو شریعتِ اسلامی کے مطابق چلانے کی کوشش کی۔ کیونکہ اب شریعتِ اسلامی کے نفاذ سے کسی کو اعلانیہ اختلاف کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن معاندینِ اسلام، الحاد پرست اور کفر و اسلام کے امتزاج سے اسلام کا مرغوب و پسندیدہ اڈیشن تیار کرنے والے دانشور نہ تو خاموش تھے اور نہ ہی مطمئن۔ در پردہ ان کی سازشیں، تگ و دو جاری رہیں۔ وہ مملکت کی باگ ڈور کو شریعتِ اسلامی کے علمبردار کے برعکس اپنے "پسندیدہ اور مرغوب اسلام" کے قائد کے لیے مخصوص کروانا چاہتے تھے اس لیے شاہ جہاں کے بیٹوں میں سے سب سے بڑے لڑکے دارا شکوہ کو اپنے رنگ ڈھب کا پا کر اس کو نظری۔ فکری اور سیاسی طور نہ صرف آگے بڑھاتے ہیں۔ بلکہ اس کے گرد جمع بھی ہوتے ہیں اور اسی کو قائد اور راہنما بنا کر نہ صرف حکومت کے اداروں پر چھا جاتے ہیں۔ بلکہ حکومت پر قبضہ بھی کرتے ہیں۔

شاہ جہاں کے بیٹوں دارا شکوہ۔ شجاع۔ اورنگ زیب۔ مراد کی سیاسی رقابت محض حصولِ مملکت ہی کے لیے نہیں تھی۔ بلکہ ان میں شدید نظریاتی اختلاف بھی تھا۔ دارا شکوہ اور اورنگ زیب میں تو ابتدا ہی سے یہ اختلاف نظر آتا ہے۔ دونوں کی عملی زندگی، دلچسپی اور پسند و ناپسند ایک دوسرے سے مختلف تھی۔

دارا شکوہ شاہ جہاں کی سب سے بڑی نرینہ اولاد تھا۔ اور اپنے باپ کا بہت ہی لاڈلا بیٹا تھا۔ اس کو اپنے عہد کے بہترین استادوں نے تعلیم دی تھی۔ انشا پردازی

میں کمال حاصل تھا۔ اسے شعر و شاعری سے بھی رغبت تھی اور خطاطی سے بھی شغف تھا۔ اپنی تخلیقی ذہانت و صلاحیت سے بہت سی علمی کتابوں کا مصنف بھی بنتا ہے اس لیے شریعت کے معیار کے مطابق نہیں بلکہ LAW OF PRIMOGENITURE کے تحت مملکت کا وارث ہو سکتا ہے (بڑے لڑکے کو جانشینی کا حق حاصل ہونا)۔

دارا کی علمی و تخلیقی کتابوں کا آغاز شاہ جہاں کی تخت نشینی کے ۱۲ سال بعد ۲۷ر رمضان المبارک ۱۰۴۹ھ سے ہوتا ہے۔ شہزادوں میں سے دارا شکوہ پہلا شہزادہ ہے۔ جو اپنے خیالات، نظریات۔ تصورات اور افکار کو اپنی تحریروں کے ذریعہ سے عام لوگوں میں پیش کرتا ہے۔ لوگ اسے پڑھتے ہیں۔ متاثر ہوتے ہیں۔ ہمنوا ہوتے علمبردار بنتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگوں کے کان ضرور کھڑے ہوتے ہوں گے اور اختلاف بھی کیا ہو گا۔ دارا شکوہ کی پہلی علمی تصنیف "سفینۃ الاولیاء" ہے۔ جو اس نے پچیس سال کی عمر میں ۲۷ر رمضان المبارک ۱۰۴۹ء میں پیش کی۔ اس کتاب میں ۴۱۱ بزرگان دین کے مختصر حالات ہیں۔ ابتداء میں رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک ہے پھر خلفاء راشدین۔ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد آئمہ کے مناقب ہیں۔ اس کے بعد اولیاء اللہ کے احوال ہیں۔ جن میں قادریہ۔ چشتیہ۔ کبرویہ۔ سہروردیہ۔ سلاسل کا ذکر خاص طور پر ہے۔[1]

---

[1] بزم تیموریہ ص ۳۹۷ سید صباح الدین عبدالرحمٰن اعظم گڈھ و مقدمہ رقعاتِ عالمگیری ص ۳۵۶ سید نجیب اشرف ندوی۔ سفینۃ الاولیاء۔ دارا شکوہ۔ نفیس اکیڈیمی کراچی۔

نوٹ:۔ ۲۷ر رمضان المبارک کی تاریخ سال بھر میں بہت مقدس تاریخ ہے اور مسلمانوں میں بہت اہم اور متبرک دن ہے۔ اسی رعایت سے دارا شکوہ اس تاریخ کو اپنی پہلی علمی تصنیف سے لوگوں کو روشناس کرتا ہے۔

نوٹ:۔ تزک جہانگیری مترجم اعجاز الحق قدوسی (جلد اوّل اور جلد دوم) مجلس ترقی ادب لاہور آسانی سے دستیاب ہے اس لیے سہولت کے لیے اس کتاب میں اس کے صفحات کے بھی حوالے دیے ہیں۔

اس کتاب میں داراشکوہ ایک شہزادہ، دولت واقتدار کے مالک ہونے کے باوجود بڑے عجز وانکساری سے اپنے نام کے ساتھ "فقیر حقیر محمد داراشکوہ حنفی قادری تحریر کرتا ہے[۲]۔ دارا کی اس عجز وانکساری کے ساتھ بہت سے قابل قدر بزرگوں کے تذکرہ سے عام لوگ ضرور متاثر ہوئے ہوں گے اور اس کے متعلق ان کی رائے ضرور پسندیدہ ہوئی ہو گی۔

دارا اپنی اسی کتاب میں ماضی قریب کے دو بزرگ حضرت میاں میرؒ اور حضرت احمد کابلی سرہندی[۳] (حضرت مجدد الف ثانیؒ) کا تذکرہ بھی احترام وعقیدت سے کرتا ہے۔ یہ دونوں بزرگ اکبر اور جہانگیر کے دور (۱۵۵۶ء تا ۱۶۲۷ء) میں لاہور اور سرہند میں اپنے اپنے طور پر احیاء اسلام کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ لیکن جہانگیر نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں شیخ احمد سرہندی کے خلاف سن جلوس کے چودھویں سال ۱۶۱۹ء میں بہت سے الزامات لگائے اور آپ کے خلاف ادب وشائستگی اور شرافت سے گری ہوئی زبان استعمال کی اور قلعہ گوالیار میں قید کیا۔ اور اس کے بعد سن جلوس ۱۴ ہی میں جہانگیر لاہور میں حضرت میاں میر سے ملاقات کرتا ہے اور ان کے بارے میں نہایت ہی اچھے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ ان کی عزت واحترام کرتا ہے اور تعریف بھی کرتا ہے[۴]۔ اپنے ہمعصر دونوں بزرگوں کے ساتھ جہانگیر کا چند ماہ کے وقفہ کے بعد یہ امتیازی رویہ کیوں؟ جہانگیر ایک کو ناپسند کرتا ہے۔ اس کے خلاف ناراضگی غم وغصہ اور غیض وغضب کا اظہار کرتا ہے۔ اور اس کے

۲؎ سفینۃ الاولیاء۔ داراشکوہ ص ۱۷۔

۳؎ تزکِ جہانگیری ص ۵۶۳۔ وص ۵۹۱۔ تزکِ جہانگیری جلد دوم ترجمہ اعجاز الحق قدوسی ص ۱۰۸ و ۱۵۰۔

۴؎ تزکِ جہانگیری ص ۵۶۳ و ص ۵۹۱ وحصہ دوم ترجمہ اعجاز الحق قدوسی ص ۱۰۸، ۱۵۰۔

برعکس حضرت شیخ میاں میرؒ کے بارے میں بہت ہی اچھے۔ ادب و شائستگی سے پُر الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اور ان کی عزّت و تکریم بھی کرتا ہے[1] لیکن شیخ احمد سرہندی ان دنوں قلعہ گوالیار میں قید رہے اور ان پر انی سنگھ دلن نگران رہا۔ جہانگیر کا اپنے سن جلوس ۱۴ ہی میں دونوں بزرگوں کے ساتھ یہ متضاد رویہ اور سلوک کیوں رہا[2]

جہانگیر کا سن جلوس ۱۴ مطابق ۱۶۱۹ء ہی امن و سکون فتوحات کا دور ہے اس کے بعد ہی بدنظمی۔ انتشار۔ خانہ جنگی کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس اثناء میں جہانگیر ایک نئی بساط سیاست بچھانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ خرّم (شاہ جہاں) "بے دولت" کے خطاب سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کو شکست ہو جاتی ہے۔ اور اپنی خطاؤں کی معافی مانگ کر اپنے دو بیٹوں دارا شکوہ اور اورنگ زیب کو بطور یرغمال جہانگیر کے پاس روانہ کر کے معافی پاتا ہے[3]

حضرت میاں میر کے بارے میں جہانگیر کی تحریر

نوٹ :- شیخ میاں میر نہایت ہی فاضل، ریاضت کش۔ مبارک نفس۔ صبر و توکّل پر عمل کرتے ہیں۔ صفائی باطن سے بہرہ ور ہو چکنے کے علاوہ دولتِ فقر سے مالا مال اور حصولِ دنیوی سے بے نیاز ہونے کی صفت کا تذکرہ کرتا ہے۔ .... دیر تک تخلیے میں ان کے ساتھ عالمانہ صحبت رہی فی الواقع نہایت شریف النفس ہیں۔ اس دور میں ان کا وجود نہایت غنیمت و قیمتی ہے میں وارفتگی کے ساتھ ان سے محوِ کلام رہا اور نہایت ہی قابلِ قدر عارفانہ باتیں سننے میں آئیں " تزکِ جہانگیری ص ۵۹۱۔

---

[1] تزکِ جہانگیری ص ۵۶۳، ۵۹۱ حصہ دوم مترجم اعجاز الحق قدوسی ص ۱۱۸، ۱۵۰۔
مجلس ترقی ادب لاہور

[2] ایضاً " "

[3] ایضاً۔ "

شیخ احمد سرہندی اس اثنا میں قید، نظر بند ہی رہے۔ جہانگیر شاہ جہاں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ان کو رہا کرتا ہے۔ اور رہائی کے بعد دسمبر ۱۶۲۴ء بمطابق ۲۸ صفر المظفر ۱۰۳۴ھ کو انتقال ہو جاتا ہے۔ سطح بیں لوگوں کے نزدیک آپ کی تحریک احیاءِ شریعت یا تحریک احیاءِ اسلام و سنّت نبوی کی تحریک ناکام ہو جاتی ہے لیکن آپ کے متبعین اور آپ کی احیاءِ شریعت کی تحریک پر لبیک کہنے والے حضرات نہ تو مایوس اور نہ ہی دل گرفتہ ہوتے ہیں ان کے عزائم اور حوصلے اور قوی ہوتے ہیں۔ اور ان کی سرگرمیاں اور تیز ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ جب نومبر ۱۶۲۷ء کو جہانگیر کا انتقال ہو جاتا ہے۔ تو وہ گروہ حکومت کے کلیدی اداروں میں چھایا ہوا تھا جو احیاءِ شریعت کا حامی نہیں تھا۔ انتشار، طوائف الملوکی اور خانہ جنگی کی کیفیت دوبارہ شروع ہوتی ہے۔ ان سب کو شکست دے کر شاہجہاں ۱۳۔ فروری ۱۶۲۸ء بمطابق ۷، رجمادی الثانیہ ۱۰۳۷ھ حکمران ہوتا ہے تو اسی دن سے شیخ احمد سرہندی کا نام لیے بغیر ان کی تحریک احیاءِ سنّتِ نبوی کے نفاذ کی پیہم کوشش کر رہا ہوتا ہے اور اس سلسلے میں بہت سے اقدام بھی کیے جن کا تذکرہ پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ شاہ جہاں کے مثبت اقدام سے احیاءِ اسلام کی حامی قوتیں ابھرتی ہیں۔ قوی ہوتی ہیں اور اکبر اور جہانگیر یا اسلام کی مخالف قوتیں کمزور اور مغلوب ہو جاتی ہیں اور اپنے ابھرتے کے لیے نئے راستے تلاش کرنا شروع کرتی ہیں۔

حضرت شیخ احمد سرہندیؒ اور حضرت میاں میرؒ کے متعلّق جہانگیر نے جن متضاد رائے کا اظہار کیا وہ ایک حکمرانِ وقت کی رائے تھی۔ جس نے شہنشاہ کی حیثیت سے ایک کو ناپسند کیا۔ وہ اس کے معتوب ہوئے ان پر الزامات لگائے خلفاء کی شان میں گستاخی کے الزام میں قلعہ گوالیار میں قید کر دیا ... لیکن ان تینوں کا انتقال ہو چکا تھا۔ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ ۱۶۲۴ء بمطابق ۱۰۳۴ھ میں انتقال کرتے ہیں۔ جہانگیر نومبر ۱۶۲۷ء اور حضرت میاں میرؒ ۱۰۴۵ھ میں انتقال کرتے ہیں[۵] اب تینوں کے وہ افکار، نظریات اور

---

۵ دارا شکوہ۔ سفینۃ الاولیاء ص ۱۰۳۔ نفیس اکیڈمی۔

کارنامے ہیں جو باقی ہیں اور وہی لوگوں کو متأثرؔ کرتے ہیں۔

دارا شکوہ اور اورنگ زیب دونوں شاہ جہاں کے بیٹے ہیں اور دونوں جہانگیر کے پاس بطور یرغمال کے رہے ہیں۔ جہانگیر دونوں کا دادا ہے اور اسی نے ان دونوں کے نام بھی رکھے تھے۔ دربار میں جو نظریات اور خیالات پرورش پا رہے تھے ان سے یہ آشنا ہوتے ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ دونوں بھائی ابتدا ہی سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

دارا شکوہ شاہجہان کی تخت نشینی کے تیرہ سال بعد اپنی پچیس سال کی عمر میں اپنی پہلی تصنیف "سفینۃ الاولیاء" لکھتا ہے اور اس میں شیخ احمد سرہندی کے انتقال کے پندرہ سال بعد (۱۰۳۴ھ میں انتقال ہوا ہے) تحریر کرتا ہے:

"آپ متأخرین مشائخ اور صاحبِ ریاضت و مجاہدات اور صاحبِ تصانیف ہیں۔ آخر حال میں بعض لوگوں نے شیخ پر یہ اتہام لگایا۔ کہ شیخ اپنا مرتبہ خلفائے راشدین سے زیادہ بتلاتے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ افتراء اور بہتان تھا۔ جو مخالفین نے آپ پر لگایا تھا۔"[۵]

دارا شکوہ محض ایک فرد اور عام دانشور ہی نہیں تھا۔ بلکہ وہ شاہ جہاں کا سب سے بڑا اور چہیتا بیٹا بھی تھا۔ اور حکومت کے ایوان اور کاروبارِ مملکت میں ایک اہم مقام رکھتا تھا۔ اس لیے دارا کے یہ الفاظ بڑی وقعت رکھتے ہیں۔ شیخ احمد سرہندیؒ پر جہانگیر کے آخری عہدِ حکومت میں عتاب نازل ہوتا ہے۔ اور الزام لگایا جاتا ہے اور قید کر دیے جاتے ہیں۔ لیکن آج دارا شکوہ اسے افتراء اور بہتان قرار دے رہا ہے اس تحریر سے شیخ احمد سرہندیؒ کے متبعین خوش ضرور ہوتے ہوں گے۔ اور دارا کی صاف گوئی اور غیر جانبداری سے عام لوگ ضرور متأثر ہوئے ہوں گے۔ کہ پہلی بار خاندانِ شاہی کا ایک اہم فرد آپ کو بے گناہ بتلا رہا ہے۔

---

[۵] سفینۃ الاولیاء ص ۷۴، ۲۔ دارا شکوہ۔ نفیس اکیڈمی۔

لیکن دارا شکوہ نے اپنی اس کتاب میں مختلف سلسلوں کے بزرگوں کے جو حالات لکھے ہیں۔ ان کو عزت و احترام تو کہا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ تمام مسلمانوں کے لیے حجت نہیں ہو سکتے۔ مسلمانوں کے لیے قرآن و سنّت نبوی ہی حجت ہو سکتی ہے۔ اس لیے دارا نے شریعتِ نبوی اور اسلام کے لیے ایک نئے طریقہ کی ابتدا کی۔

دارا شکوہ اپنی اسی کتاب میں ایک دوسرے بزرگ میاں میر جو جہانگیر ہی کے ہمعصر تھے۔ اور جہانگیر ۱۶۱۹ء میں ان سے ملاقات کرتا ہے۔ وہ ان کے بارے میں تحریر کرتا ہے کہ حضرت میاں میرؒ زمانے کے قطب، پیشوا، امامِ طریقت۔ واقفِ اسرارِ حقیقت علوم ظاہری و باطنی میں یکتائے روزگار اور عارفِ کامل تھے۔ ظاہری اور باطنی حقیقت اور قابلیت میں اتنا بلند مقام تھا کہ بڑے بڑے فاضل شخص کو بھی ان کے سامنے مجالِ سخن نہ ہوتی تھی۔ فقر و غنا توکّل۔ قناعت ترکِ دنیا و زہد و عبادت میں اپنے زمانے میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ شب و روز ذکرِ الہٰی میں مستغرق رہتے تھے[۱] میاں میرؒ لاہور میں ۱۰۴۵ھ میں انتقال کر جاتے ہیں۔ اور دارا ان کے بارے میں یہ توصیفی کلمات ۱۰۴۹ھ میں تحریر کرتا ہے۔ اس وقت وہ زندہ تو نہیں تھے البتہ ان کے مریدین، معتقدین اور متاثرین کی ایک بہت بڑی تعداد بقید حیات تھی وہ دارا کے ان تعریفی کلمات سے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے کہ ان کے پیر و مرشد سے ایک مرحوم شہنشاہ جہانگیر ۱۶۱۹ء میں ملاقات کرتا ہے۔ اور ان کے بارے میں تعریفی کلمات تحریر کرتا ہے[۲] اب اس کا پوتا دارا شکوہ ان کے پیر و مرشد کے انتقال کے بعد ان کی صفات اور دینداری کا تذکرہ کرتا ہے اس لیے وہ ایک مقتدر دینی راہنما ہیں۔ ان کا طریقۂ عبادت اور طریقِ زندگی اور مسلک ہی اسلام ہے۔ اس لیے کہ ان کی بزرگی۔ دینداری پر ایک حکمرانِ وقت اور ایک شہزادہ عین عنفوانِ شباب

---

[۱] دارا شکوہ۔ سفینۃ الاولیا ص ۱۰۲۔

[۲] تزکِ جہانگیری ص ۵۹۱۔ تزکِ جہانگیری حصہ دوم ص ۱۵۰۔

ہی ہیں ان کی دینداری پر گواہی دے رہا ہے اور اس کی یہ کتاب سفینۃ الاولیاء اس کی دینداری اور بزرگانِ دین کی عزت و تکریم کی دلیل ہے۔

داراشکوہ نے جس طرح ماضی قریب کے دو انتقال شدہ اور جہانگیر کے ہمعصر بزرگوں کا اپنی اولین تصنیف میں تذکرہ کیا ہے۔ اس سے دارا کا اسلام کے متعلق نقطہ نظر معلوم ہوتا ہے وہ قرآن و سنّت نبوی کے پیمانے پر نہیں بلکہ بزرگوں کے رویّہ پر اسلام کو پرکھتا ہے۔ دارا اپنی اسی کتاب میں اپنے کو "فقیرِ حقیر داراشکوہ حنفی قادری" کے نام سے منسوب کرتا ہے۔ اس سے عام لوگوں میں وہ "اسلام دوست" کے نام ہی سے متعارف ہوتا ہے اور لوگوں کو اس سے اسلام ہی کی سربلندی کی توقّع ہوتی ہوگی۔ اس سے عام مسلمانوں میں داراشکوہ کی قدر و منزلت میں اضافہ اور لوگوں میں اس کے لیے قبولیت عام کا جذبہ پیدا ہوگا۔ دارا کے ان خیالات سے اس کی اسلام سے وابستگی ظاہر ہوتی ہے۔ اور عام مسلمانوں کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوا ہوگا۔

اکبر اور جہانگیر کے دورِ حکومت میں:

شہنشاہ اکبر اور شیخ احمد سرہندی اور شیخ میاں میر شہنشاہ جہانگیر کا دورِ حکومت (۱۵۵۶ء تا ۱۶۲۷ء) ہندوستان میں (متحدہ قومیت، مشترک ثقافت اور مخلوط کلچر) اور احیاءِ اسلام یا شریعت کی احیاء کی تحریک کے لیے بہت ہی اہم ہے۔ اکبر نے ہندو راجپوت عورتوں سے شادی کی۔ یا سورج بنسی اور چندر بنسی ہندو راجپوت راجاؤں نے برضا و رغبت اپنی لڑکیوں کو اکبر کو شادی کے لیے پیش کیا۔ اس واقعہ سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اس سے مسلم معاشرے کی فکری وحدت و سالمیت میں شگاف پڑتا ہے۔ اور اسلامی شریعت کا زوال شروع ہوتا ہے۔ اکبر۔ ہندویت۔ جین ازم۔ بدھ مت۔ مجوسیت (آتش پرست)، اور عیسائیت کے مرکّب فکر کو اپناتا ہے۔ اور اسلام ہی کے نام سے نافذ کرنے کی پالیسی اختیار کرتا ہے (پرتگال کے عیسائی باشندوں کے) تین وفد 1577ء 1590ء 1594ء (V.A SMITH.)

AKBAR THE GREAT MOGUL 1542-1605 (PP 111-132)

اکبر سے ملاقات کرتے ہیں ان سب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ اکبر نبوّت کا لفظاً نہیں معناً انکار کرتا ہے۔ اور ایک ایسے معاشرہ اور ثقافت کو پروان چڑھاتا ہے۔ جس کی اساس یا بنیاد "عقل" فلسفہ۔ مفاد۔ تجربات اور مصلحتِ ملکی پر ہوتی ہے اور شریعت اسلام یا شریعتِ نبوی محکوم اور تابع ہوتی ہے۔ حج جو باستطاعت مسلمانوں پر قرآن وسنّتِ نبوی کی رُو سے فرض ہے۔ قرآن کے الفاظ میں:

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا۔

ترجمہ:۔ اور لوگوں پر اللہ (کی خوشنودی) کے لیے حج فرض ہے اور جو بھی اس راہ میں قدرت رکھتا ہو۔ وہ بیت اللہ کا حج کرے۔

(آل عمران ۹۷)

اور حدیث کی رو سے:

یَآاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ فُرِضَ عَلَیْکُمُ الْحَجُّ فَحُجُّوا۔ (مسلم)

ترجمہ:۔ اے لوگو تم پر حج فرض کیا گیا ہے۔ پس تم ضرور حج کرو۔

اس پر پرتگالی عیسائیوں نے پابندی لگا رکھی تھی۔ حاجیوں اور ان کے جہازوں کو لوٹ لیا جاتا تھا۔ خود اکبر کی پھوپھو بابر کی بیٹی اور ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم کو پرتگالی عیسائی روکتے ہیں۔ لیکن اکبر کو اس رکاوٹ پر کوئی احساس نہیں ہوتا۔ اور کسی قسم کا ردِ عمل ظاہر نہیں کرتا۔ بلکہ اسلامی شعائر اور ایک اسلامی فرض کو روکنے والوں کو یکے بعد دیگرے تین بار دربار میں طلب کرتا ہے اور ان کی عزت وتکریم کرتا ہے۔

اکبر ہی کے دور میں مسلمانوں کی وحدت اور سالمیت کو ختم کرنے کے لیے شیعہ اور سُنی کو دو متحارب فکر میں تبدیل کروایا۔ مسلمانوں کے سوادِ اعظم کی دل آزاری کرنے کے لیے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو باغِ فدک، حضرت عمر رضؓ کو واقعۂ قرطاس حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کو واقعہ افک۔ حضرت طلحہ رضؓ اور حضرت زبیر رضؓ کو جنگِ جمل کے واقعات الزام دیکر اور ان کی غلط تعبیر اور ترجمانی کر کے ان بزرگانِ دین کی نہ صرف تنقیص کی جاتی بلکہ اس سے

مسلمانوں کے جذبات کی دل آزاری کی جاتی ہے۔ اور ان لوگوں کو اعلیٰ عہدے اور منصب دیے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ سب ہی لوگ خوش تھے اور اکبرؔ ایک ایسا معاشرہ وجود میں لانے میں کامیاب ہوگیا اور اس کی ذات کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گی اور شریعت کی اہمیت اور مرکزیت اجتماعی معاشرے میں ختم ہوگئی۔

حضرت شیخ احمد سرہندی اکبرؔ ہی کے دور میں ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ بلکہ اکبرؔ ہی کے دور میں معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں شریعتِ محمدی کو نظر انداز کیا جا رہا تھا اس کے اس کام میں اس کا سب سے ممد و معاون ابوالفضل تھا۔ جو اکبر نامہ اور آئینِ اکبری ایسی کتابوں کا مصنّف ہے جو اپنے عہد کا ایک عظیم مورخ شمار کیا جاتا ہے۔ اقتدار و دولت۔ ثروت۔ عقل و خرد کا مالک تھا۔ اکبر کے نورتن کا سردار تھا بیرؔبل۔ ٹوڈرمل۔ مرزا عزیز کوکہ (خانِ اعظم) ایسے لوگ اکبر کے دربار کی زینت تھے لیکن ابوالفضل تاریخ کا ایک واحد مؤرّخ ہے جو اپنے ممدوح کی زندگی میں ۱۶۰۲ء بیر سنگھ بندیلہ کے ہاتھوں قتل ہوتا ہے۔ اور اس کے عوض بیر سنگھ کثیر رقم انعام میں پاتا ہے اور ہندویت کے احیا کے لیے مندریں بنواتا ہے۔ ابوالفضل کے قتل سے اکبر فکر و فلسفہ کی طرف سے مفلوج ہو جاتا ہے۔ اکبر کے آخری زمانے میں اکبر کے پوتے اور جہانگیر کے لڑکے خسرو کو مان سنگھ (بھانجا تھا) مرزا عزیز کوکہ (خانِ اعظم) (داماد تھا) حکمران بنانے کی تگ و دو کرتے ہیں۔ لیکن شیخ احمد سرہندی کے پیر بھائی اور ان کے معتقد شیخ فرید بخاری۔ مان سنگھ اور خانِ اعظم کی کوششوں کو ناکام کرتے ہیں اور خسرو کو شکست پر شکست دیتے ہیں۔

شیخ احمد سرہندی اکبر کے دور میں ذہنی و فکری طور پر بیدار مغز رہے ہیں۔ ان کے فیضی اور ابوالفضل سے تعلقات رہے۔ لیکن فیضی کی ذہانت اور ابوالفضل کی انشاد نگاری سے نہ مرعوب ہوئے۔ بلکہ ان سے آنکھ ملا کر باتیں کرتے ہیں ۱۶۰۳ء میں شیخ احمد سرہندی خواجہ باقی باللہ کے انتقال کے بعد سنّتِ نبوی کا عَلَم لے کر اٹھتے ہیں۔ تو شیخ فرید بخاری کو یکے بعد دیگرے بارہ خطوط مکتوب نمبر ۴۳ تا ۵۴ جلد اوّل لکھتے ہیں

شیخ فرید کی معرفت اکبر کے مستحکم قلعہ میں شگاف پڑ جاتا ہے۔ اب جہانگیر کو اپنی حکومت کی فکر ہوتی ہے اور شیخ احمد سرہندی کو شریعت نبوی کی تحریک آگے بڑھانے کی فکر

حضرت شیخ احمد سرہندی اکبر ہی کے دور میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں شریعت کو نظر انداز کیا جا رہا تھا۔ ان اقدامات اور واقعات کو دیکھ رہے تھے کہ جس سے غیر اسلامی نظریات کو غلبہ ہو رہا تھا۔ اس لیے وہ اپنی ذہنی۔ علمی اور فکری تحریک کا اپنے مکتوبات کے ذریعہ سے آغاز کرتے ہیں۔ آپ کی "اثبات النبوۃ" سے اکبر کے تعمیر کردہ معاشرہ جس میں عقل۔ فلسفہ، تجربہ، "مصلحت ملکی" کو معیار قرار دیا گیا کے انہدام کا آغاز کیا۔

اکبر نے مسلمانوں کی وحدت اور سالمیت کو ختم کرنے کے لیے قاضی نور اللہ شستری کو قاضی القضاۃ مقرر کیا تھا۔ جو ایک ایسے معاشرے کی تشکیل میں اکبر کے معاون رہے ہیں۔ جو شیعیت کی بنا پر اکبر کی حکومت کے ایک اہم ستون رہے ہیں۔ اور مسلم معاشرے میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ کے بارے میں بے سرو پا باتیں کرتے ہیں اور مسلمانوں کے سواد اعظم کا لحاظ نہیں کرتے اور بے سرو پا باتیں ان بزرگان دین کے خلاف کہتے ہیں۔

شیخ احمد سرہندی نہ اس پر خاموش رہے نہ گوشہ عافیت اختیار کیا۔ بلکہ اپنے مکتوبات میں مثبت انداز میں ان بزرگان دین کی عظمت بیان کرتے ہیں۔ اس لیے معاشرے میں جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس سے پاکیزہ سیرت لوگوں کی اصلاح ہوتی ہے۔ لیکن حکومت کے اعلیٰ ترین اور مقرب ترین لوگ اس سے گھبراتے ہیں اور جہانگیر کو آپ کے خلاف ورغلاتے ہیں اور جہانگیر آپ کو خلفاء کی شان میں گستاخی کے الزام میں آپ پر بے سرو پا الزام لگا کر ۱۶۱۹ء میں قلعہ گوالیار میں قید کرتا ہے اور ایک نئے دور کا آغاز کرتا ہے جس سے امن و سکون درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ملک میں انتشار و خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن حضرت مجددؒ کی جلد اول جو ۳۱۳ خطوط پر مشتمل تھی اور کتابی شکل میں ۱۶۱۶ء میں شائع ہو چکی تھی۔ اس میں لوگوں کو احیاءِ شریعت پر آمادہ کیا گیا تھا۔

شریعت اسلام کے متعلق جو شکوک و شبہات پیدا ہو گئے تھے۔ ان کو قرآن و سنّت کی روشنی میں دور کیا۔ اس طرح معاشرے میں خود اعتمادی اور عزیمت پر مشتمل ایک باعمل اور باکردار و باصلاحیت گروہ پیدا ہو گیا۔ جس سے جہانگیر کے مقرب ترین امراءِ مملکت اور جہانگیر خود خوفزدہ تھا۔ اسی لیے وہ مظالم اور دشمنی کا آغاز بھی کرتا ہے لیکن نومبر ۱۶۲۷ء میں جہانگیر کا انتقال ہو جاتا ہے تو مزاحمت۔ مخالفت کے باوجود شاہ جہان فروری ۱۶۲۸ء میں حکمران ہوتا ہے اور شیخ احمد سرہندی کی تحریک احیاءِ سنّتِ نبوی کے نفاذ کی کوشش کرتا ہے آپ کے انتقال۔ کے پندرہ سال بعد (۱۰۳۴ھ میں انتقال ہوتا ہے) دارا شکوہ اپنی اوّلین تصنیف سفینۃ الاولیاؑ میں تحریر کرتا ہے کہ آپ کے خلاف الزام ایک بہتان اور افترا تھا۔

شیخ احمد سرہندی اکبر اور جہانگیر کے دور میں ایک متحرک۔ سرگرم مضطرب دل و دماغ کے مالک رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں سے لوگوں کو بیدار کیا اور احیاءِ اسلام کے بلند و بالا مقصد کے لیے عام مسلمانوں کو ایک مقصد اور نصب العین کے لیے سرگرمِ عمل کر دیا۔

میاں میرؒ۔ اکبر اور جہانگیر ہی کے دور حکومت میں لاہور میں ایک معروف بزرگ رہے ہیں جنہوں نے ۶۰ سال تک لوگوں کو نیکی۔ سچائی۔ فقر و غنا۔ راستبازی قناعت، دنیا سے بے تعلّقی کی تعلیم دی اور ان کا حلقہ متاثرین بہت وسیع تھا اور عوام میں مقبول بھی تھے۔ جہانگیر اپنے جلوس کے چودھویں سال شیخ احمد سرہندی کو قلعہ گوالیار میں قید کرنے کے بعد ماہ بہمن کی ۱۴ تاریخ کو حضرت میاں میرؒ سے ملاقات کرتا ہے۔ اور ان کے بارے میں نہایت ہی شائستہ الفاظ استعمال کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ نہایت ہی فاضل۔ ریاضت کش۔ مبارک نفس۔ صبر و توکل پر عمل کرتے ہوئے صفائی باطن سے بہرہ ور ہو چکنے کے علاوہ دولتِ فقر سے مالا مال اور حصولِ دنیوی سے بے نیاز ہیں .... دیر تک تخلیے میں ان کے ساتھ عالمانہ صحبت رہی فی الواقع نہایت شریف النفس ہیں اس دور میں ان کا وجود

نہایت غنیمت و قیمتی ہے۔ میں وارفتگی کے ساتھ ان سے محوِ کلام رہا اور نہایت ہی قابلِ قدر عارفانہ باتیں سننے میں آئیں[1] اس کے برعکس چند ماہ قبل جہانگیر شیخ احمد سرہندی کے بارے میں لکھتا ہے کہ ایک جعل ساز ۔مکروفریب کا جال بچھا کر بھولے بھالے لوگوں کو پھانستا ہے۔ ہر شہر اور ہر علاقے میں اپنا ایک خلیفہ مقرر کرتا ہے.......... لوگوں کو فریب دینے اور معرفت کی دکان داری کرنے میں پختہ ہے۔ مریدوں اور معتقدوں کے نام وقتاً فوقتاً واہیات خطوط لکھتا ہے[2]۔ جہانگیر کے یہ اپنے الفاظ اور اسی کی تحریر ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیخ میاں میرؒ سے کس قدر خوش مطمئن اور ان کے تصوّرِ اسلام اور طریقِ زندگی کو پسند کرتا ہے۔ لیکن شیخ احمد سرہندی کے اسلام اور تصوّرِ اسلام سے غیر مطمئن اور شاکی ہے۔ جہانگیر کا پوتا داراشکوہ اپنے شہزادگی کے زمانے میں اپنی اوّلین تصنیف سفینۃ الاولیاء میں میاں میرؒ کے بارے میں تحریر کرتا ہے کہ "حضرت میاں میرؒ زمانے کے قطب۔ پیشوا۔ امامِ طریقت۔ واقفِ اسرار۔ حقیقتِ علومِ ظاہری و باطنی میں یکتائے روزگار اور عارفِ کُل گزرے ہیں۔ ظاہری اور باطنی حقیقت میں اتنا بلند مقام تھا کہ بڑے بڑے فاضل شخص کو بھی ان کے سامنے مجالِ سخن نہ ہوتی۔ فقر و غنا اور ترکِ دنیا و زہد و عبادت میں اپنے زمانے میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ شب و روز ذکرِ الٰہی میں مستغرق رہتے تھے[3]۔

حضرت میاں میرؒ اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ ایک شہنشاہِ وقت جہانگیر ان کے طرزِ عمل سے خوش اور مطمئن تھا۔ ان کے مریدین و معتقدین سے بھی خوش رہا ہوگا اور اب اسی کا پوتا اور شہنشاہِ وقت شاہ جہاں کا سب سے بڑا بیٹا داراشکوہ

۱۔ تزکِ جہانگیری ص ۵۹۱۔ مترجم اعجاز الحق قدوسی حصہ دوم ص ۱۵۰

۲۔ تزکِ جہانگیری ص ۵۶۳ " " ص ۱۱۸

۳۔ سفینۃ الاولیاء ص ۱۰۲۔ داراشکوہ۔ نفیس اکیڈمی کراچی۔

اپنی شہزادگی ہی کے زمانے میں اپنی اوّلین علمی تصنیف میں ان کے بارے میں خوشنما اور دل خوش کن الفاظ استعمال کرتا ہے[1] لیکن دارا کے یہ دل خوش کن الفاظ کسی اور مقصد کی غمازی کرتے ہیں۔ وہ قرآن۔ سنّتِ نبوی کی اتباع میں اپنی حربی اہلیت وصلاحیت سے نہیں۔ بلکہ بزرگوں کی معرفت آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ شیخ میاں میرؒ کے سہارے اپنے مرغوب اور پسندیدہ اسلام کو حضرت شیخ احمد سرہندی کی تحریک اتباع سنّتِ نبوی کے مقابل پیش کرنے کا عزم کرتا ہے۔ یہ خیال رہے کہ حضرت میاں میرؒ کو انتقال کئے ہوئے چار سال ہو چکے تھے اور دارا کی یہ کتاب ۲۷ رمضان المبارک ۱۰۴۹ھ میں آئی ہے اب وہ میاں میرؒ کے معتقدین کی معرفت آگے بڑھنے کا ارادہ کرتا ہے۔

خواب کی معرفت متبادل شریعت کا جواز:۔

۲۷ رمضان المبارک ۱۰۴۹ھ کو عام لوگوں کو اپنی اوّلین تصنیف سے متعارف کراتا ہے اور اپنے نام کے ساتھ نہایت عجز وانکساری "فقیر حقیر محمد دارا شکوہ حنفی قادری" تحریر کرتا ہے لیے دارا اپنی اس کتاب کی معرفت اپنے کو آگے بڑھاتا ہے۔ قرآن سنّت نبوی کی بنیاد پر اپنی باتیں اور خیالات پیش نہیں کرتا بلکہ ۴۱۱ بزرگان دین کی سوانحیات لکھ کر اپنے کو حامیٔ اسلام ثابت کرتا ہے۔ اب اپنی نئی کتاب اور خیالات وفکر کی قبولیت کے لیے ایک نیا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ کہ "خواب میں فرشتہ نے مجھے آواز دی اور چار مرتبہ کہا کہ "تجھے اللہ تعالیٰ ایسی چیز عنایت کرے گا۔ جو روئے زمین پر کسی بادشاہ کو نہیں ہوئی۔ نیند سے بیدار ہو کر میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اس قسم کی سعادت البتہ عرفان ہو گی اور بے شک اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و

---

[1] سفینۃ الاولیاء ص ۱۷۔ مقدمہ رقعات عالمگیری ص ۵۰۶ و بزم تیموریہ ص ۳۹۹۔

وکرم سے مجھے یہ دولت بخش دے گا۔ ان اللہ غفور رحیم ط۔ میں ہمیشہ اس دولتِ عظمیٰ کا طالب رہا۔ یہاں تک کہ ۲۹ ذی الحجہ ۱۰۴۹ھ کو ایک دوستِ خدا کی صحبت میں پہنچا وہ مجھ پر نہایت مہربان ہوا۔ جو بات دوسرے لوگوں کو ایک مہینہ میں حاصل ہوئی وہ مجھے پہلی رات میں مل گئی اور جو کچھ دوسرے ایک سال میں حاصل کرتے تھے مجھے ایک مہینہ میں حاصل ہو گئی جہاں اور کوئی طالب سالہا سال کے مجاہدوں اور ریاضتوں سے پہنچتا۔ میں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بغیر ریاضت یکبارگی پہنچ گیا۔ دونوں جہاں کی محبت میرے دل سے اُٹھ گئی اور فضل ورحمت کے دروازے میرے دل پر کھل گئے اور جو کچھ میں چاہتا تھا وہ مجھے مل گیا۔[1]

دارا کی یہ اپنی کیفیات ہیں جس کا علم قرآن وسنّتِ نبوی صحابہ کبار اور آئمہ کبار کے قول وعمل سے نہیں بلکہ محض خواب میں ایک فرشتہ کی آواز اور اس کی بشارت کی بنیاد پر تھا۔ اب دارا اس سے عام لوگوں کو مطلع کرتا ہے اس دعویٰ او بشارت پر اندھے مقلد ہی ایمان لا سکتے ہیں یا وہ لوگ جو۔ کہنے کو تو مسلمان ہیں لیکن قرآن وسنت کے پیرو نہیں ہیں یا جو قرآن وسنّت پر ایمان نہیں رکھتے۔ دارا کی یہ تحریر وخیالات دانشوری کے اس گروہ کو پسند آئی جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت سے فرار اختیار کرنا چاہتے تھے۔ وہ دارا کی فکری تبدیلی کو پسند کرتے ہیں اور اس کے گرد جمع ہونا شروع ہوتے ہیں۔ لیکن ....

..... صحیح الخیال اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کو دارا کی یہ تحریریں پسند نہ آتی ہوں گی۔ وہ تذبذب میں مبتلا ہو گئے ہوں گے دوسرے دارا نے خود اپنے بیان کے مطابق جس عجلت اور تیزی سے راہِ سلوک کی منزلیں طے کیں وہ ہندوستان میں کسی صوفیائے کرام نے نہیں کی۔ دارا کا یہ دعویٰ کرنا کہ اس نے یکبارگی ہو سب کچھ" حاصل کر لیا مضحکہ خیز

---

[1] سکینۃ الاولیاء۔ مصنفہ دارا شکوہ۔ بحوالہ بزمِ تیموریہ ص ۳۹۹۔ سید صباح الدین عبدالرحمان اعظم گڑھ۔

معلوم ہوتا ہے[1] دارا یہیں سے ایک راستہ اختیار کرتا ہے جس سے عام مسلمان مطمئن نہیں ہوتے اور دارا عام مسلمانوں کو اپنے "پسندیدہ" اسلام پر مطمئن کرنے پر تلا نظر آتا ہے اور یہی وہ مرحلہ ہے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت سے انحراف کرنے والے اور بزرگانِ دین کے اسلام یا متبادل شریعت کے متلاشی دارا کے گرد جمع ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

دارا شکوہ خواب میں فرشتہ ہی کی بشارت پر ۲۹۔ ذی الحجہ ۱۰۴۹ھ کو زبدۃ العارفین میاں میرؒ کے خلیفہ ملا شاہ بدخشی کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے[2]۔ ملا شاہ بدخشی کا آبائی وطن بدخشاں تھا وہ ۱۰۳۳ھ میں لاہور آئے اور میاں میرؒ کی خانقاہ میں حاضری کی سعادت حاصل کی اور ان کے انتقال کے بعد ان کے خلیفہ ہوئے۔ دارا انہیں کا مرید ہوتا ہے وہ اپنے پیر "لسان اللہ" ملا شاہ محمد اور پیرو مرشد میاں میرؒ (ملاجیو) کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور شاہ جہاں کے سن جلوس ۱۴ یکم جمادی الاُخریٰ ۱۰۵۰ھ بمطابق ۱۸ ستمبر ۱۶۴۰ء کو جشن جلوس کے عشرت انگیز موقع پر ملا شاہ جو زبدۃ العارفین حضرت میاں میرؒ قادری کے خلیفہ ہیں وہ بادشاہ کے فیضِ صحبت سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور اس موقع پر معرفت اور توحید کے بہت سے نکتے بیان کرتے ہیں[3] ملا شاہ بدخشی اور شاہ جہاں کی یہ ملاقات شاہ جہاں اور اس کے خاندان اور شیخ احمد سرہندی کی تحریک احیاءِ شریعت کو ایک نئے حالات سے دوچار کرتی ہے یہیں سے دارا تحریک احیاءِ سنتِ نبوی کو ایک نئی سمت پر موڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

---

[1] بزمِ تیموریہ ص ۴۰۰۔

[2] مقدمات رقعات عالمگیری ص ۳۵۷۔

نوٹ:۔ میاں میر ۷ ربیع الاول ۱۰۴۵ھ کو انتقال کرتے ہیں اور دارا شکوہ ۲۷ رمضان المبارک ۱۰۴۹ھ سفینۃ الاولیاء لکھتا ہے اور اس کے تین ماہ دو دن بعد خواب کی بنیاد پر ۲۹۔ ذی الحجہ ۱۰۴۹ھ کو ملا شاہ بدخشی کا مرید ہوتا ہے۔

[3] عملِ صالح حصہ دوم ص ۲۷۳۔

دارا ملاشاہ بدخشی کے ہاتھوں بیعت ہونے کے بعد میاں میرؒ کی روحانیت سے بہت متاثر ہوتا ہے ان کو باری تعالیٰ کہتا ہے (ایشاں را حضرت باری تعالیٰ گفتم) انہیں کی معرفت وہ "وحدۃ الوجود" سے متعارف ہوتا ہے اور ہمہ تن میاں میرؒ کے حالات ملفوظات کرامات اور ان کے خاندان اور خلفاء کے احوال تفصیل سے لکھنا شروع کرتا ہے۔ لکھتا ہے کہ ملا جیو (میاں میرؒ) نے خواب میں اس کو مشاہدہ اور مراقبہ کرنا سکھایا اور خواب ہی میں اپنے سینے کی امانت اس کے سینے میں منتقل کر دی اس کے بعد ہی سلوک میں فتح پر فتح حاصل ہوئی۔ ملا جیو (میاں میرؒ) کو اپنے مریدوں سے غیر معمولی شیفتگی تھی۔ وہ اپنے "یاروں" اور "مریدوں" سے کہا کرتے تھے کہ جس طرح میں دارا کے حال کی طرف متوجہ رہتا ہوں تم بھی رہا کرو اگر تم اس کی طرف متوجہ نہ ہو گے تو خدا سے پھر جاؤ گے۔ (العیاذ باللہ) وہ اپنے مریدوں کو دارا شکوہ ہی کی صورت کا مراقبہ کرنے کی تلقین کرتے تھے[1]

دارا شکوہ کا ملا شاہ بدخشی اور میاں میرؒ کی تعلیمات کی طرف ہمہ تن توجہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ۲۸ سال کی عمر میں ۱۰۵۲ھ میں اپنے پیر و مرشد کے پیر میاں میرؒ (ملا جیوؒ) کی سوانح حیات "سکینۃ الاولیاء" کے نام سے لکھی یہ دارا شکوہ کی دوسری علمی تخلیقی تصنیف ہوتی ہے۔ یہ کتاب بہت ہی اہم اور راس ثابت ہوتی ہے۔ تاریخ جس رخ اور دھارے پر شاہ جہاں کی تخت نشینی سے ۱۰۳۷ھ بمطابق ۱۶۲۸ء سے جارہی تھی اس کتاب کی معرفت اس پر بند باندھنے کی کوشش کی گئی اور ایک دوسری سمت تاریخ کو موڑنے کا عزم کیا گیا۔ یہ سمت قرآن و سنت نبوی کی طرف نہیں بلکہ دارا شکوہ کے ان "دوزرگان" کی طرف تھا جن کا اس نے سفینۃ الاولیا میں تذکرہ کیا ہے۔ خصوصیت سے حضرت میاں میر کی طرف جو اکبر و جہانگیر کے عہد میں زندہ

---

[1] بزم تیموریہ ص ۳۹۸ و ۴۰۰ و مقدمہ رقعات عالمگیری ص ۳۵۶۔

رہے اور انہیں انتقال کیے ہوئے صرف چند سال ہوئے تھے۔

دارا کے اپنے پیر کے مرشد میاں میرؒ (ملا جیو) ۶۰ سال کے قریب لاہور میں مقیم رہے اور سالکان طریقت کی رہنمائی کرتے رہے اور ۱۰۴۵ھ مطابق ۱۶۳۳ء انتقال کرتے ہیں۔ تمام عمر پارسائی و تجرد میں گزار دی۔ شادی۔ بیاہ۔ بال۔ بچوں کے بکھیڑے میں نہ پڑے۔ فقرو غنا اور بے نیازی واستغنا کا یہ حال تھا کہ کبھی کسی سے کچھ سوال نہ کیا۔ ہاں کبھی کبھی جب بشریت کے تقاضے سے بھوک ستاتی تھی۔ تو انتہائی ضرورت کے عالم میں شریف مریدوں سے ان کی حلال کی کمائی سے نان خشک اور معمولی لباس کے لیے کچھ قبول فرما لیتے۔ دنیا والے ان کے پاس پہنچتے تو انہیں یہی تلقین کرتے کہ علائق کا پھندا توڑ کر نکلو۔ مرید کو معرفت وسلوک کی منزل تک پہنچانے میں انہیں کمال حاصل تھا جو سعادت مند ان کے حلقے میں داخل ہو کر طریقت کی منزل میں قدم رکھتا بہت جلد اونچے درجوں میں پہنچ جاتا۔ آخر عمر میں معشوق حقیقی کا جلوہ نظر میں ایسا سما گیا تھا کہ باقی تمام چیزیں نظر سے محو ہو گئی تھیں............ علائق دنیوی سے آزاد ہو گئے تھے اپنے بیگانے سب سے علیحدہ ہو کر گوشۂ عزلت میں بیٹھے رہتے.......... خلاصہ یہ۔ کہ زاویہ نشینی اور گوشہ نشینی کے زمانے میں تمام تعلقات توڑ کر کنج تنہائی میں بیٹھے رہتے اہل دنیا سے ملنا یا ان کے گھر جانا تو درکنار فقیروں اور درویشوں تک سے ملنے نہ جاتے۔[1]

میاں میرؒ کا یہی طرز عمل اور طریقۂ کار رہا کہ اکبر اور جہانگیر کے عہد میں خاموش اور گوشہ نشین رہے اور ان کی یہی صفت جہانگیر کو پسند آئی اور ان سے ملاقات کی اور ان کی تعریف و توصیف بیان کی اب دارا شکوہ ان کی سوانح حیات لکھ کر ایک طرف تو اسلام سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتا ہے۔ دوسری طرف اسلام کے متعلق

---

[1] عمل صالح حصہ دوم ص ۸۸، تا ۹۱،

اپنے ماضی قریب کے ایک بزرگ میاں میرؒ کو بطور ایک آئیڈیل کے پیش کرتا ہے۔

میاں میرؒ نے تمام عمر پارسائی و تجرد میں گزار دی۔ شادی و بیاہ۔ بال بچوں کے بکھیڑے میں نہ پڑے اور یہی حال ان کے مرید ملّا شاہ بدخشی کا تھا۔ دارا شکوہ خود ان کے تقویٰ و پرہیزگاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھوں نے شادی نہیں کی اور نہ کبھی اپنے حجرے میں چراغ روشن کیا۔ وہ اس بات پر شاہد ہے کہ اس کے مرشد تیس برس تک مطلق نہیں سوئے اور نہ ہی انہیں غسلِ جنابت کی حاجت پیش آئی[1]

میاں میرؒ اور ملّا شاہ بدخشی کا تجرد کی زندگی گزارنا۔ عیسائیت یا ہندویت یا کسی دوسرے تصورِ حیات کے مطابق جائز۔ پسندیدہ۔ مستحسن ہو سکتا ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور طریقے کی صریح خلاف ورزی تھی جس کو شریعت کے حامل مسلمان پسند نہیں کر سکتے تھے۔ آنحضرتؐ کی حدیث ہے کہ:

اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ رَغِبَ	نکاح میری سنّت ہے پس جس نے
عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّی۔	میری سنّت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں۔

حضور کا یہ حکم ہی نہیں بلکہ مکّی اور مدنی زندگی میں اس پر عمل کیا۔ مدنی زندگی میں تو مختلف مصالح اور حکمتِ عملی کے پیشِ نظر دس شادیاں کیں اور عام مسلمانوں کو چار شادی کی شرائط کے ساتھ اجازت دی۔ اس واضح ارشاد اور عمل کے باوجود میاں میر اور ملّا شاہ بدخشی کا پوری زندگی تجرّد میں گزارنا شریعت کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔ ان بزرگوں کو دارا شکوہ بطور آئیڈیل کے پیش کرتا ہے جو کسی طرح عام مسلمانوں کو منظور نہیں ہو سکتا تھا۔ اور نہ یہ عام مسلمانوں کے لیے حجّت ہو سکتا تھا اسی عہد میں لوگ دیکھ چکے تھے کہ حضرت شیخ احمد سرہندی نے شادی بھی کی۔

---

[1] پروفیسر محمد اسلم "دارا کے مذہبی رجحانات" المعارف لاہور جولائی ۷۵ء

بال بچے بھی تھے۔ دنیاوی مال واسباب۔ باغ وزمین مکان وجائیداد کے مالک بھی تھے اور دنیاوی علائق واسباب کے باوجود عبادات ریاضت۔ مجاہدہ۔ مراقبہ۔ سُنن۔ نوافل کے پابند بھی تھے۔ جب جہانگیر نے ۱۶۱۹ء میں قید کر دیا۔ تمام دنیاوی مال و اسباب ضبط کر لیا تو قناعت۔ بے نیازی اور استغناء سبھی پر اس طرح عامل رہے کہ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے اور اپنے تمام فعل و عمل کو سنّتِ نبوی کے تابع اور مطابق کرنے کی تلقین کرتے تھے۔

دارا شکوہ "سکینۃ الاولیاء" کے معرفت میاں میرؒ کے سوانح نگار کی حیثیت سے ایک ایک روحانی سلسلہ کا ایک عام مرید ہی نہیں بلکہ ایک ایسے بزرگ کا سوانح نگار ہوتا ہے جو اپنے زمانے میں محرمِ اسرار۔ فنا بقا۔ شیخِ کامل۔ اہلِ معرفت کے پیشوا۔ فقر و تصوف کے مرحلے طے کرنے کے بعد "فنا فی اللہ اور لاموجود الا اللہ" ترکِ دنیا و مافیہا کر کے خواہشاتِ نفسانی سے بلند ہو کر واصل باللہ ہو گئے۔[۱] اس لیے دارا شکوہ ملّا شاہ بدخشانی کا مرید ہی نہیں رہا بلکہ اپنے پیر و مرشد کے پیر کا سب سے پہلے سوانح نگار ہونے کا بھی شرف حاصل کیا اور میاں میر کے معتقدین و متأثرین میں اس کو ایک امتیازی مقام حاصل ہوا۔

دارا شکوہ ۲۸ سال کی عمر میں ایک روحانی سلسلے میں ایک نمایاں مقام و پوزیشن حاصل کرتا ہے۔ بلکہ ایک شہنشاہ شاہ جہاں کا سب سے بڑا نرینہ اولاد بھی تھا۔ ماں باپ کے لاڈ پیار نے اسے لوگوں میں معزّز بنا دیا تھا۔ درباریوں کی خوشامد۔ غلط تعریف اور خود شاہ جہاں کی انتہائی محبّت نے اسے خودسر۔ خود رائے اور ستائش پسند بنا دیا تھا اور ایک روحانی سلسلے سے تعلّق سے اسے اس حلقے میں بھی ایک محترم مقام حاصل ہو چکا تھا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ اس سے زیادہ صائب الرائے۔ ہوشمند۔ وسیع المشرب۔ وسیع الخیال اور صاحبِ اقتدار

---

[۱] عملِ صالح حصہ دوم ص ۲۸۸۔

کوئی نہیں۔ میاں میرؒ کے پیروکاروں اور ان کے خلیفہ ملّا شاہ بدخشی کی طرف سے داراشکوہ کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کی اعلانیہ تائید ہوتی تھی اور اس سے انہیں بہت ہی توقعات وابستہ تھیں۔ کہ اس سے قادریہ سلسلے کو فروغ حاصل ہوگا۔

شیخ احمد سرہندی اور میاں میرؒ شہنشاہ اکبر اور جہانگیر کے دورِ حکومت میں (۱۵۵٦ تا ۱٦۲۷ء) دو علیحدہ فرد ہی نہیں بلکہ دو الگ الگ طرزِ فکر کے نمائندے بھی تھے۔ داراشکوہ ۱۱۴ بزرگانِ دین کا تذکرہ لکھ کر اپنی اسلام سے وابستگی کا اظہار کرتا ہے اور چند سال میں اپنی دوسری تخلیقی تصنیف کی معرفت میاں میرؒ اور اس سلسلے کے دیگر بزرگوں کا حال لکھ کر جس اسلام کے ترجمان اور علمبردار کی حیثیت سے عوام کے سامنے آتا ہے اس سے عوام میں مختلف ردِعمل ہوتا ہے۔ میاں میرؒ اکبر اور جہانگیر کے دورِ حکومت میں گوشہ نشین۔ خاموش رہے اور جو کتابیں بھی لکھیں باجو تلقین بھی کی اس سے بھی لوگ مطمئن رہے اور حکومت بھی ان سے خوش رہی۔ اسی لیے جہانگیر ان سے خوش مطمئن رہا اور ملاقات بھی کی تو تعریفی کلمات بھی تحریر کیے۔ اب داراشہزادے کی حیثیت سے انہیں کو اپنا لیڈر، رہنما تسلیم کرتا ہے۔ اس لیے اکبری (اکبر بادشاہ) طرزِ فکر کے علمبردار اور جہانگیری عہد کے منافقین۔ ہندویت اور اسلام کا امتزاج چاہنے والے حضرات دارا کو پسند کرتے ہیں اور دارا ان حضرات کا لیڈر بن کر ابھرتا ہے۔ اکبر کی طرح اسلام کی اعلانیہ مخالفت اور جہانگیر کی منافقت کی گنجائش نہیں تھی اس لیے دارا ایک نئے اسلام کے مفکر کی حیثیت سے ابھرتا ہے جس میں قرآن وسنّتِ نبوی کو معیار نہیں بلکہ بزرگانِ دین کو معیار بنایا جاتا ہے اس کے برعکس شیخ احمد سرہندی اس دورِ حکومت میں رہے بہت سے مکتوبات مختلف افراد کو لکھے ان کو متاثر کیا۔ ان کے خیالات اور افکار کو تبدیل کیا۔ جہانگیر نے ۱٦۱۹ء میں شیخ احمد سرہندی کو قید کیا اور ان کے انتقال کے پندرہ سال بعد داراشکوہ سفینۃ الاولیاء میں ان کی صفائی پیش کرتا ہے۔ لیکن ان کا سیدھا سادھا مسلک اتباعِ سنّتِ نبوی اختیار نہیں کرتا۔ بلکہ ایک ایسا مسلک اختیار کرتا ہے جس سے

جہانگیر مطمئن تھا اس سے وہ شیخ احمد سرہندی کی تحریک نفاذِ شریعت کے مقابلے میں تبادل شریعت پیش کرتا ہے۔

تبادل شریعت کا طریق کار:

دارا شکوہ اپنے فکر و فلسفہ کو آگے بڑھانے کے لیے اور لوگوں کو اس پر قائل اور مائل کرنے اور اس کے حصول کے لیے ایک باقاعدہ لائحہ عمل اپنی تیسری تخلیقی تصنیف "رسالہ حق نما" ۱۰۵۶ھ میں بمطابق میں پیش کرتا ہے۔

اس میں "واصل الی الحق" ہونے کے مختلف مدارج دیے ہیں اور لکھا ہے کہ اس رسالہ کو صرف ایسے شخص کو پڑھنا چاہیئے جس کی ہدایت کے لیے ایک "مرشد" موجود ہو پھر لکھتا ہے کہ جو "اہل اللہ" اور "عارف" اس رسالہ کو پڑھیں گے وہ اس بات پر منتج ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے کشفِ رموز و حقائق کے کیسے کیسے ابواب مجھ پر کھول دیے ہیں اور ایک شاہزادہ ہونے کے باوجود کسی ریاضت و عبادت کے بغیر عرفان کا دروازہ کس طرح مجھ پر باز ہے۔ وہ اپنے اسلام کو سمجھنے کے لیے چار مدارج بیان کرتا ہے۔ اس میں چار باب ہیں جو ۱۰۵۶ھ میں مکمل کرتا ہے۔

دارا کی اس تحریر سے صحیح العقیدہ مسلمان متفکر ہوتے ہیں۔ اس کی اپنی تحریروں کی روشنی میں وہ دیکھتے ہیں کہ اپنی پہلی کتاب میں "حضرت سرورِ کائنات بہترین موجودات صلی اللہ علیہ وسلم" "خلفائے راشدہ[۳] کو "چہار یار بزرگوار" ائمہ اربعہ یعنی حضرت امام ابوحنیفہؒ حضرت امام مالکؒ حضرت امام شافعیؒ حضرت امام احمد بن حنبلؒ

---

[۱] رقعاتِ عالمگیری ص ۳۵۷۔

[۲] سفینۃ الاولیاء۔ دارا شکوہ۔

[۳] حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ۔ حضرت عثمانؓ۔ حضرت علیؓ۔

کو "چہار دیوارِ خانۂ اسلام" قرار دیتا ہے۔ لیکن ۳ ماہ ۲ دن کے بعد ۲۹ ذی الحجہ ۱۰۴۹ھ کو خواب دیکھتا ہے اور اسی کی بنیاد پر ملا شاہ بدخشی کا مرید ہوتا ہے۔ اور ۱۰۵۲ھ میں اپنے پیر و مرشد کے پیر میاں محمد میرؒ کی سوانح حیات "سکینۃ الاولیاء" کے نام سے لکھتا ہے اب اس کتاب میں اپنی مثال آپ پیش کرتا ہے کہ:

شبے بخواب دیدم ہاتفے آواز داد و چہار بار مکرر کرد کہ ہیچ یکے از سلاطین روئے زمین است ندادہ اللہ تعالیٰ ارزانی داشتہ۔[1]

ترجمہ:۔ ایک رات خواب دیکھا کہ فرشتے نے آواز دی اور چار بار کہا کہ تجھے اللہ تعالیٰ ایسی چیز عنایت کرے گا جو زمین میں کسی بادشاہ کو نصیب نہیں ہوئی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے مجھے بخش دے گا۔[2]

دارا کی یہ باتیں سوچنے سمجھنے والوں کو بیدار کرتی ہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور آنکھ کھولتے ہیں اور غور کرتے ہیں کہ یہ شخص پیدائشی طور پر تو ایک شہنشاہ کا بیٹا ہے اور سات سال قبل ایک روحانی سلسلہ سے منسلک ہوا ہے اور اس میں اسے ایک بہت ہی اہم مقام و مرتبہ حاصل ہو گیا ہے۔ یہ شخص دولت۔ امارت۔ عیش و عشرت میں پلا و بڑھا۔ اسے بلا کسی محنت۔ مشقت۔ ایثار۔ قربانی۔ جفاکشی کے سبھی کچھ حاصل ہو گیا۔ اب ہدایت کے لیے ایک "مرشد" کی ضرورت بتاتا ہے دارا کی یہ باتیں "سہل پسند" تن آسان لوگوں کو اپیل کرتی ہیں اور وہ اس کے قائل و ہمنوا ہو جاتے ہیں۔ اس میں ایثار۔ قربانی کے مراحل نہیں آتے اور کسی قسم کا خوف و خطرہ نہیں ہوتا۔ اقتدار اس کا ہمنوا ہوتا ہے۔ اقتدار کے پیچھے چلنے والے یا اقتدار پرست حضرات کے لیے بزرگی۔ عظمت کے لیے یہ آسان نسخہ ہے۔ لیکن اتباعِ سنتِ

---

[1] مقدمہ رقعاتِ عالمگیر ص ۳۵۷۔

[2] بزمِ تیموریہ ص ۳۹۷ تا ۴۰۰

نبوی کے علمبرداروں کے لیے ایک بنیادور شروع ہوتا ہے۔

شریعتِ نبوی سے انحراف:

داراشکوہ محض ایک فلسفی عالم اور دانشور ہوتا تو شاید عام لوگ اس کی تحریروں پر زیادہ توجہ نہ دیتے۔ لیکن دارا ایک بااثر منظورِ نظر شہزادہ بھی تھا۔ اس لیے اس کی تحریریں بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی تھیں اور مختلف نقطہ نظر رکھنے والے اپنے نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر اس کے بارے میں اپنی رائے بھی قائم کرتے تھے[1] کچھ لوگ اتفاق کرتے اور حامی بن جاتے تو اقتدار کی حمایت اور سرپرستی حاصل ہو جاتی اور کچھ اختلاف کرتے تو دارا ان کو مطمئن کرنے کے لیے توضیحات پیش کرتا تاکہ ان کے شکوک و شبہات دور ہوں اور اعتراض رفع ہو جائے۔ چنانچہ دارا کی اپنی تحریروں سے جہاں اس کا حلقۂ اثر بڑھ رہا تھا۔ اس سے معاشرہ میں ایک گروہ اس کے قدردانوں کا اور اس کے متاثرین کا پیدا ہو رہا تھا تو ساتھ ہی اختلاف کرنے والوں کا بھی پیدا ہو رہا تھا۔ دارا اپنے پسندیدہ، مرغوب اسلام" اور طریق کار پر لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے علمی تحقیق کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ رسالہ "حق نما" کی اشاعت کے بعد ہی ایسے جملے اور الفاظ عام گفتگوؤں میں استعمال کرنا شروع کیے جو شریعتِ نبوی کی نظر میں قابلِ الزام تھے اور شریعت نبوی کے علمبردار اس سے اختلاف کرتے تھے۔

دارا اپنے سے اختلاف کرنے والوں کو مطمئن کرنے کے لیے چار سال کی مدت

---

[1] داراشکوہ کی کتاب سفینۃ الاولیاء کو لارڈ ڈلہوزی (۱۸۴۸-۱۸۵۶ء) کے عہد میں ایک انگریز مسٹر بیل نے مطبع مدرسہ آگرہ سے ۱۸۵۳ء میں شائع کیا۔ یہ کتاب ان کو اپنے نقطہ نظر سے بہت پسند آئی اور انگریزی عہد میں ۱۸۵۸ء سے اسی اسلام کی سرپرستی کی گئی۔
مؤلف بزم تیموریہ ص ۳۹۷۔

میں ۱۰۶۲ھ "حسنات العارفین" یا شطحیات" یا طریقت الحقیقت" کے نام سے چوتھا تخلیقی رسالہ لکھتا ہے کہ "وجد و ذوق کی حالت میں اس کے منہ سے ایسے کلماتِ بلند خفائق نکل جاتے ہیں جن کو سن کر "پست فطرت" "دون ہمت" اور "زاہدِ خشک" اپنی کوتاہ بینی سے اس پر تکفیر کے فتاوی صادر کرتے ہیں

اس تکفیر سے بچنے کے لیے صوفیائے کرام اور علماء عظام بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے ایسے کلمات اور اقوال پیش کیے ہیں جو اس کے خیال میں "شطحیات" ہیں۔ ان اقوال سے یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ توحید و معرفت کے منازل و مدارج میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جب ایک سالک شریعت و طریقت' کفر و ایمان' خیر و شر۔ ظلمت و ضیاء' عبد و معبود سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے اور بے خودی میں اس کی زبان سے ایسے کلمات نکلتے ہیں۔ جو بظاہر مذہب و ایمان کے منافی ہوتے ہیں لیکن وہ قابلِ مؤاخذہ نہیں ہوتے چنانچہ دارا لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ سلوک میں ایسے ہی مقام پر پہنچ گیا ہے۔ جہاں "کفر و اسلام" "الحاد و ایمان" "نور و نار" خیر و شر" ظلمت و ضیاء عبد و معبود کا سوال باقی نہیں رہتا ہے[1]

دارا کی اس صفائی اور توضیح سے اختلاف کرنے والے اس کے خیالات و افکار سے مطمئن نہیں ہوتے بلکہ اس کے اقرار سے لوگوں میں نفرت اور حقارت کی آگ اور تیز ہو گئی مولانا سید نجیب اشرف مرتبہ مقدمہ رقعاتِ عالمگیری کے بیان کے مطابق دارا نے یہ کتاب "حسنات المعارفین" لکھ کر خود اپنا پردہ فاش کر دیا کیونکہ

---

[1] پست فطرت "دون ہمت۔ زاہد خشک۔ ایسے تحقیر آمیز الفاظ اختلاف کرنے والوں کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ گیا یہ الفاظ کسی صوفی منش کو جور و حانیت کے اعلی مرتبے پر فائز ہو زیب دیتے ہیں

[2] مقدمہ رقعاتِ عالمگیری ص ۳۵۸ بزمِ تیموریہ ص ۱۰۲

کسی خاص کیفیت وحالت میں کسی بزرگ سے ایسے جو جملے نکلتے ہیں تو ان کی سچائی و صداقت پر انہوں نے کبھی بحث نہیں کی ہے اور نہ ان کو اس کی پرواہ رہی ہے کہ اس جملے کو کوئی شخص کیا معنی پہناتا ہے[1]

صحیح العقیدہ مسلمان دارا کی اس وضاحت وصفائی سے مطمئن نہیں ہوتے بلکہ اس سے اختلاف مزید بڑھ جاتے ہیں۔ دارا اس سے مزید برہم ہوجاتا ہے اور وہ علماء کرام اور صوفیاء عظام اور مشائخ اور ان کے متاثرین جو اتباع سنتِ نبوی۔ استیلائے اسلام۔ ترویج شریعتِ نبوی کا ہی دم بھرتے ہیں۔ انہیں دجّال۔ فرعون اور ابوجہل کے القاب سے یاد کرنے لگتاہے اس طرح دارا کے نظریات، تصورات سے مسلم معاشرہ کی نظری وفکری وحدت وسالمیت ختم ہوگئی۔ شریعت کے حامل علماء کرام صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں تو اس پر دارا بڑی حقارت سے انہیں "پست فطرت۔ دون ہمت۔ زاہدِ خشک اور کوتاہ بین قرار دیتا ہے۔ اور انہیں لائقِ اعتنا ہی نہیں سمجھتا۔ دارا کے ان الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے جدِّ امجد اکبر کی طرح "محمدی المشرب" علماء کا مخالف ہو چکا تھا اور الحاد کا علمبردار ہوگیا۔ بقول علامہ اقبال:

تخمِ الحادے کہ اکبر پرورید بازاندر فطرتِ دارا دمید

اسلامی تصوّف اور ویدانت میں کوئی فرق نہیں:

دارا ایک شہزادے اور دانشور کی حیثیت سے اپنے فکر وفلسفہ اور تصورِ اسلام کی اپنی تخلیق کتابوں کی معرفت ترجمانی کر رہا تھا تو اس سے حضرت شیخ احمد سرہندی کے متاثرین۔ پیروکاروں نے محسوس کیا کہ یہ "شریعتِ نبوی" کا راستہ اور مسلک نہیں ہے بلکہ۔ کبیر۔ نانک۔ دھنّہ۔ داؤد۔ نام دیو وغیرہ کی فکری تحریک ہے۔ اور شہنشاہ اکبر نے

---

[1] مقدمہ رقعاتِ عالمگیری ص ۳۵۸ و بزمِ تیموریہ ص ۲۰۲۔

اسی فکر و فلسفہ پر حکومت کی اور اسلام "کو محکوم و تابع کیا۔ لیکن حضرت شیخ احمد سرہندی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتِ نبوی کے مطابق "دگر نہ تو زمانہ نہ سازد تو زمانے دیگر نے بسانہ" کے مصداق اکبر و جہانگیر کے دور میں عمل کیا اور اب دارا اپنی تخلیقی تصانیف کے معرفت ہمیں اکبر و جہانگیر ہی کے فکری دور میں لے جانا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ بیدار اور سرگرم ہونا شروع ہوئے۔ دارا اپنی فکر و نظریات سے لوگوں کو متعارف کرنے کے لیے اپنی پانچویں تخلیقی تصنیف ۱۰۶۵ھ "مجمع البحرین" پیش کرتا ہے۔ دارا عمر کے لحاظ سے بیالیسویں سال میں تھا۔ اس کتاب میں وہ اسلام اور ہندو مذہب کو ایک ہی سمندر کے دو دھارے بتاتا ہے اور ان دونوں کو ملانے کی کوشش کرتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ اسلامی تصوّف اور فلسفہ ویدانت میں لفظی اختلاف کے سوا کوئی فرق نہیں۔ توحید کے شیدائی ان دونوں میں سے جس کی بھی تقلید کریں حقّانیت کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔[۱]

دارا کے ارتقائی فکر و فلسفہ سے صحیح العقیدہ مسلمان تو مطمئن ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ یہ شریعت سے انحراف ہی نہیں بلکہ یہ تو علی الاعلان "اسلام اور ہندویت کا امتزاج تھا۔ جدید اصطلاح میں اسے "متحدہ قومیت یا مشترک ثقافت" "مشترک کلچر" یا اتحادِ مذاہب " کا فلسفہ اور تصوّف کہہ سکتے ہیں۔ دارا کے اس فکر و فلسفہ سے ہندویت اور اسلام کے امتزاج کے علمبردار مصلحین۔ مفکرین۔ سیاستدان دانشور مطمئن ہو سکتے ہیں۔ اور حمایت بھی اور تعاون بھی کرتے ہیں اور سرگرم، مستعد اور فعال حضرات اس کے قیام کی جدوجہد کرتے ہیں۔ لیکن حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے پیروکار و معتقدین نہ خوش ہو سکتے ہیں نہ تعاون کر سکتے ہیں اور نہ ایسی صورت میں خاموش تماشائی بن سکتے تھے۔ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ تو زندہ نہیں تھے لیکن ان کی تحریریں اور انکے اولین مخاطب بقیدِ حیات تھے اور معاشرے میں ان کے اخلاق و کردار اور عمل کا اچھا خاصا اثر تھا۔

---

[۱] بزمِ تیموریہ ص ۲۰۲م و مقدمہ رقعاتِ عالمگیری ص ۳۵۸۔

انہیں حضرات کو مطمئن کرنے اور تعاون حاصل کرنے کے لیے شاہ جہاں نے "نفاذِ شریعت کا آغاز کیا تھا اور اس سے کم پر وہ لوگ مطمئن بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ منصب۔ جاگیر انعام و خطابات پر بہلائے اور خریدے نہیں جا سکتے تھے ان حضرات اور اتباعِ سنّت کے علمبرداروں کی حرارت اور شدّتِ جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے دارا "سفینۃ الاولیا" کے نام سے ایک ترتیب سے یکے بعد دیگرے اپنی تحلیقی تصانیف کا آغاز کرتا ہے۔ اور "مجمع البحرین" ۱۰۶۵ھ میں اس کی یہ آخری تخلیقی تصنیف تھی۔ اس کتاب کے مندرجات سے شریعت کے علمبرداروں نے محسوس کر لیا کہ ہوا کا رخ کدھر ہے ان کتابوں سے طریقت بے شریعت کو فروغ حاصل ہو رہا تھا اور شریعت کے علمبرداروں کے لیے دائرہ تنگ ہو رہا تھا۔ اب دارا کے فکر و فلسفہ اور نظریات کو معاشرہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں ایک معتد بہ تعداد نے قبول کر لیا تھا۔ اور دارا اس مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں وہ کھل کر "ہندویت و اسلام" کے اتحاد کو اپنا نصب العین قرار دیتا ہے۔ حضرت مجدد کے متاثرین اس صورت حال پر خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ دارا کے ذہنی و فکری انقلاب اور اس کے اقتدار سے اسلام کی انفرادیت اور تشخص کو سخت خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے حضرت مجدد کے پیروکار مضطرب بے چین ہی نہیں ہوتے بلکہ اس حالت کا رخ موڑنے کے لیے سرگرم ہو جاتے ہیں۔

ہندویت کو اسلام پر فوقیت:

دارا تو اپنی پہلی تخلیقی تصنیف میں تو حنفی المشرب اور سلسلہ قادریہ کے پیروکار ہونے کا اعلان کرتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اپنے نظریات اور عقائد کو وہ ایسے سانچے میں ڈھال رہا تھا کہ ہندو اس کی طرف مائل ہوں۔ چنانچہ اس ضمن میں دارا کی "مجمع البحرین" ایک اہم کتاب ثابت ہوئی ہے جو ۱۰۶۵ھ شائع ہوئی ــــ دارا اس دور میں نہ صرف اپنی فکری نقطۂ عروج کو پہنچتا ہے۔ بلکہ سیاسی طور پر اپنے کمال کی طرف تیزی سے رواں ہوتا ہے۔

مجمع البحرین۔ دارا کی آخری تخلیقی تصنیف ہے۔ ان تصانیف کی معرفت اس کا ذہن و فکر اور تصورات پختہ شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ شریعتِ نبوی سے انحراف کرنے والے لوگوں کا وہ "پسندیدہ، محبوب" لیڈر اور قائد ہو جاتا ہے۔ اس کے مصاحبین اسے "خدا آگاہ" کہتے ہیں اس کی بہن جہاں آرا بیگم "مونس الارواح" نام سے ایک کتاب لکھتی ہے تو وہ دارا شکوہ کو "صاحبِ باطن و ظاہر" کے لقب سے یاد کرتی ہے۔[1]

دارا کے یہ خیالات و فکر ہی تھے جس سے شریعت سے انحراف کرنے والے لوگ اسے دلفریب خطاب دے رہے تھے اب مزید لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے ۱۰۶۷ھ میں "سرِ اکبر" کے نام سے "اپنشد" کے پچاس ابواب کا فارسی میں بنارس کے پنڈتوں کی مدد سے ترجمہ کرتا ہے۔ اس کتاب میں "بسم اللہ" کی بجائے "گنیش جی" کی تصویر دی ہے اور دیباچہ میں لکھا ہے کہ اصل قرآن مجید یہی ہے (نعوذ باللہ) اس کی وجہ تصنیف کے متعلق خود دیباچہ میں لکھتا ہے (نقل کفر کفر نہ باشد) کہ قدیم ہند کے ظاہری اور باطنی علماء کو وحدت سے انکار اور موحدوں پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ ان پر اعتبار ہے برخلاف اس کے۔ جہلائے وقت۔ خدا شناسوں اور موحدوں کے قتل، کفر اور انکار میں مشغول ہیں اور توحید کی تمام باتوں کو کلام اللہ میں اور صحیح احادیثِ نبوی سے ظاہر ہیں رد کرتے ہیں۔ وہ خدا کے راستے کے رہزن ہیں۔ ان باتوں کی تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ اس قوم قدیم (یعنی ہندوؤں) کے درمیان آسمانی کتابوں سے پہلے چار آسمانی کتابیں (رگ وید۔ سام وید۔ اتھر وید یجروید) اور اس وقت کے سب سے بڑے نبی برہما یعنی آدم صفی اللہ پر یہ تمام احکام نازل ہوئے۔ اور یہ تمام کتابیں ان کتابوں سے ظاہر ہیں.........
......اور محض توحید کے اشغال اس میں درج ہیں جس کا نام۔

---

[1] پروفیسر محمد اسلم۔ المعارف ص ۱۲۔ دارا شکوہ کے مذہبی رجحانات۔

"دا پنشد" ہے .... ان اپنشد کو جو کہ توحید کا خزانہ ہے اور جس کے جاننے والے اس قوم میں کم رہ گئے ہیں۔ فارسی زبان میں بغیر کسی کمی و بیشی اور نفسانی غرض کے لفظ بلفظ ترجمہ کر کے سمجھوں کہ یہ جماعت اس کو اہلِ اسلام سے پوشیدہ اور پنہاں رکھتی ہے۔ اس کا کیا بھید ہے۔ شہر بنارس جو اس قوم کا دار العلم ہے اور جہاں پنڈت اور سنیاسی جو سر آمدِ وقت و بیدار اور اپنشد کے جاننے والے تھے .... اس خاکسار سے تعلق رکھتے تھے، ۱۰۶۷ھ میں بے غرضی کے ساتھ اس کا ترجمہ کیا اور توحید کے متعلق ہر قسم کی مشکل اور اعلیٰ باتیں جن کا میں طلب گار تھا لیکن حل نہیں پاتا تھا۔ اس قدیم کتاب کے ذریعہ سے معلوم ہوئیں جو بلاشک پہلی آسمانی کتاب ہے اور بحرِ توحید کا سرچشمہ ہے اور قدیم ہے اور قرآن مجید کی آیت بلکہ تفسیر ہے اور صریحۃً ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت بعینہٖ اس کتابِ آسمانی سرچشمۂ بحرِ توحید اور قدیم کے حق میں ہے۔ انہ لقرآن کریم فی کتٰب مکنون لا یمسہٗ الّا المطھرون تنزیل من رب العلمین" یعنی قرآن کریم ایسی کتاب میں جو پوشیدہ ہے اور اس کو نہیں چھوتے ہیں مگر وہ جو کہ پاک ہیں وہ نازل ہوئی ہے۔ خداوندِ عالم کی طرف سے تعین طور سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت توریت اور انجیل کے حق میں نہیں۔ لفظ تنزیل سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ لوحِ محفوظ کے حق میں ہے۔ چونکہ اپنشد ایک محض راز ہے اصل و ماخذ ہے اور قرآن مجید کی آیتیں بعینہٖ اس میں پائی جاتی ہیں۔ پس تحقیق کہ چھپی ہوئی کتاب یہی کتابِ قدیم ہے اور اس فقیر کا جس نے بے جانی ہوئی چیز کو جان لیا اور بے سمجھی ہوئی چیز کو سمجھ لیا۔ اس ترجمہ کے کرنے میں اس کے سوا کوئی مطلب اور مقصد نہ تھا کہ وہ اس کی اولاد اور اس کے دوست اور حق کے طلب گار فائدہ اٹھائیں[1]

مولانا شبلی ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس منعقدہ بنارس ۱۹۰۶ کی علمی نمائش گاہ

---

[1] بزمِ تیموریہ ص ۴۰ تا ۴۵۔

میں اس کتاب کے دیباچہ کو دیکھ کر لکھتے ہیں کہ اس کتاب کے دیباچے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دارشکوہ بالکل ہندو بن گیا تھا اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر وہ تختِ شاہی پر متمکن ہوتا تو اسلامی شعار اور خصوصیات بالکل مٹ جاتے۔[1]

دارا سِر اکبر (اپنشد کا فارسی میں ۱۰۶۷ھ ترجمہ) کی معرفت اسلام کے متعلق اپنے جن خیالات۔ تصورات کا اظہار کرتا ہے اس سے اسلام کی انفرادیت تشخص چاہنے والے قطعی اتفاق نہیں کر سکتے تھے اور صحیح العقیدہ مسلمانوں نے محسوس کیا کہ:

لکم دینکم۔ ولی دین ط — تمہارا دین تمہارے لیے ہے اور ہمارا دین ہمارے لیے۔

کے فلسفہ پر تو مسلمان ایمان رکھتے ہیں اور عمل کرتے ہیں اور اسلام پر ایمان نہ رکھنے والوں کے تمام حقوق کا اقرار کرتے ہیں اور اس کے محافظ ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف غیر مسلم اس بات پر آمادہ نہیں کہ مسلمانوں کی انفرادیت کو باقی رکھیں۔ وہ مسلمانوں کو اپنے میں جذب کرنے کے لیے ہر قسم کے ہتھکنڈے اختیار کرنے کے لیے تیار ہیں۔ صحیح العقیدہ مسلمان اس صورتِ حال کو برداشت کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں ہوتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ داراشکوہ اور اس کے حامیوں اور احیاءِ سنتِ نبوی کے علمبرداروں میں مخالفت و مخاصمت کی خلیج مزید وسیع ہو جاتی ہے۔

داراشکوہ اور رام چندر جی صدقِ طلب میں بھائی ہیں:

داراشکوہ جس طرح اپنی تخلیقی تصانیف کی معرفت نظریاتی اور فکری تحریک کی طرف سفر کر رہا تھا اس کا یہ تقاضا تھا کہ وہ ہندوؤں کی عظیم الشان عددی اکثریت کو اپنا ہمنوا بنائے۔ تاکہ اس کا سفر آسان ہو اور منزلِ مقصود تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ اور کامیابی یقینی ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے عقل یا دلائل کا سہارا نہیں

---

[1] بزمِ تیموریہ ص ۴۰۵۔

لیتا بلکہ ماضی کی طرح ایک خواب دیکھتا ہے اور دربارِ عالی کے حاضرین میں سے ایک شخص کو مقرر کرتا ہے کہ سنسکرت کی ایک مشہور کتاب "یوگ داسی پشسٹ" (جگ لشت) کا فارسی میں ترجمہ کریں۔ چنانچہ ۱۰۶۶ھ میں فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کتاب سے دارا اسلام یا شریعتِ نبوی سے ایک قدم اور دور ہوتا ہے اور کفر و الحاد سے قریب تر ہو جاتا ہے اور "ہندویت" کے علمبرداروں کے نزدیک "طالبِ صادق" "حق جو" کہلاتا ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ میں خود دارا شکوہ لکھتا ہے کہ "خواب میں دیکھا کہ دو بزرگ قبول صورت ایک اونچے پر اور دوسرے کسی قدر ان سے نیچے کھڑے معلوم ہوئے جو اونچے پر کھڑے تھے بشسٹ تھے اور دوسرے رام چندر .....

...... میں بے اختیار بشسٹ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بشسٹ نے نہایت مہربانی سے ہاتھ میری پیٹھ پر رکھا اور فرمایا کہ اے رام چندر یہ سچا طالب ہے اور سچی طلب میں تیرا بھائی ہے اس سے بغلگیر ہو۔ رام چندر کمال محبت کے ساتھ مجھ سے ملے اس کے بعد بشسٹ نے رام چندر کے ہاتھ میں مٹھائی دی تا کہ مجھے کھلائیے۔ میں نے وہ شیرنی کھائی اس خواب کے دیکھنے پر ترجمہ کی خواہش از سر تو زیادہ ہوئی اور دربارِ عالی کے حاضرین میں سے ایک شخص کو اس خدمت پر مقرر کیا کہ ہندوستان کے پنڈتوں سے .... اس کتاب کے لکھنے میں اہتمام و انصرام کیا[۱]"

اس کتاب کے ترجمہ کرانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دارا عام ہندوؤں پر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ وہ محض ایک بادشاہ کا سب سے بڑا بیٹا اور با اقتدار شہزادہ ہی نہیں بلکہ وہ بھی رام چندر جی کی طرح ایک اوتار ہے۔ راجہ رام چندر عام ہندوؤں میں عزت و احترام سے دیکھے جاتے ہیں۔ ہندو ایک مثالی حکومت کے لیے انہیں کو بطور آئیڈیل پیش کرتے ہیں اب دارا خواب کی معرفت ہندوؤں کو یقین دلاتا ہے

---

[۱] مقدمہ رقعاتِ عالمگیری۔ ص ۳۶۰

راجہ رام چندر محبت وعقیدت سے دارا سے ملتے ہیں ۔ بغلگیر ہوتے ہیں اور مٹھائی کھلاتے ہیں اور اپنا بھائی سمجھتے ہیں اور اس کے قدرداں ہیں اس لیے وہ عام ہندوؤں کا ایک محبوب، پسندیدہ لیڈر ہو جاتا ہے جیسے ان کے اوتار راجہ رام چندر کی حمایت وتائید حاصل رہے ۔ اس طرح دارا ایک ایسے اسلام کا علمبردار ہو جاتا ہے جس کے "ہندویت" کے علمبردار ضرور حامی ہوتے ہیں ۔ حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ نے اپنی حیات میں "ہردے رام کو ایک خط کے جواب میں لکھا تھا کہ رام جسرتھ کا بیٹا لچھمن کا بھائی اور سیتا کا خاوند تھا ۔ جب رام اپنی بیوی کو نگاہ نہ رکھ سکا تو وہ پھر دوسرے کی کیا مدد کر سکتا ہے عقلِ دور اندیش سے کام لینا چاہیئے اور ان کی تقلید پر نہ چلنا چاہیے"[۱] اس لیے حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے پیروکار و صحیح العقیدہ مسلمان جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے طریقے پر مسلمانوں اور تمام انسانوں کی نجات تصوّر کرتے تھے ۔ وہ دارا سے منحرف ہو اور اس کے مخالف ہوتے ہیں اور اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دیتے ہیں تاکہ عوام الحاد و ہندویت کے دامِ فریب میں گرفتار نہ ہو سکیں ۔

داراشکوہ کے وضع کردہ اسلام کی دانشوروں کی طرف سے حمایت :

داراشکوہ محض ایک شہزادہ ہی نہیں تھا بلکہ وہ شاہ جہاں کی سب سے بڑی نرینہ اولاد اور ولیعہدِ سلطنت بھی تھا اس کے اقتدار ۔ اختیار اور حکومت کے معاملات میں روز بروز اضافہ ہی ہو رہا تھا وہ ایک ذہین شخص بھی تھا اور اس نے اپنے خیالات، افکار، نظریات سے عین عنفوانِ شباب ہی سے لوگوں کو متعارف کرانا شروع کر دیا تھا ۔ ابتداء میں تو وہ عاجزی اور انکساری سے خود کو "فقیرِ حقیر محمد داراشکوہ" تحریر کرتا ہے لیکن جوں جوں اس کے نظریات اس کی اپنی

---

[۱] مکتوباتِ امام ربانی جلد اول مکتوبات نمبر ۱۶۷ ص ۲۸۴ ۔

تخلیقی کتابوں کی معرفت لوگوں تک پہنچتے ہیں اور لوگ اس کے فکر و خیال سے متعارف ہوتے ہیں تو اقتدار پرست اور شکم پرور الحاد و ہندویت کے علمبردار دانشوروں کی ایک خاصی تعداد اس کے فکر کی گرویدہ اور علمبردار ہو جاتی ہے۔ دارا خود بھی اپنے عہد کے دانشوروں سے خط و کتابت کرتا ہے۔ چنانچہ دارا شاہ دلربا کو لکھتا ہے کہ اس کے دل سے اسلامِ مجازی محو ہو گیا اور اب کفرِ حقیقی کا جلوہ نظر آتا ہے اور کفرِ حقیقی کی قدر معلوم کرنے کے بعد وہ زنّار پوش۔ بت پرست بلکہ خود پرست اور دیر نشین ہو گیا ہے اور اس کے لیے کسی چیز کے اقرار اور انکار کا سوال باقی نہیں رہا۔ شعر:

مسلماں گر بدانستے کہ بت چیست بدانستے کہ دیں در بت پرستی است
اگر کافر ز اسلامِ مجازی گشت بیزار کرا کفرِ حقیقی شد پدیدار[1]

دارا کے اپنے عہد کے دوسرے دانشور محسن فانی مصنّف "داستان المذاہب" محب اللہ الہ آبادی، ابن عربی ہند" نظریۂ وحدت الوجود کے مطابق قرآن کے مفسر[2] چندر بھانی وغیرہ اس کے حامی ہو جاتے ہیں جو اس عہد کے عظیم دانشور ہوتے ہیں۔ دارا انہیں "طالبانِ صدق" کے نام سے یاد کرتا ہے اور یہ سب ایسے دانشور تھے جو ہمہ اوست کے مسئلہ کو آزادانہ استعمال کرتے تھے اور اہلِ شریعت کے خلاف زبان کھولتے تھے دارا نے بھی نماز۔ روزہ سب کچھ چھوڑ دیا اس کے پاس جتنے قیمتی پتھر تھے ان پر "پربھو" کندہ کرایا۔ خوشامدی درباریوں اور دنیا پرست دانشوروں نے اسے یقین دلایا کہ وہ راہِ حق کی تمام منزلیں چشم زدن میں ختم کر چکا اور فنافی اللہ کے درجے پر پہنچ گیا۔ چنانچہ ترکِ شریعت کی وجہ وہ یہ پیش کرتا ہے وہ یہ تھی کہ جب میں "فنافی اللہ" کے درجہ میں پہنچ چکا تو پھر اپنی ہی عبادت کیوں کروں۔؟

---

[1] بزمِ تیموریہ ص ۴۸۱ و مقدمہ رقعاتِ عالمگیری ص ۳۶۲۔

[2] ڈاکٹر زبید احمد۔ عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ ص ۸۴۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور۔

مسلمانوں، صوفیوں، ہندوؤں کے علاوہ اس زمانے کے عیسائیوں اور مسیحیوں سے دارا کے تعلقات تھے وہ حضرات بھی دارا کے خیالات اور افکار کو اپنے تصورات اور عقائد کے قریب پاتے تھے اور ان سے اتنے گہرے تعلقات و روابط تھے کہ وہ لوگ سمجھنے لگے تھے کہ دارا مسیحی ہے اور ان کا یہی خیال تھا جس نے تمام یورپین سیاحوں کو یہ لکھنے کی ہمت دلائی کہ داراشکوہ مسیحی مرا ہے اور جس وقت وہ مرا ہے اس کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ "محمد مرا می کشد وابن اللہ مریم مرا می بخشد۔ (محمد مجھے قتل کرتے ہیں اور اللہ کا بیٹا (حضرت عیسیٰ) و حضرت مریم مجھے بخشتے ہیں) ۔[1]

دارا کے سرمد سے بھی گہرے تعلقات تھے اور ایک دوسرے سے خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ سرمد کے خیالات اور افکار نے دارا پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ سرمد آرمینیہ کا باشندہ اور پیدائشی یہودی تھا بعد ازاں اس نے اسلام قبول کر لیا اور ٹھٹہ (سندھ) کے راستہ ہندوستان آیا۔ ٹھٹہ میں قیام کے دوران ایک نوعمر ہندو لڑکے ابھے چند پر عاشق ہو گیا اور جب تک ابھے چند کے باپ نے اسے سرمد کے حوالہ نہیں کر دیا اس وقت تک وہ اس کے دروازے سے نہیں اٹھا۔ کچھ عرصہ بعد سرمد ٹھٹہ سے دہلی چلا آیا جہاں داراشکوہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کے گذر بسر کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا۔ سرمد وحدتِ ادیان پر کامل یقین رکھتا تھا۔ ابھے چند کا یہ شعر سرمد کے خیالات کی بڑی حد تک عکاسی کرتا ہے۔ شعر:

ہم مطیع فرقانم وہم کشیش ورہبانم   ربیّ یہودانم۔ کافرم۔ مسلمانم۔![2]

داراشکوہ سرمد کا بڑا معتقد تھا اور اسی یہودی نژاد نومسلم۔ سے یہودی مذہبی

---

[1] مقدمہ رقعاتِ عالمگیری ص ۳۶۲-۳۶۴۔

[2] پروفیسر محمد اسلم ص ۱۵۔ الحارف (ماہنامہ) جولائی ۱۹۷۵ء داراشکوہ کے مذہبی رجحانات و مقدمہ رقعاتِ عالمگیری ص ۳۶۵۔

کتابیں دارا کو سمجھنے میں مدد ہوگی۔ اس طرح ہندو برہمنوں عیسائیوں اور یہودیوں کے مشترکہ فکری اور نظریاتی اتحاد کا دارا علمبردار بنتا ہے شریعتِ نبوی کے علمبرداروں کے علاوہ اسے سب کی حمایت و تائید حاصل ہوتی ہے۔

چندر بھان برہمن حکومت کا ایک ذمہ دار عہدیدار تھا وہ دارا شکوہ کا نظریاتی رفیق اور حامی تھا۔ وہ ایک اچھا انشاپرداز اور مدّعا نگار بھی تھا۔ اس نے دارا کے نقطہ نظر کو تقویت دینے کے لیے بابا لال کے مکالمات قلمبند کیے جو دلچسپ بھی ہیں اور معنی خیز بھی جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ حق و صداقت کسی ایک مذہب کی ملکیت نہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام کا دعویٰ کہ انسانیت کی فلاح و بہبود "اسلام" ہی میں مضمر ہے" صحیح نہیں بلکہ سب مذاہب میں ہے اس طرح مکالمات بابا لال کی معرفت دارا کے نقطہ نظر "وحدت ادیان" کی حمایت کی گئی اور خصوصیت سے ہندوؤں کو آمادہ کیا گیا کہ وہ دارا کا ساتھ دیں دارا شکوہ کو چندر بھان برہمن کا یہ شعر بہت پسند تھا شعر :-

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار　　بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

دارا نے چندر بھان برہمن کی ہمّت افزائی کی اور ہندوؤں کو اس قدر چھوٹ دی کہ اس سے ہندویت اتنی آگے بڑھی کہ وہ مذہبی رواداری اور لبرل ازم کے نام سے مسلمانوں کی دل آزاری کرنے لگی چنانچہ چھبیلا رام ایک ہندو قانون گو کو یہ حوصلہ ہوا کہ حضور سرورِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی شان میں زبان درازی کرے اور اس جرم پہ ہندو اصرار کریں[2] ہندوؤں کو ایسی جرأت اور غلط کام پہ اصرار تھا جس سے عام مسلمانوں کا خون کھولتا تھا۔ مسلمان یہ دیکھ رہے تھے کہ دارا کی سرپرستی سے ہندو کس قدر سرکش اور جری ہو گئے ہیں اور مسلمانوں کی دل آزاری پہ مائل ہو گئے ہیں اور

---

[1] بزم تیموریہ ص ۸۰۔ ۱۶۷، ۱۶۸

[2] رقعاتِ عالمگیری ص ۲۵۰۔ ۲۵۱۔

اگر دارا ہی برسر اقتدار آگیا تو اسلام اور عام مسلمانوں کا کیا حال ہوگا۔؟

اقتدار پرست، شکم پرور اور وحدتِ ادیان کے علمبردار دانشوروں کی حمایت کی وجہ سے دارا میں تکبّر۔ رعونت۔ خود پسندی اور غرور ہی کا اضافہ ہوا۔ اور دارا نے ایسی باتیں کہنا اور لکھنا شروع کر دی تھیں جو عام مسلمان کبھی پسند نہیں کر سکتے تھے۔ خود کو "زنّار پوش" "بت پرست "، خود پرست اور" دیر نشین" کہلانے میں فخر محسوس کرتا کیا کوئی مسلمان جس میں آنحضرتؐ کی غیرت اور حمیّت کا احساس ہو وہ دارا کے ان دعووں سے مطمئن ہو سکتا تھا۔ کیا جس میں شریعتِ نبوی کے احترام وعظمت کا ذرہ برابر بھی شائبہ ہو وہ خاموش رہ سکتا تھا۔ کیا یہ اس کی صوفیت و رواداری تھی کہ اپنے سے اختلافِ رائے رکھنے والوں کو دجّال۔ فرعون ابوجہل کے نام سے یاد کرے کیا اس سے لوگوں کے دل جیت سکتا تھا۔ کیا وہ شخص جو تحقیر و تذلیل کے انداز میں لوگوں کو "پست فطرت" "دون ہمّت اور زاہدِ خشک" کی پھبتیاں کسے وہ ان کا محبوب لیڈر ہو سکتا تھا۔ داراشکوہ کے یہ خیالات۔ اندازِ تخاطب رواداری اور شائستگی کے سراسر خلاف تھیں اس سے وہ کسی کو حامی نہیں بنا رہا تھا۔ بلکہ اس کے خلاف نفرت کی آگ مزید تیز ہو رہی تھی۔

داراشکوہ کو شاہِ بلند اقبال کا خطاب ملنا:

داراشکوہ نے ۱۰۶۵ھ میں اپنی آخری تخلیقی تصنیف لکھ کر اسلام اور ہندو مذہب کو ایک ہی سمندر کے دو دھارے بنا دیا۔ یعنی اسلام اور ہندویت میں امتزاج و اشتراک پیدا کیا اور اسلام کی انفرادیت اور تشخّص کو ختم کیا اس کے بعد وہ خود کسی تخلیقی تصنیف کی طرف متوجّہ نہیں ہوتا البتہ اس کے فکر و تصوّرات کے حامل دانشور اس کی زیرِ سرپرستی مختلف کتابیں اور تراجم شائع کرتے ہیں اور اس کے نام سے منسوب کرتے ہیں جو دارا ہی کے نظریات و تصوّرات کی حمایت کرتے ہیں اور دارا ہی کی شخصیت کو ابھارتے ہیں۔ اس طرح ہر طرف دارا ہی دارا نظر آتا ہے اور ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ دارا کے علاوہ اور کوئی دوسرا نہیں۔ ہے۔

دارا نظریاتی و فکری پوزیشن کو مستحکم کرنے کے بعد اپنی ساری توجہ حکومت کے نظم و نسق میں اپنے اثر و اقتدار و پوزیشن کو مضبوط و مستحکم اور آگے بڑھانے پر صرف کرتا ہے۔ چنانچہ۔ ار ربیع الاول ۱۰۶۵ھ مطابق ۸ار جنوری ۱۶۵۵ء کو شاہ جہان کے جشن تلادان شمس کی تقریب ہوتی ہے۔ اس میں دارا شکوہ کو قیمتی تحفے تحائف انعام و اکرام کے علاوہ "شاہِ بلند اقبال" کا خطاب ـــــ انتہائی شفقت و الفت کے سبب طلائی کرسی پہ بیٹھنے کی اجازت ملی جو تخت شاہی سے ملاکر رکھی گئی۔ کسی اقبال مند شہزادے کے واسطے اعزاز و افتخار کا سب سے اونچا درجہ یہی ہے جو شاہ جہاں نے اسے عنایت کیا۔ شفقت و عطوفت کے جوش میں اپنی زبان مبارک سے اسے اس رتبۂ ارجمند پہ پہنچنے کی مبارک دی اور یہ فرمان بھی جاری کیا کہ امرائے نامدار شاہزادے کے مسکن پہ جاکر تسلیم و کورنش کے بعد مبارک دیں۔ دارا کے بڑے لڑکے سلطان سلیمان شکوہ کو دو ہزاری ذات۔ ہزار سوار سے ترقی دے کر بارہ ہزاری ذات، سات ہزار سوار کا منصب بخشا۔ اس طرح دارا کو "شاہِ بلند اقبال" کا خطاب تخت شاہی سے ملحق طلائی کرسی اور اس پہ شاہ جہاں کی طرف سے مبارک باد ملی اور دوسرے امرائے نامدار کو حکم دیا گیا کہ وہ تسلیم و کورنش بجالائیں اور مبارک بادی دیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۰۶۵ھ میں دارا شکوہ کو سیاسی عظمت و دبدبہ اور حکومت کے کاروبار میں کس قدر اہم پوزیشن اور مرتبہ حاصل ہو گیا تھا۔

شاہ جہاں جب دارا شکوہ پہ اتنا مہربان تھا اور اس کو یہ اعزاز بخشے تو دارا نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اللہ ویردی خاں کی سفارش کی اور شاہ جہاں اس کی خطاؤں کو معاف کر کے دوبارہ دربار میں حاضری کی اجازت دیتا ہے اور صرف یہی نہیں کیا بلکہ اس کا منصب بھی بحال کیا اور پانچ ہزار ذات اور چار ہزار سوار کا منصب عطا کیا۔ اس کے علاوہ انعام و اکرام تحفے تحائف الگ دیے[1]

داراشکوہ کی ساٹھ ہزاری منصب پر تقرری:

ابھی صرف ایک ہی سال گزرا تھا۔ اور داراشکوہ کوئی اہم سیاسی خدمت بھی اس اثناء میں انجام نہیں دیتا البتہ داراشکوہ ہی کے حکم سے ۱۰۶۶ھ میں سنسکرت کی کتاب "جوگ بشسٹ" فارسی میں ترجمہ ہوتی ہے۔ جس کا تذکرہ پچھلے صفحہ میں کیا جا چکا ہے اس میں یہ بتلایا جاتا ہے کہ سری رام چندر اور داراشکوہ صدقِ طلب میں بھائی ہیں۔ اس طرح دارا اپنی نظری و فکری ارتقاء میں ایک منزل اور آگے بڑھتا ہے اور شریعت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک قدم اور دور ہوتا ہے۔ اسی اثناء میں شاہ جہان بھی اپنی ۶۵ ویں شمسی سال کا جشن تلا داں ۲۴ ربیع الاول ۱۰۶۶ھ بمطابق ۱۲ جنوری ۱۶۵۶ء کو کرتا ہے تو اس موقع پر شہزادہ داراشکوہ کو انعام، اکرام، تحفے، تحائف کے علاوہ منصب میں دس ہزار کا اضافہ کرتا ہے۔ اب داراشکوہ کا منصب چالیس ہزار ذات بیس ہزار سوار دواسپہ وسہ اسپہ مقرر کرتا ہے اور اس کے فرزند سلیمان شکوہ کو خلعت کے علاوہ ہزار سوار کے اضافہ سے منصب ۱۲ ہزار ذات آٹھ ہزار سوار دواسپہ اور سہ اسپہ مقرر کرتا ہے اس کے علاوہ پٹنہ کی صوبہ داری مرحمت کی۔ یہ تو دارا کے اقتدار میں براہ راست اضافہ تھا اس کے علاوہ بہت سے دیگر امرائے مملکت کے منصب میں ترقیاں کی گئیں۔ انہیں تحفے، تحائف اور خطاب دیے گئے۔ مثلاً مہاراجہ جسونت سنگھ۔ راجہ جے سنگھ۔ راو ستر سال۔ روپ سنگھ راٹھور یہ سب کے سب ہندو راجپوت سردار تھے اور حکومت کے معتمد علیہ ملازم تھے۔ وہ سب کے سب دارا کے نظریاتی اور فکری رفیق ہی نہ تھے۔ بلکہ اس کے داعی بھی تھے۔ دارا کو ان لوگوں پر اعتماد تھا اسی لیے انہیں آگے بڑھایا اور ان لوگوں نے دارا کی جوش و جذبہ سے حمایت کی۔ دارا کی کامیابی میں انہیں

ل عمل صالح حصہ دوم ص ۶۴۹-۶۵۱۔

اپنا اقتدار بڑھتا نظر آیا اور "ہندویت و اسلام" کے اشتراک و امتزاج کی تحریک آگے بڑھی۔ اس طرح دارا نے اپنی حمایت میں اقتدار سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اور لوگوں نے محض اقتدار کی خوشنودی کے لیے دارا کا ساتھ دیا۔

ایک سال قبل تو پٹنہ کی صوبہ داری اپنے بیٹے سلیمان شکوہ کو دلوائی تھی لیکن اب اپنی طرف سے محمد علی خاں کو پٹنہ کی صوبہ داری عنایت کرتا ہے اور عبدالرزاق گیلانی کو ملتان کی صوبہ داری پر سرفراز کرتا ہے اور نہال چند کو رائے کا خطاب دیتا ہے۔[1]

انتظامیہ میں اس تبدیلی اور خطابات سے دارا شکوہ ہی کو سیاسی فائدہ ہوتا ہے لیکن صرف ڈیڑھ ماہ کے بعد ہی جمادی الاولیٰ ۱۰۶۶ھ کو مطابق مارچ ۱۶۵۶ھ کو دارا شکوہ بلند اقبال" کو چھ بیس کروڑ ساٹھ لاکھ روپیہ کا انعام دیا جاتا ہے۔ آگرہ سے دہلی تک کی راہ داری کی خدمت بھی اس کے نوکروں کو تفویض کی جاتی ہے۔[2]

رائے رگناتھ جو دفتر تن اور خالصہ کا مہتمم تھا۔ خلعت ہاتھی اور رائے رایاں کے خطاب سے سربلند ہوتا ہے۔ چندر بھان برہمن جو انشا پردازی اور مدح نگاری کے فن میں کمال رکھتا تھا اس نے دارا شکوہ ہی کے ایماء پر مکالماتِ بابا لال" کو قلمبند کیا تھا جو دارا کیلئے نظریاتی اور فکری طور پر بہت کارآمد چیز تھی اور دارا ہی کے نظریات اور فکر کو فروغ دیتی تھی اس لیے اُسے دارا شکوہ نے شاہ جہاں سے اپنے لیے مانگا دارا شکوہ چندر بھان برہمن کی سیاسی اہمیت و قدر و قیمت کو جانتا تھا۔ وہ ہندوؤں میں ایک اعلیٰ ذات کے ہندو ہونے پر ایک اعلیٰ مقام رکھتا تھا اس لیے دارا شکوہ کے لیے بہت کارآمد تھا۔ اس لیے دارا نے اسے ایک اعلیٰ عہدہ

ؐ۱ عملِ صالح حصہ دوم ص ۲۶۲۔

ؐ۲ عملِ صالح حصہ دوم ص ۶۶۶-۶۶۷-۶۷۷-۸۵۵۔

ؐ۳ بزمِ تیموریہ ص ۲۰۸۔

منصب اور خطاب دیا اور حکومت کے ایک اہم کارکن کی حیثیت سے دارا کے نظریات کو فروغ دینے کے لیے اہم کام سپرد کیا۔ اس طرح دارا شکوہ کے لیے چندر برہمن ایک بہت ہی کارآمد رفیق تھا۔ اس کی موجودگی سے دارا کے نظریات کو تقویت پہنچتی تھی اور فروغ حاصل ہوتا تھا۔

دارا کے مشورے سے امراء مملکت کے تبادلے۔ عہدوں میں ترقیاں۔ انعام و اکرام کی داد و دہش سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وحدتِ ادیان کے حامیوں کو آگے لایا جا رہا تھا۔ ان سے دارا خوش رہا ہوگا۔ لیکن صحیح العقیدہ مسلمان خوش نہیں رہے ہوں گے اور شاہ جہاں دارا کی محبت میں جو یہ سب کچھ کر رہا تھا اس سے اس کی خود اپنی پوزیشن اپنے بیٹوں میں اختلافی ہونی شروع ہو گئی ہو گی۔

ابھی سال بھی پورے نہیں ہوا کہ شہزادہ دارا شکوہ کو پانچ کروڑ دام اور اس کی تنخواہ بڑھا کر ساٹھ کروڑ دام یعنی ڈیڑھ کروڑ سالانہ ۱؎ ربیع الثانی ۱۰۶۷ھ بمطابق ۳۰ جنوری ۱۶۵۷ء کو کر دی جاتی ہے اور اس کے دوسرے لڑکے سپہر شکوہ کو آٹھ ہزار ذات۔ تین ہزار سوار کے منصب پر سرفراز کیا گیا اس کے علاوہ شاہ بلند اقبال" کے ایما پر متعدد منصب داروں کے تبادلے، عہدوں میں ترقیاں۔ جاگیروں کے تبادلے، تحفے۔ تحائف، انعام و اکرام ملے اس سے دارا کی پوزیشن مضبوط اور مستحکم ہوئی۔

دارا شکوہ کا حکومت پر غاصبانہ قبضہ:

دارا شکوہ ۱۰۶۵ھ بمطابق ۱۶۵۵ء (اسی سال "مجمع البحرین" تصنیف مکمل کی تھی) سے خاص پلان اور اسکیم کے ساتھ حکومت کے اداروں میں اپنے اثرات اور اپنے ہمدردوں کی تقرری، ترقیاں تبادلے کرا رہا تھا اور فکری و نظری طور پر اس کے

۱؎ عملِ صالح ص ۶۸۳۔

ہمدرد اور حامی از خود یا اس کی ایما پر دارا کے نظریات یا ان کے اپنے خود ساختہ نظریات جو دارا کی معرفت عام کرنا چاہتے تھے۔ وہ دارا کے نام سے پیش کر رہے تھے دارا شکوہ کی نظریاتی اور فکری عروج اور مکمل اقتدار و قبضہ ۱۰۶۷ھ بمطابق ۱۶۵۷ء کو ہو جاتا ہے کیونکہ اسی سن میں دارا کے ایما پر سر اکبر کے نام سے اپنشد کے پچاس ابواب کا فارسی میں ترجمہ ہوتا ہے جس میں بسم اللہ کے بجائے گنیش جی کی تصویر دی جاتی ہے۔ اور دارا اسی کو بحر توحید کا سرچشمہ اور اسی کو قرآن مجید کی آیت بلکہ تفسیر قرار دیتا ہے۔ فکری و نظریاتی لحاظ سے شریعت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے متبادل ایک اپنی طریقت بے شریعت کا نفاذ کرتا ہے۔ یہی سن اس کے سیاسی عروج کی بھی انتہا ہے۔ اس کے فکری اور نظریاتی ہمنوا ہی نہیں بلکہ اقتدار کے حامی افراد حکومت کے نظم و نسق پر چھا چکے تھے اور اسی وقت حکومت پر قبضہ کر سکتے تھے۔

دارا شکوہ تو تمام تیاریاں مکمل کر ہی چکا تھا اور یہ تمام کام شاہ جہاں ہی کے حکم سے انجام پائے تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جہاں تو مکمل اس کی مرضی و منشا کے مطابق کام کر رہا تھا۔ لیکن پھر بھی دارا کو اعتبار نہیں تھا۔ اس لیے جیسے ہی ۷ ذی الحجہ ۱۰۶۷ھ بمطابق ۲۴ ستمبر ۱۶۵۷ء کو شاہ جہاں کی طبیعت ناساز ہوتی ہے دارا شکوہ کے لیے ایسا موقع فراہم ہو جاتا ہے جس کیلئے وہ برسوں سے تیاری کر رہا تھا۔

شاہ جہاں کی بیماری کے صرف ایک ہفتہ بعد ۱۵ ذی الحجہ ۱۰۶۷ھ بمطابق یکم اکتوبر ۱۶۵۷ء کو شاہزادہ دارا شکوہ کو دس ہزار ذات، دس ہزار سوار ترقی دے کر پچاس ہزار ذات۔ چالیس ہزار سوار دو اسپہ و سہ اسپہ کا منصب ملتا ہے۔

ایک کروڑ کا اضافہ کر کے بیس کروڑ دام (پچاس لاکھ روپے سالانہ) تنخواہ مقرر ہوئی۔ آگرے کی زکوٰۃ ساڑھے سات کروڑ روپے تھی وہ معاف فرمائی گئی اور یہ بھی حکم ہوا کہ جہاں کہیں سواری جایا کرے وہاں کی زکوٰۃ معاف اور قید خانے

میں جو قیدی تھے ان میں سے اکثر کو جرائم کی تحقیق کے بغیر آزاد کر دیا جائے[1]۔ ان احکام سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک طرف تو دارا شکوہ کے اقتدار میں اضافہ کیا جا رہا ہے اور دوسرے حکومت کے نظم و نسق کو جو شریعت کے قریب لانے کی کوشش کی گئی تھی اس کو ختم کر کے دارا کی طریقت بے شریعت کے مطابق کیا جا رہا ہے۔
شاہ جہاں کی بیماری کے دوران میں دارا شکوہ کا مملکت کے نظم و نسق پہ مکمل کنٹرول ہو گیا تھا۔ تنخواہ۔ جاگیرات اور انعام و اکرام کی صورت میں اس کی دولت و اثرات میں بے انتہا اضافہ ہوا۔ اس سے دارا کے نظریات سے اختلاف کرنے والے لوگ ضرور فکر مند ہوئے ہوں گے۔

۱۷ اور ۱۹ محرم ۱۰۶۸ھ بمطابق ۲۵، ۲۷ اکتوبر ۱۶۵۷ء کو شاہ جہاں جھروکہ میں درشن دیتا ہے اور ۲۰ محرم (۲۸ اکتوبر) کو دہلی سے آگرہ کے لیے روانہ ہوتا ہے اور دہلی سے روانگی کے وقت مختلف انتظامی امور کے لیے احکام دیتا ہے اور شاہزادہ دارا شکوہ کی طرف سے عزت خاں کو دارالسلطنت لاہور کا انتظام سپرد کرتا ہے اور اسی کی نیابت میں اسی کے نوکر شیخ مولوی گیلانی کو ملتان کی حکومت دیتا ہے اور شاہی سواری جب متھرا پہنچتی ہے تو یہاں بھی شاہ جہاں کچھ انتظامی تبدیلی کرتا ہے اور منصب دارہ کے منصب میں کچھ اضافہ کرتا ہے اور انعام و اکرام دیتا ہے۔

شاہ جہاں کی ۷ ذی الحجہ کی بیماری صرف ایک ماہ پندرہ دن کے بعد دہلی سے آگرہ روانگی اور اس اثناء میں ۱۵ ذی الحجہ میں شاہزادہ دارا شکوہ کے منصب میں اضافہ اور مختلف انتظامی امور کے لیے منصب داروں میں تبدیلی اور منصب میں اضافہ اس سے شکوک و شبہات میں اضافہ ہوتا ہے اور شہزادوں نے محسوس کیا ہوگا کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے؟ آخر کار شاہ جہاں ۸ ار صفر (۲۵ نومبر

---

[1] عملِ صالح حصہ دوم ۷۰۵، ۷۰۶ ص۔

۱۶۵۷ء) کو آگرہ میں شاہزادہ دارا شکوہ کی کوٹھی میں قیام کرتا ہے اور ۱۰ ربہمن ۴ ۲ ر ربیع الاول مطابق ۳۰ ر دسمبر ۱۶۵۷ء کو اپنی بیماری سے صحت یاب ہونے کے بعد ۶۹ ویں قمری سال کا جشن مناتا ہے اور شاہزادہ دارا شکوہ فرزند اقبال کو ایک کروڑ روپے عطا کرتا ہے۔ بیش قیمت تحفے تحائف تیس لاکھ موتیوں کی مالا مال چودہ لاکھ کے مرصّع آلات کے علاوہ دس ہزار ذات اور سوار کی ترقی دے کر اس کا منصب ۶۰ ہزار ذات، چالیس ہزار سوار۔ تیس ہزار دو اسپہ وسہ اسپہ مقرر فرماتا ہے۔ اسی کے مطابق جاگیریں اور تنخواہ متعیّن کی صوبہ بہار کا نظام اُسکے سپرد کیا۔ ۸۳ کروڑ دام سالانہ تنخواہ معیّن کی دو کروڑ ستاون لاکھ پچاس ہزار روپے کے مساوی۔ ستو راس گھوڑے تحفے میں مرحمت کیے دارا شکوہ کے لڑکے کو تین ہزار ذات سوار سے ترقی دے کر دس ہزار ذات پانچ ہزار سوار کا منصب بخشا۔ جعفر خاں کو خلعتِ خاصہ اور قلمدانِ مرصّع عنایت کر کے وزارت کل کا عہدہ عطا کیا اور حکم ہوا کہ حساب کے فردوں پر رائے رایاں کے دستخط ثبت ہوا کریں، اور پروانوں پر جعفر خاں کی مہر کے نیچے رائے رایاں کی بھی مہر لگا کرے۔ اس کے علاوہ متعدد دیگر منصب داروں کی ترقیاں ہوئیں[1]۔

دارا کو یہ اعزاز اور رتبہ جو انعام و اکرام کی صورت میں ملا تو عملاً اپنے منصب اور اقتدار کے لحاظ سے سب بھائیوں کے مقابلے میں زیادہ با اثر و با اقتدار ہو گیا اور حکومت کے نظم و نسق میں اس کو برتری حاصل ہو گئی۔ شاہ جہاں نے از خود دارا پر یہ اعزاز و عنایات بخشے یہ بات سیاسی مصلحت اور حکمتِ عملی کے خلاف تھی اس سے خود اس کے بیٹے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔ جیسا کہ بعد میں نظر آتا ہے یا دارا اپنے فکر و نظریات کی وجہ سے اتنا با اثر ہو گیا تھا اور شاہ جہاں بے بس ہو گیا تھا کہ دارا جو کچھ چاہتا تھا۔ وہ کرا لیتا تھا یا شاہ جہاں۔ ملا شاہ بدخشی اور اس کے

---

[1] عملِ صالح حصہ دوم ص ۷۰ تا ۱۰۷

مرید داراشکوہ کے فکر و نظریات کے دامِ فریب میں آگیا تھا اور جو کچھ یہ لوگ چاہتے تھے اسی میں اس کی بھی مرضی ہوتی تھی اور سنّتِ نبوی کے نفاذ سے جس سے اس نے اپنے دورِ حکومت کا آغاز کیا تھا اب وہ داراشکوہ کی طریقت بے شریعت کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ شاہ جہاں کے اس رویّہ سے اس کے دوسرے بیٹے یا دارا کے دیگر بھائی مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔ عدمِ اطمینان ہونے کی صورت میں اس ظلم و ناانصافی کے خلاف جنگ ناگزیر ہو گئی تھی۔ دوسرے دارا کے افکار و نظریات سے شریعت کے حامل مسلمان الگ بے چین و مضطرب تھے۔ اور اس سے نجات پانے کے لیے ایک آواز پر لبیک کہنے کے لیے تیار تھے۔ دارا نے خود اپنے فکر و نظریات اور عمل و کردار سے ہر مخلص و باکردار شخص کو اپنا دشمن بنا لیا تھا۔

دارا کے اس عروج و اقتدار سے لوگ مضطرب تو ہو رہے تھے اور انہیں کوئی صحیح اطلاع نہیں مل رہی تھی کہ اسی اثناء میں داراشکوہ نے ڈاک کی ترسیل بند کر دی اور شہزادوں کے وکیلوں کو قید کر دیا[1] اور اورنگ زیب کے وکیل عیسیٰ بیگ کو نہ صرف قید کر لیا۔ بلکہ گھر بھی ضبط کر لیا[2] دارا کے اس فرمان سے "حق و باطل کی جنگ" شروع ہو جاتی ہے۔

حضرت میاں میرؒ کا سوانح نگار:

حضرت میاں میرؒ ۹۵۷ھ میں حصول دنیا اور سیوستان (موجودہ سیہون ضلع دادو) میں پیدا ہوئے لیکن نقل مکانی کر کے لاہور چلے آئے تھے اور ۶۰ سال تک لاہور میں قیام کیا اور ۱۰۴۵ھ میں لاہور میں انتقال کیا اور اور یہیں مدفون ہوئے[ع]

ع سفینۃ الاولیاء ص

[1] عمل صالح دوم ص ۱۴۷۔

[2] مآثرِ عالمگیری ص ۲ ساقی مستعد خاں۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔

حضرت میاں میرؒ اکبر بادشاہ کے دورِ الحاد کو دیکھا لیکن دربار اور بادشاہ سے تعلق نہیں رکھا۔ فقر و غنا نے توکل و قناعت کی زندگی اختیار کی، سنت کی بڑی پابندی کرتے تھے شریعت کے خلاف ایک قدم باہر نہیں نکالتے تھے۔ خلوت و جلوت میں کسی وقت بھی اپنی زبان سے ایسی بات نہ نکالتے جو شرع کے مخالف ہو[1]۔ ان کی یہی صفت تھی کہ جہانگیر بادشاہ ۱۶۱۹ء میں حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کو قلعہ گوالیار میں قید کرنے کے بعد ان سے ملاقات کرتا ہے اور اپنی تزک میں دولت فقر سے مالا مال اور حصولِ دنیا سے بے نیاز ہونے کا تذکرہ کرتا ہے[2] شاہ جہان بادشاہ نے بھی کشمیر سے واپس آتے ہوئے دو مرتبہ ان کی خانقاہ لاہور میں ان سے ملاقات کی۔ حالانکہ ان میاں میرؒ کو دنیا والوں کی ملاقات سے نہایت نفرت و وحشت تھی اور ہمیشہ اس کام سے بچتے رہتے۔ لیکن شاہ جہاں کے ساتھ خوش بیٹھتے بلکہ دیر تک تشریف رکھنے کی فرمائش کرتے اس سے شاہ جہاں کی میاں میرؒ سے عقیدت و احترام ظاہر ہوتا ہے لیکن میاں میرؒ کا ۱۰۴۵ھ میں انتقال ہو جاتا ہے اور دارا شکوہ اپنی اولین تصنیف سفینۃ الاولیاء ۲۷ رمضان المبارک ۱۰۴۹ھ میں شائع کرتا ہے اور اس میں حضرت میاں میرؒ کی دینداری کے متعلق بہت ہی اچھے الفاظ لکھتا ہے۔ اس کے تین ماہ دو دن کے بعد حضرت میاں میرؒ مرحوم کے خلیفہ ملا شاہ بدخشی کا ۲۹ ذی الحجہ ۱۰۴۹ھ کو مرید ہوتا ہے ان کی دنیا سے بے رغبتی۔ توکل۔ قناعت اور ترکِ دنیا کی تعریف کرتا ہے اور اپنے پیر کے پیر کے حالات کی طرف ہمہ تن مشغول ہو جاتا ہے اور تین سال کی مسلسل محنت کے بعد ۱۰۵۲ھ میں حضرت میاں میرؒ کی سوانح حیات "سکینۃ الاولیاء" کے نام سے شائع کرتا ہے۔ اس سے دارا شکوہ کو اپنے روحانی سلسلے میں ایک بہت بلند مقام حاصل ہو جاتا ہے۔

---

[1] عملِ صالح حصہ دوم ۷۸۸

[2] تزکِ جہانگیری ص ۵۶۳ و ۵۹۱۔

جس کو وہ اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔

دارا شکوہ ۱۰۵۲ھ تا ۱۰۶۵ھ اپنی تخلیقی تصانیف کے ذریعہ اپنے نظریات کو فروغ دیتا ہے اور اسے اپنے پیر اور روحانی سلسلے کے مریدین کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن حضرت میاں میرؒ کا سوانح نگار ۱۰۶۵ تا ۱۰۶۷ھ صرف دو سال کے درمیان میں دنیا کے حصول میں انعام و اکرام، تحفے، تحائف۔ جاگیرات منصب اور تنخواہ میں اضافے۔ منصب میں بیس ہزار سے بڑھ کر ساٹھ ہزار تک اضافہ۔ اپنے حامی ملازمین کی تقرری۔ ترقیاں۔ تبادلے جس سرعت ڈھٹائی و بے شرمی سے کرتا ہے اس سے تاریخ کے ایک غیر جانبدار طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہی حضرت میاں میرؒ کی قناعت تھی؟ کیا یہی دنیا سے بے رغبتی تھی۔ کیا یہی صبر و توکل تھا؟ کیا یہی حصولِ دنیا سے بے نیازی کی تعلیم تھی جس پر دارا شکوہ عامل تھا اور لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی تقلید کریں۔

دارا کہنے اور لکھنے کو تو یہ سب کچھ کہتا تھا اور لکھتا تھا۔ اور اپنے پیر و مرشد اور ان کے خلیفہ کی دینداری کے متعلق نہایت ہی اچھے اور خوشنما الفاظ استعمال کرتا تھا اور ان کی معرفت اپنی ذات کو بڑھاتا تھا۔ لیکن خود اس کی عملی زندگی و کردار اس کے بالکل برعکس تھی۔ حصولِ دنیا اور دین کے معاملے میں اس کا رویہ نہایت ڈھٹائی و بے شرمی اور کھلم کھلا منافقت پر مبنی تھی وہ کسی اعلیٰ قدر کا قائل ہی نہیں تھا۔ وہ تو دنیاوی اقتدار اور جاہ و منزلت اور حکومت برائے حکومت کا حریص تھا۔ اس کی تمام تگ و دو اور مذہبیت کا دعویٰ محض اپنے نفس کو تسکین دینا تھا اس پہ کوئی مخلص اور شریعتِ نبوی کا حامی مسلمان مطمئن نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے حضرت میاں میرؒ مرحوم کی نیک نامی۔ پاکبازی۔ راست بازی۔ قناعت تقویٰ۔ دنی دنیا سے بے تعلقی کو اپنے مذموم مقاصد کے حصول اور مسلمانوں کے درمیان فکری اور نظریاتی انتشار پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح العقیدہ مسلمان دارا کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اس کو ناکام کرتے ہیں

لیکن جو طاقتیں مسلمانوں کی وحدت اسلامیت اور شریعتِ نبوی کے خلاف ہیں ان کے نزدیک دارا ایک لائق ذہین ۔ فلسفی اور ترقی پسند مسلمان ہے اور مسلمانوں کو اس کی تقلید کرنی چاہیئے ۔ تا کہ مسلمانوں کو مغلوب اور شریعتِ نبوی سے دور رکھا جا سکے ۔

مُلّا شاہ کی تحریک طریقت بے شریعت :

ملّا شاہ کا نام شاہ محمد تھا ۔ حضرت میاں میرؒ ان کے مرشد ان کو محمد شاہ کے نام سے پکارتے تھے ۔ لیکن وہ ملّا شاہ کے نام سے مشہور و معروف ہوئے ۔ ان کا آبائی وطن بدخشاں تھا اس لیے وہ ملّا شاہ بدخشی کے نام سے مشہور ہوئے ۔ مُلّا شاہ شروع ہی سے نماز ادا کرتے ، روزے رکھتے ۔ کم کھاتے اور کم سوتے ، زہد و تقویٰ ان کی زندگی کا شعار تھا انہوں نے ابتدائی تعلیم بدخشاں ہی میں حاصل کی اور اس کے بعد شیخ طریقت کی تلاش میں ۱۰۲۳ھ میں کشمیر میں آئے اور یہیں سے وہ پھر دہلی اور آگرہ پہنچے اور یہیں انہیں معلوم ہوا کہ ایک صوفی نقش شیخ لاہور میں ہے ۔ اس لیے وہ حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے ۔ اور ان کے سلسلہ قادریہ میں داخل ہو کر طریقت و معرفت کی منزلیں طے کیں ۔ میاں میرؒ کو ابن عربی کی تصنیف "فتوحات کلیہ" اور جامی نے ابن عربی کی فصوص الحکم) کی جو شرح لکھی تھی وہ از بر تھی ۔ مُلّا شاہ حضرت میاں میرؒ کے بہت قریب اور ان کے مریدوں میں بہت ممتاز رہے اس لیے جب حضرت میاں میرؒ کا ۱۰۴۵ھ میں بمطابق ۱۶۳۴ء میں انتقال ہو جاتا ہے تو ملّا شاہ بدخشی ہی ان کے خلیفہ منتخب ہوتے ہیں ۔ اس طرح وہ زبدۃ العارفین حضرت میاں میرؒ قادری کے خلیفہ ہوتے ہیں ۔ اب ملّا شاہ کو ایک مشہور روحانی سلسلہ قادریہ کی قیادت حاصل ہو جاتی ہے ۔ ملّا شاہ نے اپنے زیر تربیت زمانے میں دیکھا تھا کہ ۱۰۲۸ھ میں شیخ احمد سرہندی کو قلعہ گوالیار میں قید کرنے کے بعد جہانگیر بادشاہ

نے حضرت میاں میرؒ سے لاہور میں ملاقات کی تھی اور جہانگیر کے انتقال کے بعد جب شاہ جہاں بادشاہ ہوتا ہے تو وہ بھی کشمیر سے واپس ہوتے ہوئے لاہور کی خانقاہ میں حضرت میاں میرؒ سے ملاقات کرتا ہے۔ حالانکہ حضرت میاں میرؒ کو دنیا والوں کی ملاقات سے نہایت نفرت اور وحشت تھی اور ہمیشہ اس کام سے بچتے تھے لیکن شاہ جہاں سے بڑی کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ خلفاء راشدین کے اس جانشین شاہ جہاں کے ساتھ وہ خوشی سے بیٹھے بلکہ اصرار کیا کہ دیر تک تشریف رکھے غرض وہ صحبت بہت ہی دلفریب اور دل آویز تھی اہل مجلس نے روحانی فیض خوب حاصل کیے[۱] ملّا شاہ نے کہ جہانگیر اور اس کے بعد شاہ جہاں کی حضرت میاں میرؒ سے عقیدت خود اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اب وہ میاں میرؒ کے جانشین اور خلیفہ تھے اور ان کو قادری سلسلہ میں مرکزی مقام حاصل ہو گیا تھا! اسطرح وہ تمام حضرات جو حضرت میاں میرؒ کے طریق فکر سے متاثر تھے وہ ملا شاہ بدخشی کے پیرو کار ہو جاتے ہیں۔

۱۰۲۸ھ میں جہانگیر بادشاہ شیخ احمد سرہندیؒ کی تحریک احیاءِ شریعت سے ناخوش ہو جاتا ہے اور ان کو قلعہ گوالیار میں قید کر دیتا ہے اور اس کے بعد شیخ میاں میرؒ سے ملاقات کرتا ہے اور ان کی تائید و حمایت چاہتا ہے۔ شاہ جہاں کو "بے دولت" کا خطاب دے کر اس کے خلاف جنگ کرتا ہے شاہ جہاں ناکام ہوتا ہے اور جہانگیر سے معافی مانگ کر امن کا خواستگار ہوتا ہے اور اپنے دو لڑکوں دارا شکوہ اور اورنگ زیب کو بطور ضمانت کے دربار روانہ کرتا ہے اس طرح واقعات کا ایک رُخ جو ۱۶۱۹ء سے شروع ہو جاتا ہے۔ جہانگیر اس پر قابو پا لیتا ہے اسی اثناء میں ۱۶۲۴ء میں مطابق ۱۰۳۴ھ میں شیخ احمد سرہندیؒ انتقال کر جاتے ہیں۔ اور اس وقت حکومت کے ایوانوں پر جو لوگ چھائے ہوئے تھے سب کچھ

---

[۱] عملِ صالح حصہ دوم ۲۸۸۔

توقع کی جا سکتی تھی لیکن احیاءِ اسلام اور شریعتِ نبوی کے نفاذ کی توقع ممکن نہیں تھی تاہم شیخ احمد سرہندیؒ نے اپنی تحریروں اور عملی تحریک سے احیاءِ شریعت کے لیے مسلمانوں کے دلوں اور دماغوں کو جو گرمایا تھا اس کو سرد نہیں کیا جا سکتا تھا۔

چنانچہ ۸ نومبر ۱۶۲۷ء کو جہانگیر کے انتقال کے بعد جہانگیر کی جانشینی کے دونوں قوتیں سرگرم عمل ہو گئیں۔ شاہ جہاں بھی تخت کی جانشینی کا دعویدار تھا اور اپنے حریف سلطان داور بخش اس کے بھائی گرشاسپ اور طہورث۔ ہوشنگ اور بائیسنغر کی جدوجہد کو ناکام کیا اور انہیں قتل کرا کے اپنی مخالف طاقتوں کے لیے راستہ مسدود کر دیا۔ اس کے بعد شاہ جہان کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔ اور وہ ۱۳ فروری ۱۶۲۸ء بمطابق ۱۰۳۷ھ کو تخت نشین ہوتا ہے اور حکومت کی پالیسی کو احیاءِ شریعت کی طرف تبدیل کرتا ہے۔ شیخ احمد سرہندیؒ کا نام لیے بغیر وہ انہیں کی تحریک احیاءِ شریعت یا سنتِ نبوی کے لیے اقدامات شروع کرتا ہے اور ایک شاعر "زینتِ شرع" سے تاریخ تخت نشینی نکالتا ہے[1]۔ شاہ جہاں کے ان اقدامات کا پچھلے صفحات میں تفصیل سے تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ جن سے تحریک احیاءِ شریعت کو تقویت ملتی ہے۔ شاہ جہاں کی اس پالیسی سے اکبر اور جہانگیر کے پروردہ دانشور اتفاق نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی مخالفت کرنے کی جرأت تھی ان کی حکمت عملی اور مصلحت تھی کہ شاہ جہاں کے ابتدائی عہدِ حکومت میں خاموش رہے لیکن ان کی کوششیں جاری رہیں۔ تحریک احیاءِ شریعت یا احیاءِ سنتِ نبوی کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے لیکن شریعت کے نام سے وہ ایک ایسی شریعت چاہتے تھے جس پر مسلمان۔ ہندویت۔ عیسائیت اور یہودیت کے علمبردار سبھی متفق اور متحد ہوں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت اس کے تابع ہو اور اس کے علمبرداروں کے لیے کوئی جگہ نہ ہو یہ ایک ایسی خواہش تھی جو تحریک

---

[1] عملِ صالح حصہ اول ص ۲۱۲، ۲۰۹ تا ۲۳۸۔

سنّتِ نبوی کے مخالفین کے دلوں میں موجود تھی۔ لیکن وہ اس کا اظہار برملا نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی کسی میں یہ جرأت تھی کہ وہ اعلانیہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی شریعت کے خلاف تحریک چلاتا اس لیے شریعت کے نام پر طریقت بے شریعت کو فروغ دینے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی ہی پسند کے رہنما کو تحریک کا قائد بناتے ہیں جو ان کو طریقت بے شریعت کے نام پر اپنے پسندیدہ اسلام پہ چلانے کی کوشش کرتا ہے

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اکبر اور جہانگیر کے دورِ حکومت میں شیخ احمد سرہندیؒ اور شیخ میاں میر دو فرد ہی نہیں بلکہ دونوں حضرات اپنے اپنے طریقہ سے اسلام کی سربلندی اور احیاء کے لیے کام کرتے ہیں لیکن طریقہ مختلف ہے۔ میاں میرؒ اکبر ہی کے عہد میں ۹۵۷ھ میں پیدا ہوتے ہیں اور اپنی جائے پیدائش سے ترکِ سکونت کر کے لاہور میں ۶۰ سال تک قیام کرتے ہیں اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں اور شیخ احمد سرہندیؒ ۹۷۱ھ میں سرہند میں پیدا ہوتے ہیں اور یہیں سے لوگوں کو احیاءِ شریعت اور اتّباعِ سنّتِ نبوی کی طرف بلاتے ہیں۔ میاں میرؒ تصوّف کے حقائق و نیز اصطلاحات سمجھاتے۔

ابنِ عربی کی تصنیف "فتوحاتِ مکیہ" اور "فصوص الحکم" پہ زور ہوتا اس کے برعکس شیخ احمد سرہندی کا قرآن پاک، سنّتِ نبوی، احیاءِ شریعت، غلبہ اسلام اور انہدامِ شرک و کفر پہ زور ہوتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہانگیر ان پہ الزام و اتّہام لگاتا ہے اور قلعہ گوالیار میں ۱۶۱۹ء میں قید کرتا ہے اور اس کے بعد حضرت میاں میرؒ سے ملاقات کرتا ہے اور اپنی تزک میں ان کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ یہ ایک بادشاہ جہانگیر کا اپنے عہد کے دو مسلمان مصلحین کے ساتھ رویہ ہوتا ہے۔ پچھلے صفحات میں اس پہ تفصیل سے بحث ہو چکی ہے۔ اب دونوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ شیخ احمد سرہندیؒ کا ۱۰۳۴ھ میں انتقال ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کی تحریک احیاءِ شریعت ۱۰۳۷ھ سے برگ و بار لانا شروع کرتی ہے

اور کفر اور شرک کی قوتوں پر چھانا شروع کرتی ہے۔ اس سے میاں میرؒ خوش ہوتے ہیں۔ خلفاءِ راشدین کا جانشین شاہ جہاں جب خانقاہ میں ملاقات کے لیے آتا ہے تو اپنے مسلک کے برخلاف اس سے دیر تک بیٹھنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں[۱۱] لیکن میاں میرؒ کا ۱۰۴۵ھ میں انتقال ہو جاتا ہے تو ان کے مرید ملا شاہ بدخشی خلیفہ ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اکبر و جہانگیر مر چکے اور دونوں مسلمان مصلحین شیخ احمد سرہندیؒ اور شیخ میاں میرؒ بھی انتقال کر چکے اب جہانگیر کا بیٹا شاہ جہاں حکمران تھا جس نے شیخ احمد سرہندیؒ کی تحریک احیاءِ شریعت کو ۱۰۳۷ھ سے اپنی مملکت کی پالیسی کا مقصد قرار دیا اور اس کے مطابق اقدامات بھی کرتا رہا۔

مُلّا شاہ بدخشی اور شاہ جہان کی مملکت کی پالیسی:

ملّا شاہ ۱۰۲۳ھ میں بدخشاں سے کشمیر آئے اور شیخ طریقت کی تلاش میں دہلی آگرہ گھومتے پھرے اور پھر لاہور آئے اور میاں میرؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے اور ان کے انتقال کے بعد ان کے خلیفہ ہو گئے۔ میاں میرؒ اپنی نیک نفسی اور قناعت پسندی کی وجہ سے عام لوگوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ جہانگیر بھی ان سے ملاقات کرتا ہے اور شاہ جہاں بھی ان سے ملاقات کے لیے جاتا ہے اس لیے جب ملّا شاہ میاں میر کے خلیفہ ہو جاتے ہیں تو ساتھ ہی سلسلہ قادریہ کے روحانی رہنما ہو جاتے ہیں اور ان کو بہت ہی معزز اور با اقتدار مقام حاصل ہو جاتا ہے۔

ملّا شاہ بدخشانی کو شروع ہی سے روزہ رکھنے، نماز ادا کرتے، کم کھانے اور کم سونے کی عادت تھی زہد و تقویٰ ان کی زندگی کا شعار تھا تمام علومِ دینی کی تکمیل کے بعد جستجوئے حقیقت اور معرفتِ خداوندی کا جوش غالب آیا تو ہندوستان کا رُخ کیا۔ انہوں نے صَرف۔ نحو، منطق۔ ہیئت، کلام۔ معانی۔ بیان۔ بدیع۔ فقہ اور حدیث و تفسیر کی تعلیم حاصل کی۔ مدرسوں اور خانقاہوں میں بیٹھے۔ لیکن اس محنت و کاوش

کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سب تعلیم بے نتیجہ اور وسوسہ انگیز ہے۔ ہندوستان میں بھی وہ کشمیر۔ دہلی و آگرہ میں مارے مارے پھرتے رہے پھر شیخ طریقت کی تلاش میں لاہور آئے اور میاں میرؒ کو ملا شاہ کے خلوص وطلبِ صادق کا یقین ہوگیا تو اپنے حلقۂ ارادت میں لے لیا۔ یہ شاہ جہاں کا دورِ حکومت تھا۔ اس کی حکومت احیاءِ سنّتِ نبوی کے لیے سرگرم عمل تھی۔ شیخ احمد سرہندیؒ کے متاثرین اور معتقدین نے اپنے دل و دماغ کی یکسوئی کے ساتھ معاشرے میں اسلام کی روح کو بیدار رکھا۔ اور اس کے اثرات امراء اور حکومت کے ایوانوں میں دیکھے جاسکتے تھے۔ اس کا اثر تھا کہ شاہ جہاں کا بڑا بیٹا داراشکوہ اپنے عنفوانِ شباب ہی میں بزرگان دین پر مشتمل "سفینۃ الاولیاء" لکھتا ہے اور اس کے تین ماہ دو دن کے بعد ۲۹ ذی الحجہ ۱۰۴۹ھ کو میاں میرؒ کے خلیفہ ملا محمد شاہ بدخشی کا مرید ہوجاتا ہے اور اس کے بعد میاں محمد میرؒ کی سوانح حیات کی طرف متوجہ ہوتا ہے یہیں سے داراشکوہ اپنے خیالات و افکار کو میاں محمد میرؒ مرحوم کے سہارے آگے بڑھانا شروع کرتا ہے۔

ملا شاہ اپنے آپ کو لسان اللہ کے خطاب سے لوگوں میں متعارف کرایا کرتے تھے اور خود اپنی ایک رباعی میں اپنے بارے میں کہتے ہیں:

رباعی

آنکس کہ زراہِ معرفت آگاہ ہست ملا شاہ است عارفِ ایں راہ است

ترجمہ:۔ وہ شخص جو کہ معرفت کے راستے سے آگاہ ہے۔ ملا شاہ ہے اس راہ کا عارف ہے۔

ازتاثیرِ زبان او معلوم است کامروز ملقّب بلسان اللہ است

اس کی زبان کی تاثیر معلوم ہے کیونکہ اس زمانے میں اس کا لقب لسان اللہ (اللہ کی زبان) ہے

اب ملا شاہ ایک ایسی شریعت کی تبلیغ و اشاعت کا آغاز کرتے ہیں جس میں ان کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور خود دعویٰ کے ساتھ اپنے کو "اللہ کی زبان"

قرار دیتے ہیں۔ ملّا شاہ کا یہ دعویٰ اور ان کی تحریک معاشرے اور شیخ احمد سرہندی کی تحریک احیاءِ شریعت پر بہت گہرا اثر ڈالتی ہے اس کا مطالعہ، ارتقا۔ معاشرے پر اس کے اثرات و نتائج بہت ہی عبرت انگیز اور دوررس ہوتے ہیں۔

ملا شاہ بدخشی سے شاہ جہاں کی ملاقات:

داراشکوہ ملّا شاہ بدخشی کا ۲۹ ذی الحجہ ۱۰۴۹ھ کو مرید ہوتا ہے اور شاہ جہاں کا چودھواں سنِ جلوس یکم جمادی الاُخریٰ ۱۰۵۰ھ بمطابق ۸ ستمبر ۱۶۴۰ء کو ہوتا ہے اس میں ملّا شاہ بدخشی جو زبدۃ العارفین حضرت میاں میر قادری کے خلیفہ ہیں وہ بادشاہ کی صحبت سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور معرفت و توحید کے بہت سے نکتے بیان کرتے ہیں[۱] اب اس سے ملّا شاہ کے وقار اور قدر و منزلت میں اضافہ ہوتا ہے اس سبب سے انہیں اپنے قادریہ سلسلے کے عروج و کامیابی کا یقین ہو گیا ہو گا اور خود میاں میر مرحوم کے متاثرین اور معتقدین اپنے طریقے اور مسلک پر مزید پُرا عتماد اور مطمئن ہو گئے ہوں گے۔

داراشکوہ کی بڑی بہن جہاں آرا بیگم تھی وہ اپنے بھائی کی معرفت ملّا شاہ بدخشی کی مرید ہوتی ہے اور طریقت ہی کے مسلک کو اختیار کرتی ہے اس نے ۲۶ سال کی عمر میں تصوّف پر ایک کتاب "مونس الارواح" لکھی ہے جس میں حضرت معین الدین چشتی اور ان کے سلسلہ کے دوسرے اکابر کے حالات بہت ہی عقیدتمندانہ انداز میں لکھے ہیں

---

[۱] عملِ صالح حصہ دوم ص ۲۷۳۔

نوٹ:۔ شیخ احمد سرہندی کو جہانگیر اپنے چودھویں سالِ جلوس میں قلعہ گوالیار میں قید کرتا ہے اور اس کے بعد میاں میر کو ملاقات کے لیے بلاتا ہے شاہ جہاں کشمیر سے واپسی میاں میرؒ سے خانقاہ میں ملاقات کرتا ہے اب ان کے خلیفہ ملّا شاہ بدخشی کو اپنے سنِ جلوس کے چودھویں جشن میں بلاتا ہے اور معرفت و توحید کی باتیں سنتا ہے۔

جس سے اس کے مذہبی اور صوفیانہ اندازِ فکر کا پتہ چلتا ہے۔ ملّا شاہ اس حیثیت سے بہت ہی خوش قسمت پیر و مرشد تھے کہ زبدۃ العارفین میاں میر قادریؒ کے انتقال کے بعد صرف پانچ سال میں شاہ جہاں کا سب سے بڑا بیٹا دارا شکوہ اور سب سے بڑی لڑکی جہاں آرا بیگم ان کی مرید ہو جاتی ہے اور اپنی عقیدت و محبت کے اظہار کے لیے دونوں مذکورہ کتابیں لکھتے ہیں اور ملّا شاہ جہاں کے چودھویں سن جلوس میں شرکت کرتے ہیں۔ ملّا شاہ ایک صوفی پیرِ طریقت ہی نہیں بلکہ ایک شاعر بھی تھے شاہزادہ اور شاہزادی دونوں ان کے حلقے میں شامل ہو چکے تھے اور شاہ جہاں بھی اپنی ارادتمندی کا اظہار کر چکا تھا اس لیے شاہ جہاں کے متعلق اپنی ایک رباعی میں لکھتے ہیں:۔

اے شاہ جہاں از اہل دردی شاباش　　در عہد خویش طاق و فردی شاباش

ترجمہ:۔ اے جہاں کے بادشاہ تو اہلِ درد میں سے ہے شاباش۔ تو اپنے عہد میں طاق اور یکتا ہے شاباش۔

دل را بوصال زندہ کردی، شاباش　　شاباش دریں زمانہ مردی شاباش

ترجمہ:۔ دل کو تو نے وصال سے زندہ کر دیا شاباش۔ شاباش تو اس زمانہ میں مرد ہے شاباش۔

ملّا شاہ نے یہ تعریفی اور توصیفی کلمات تو شاہ جہاں کے متعلق کہتے ہیں۔ لیکن شاہ جہاں پر اپنے منصب اور شریعت کی رُو سے جو ذمہ داری اور فرائض عائد ہوتے ہیں اس کی یاد دہانی نہیں کراتے۔ یہ خاموشی کیوں؟ بلکہ صرف تعریف ہی کرتے ہیں۔ اسی اثنا میں دارا شکوہ اپنے پیر میاں میرؒ مرحوم کی سوانحیات "سکینۃ الاولیاء" لکھتا ہے

---

[۱] بزمِ تیموریہ ۸ ۱۴ ۱۴ مقدمہ رقعاتِ عالمگیری ۳۸۵۔

نوٹ:۔ دارا شکوہ پچیس سال کی عمر میں سفینۃ الاولیاء، لکھتا ہے اور جہاں آرا ۲۶ سال عمر میں مونس الارواح لکھتی ہے دونوں صوفیانہ طرزِ فکر اختیار کرتے ہیں۔

اس وقت اسکی عمر ۲۸ سال کی ہوتی ہے وہ اپنے پیر کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ تیس سال سے اوپر مدت تک ایک لمحے کے لیے نہیں سوئے انھوں نے سات سال تک عشا کی نماز سے صبح تک حبسِ نفس سے ذکر خفی کیا انھوں نے خود فرمایا کہ کبھی کبھی دو سانس میں رات گزار دیتا تھا دو مرتبہ سردیوں میں ان کے روئیں روئیں سے پسینہ نکلا۔ کشمیر میں تو ان کے جسم پر قطرے جم جاتے تھے لاہور میں وہ سردیوں میں بھی پنکھا کرتے تھے۔ ذکرِ خفی اور حبسِ دم کے متعلّق حضرت میاں میرؒ کے حوالہ سے بیان کرتا ہے کہ یہ طریقہ حضرت غوث الثقلین نے رائج کیا تھا۔

چشم بند و گوش بند و لب ببند گر نہ بینی سرِّ حق بر من بخند

ترجمہ:- آنکھ بند کر کان بند کر، لب بند کر۔ جب تو سازِ حق نہ دیکھے تو مجھ پر ہنس۔[1]

ملّا شاہ کی یہ باتیں لوگوں کو ان کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیتی ہیں۔

حضرت عبد القادر جیلانیؒ پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کے ایک بہت ہی قابلِ احترام اور قابلِ قدر بزرگ گزرے ہیں جنھوں نے اپنے عہد میں شریعت کا احیاء کیا ہے اب گیارہویں صدی ہجری میں ملّا شاہ بدخشی کے مرید کی معرفت ان سے ایسی بے سرو پا بات منسوب کی جا رہی ہے۔ لیکن حضرت میاں میرؒ تو لوگوں کے عہدِ قریب میں گزرے ہیں (دسویں اور گیارہویں صدی ہجری میں ۹۵۰ھ تا ۱۰۴۵ھ) اس عہد میں اکبر بادشاہ کے دور میں شریعت کو نظر انداز کیا جاتا ہے بلکہ شریعتِ نبوی کا لفظاً نہیں بلکہ معناً انکار کیا جاتا ہے اور اسی زمانے میں شیخ احمد سرہندیؒ قرآن پاک کی تعلیمات کی روشنی میں:

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے
اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ نہیں ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے

---

[1] پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ۔ ڈاکٹر ظہور الدین ص ۱۲۷۔

أَذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ط   دیکھتے نہیں ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔

(تفہیم القرآن جلد دوم ص ۱۰۲۔)

معاشرے کے ہر پہلو کو دیکھتے ہیں اور اس پر آنکھیں بند کرنے اور خاموشی اختیار کرنے کی بجائے مسلمانوں کو شریعتِ نبوی کی حقانیت کی روشنی میں بیدار کرتے ہیں۔ اور جہانگیر کے دور میں خود جہانگیر کے امراءِ مملکت کے ذہن و فکر اور عمل میں انقلاب پیدا ہوتا ہے اور خود شاہ جہان اپنے تیسویں سن سالگرہ میں باقاعدہ ایک جشن میں شراب نوشی ترک کرتا ہے (پچھلے صفحات میں اس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے) اور یہیں لوگوں میں ایک فکری انگڑائی شروع ہوتی ہے اور شریعتِ نبوی کے غلبہ کے لیے ایک کوشش شروع ہو جاتی ہے اور معاشرے میں شریعت کے معاملے میں جو جمود طاری تھا اس سے لوگ بیدار ہونا شروع ہوتے ہیں اور چند سالوں میں شریعتِ نبوی غلبہ حاصل کرنا شروع کرتی ہے۔ البتہ میاں میرؒ کا طرزِ عمل:

چشم بند و گوش بند و لب بہ بند   تا نہ بینی سرِّ حق بر من بخند

ترجمہ:۔ آنکھ بند کر۔ کان بند کر۔ لب بند کر جب تو سازِ حق نہ دیکھے تو مجھ پر ہنس۔

کے مصداق کے مطابق تھا اور یہی وجہ ہے کہ جہانگیر انہیں ۱۰۲۸ھ بمطابق ۱۶۱۹ء میں لاہور میں ملتا ہے اور ان کی تعریف و توصیف کرتا ہے۔ اب انہیں کے خلیفہ کا مرید شہزادہ دارا شکوہ ہوتا ہے اور ملّا شاہ بدخشی میاں میرؒ کے عمل کے خلاف شاہ جہاں کے چودھویں جشن میں شریک ہوتے ہیں اس پر شریعتِ نبوی کے متاثرین اور علمبرداروں کو حیرت و استعجاب ہوا ہوگا۔

دارا شکوہ ہی کی وساطت سے اس کی بڑی بہن جہاں آرا بیگم دخترِ شاہ جہاں ملّا شاہ بدخشی کی مرید باصفا ہو جاتی ہے وہ صاحبیہ میں اپنے پیر کے بارے میں لکھتی ہے کہ وہ انیس برس تک حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں رہے۔ ان کا مزاج گرم تھا۔

وہ اپنے پیر کی اجازت سے گرمیوں میں کشمیر چلے جاتے انہوں نے سخت ریاضت و محنت کی انیس برس پہلے اور پانچ سال مرشد کی وفات کے بعد تک پہلو زمین پر نہ لگایا[1]

داراشکوہ اور جہاں آرا دونوں اپنے پیر ملّا شاہ بدخشی کے خرقِ عادت کا تذکرہ کرتے ہیں اس پر جو لوگ اعتبار کرتے ہیں اور ایمان لاتے ہیں تو ملّا شاہ بدخشی کے مرید اور منظورِ نظر ہو جاتے ہیں لیکن شیخ احمد سرہندیؒ نے اپنے مکتوبات جلد اوّل دوم۔سوم سے اور اپنے عمل اور تحریک سے جن لوگوں کے دل و دماغ کو بیدار کر دیا تھا وہ اس قسم کی باتوں سے ہنستے تو ہوں گے اعتبار لانا ان کے لیے مشکل ہوگا بلکہ ناممکن ہوگا کیونکہ ان کے سامنے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم صحابہ کبار اور آئمہ عظام اور علمائے حسن کی سیرت و کردار معیار رہا۔

وہ صاحبیہ ہی ہیں اپنے پیر و مرشد ملّا شاہ بدخشی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ کبھی ان کی نماز قضا نہیں ہوئی۔ وہ کبھی بیمار نہیں ہوئے۔جس کی وجہ سے ان کی نماز فوت ہوئی ہو انہوں نے ہمیشہ وقت پر نماز ادا کی[2] ملّا شاہ بدخشی کی یہ باتیں اور عمل قابلِ قدر اور قابلِ تقلید تھا لوگ ضرور اس کی قدر کرتے رہے ہوں گے۔ لیکن ملّا شاہ بدخشی کو اور ان کے مریدوں کو اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ توفیق دی کہ وہ شریعت پر عمل کرتے ہیں اور ایک مسلمان کے لیے یہ ضروری اور لازمی ہے کہ وہ شریعت پر عمل کرے اسے یہ زیبا نہیں دیتا کہ وہ اپنے ان اعمال کی نمائش کرے اور لوگوں کے سامنے اپنے عمل کا اشتہار دے۔مصرعہ:۔

مشک آن است کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

---

[1] پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ ص ۱۲۷

[2] ایضاً۔

ملا شاہ بدخشی کی جشنِ شاہ جہاں میں شرکت :

ملا شاہ بدخشی کی ۲۰ یکم جمادی الاُخریٰ ۱۰۵۰ھ ملا شاہ جہاں سے ملاقات ہو چکی تھی اور اس کے بیٹے دارا شکوہ اور بڑی بیٹی جہاں آرا بیگم ملا شاہ بدخشی کے مرید ہو چکے تھے اور دونوں نے ملا شاہ کے طرزِ فکر اور عمل آپنی عقیدت اظہار کرنے کے لیے سکینۃ الاولیاء اور مونس الارواح" ۲۵ اور ۲۶ سال کی عمر میں لکھ چکے تھے۔ شاہ جہاں کو اپنے بڑے بیٹے دارا شکوہ سے جو محبت اور عقیدت تھی وہ فطری تھی لیکن دارا شکوہ ایک حکمت سے اپنے کو اور قریب کر رہا تھا۔ اور جہاں آرا بیگم اپنی فطری شرافت و نیکی اور ماں کے انتقال کے بعد شائستگی سے باپ کی خدمت کی وجہ سے بہت قریب تھی۔ اس لیے جب شاہ جہاں اپنا ۵۶ واں جشن وزن قمری ربیع الاوّل ۱۰۵۵ مطابق جون ۱۶۴۵ء کرتا ہے تو اس میں ملا شاہ بدخشی کو اور دریائے معرفت میاں میرؒ کے مرید اور دارا شکوہ کے پیر کو بھی جشن میں شرکت کے لیے بلاتا ہے۔ ملا شاہ اس میں شرکت کرتے ہیں اور ایک رباعی پیش کرتے ہیں۔ جس پر بہت تحسین و آفریں ہوتی ہے: رباعی یہ ہے:

اے فضل بندہ فضل فضل تو بود فضلت خوش باد فضل فضل تو بود

ترجمہ :۔ اے بندوں میں فضل فضل تیرا ہی فضل ہے۔ تیرا فضل خوش ہو فضل تیرا ہی فضل ہے۔

چیزے کہ برابر تواند کردن در پلۂ میزان تو عدل تو بود

ترجمہ:۔ جو چیز کہ برابری کر سکتی ہے تیری میزان کے پلے میں تیرا ہی عدل ہے [1]

---

[1] عملِ صالح حصہ دوم ص ۵۶۰۔

ملّا شاہ کی اس رباعی پر خوب ہی تحسین و آفرین ہوتی ہے۔ شاہ جہاں کی اس میں تعریف و توصیف ہے۔ انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ وہ اپنی تعریف و توصیف کو پسند کرتا ہے۔ ملّا شاہ تعریف و توصیف کر کے شاہ جہاں کی توجّہ اپنی طرف مرکوز کر رہے تھے۔ لیکن سنّتِ نبوی کے علمبردار حضرات بادشاہ کو اور ذمّہ دار حضرات کو ان کے فرائض اور عام لوگوں کے جو ان پر حقوق واجب ہوتے ہیں ان کی طرف انہیں توجہ دلاتے ہیں۔ اس کے برعکس ملّا شاہ صاحب ان کی تعریف اور قصیدہ ہی پڑھتے ہیں۔ حضرت مقدادؓ بن اسود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم تعریف کرنے والوں کو دیکھو تو ان کے مُنہ میں خاک ڈال دو۔ (مشکوٰۃ باب حفظ اللسان)

ملّا شاہ کے اس عمل و کردار سے صحیح العقیدہ مسلمان خوش نہیں ہو سکتے تھے اس سے ان میں برگشتگی اور بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

ملّا شاہ بدخشی کے بھائی کو انعام دینا:

جہاں آرا بیگم صاحبہ یہ لکھتی ہے کہ وہ سلاطین سے اور امراء سے نذر و نیاز قبول نہیں کرتے تھے اپنے مریدوں سے معمولی نیاز مثلاً ایک دو روپیہ قبول فرما لیتے تھے اور یہ رقم غرباء اور مساکین پر صرف کر دیتے تھے[۱]

عام لوگوں کو جب ملّا شاہ بدخشی کے استغنا اور قناعت پسندی۔ غریب پروری اور مساکین کی سرپرستی کا حال معلوم ہو تو کیوں قبول نہ کریں۔ لیکن سوچنے اور غریبوں میں رہنے والوں کو یہ سوال ضرور ستاتا ہوگا کہ جب ملّا شاہ بدخشی کے مریدین میں اتنے با اقتدار جیسے دارا شکوہ اور جہاں آرا بیگم شریک ہوں تو کس غریب کی ہمت ہو گی کہ انہیں ایک دو روپیہ نذر دے کسی کو ان کی غریب پروری پر یقین نہیں ہوتا

---

[۱] فارسی ادب ص ۱۲۸

ہو گا۔ بلکہ ان کے بارے میں شک و شبہ ہی ہو گا۔ کہ یہ سب باتیں ان کے مریدوں کی اڑائی ہوئی ہوں گی۔ لیکن ملّاشاہ بدخشی دو بھائی تھے۔ ملّا سلطان علی اور سلطان محمد یہ دونوں اپنے اہل و عیال سمیت بدخشاں سے ہندوستان آتے ہیں۔ انہیں ۱۶ رجب ۱۰۵۹ھ مطابق ۲۶ جولائی ۱۶۴۹ء کو چار چار ہزار روپیہ انعام دیا جاتا ہے۔ اور کشمیر کے خزانہ سے آٹھ لاکھ روپیہ عنایت کیا جاتا ہے اور ملّاشاہ کے ساتھ رہنے کا حکم ہوتا ہے[1] ملّاشاہ تو نذر و نیاز نہیں لیتے۔ لیکن ان کے بھائی کو اتنی کثیر رقم کیوں دی جاتی ہے وہ کوئی عہدیدار اور منصب دار تو نہیں تھے؟ یہ بلا کسی محنت و مشقت کے اتنی کثیر رقم اور جائیداد ان کے بھائی کو ملتی ہے تو پھر انہیں حاجت کیا تھی کہ وہ کسی سے ایک یا دو روپیہ لیں؟ یہ عنایت آخر کس وجہ سے تھی! قناعت و خودداری کا اشتہار کیوں؟ اس سے ملّاشاہ کی استغنا اور قناعت پر کون اعتبار کرے گا۔

ملّاشاہ بدخشی اور شاہ جہاں کی تعظیم:

ملّاشاہ کے سلسلۂ ارادت میں جس طرح شہزادہ اور شہزادی شامل ہو گئے تھے اور شاہ جہاں جس طرح ان پر مہربان تھا اس سے عام لوگوں میں طرح طرح کی باتیں مشہور ہوئی ہوں گی۔ کوئی انہیں شاہ پرست اقتدار پرست کہتا ہو گا۔ خود ان کے پیر و مرشد میاں میرؒ کو دنیا والوں کی ملاقات سے نہایت نفرت و وحشت تھی اور ہمیشہ اس کام سے بچتے تھے[2] اس لیے معاشرے میں ان کے بارے میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں لازماً شروع ہو گئیں ہوں گی۔ وہ لاہور کی گرمی برداشت نہیں کر پاتے تھے اس لیے اپنے پیر ہی کی اجازت سے کشمیر چلے جاتے تھے اور یہیں کشمیر کے پُر فضا مقامات اور خصوصاً باغات جہاں کی آب و ہوا تر و تازہ اور دلکش ہوتی اور روح افزائی کے لیے

---

[1] عملِ صالح حصہ دوم ۵۶۰ و پاکستان میں فارسی ادب ص ۱۲۵۔

[2] ایضاً ص ۷۸۸۔

مفید ہوئی یہیں مقیم ہوئے۔ یہ باغات شاہ جہاں دارا شکوہ، جہاں آرا بیگم نے بنوائے تھے یہیں ایک پر تکلّف اور اعلیٰ مکان شاہ جہاں نے بنوا کر دیا تھا اور ملّا شاہ گرمیوں میں وہیں آکر ٹھہرتے تھے۔ ملّا شاہ اسی باغ میں مقیم ہوتے اور جب بادشاہ (شاہ جہاں) کے آنے کی خبر ہوتی تو عصا ہاتھ میں لیے ہوئے سیر میں مشغول ہو جاتے اور کھڑے کھڑے بادشاہ سے ملاقات کرتے جب بادشاہ رخصت ہونے کو کھڑا ہوتا تو وہ بھی ان کے ہمراہ کھڑے ہو جاتے اور کچھ عرصہ کے لیے سیر کرتے رہتے اس طرح بظاہر ان سے بادشاہ کی تعظیم ظاہر نہ ہوتی[1] اس طرح ملّا شاہ اپنے متاثرین اور اپنے روحانی سلسلے کے لوگوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے تھے کہ ان سے بادشاہ شاہ جہاں کی تعظیم نہیں ہوتی وہ تو بادشاہ کے لیے کھڑے بھی نہیں ہوتے اور سیر کرتے رہتے ہیں تو اسی حالت میں بادشاہ سے ملاقات ہوتی ہے۔ لیکن ملّا شاہ صاحب کے اس عمل سے کم فہم اور سادہ لوح لوگ تو یہ یقین کر سکتے تھے لیکن شریعتِ نبوی کے علمبردار تو جانتے تھے۔ ابھی چند سال قبل ۱۰۲۸ھ میں جب جہانگیر نے شیخ احمد سرہندیؒ کو دربار میں طلب کیا تھا تو آپ تشریف لے گئے مگر نہ کورنش بجا لائے اور نہ سجدہ کیا صرف مسنون طریقہ پر "السّلام علیکم" کہا اور جب بادشاہ نے شاہی آداب جن میں سجدہ بھی تھا بجا لانے کا حکم دیا تو آپ نے فرمایا کہ سجدہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے شاہی مفتی نے فتویٰ دیا کہ بادشاہ کو سجدہ کرنا جائز ہے۔ آپ نے فرمایا بے شک جب جان کا خوف ہو وہ آخری سجدہ بھی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہو۔ بادشاہ اس سے بہت ناراض ہوا۔ اور قلعہ گوالیار میں قید کر دیا۔ شاہ جہاں ۱۰۳۷ھ میں تخت نشین ہوا اور مملکت کی پالیسی کو شریعت کے تابع کرنا شروع کیا تو اس نے سجدہ تعظیمی کو ختم کیا اور شبستان ہند کو شریعتِ محمدی کے نور سے روشن کر کے سجدہ اور زمین بوسی کی بجائے چار تسلیمات کا حکم دیا۔ سادات۔ عارفوں۔ خدا رسیدہ درویشوں اور

---

[1] پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ ص ۱۲۸

علماء فضلاء کو جو خود تعظیم کے لائق ہیں ان چار تسلیمات سے بھی معاف فرمایا تاکہ ان کا وقار برقرار رہے[۱]۔ ملّا شاہ بدخشی کا شاہ جہاں سے ملاقات کا طریقہ اور عام لوگوں کو یہ تاثر دینا کہ وہ پادشاہ کی تعظیم نہیں کرتے ایک نہایت ہی بھونڈی اور مصنوعی حرکت تھی اس سے لوگ مرعوب ہو سکتے تھے۔ لیکن ان کے لیے دل میں احترام و عظمت پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ شریعتِ نبوی کے علمبرداروں کے سامنے حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کی مثال تھی وہ شاہ جہاں کی حمایت کرتے ہیں صرف اس لیے کہ اس کے پاس اقتدار و اختیار ہے وہ شریعتِ نبوی کو نافذ کر سکتا ہے اس کے لیے ان کو کوئی دنیاوی خواہش نہیں ہے اور نہ ہی کوئی مصنوعی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ مُلا شاہ بدخشی کے طور طریقوں سے ان کے مرید داراشکوہ کی طریقت اور شریعت کو فروغ حاصل ہو رہا تھا اس سے شریعتِ نبوی کے علمبردار فکرمند ہوتے ہیں اور اپنی کوشش تیز تر کر دیتے ہیں۔

ملّا شاہ بدخشی اور جہاں آراء بیگم :

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جہاں آرا بیگم بڑی دختر شاہ جہاں اپنے بھائی داراشکوہ کی وساطت سے حضرت ملّا شاہ کی مرید ہو جاتی ہے اور چھبیس[۲۶] سال کی عمر میں عقیدت سے صوفیانہ انداز میں "مونس الارواح" لکھتی ہے جس سے اس کے مذہبی اور صوفیانہ ذہن کا صحیح طور پر اندازہ ہوتا ہے[۲]۔ وہ صاحبیہ میں لکھتی ہے کہ میں نے اخلاص و عقیدت سے بھرے ہوئے خطوط لکھے۔ ایک مرتبہ اپنے ہاتھ سے روٹی اور ساگ پکا کر بھیجا ایک ماہ تک انہوں نے اعتنا نہ کیا اور فرماتے رہے کہ ہمیں دنیاداروں اور بادشاہوں سے کیا کام۔ آخر وہ میرے جذبۂ صادق کو جان کر خطوں کا جواب دینے لگے

۱۔ عملِ صالح حصہ اول ص ۲۳۶۔

۲۔ بزمِ تیموریہ ص ۸۴۴، مقدمات رقعاتِ عالمگیری ۳۸۵۔ پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ جلد ۱۳۲۔

ایک دفعہ میں نے ان کے گھر جاکر دور سے انہیں دیکھا اور آخر انہیں اپنا مرشدِ حقیقی بنایا وہ اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہے کہ میں تو سلسلہ چشتیہ میں مرید ہوں اور اب مشربِ قادری میں شریک ہوتی ہوں۔ مجھے کشائش ہو گی یا نہیں؟ وہ فرماتی ہیں کہ اسی رات میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حضرت مرشد کو ان کے قدموں میں سر رکھے ہوئے دیکھا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا:

"تو نے تیموری چراغ روشن کر دیا" میرا دل باغ باغ ہوا۔¹

وہ لکھتی ہے کہ پیرِ دستگیر اور مرشدِ کامل کے فیض سے مجھے ایمانِ حقیقی حاصل ہوا۔ جہاں آرا بیگم اپنے پیر و مرشد کے متعلق شوق و وجد کی حالت میں یہ شعر بھی کہتی ہے: شعر:

پیر من خدائے من، دین من و پناہ من

نیست کسی پیغمبر تو شاہ من و الٰہ من

ترجمہ:۔ میرا پیر میرا خدا ہے میرا دین میری پناہ ہے۔ کوئی پیغمبر نہیں ہے۔ تو میرا بادشاہ ہے میرا معبود ہے۔

جہاں آرا کی اپنی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس پر ملا شاہ کی طریقت کس قدر حاوی تھی کہ انہیں کے مرکزِ خیال فکر کے تحت گھومتی تھی اس سے ہٹ کر وہ سوچ ہی نہیں سکتی تھی حالانکہ وہ ایک مسلمان تھی اور مسلمان ماں اور باپ کی بیٹی تھی اور اس کے باپ ہی نے مملکت کی پالیسی کو شریعت کے تابع کرنا شروع کیا تھا وہ خود اپنے کو شریعت اور خلفاء راشدین کا جانشین قرار دیتا ہے۔² جہاں آرا بیگم اپنی تعلیم اور علم کے باوجود ملا شاہ کی طریقت کی پیرو ہوتی ہے اور انہیں کو اپنا سب کچھ سمجھتی ہے وہ "حق" سے ملا شاہ کو پہچاننے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ ملا شاہ سے "حق" پہچاننے کی کوشش

۱؎ پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ ص ۱۳۳

۲؎ عملِ صالح حصہ اول ص ۲۰۹ تا ۲۳۸۔

کرتی ہے وہ اپنی فطرت سے دیندار، نیک۔ شریف اور دین کی ہمدرد تھی اس کی بالا تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر ملّا شاہ کی عقیدتمند تھی انہیں کے اسلام کو عین اسلام سمجھتی ہے۔ ان کی عبادت و ریاضت کے لیے چالیس ہزار دینار کے صرفے سے ایک مسجد بنواتی ہے اور اس کے قریب درویشوں کے قیام کے لیے بیس ہزار روپیہ سے حجرے بنواتی ہے۔ یہیں ملّا شاہ بدخشی ۴ شعبان ۱۰۶۱ھ مطابق ۲۲ جولائی ۱۶۵۱ء کو شاہ جہاں سے ملاقات کرتے ہیں اور یہیں بادشاہ سلامت (شاہ جہاں) باخدا بزرگ ملّا شاہ کے فیض و صحبت سے بہرہ مند ہوتے اور حقائقِ معرفت کے نکتے سنتے ہیں۵۔[۱]

ملّا شاہ کی تربیت اور ان کی طریقت بے شریعت کا جہاں آرا بیگم پہ یہ اثر ہوتا ہے۔ وہ نیکی و شرافت کا مجسمہ ہوتی ہے۔ وہ بہت ہی بھولی اور سادہ لوح ہوتی ہے وہ مملکت کے کاموں یا بھائیوں کے معاملات میں دو حیثیتوں میں نظر آتی ہے وہ صلح اور امن کی دیوی نظر آتی ہے وہ اپنے باپ شاہ جہاں کی حمایت کرتی نظر آتی ہے اس لیے کہ ماں کے ۱۶۳۱ء کے انتقال کے بعد باپ کی خدمت و آسائش کا وہی خیال رکھتی ہے اس کو باپ کی خوشنودی ہر حال بہت ہی عزیز تھی۔ اس لیے وہ باپ کی حمایت کرتی ہے شاہ جہاں کی یہ خواہش تھی کہ اس کا بڑا بیٹا داراشکوہ ہی اس کی جگہ بادشاہ ہو اس لیے جہاں آرا بیگم اصولاً مجبور تھی کہ وہ باپ کی حمایت کرے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مؤرخین اسے داراشکوہ کا حامی سمجھتے ہیں اور اورنگ زیب کا دشمن لیکن میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ شریعتِ نبوی یا اتباعِ سنّت اور احیاءِ اسلام سے اختلاف کرنے والے لوگ نہایت ہی حکمت و چالاکی سے اپنا کھیل کھیلتے ہیں اور ملّا شاہ بدخشی کو آلۂ کار بناتے ہیں اور انہیں کو آگے رکھتے ہیں۔ اور انہیں کے ایک مرید داراشکوہ کو آگے لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاں آرا بیگم اپنی طبعی نیکی اور افتادِ طبع سے شرافت۔ نیکی اور پریم و محبت کی دیوی تھی اس کو

---

۱ عملِ صالح حصہ دوم ص ۵۸۳ - ۵۸۴

۵ ملّا شاہ کے لیے عملِ صالح کا مصنّف "باخدا بزرگ" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ مؤلف۔

سیاست اور برائی چھو کر نہیں گئی تھی ہو سکتا ہے کہ وہ دارا شکوہ کی حامی ہو کیونکہ دارا شکوہ اس کا بڑا بھائی۔ باپ کا ولی عہد اور اس کے پیر ملا شاہ کا مرید اور اس کے پیر کے پیر میاں میر کا سوانح نگار ہے۔ لیکن اس میں کوئی سیاست نہیں تھی وہ اپنی نیکی و شرافت سے دارا شکوہ کی سازشوں میں پھنس جاتی تھی۔ لیکن جوں ہی اس کو علم ہوتا تو فوراً اس کی تلافی کرتی تھی یہی وجہ ہے کہ اورنگ زیب دارا کے لگائے ہوئے زخم اپنی بہن جہاں آرا بیگم کو دکھاتا اور جب دارا کی سیاسی چالوں اور حربوں سے پریشان ہوتا تو اس کو اپنی پیاری بہن ہی کے آغوشِ محبّت میں پناہ ملتی اور جس گھڑی شاہ جہاں کے غلط عتاب کی بجلی اس پر گرتی تو یہ پیاری بہن کا دامن ہوتا۔ جہاں سے سکون و تسلّی اور امن نصیب ہوتا اور اورنگ زیب کے خطوط پڑھیں تو مخلصانہ محبت کا رنگ اس میں صاف چمکتا ہوا نظر آتا ہے[1]

جہاں آرا بیگم سب کچھ اپنے پیر ہی کو سمجھتی تھی اس لیے اپنے پیر ملّا شاہ اور میاں میرؒ کی سنّت پر عمل کرتے ہوئے ساری زندگی تجرد میں گزار دی۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ شاہ جہاں بادشاہ جن اسباب کی بنا پر دارا شکوہ اور شجاع کی شادی کرتا ہے اور جہاں آرا بیگم ہی کو نگران بناتا ہے اور یہی دونوں شادیوں کے تمام اخراجات برداشت کرتی ہے اور اپنے کو شریعتِ نبوی کا پیکر بنا کر پیش کرتا ہے۔ اپنے حلیہ قد۔ چہرہ۔ داڑھی کو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مشابہ قرار دیتا ہے تاکہ عامۃ المسلمین میں شریعت کے پیروکار کی حیثیت سے اس کی قدر و منزلت ہو لیکن جہاں آرا بیگم کی شادی کا اہتمام نہیں کرتا۔ شاہ جہاں کا یہ فعل شریعتِ نبوی کے خلاف ہے۔ جبکہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنے چاروں لڑکیوں حضرت زینبؓ۔ حضرت رقیہؓ۔ حضرت ام کلثومؓ۔ حضرت فاطمہؓ کی شادی کرتے ہیں کہ یہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سنّت ہے اور یہ ذمہ داری باپ کی ہے سنِ بلوغ کو پہنچنے کے بعد ان کا یہ فرض ہے کہ جس طرح لڑکوں کی شادیاں

---

[1] مقدّمات رقعاتِ عالمگیری ۳۸۶۔

کرتا ہے وہ جہاں آرا بیگم کی بھی شادی کرتا لیکن اس نے یہ فرض پورا نہیں کیا۔ اس طرح اس نے سنّتِ نبوی کو نظر انداز کیا اور مصلحت اور مفاد کو پیش نظر رکھا دوسرے اس کے پیر ملا شاہ بدخشی کا یہ فرض تھا کہ وہ اس طرف شاہ جہاں یا دارا شکوہ کو توجہ دلاتے لیکن وہ خود ہی سنّتِ نبوی پہ عامل نہیں تھے۔ ملا شاہ کا یہ عمل اور ان کی طریقت بے شریعت کی پالیسی ان مسلمانوں، ہندوؤں اور عیسائیوں کو محبوب تھی جو آنحضرت کی مکمل اتباع کو پسند نہیں کرتے۔ اسی انحراف کا نتیجہ ہے کہ ایک فرانسیسی عیسائی مؤرخ ڈاکٹر برنیر جو دارا شکوہ کا حامی تھا۔ اس کو دارا شکوہ کے نظریات سے اتفاق تھا اور اورنگ زیب کا مخالف تھا وہ جہاں آرا بیگم کی تجرد کی زندگی پہ گرفت کرتا ہے اور عیسائی نقطۂ نگاہ سے شاہ جہاں اور جہاں آرا بیگم پر تنقید کرتا ہے۔ ڈاکٹر برنیر جو ۱۶۵۶ء تا ۱۶۶۸ء تک ہندوستان میں مقیم رہا اور "شاہ جہاں کے ایامِ اسیری اور عہدِ اورنگ زیب" پہ ایک کتاب لکھی وہ شاہ جہاں اور جہاں آرا بیگم کی عفت اور پاکدامنی پہ حرف گیری کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ "بادشاہ (شاہ جہاں) اس درخت کے میوے سے متمتع ہوتا۔ جس کو اس نے خود لگایا ـــــــــــ "[۱] سنّتِ نبوی سے انحراف کا نتیجہ ہے کہ ایک عیسائی مؤرخ دارا شکوہ کا سیاسی طور پہ حامی اور اورنگ زیب کا مخالف شاہ جہاں اور جہاں آرا بیگم کو بخشتا نہیں اور وہ ان دونوں کے کردار کو مشکوک، مشتبہ اور گھناؤنا بنا کر پیش کرتا ہے اور اب خواہ اس کی صفائی اور تردید میں کچھ بھی کہا جائے۔ لیکن ڈاکٹر برنیر کی بات تو ایک ہمعصر اور دارا شکوہ کے قریب ترین فرد کی رائے ہے۔ جس پہ بہت سے لوگ اعتماد کرنے والے مل جاتے ہیں۔ اس طرح ملا شاہ بدخشی کی ایک مریدنی کی معرفت شاہ جہاں، دارا شکوہ اور تمام مسلمانوں پہ ہمیشہ کے لیے بدنما داغ لگتا ہے۔ ملا شاہ کی یہی طریقت بے شریعت تھی جس سے ان کو تو فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن

---

[۱] شاہ جہاں کے ایامِ اسیری اور عہدِ اورنگ زیب۔ ص ۴۴ ڈاکٹر برنیر۔ خلیفہ سید محمد حسین نفیس اکیڈیمی کراچی۔

شریعتِ نبوی قائم نہیں ہوتی بلکہ تضحیک کا نشانہ بنتی ہے۔

جہاں آرا بیگم مُلّا شاہ بدخشی کی سنّت پر عمل کر کے ایک غیر فطری زندگی گزارتی ہے۔ اور پوری زندگی میں ذہنی اذیت اور بدنامی ہی بدنامی حصّہ میں آئی ہے اس بیسویں صدی عیسوی میں بھی ایک انگریز خاتون سیاح ۱۹۳۱ء میں لندن سے

نام کی کتاب شائع کرتی ہے جیسے وہ جہاں آرا بیگم کی خود نوشت سوانح حیات قرار دیتی ہے۔ تحریر میں رومانی تمثیلی رنگ غالب ہے اور اسلوبِ بیان بہت ہی دلکش و مؤثر ہے۔ لیکن بزمِ تیموریہ کے مصنّف سید صباح الدّین اس کو سراسر جعلی اور نقلی قرار دیتے ہیں انہوں نے ایک نئے دلنشیں انداز میں جہاں آرا بیگم کے اخلاق و کردار کو مسخ کر کے دکھایا اور اورنگ زیب کی ذات سے نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں بعض لغو اور بیہودہ واقعات ایسے ہیں جن کی تردید کرنا محض تضیع اوقات ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں جبکہ مسلمان عیسائیوں کے غلام اور محکوم تھے اور ہندو اس تاک میں تھے کہ انگریزوں کو غیر ملکی اور مسلمانوں کو ہندوستانی قرار دے کر پورے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرلیں تو اس زمانے میں بھی ایک عیسائی خاتون جہاں آرا بیگم کی سیرت و کردار کو داغدار انداز میں پیش کرتی ہے اور مسلمانوں کے جذبات اور احساسات کو ٹھیس پہنچاتی ہے اور اس کے راجپوت سے فرضی اور من گھڑت معاشقہ کو افسانہ کے رومانی انداز میں پیش کر کے ہندو راجپوت کو خوش کرتی ہے اور مسلمانوں اور اسلام کی انفرادیت اور اسلام کے تشخّص پر ضرب لگاتی ہے۔

مُلّا شاہ بدخشی اور شہزادہ دارا شکوہ :

مُلّا شاہ اپنے کو "لسان اللہ" کہتے ہی تھے لیکن ان کو یہ بھی دعویٰ تھا کہ وہ

ایک کامل پیر طریقت ہیں وہ تصوّف وعرفان کے مسائل پر عبور رکھتے ہیں وہ عارف اور موحد کا درجہ رکھتے ہیں چنانچہ ان کمالات کی وجہ سے وہ لوگوں کو اپنی طرف بھی دعوت دیتے ہیں وہ اپنے بارے میں خود اپنی ایک رباعی میں کہتے ہیں :

رباعی

آن کس کہ ز روی صدق دولت خواہ است

آخر او را بسوی دولت راہ است

وہ شخص جو کہ صدق کے ساتھ دولت چاہنے والا ہے آخر اس کو دولت کی طرف راستہ مل جاتا ہے۔

دولت یعنی معرفت اللہ است !

این دولت در خانۂ ملّا شاہ است !

دولت سے مراد اللہ کی معرفت ہے اور یہ دولت ملا شاہ کے گھر میں ہے۔

دارا شکوہ ملا شاہ کے اس دعوئ پر یقین لاتا ہے اور ۲۹ ذی الحجہ ۱۰۴۹ھ میں ان کا مرید ہو جاتا ہے اور اپنے پیر کے پیر میاں میر کے حالات اور ملفوظات پر مشتمل ۱۰۵۲ھ میں "سکینۃ الاولیاء" میں لکھتا ہے کہ اس نے قریب سے دیکھا وہ تصوّف وعرفان مسائل میں اکثر ان سے رجوع کرتے اور ان سے ہدایت پاتے وہ کہتے تھے کہ دلوں کی گرہیں کھولنے، مردہ جانوں کو زندہ کرنے اور زبان کی تاثیر میں ان جیسا کوئی بزرگ نہیں دیکھا گیا۔ انہوں نے لکھا کہ جب مرشد نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک اس سے بڑھ کر کرامت۔ درجہ۔ مقام، حالت اور کشف نہیں کہ مردہ دلوں کو زندہ کیا جائے، بندھی ہوئی گرہیں کھولی جائیں۔ نیز نہ خود غفلت میں زندگی بسر کریں اور نہ بسر کرنے دیں، یہ دارا شکوہ کے لیے ایسی باتیں اور وعدہ تھا جس پر وہ ایک شہزادے کی حیثیت سے ایمان لاتا ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ میں نے ان سے یہ حقائق سن کر ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

ملّا شاہ اپنے مریدوں کو دین و دنیا میں کامرانی کی بشارتیں دیتے چنانچہ دارا خود لکھتا ہے کہ در رہا دنیا کا سفر سو اس کے انجام ہونے میں کس کو کلام ہے جس کو وجودِ اعظم کا یقین حاصل ہو گا یقیناً اس کے اغیار کا لشکر بھی شکست کھائے گا۔ فتح و نصرت عنقریب اللہ کی طرف سے حاصل ہو گی۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے مجازی کاموں میں بھی بامراد کرے گا[۱] ملّا شاہ بدخشی کے انہیں کمالات پر دارا شکوہ کو یقین تھا اور وہ اپنے خود ساختہ اور من بھاتے انداز میں اسلام کی ترجمانی کرتا اور اسی دامِ فریب میں اپنی بڑی بہن جہاں آرا بیگم کو بھی پھانس لیا تھا۔ جہاں آرا بیگم کے خیالات اور افکار کو ہم پچھلے صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ وہ بھی ملّا شاہ بدخشی کی کس طرح معتقد تھی اور اس کا ان پر کس قدر پختہ ایمان تھا۔ یہ دونوں گھیر کر شاہ جہاں کو بھی اپنے قریب لائے اور شاہ جہاں بھی ملّا شاہ سے ملاقات کرتا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔

ملّا شاہ شاعر بھی تھے اور اشعار کے ذریعہ سے بھی اپنے افکار و خیالات کو پھیلاتے تھے وہ اپنی ایک مثنوی میں جس میں تصوّف، عارف اور اس کے مقامات وغیرہ کا ذکر ہے اس کا نام اپنے مریدانِ خاص شاہ جہاں۔ دارا شکوہ اور جہاں آرا کی نسبت سے "شاہیہ" رکھا ہے وہ لفظی رعایت سے ان تینوں کا نام استعمال کرتے ہیں۔ ان اشعار سے ملّا شاہ کی ان لوگوں سے عقیدت ظاہر ہوتی ہے۔ مثنوی کے اشعار یہ ہیں۔

اے تو شاہ جہاں و تو دارا ۔۔۔ اے تو دارا و تو جہاں آراء
بتو شاہِ جہانیِ قائم! ۔۔۔ بتو داری جہاں دائم!
ہمہ شاہ جہانیت دارا ۔۔۔ تو و دارائی ہے جہاں آرا

ترجمہ:۔ اے کہ تو جہاں کا بادشاہ ہے اور تو دارا (رکھوالا ہے) اے کہ

---

[۱] سکینۃ الاولیا اردو ترجمہ ص ۴۴ بحوالہ فارسی ادب ص ۱۳۲
[۲] ؍؍ ؍؍ ؍؍ ص ۱۳۲

تو دارا ہے تو جہاں آرا ہے۔ شاہ جہان تجھ سے قائم ہے۔ دنیا کی دارائی
تیرے لیے ہمیشہ ہے۔

ملّا شاہ کے ان اشعار میں تینوں حضرات کی صرف تعریف ہی تعریف ہے اور یہی تینوں ملک کے سیاہ وسفید کے مالک تھے اور یہ ان پر بہت ہی مہربان تھے۔ دارا اور جہاں آرا ان کے مرید ہو چکے تھے وہ ان کے ذوق وشوق سے بڑے خوش تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ سلسلہ قادریہ کو فروغ دیں گے[1] ملّا شاہ کے بعض اشعار پہ علماء کو اعتراض تھا اور وہ انہیں کافر اور واجب القتل قرار دیتے تھے۔ ریاض الشعراء کے مصنّف ملا شاہ کا یہ شعر نقل کرتے ہیں (نقل کفر کفر نہ باشد)

پنجہ در پنجۂ خدا دارم ! من چہ پروا ہے مصطفیٰ دارم

میں خدا کے پنجہ میں پنجہ رکھتا ہوں۔ میں مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی پرواہ کیا کروں۔ (نقل کفر کفر نہ باشد)

علماء نے شاہ جہاں سے استدعا کی اور ان کے خلاف حدِ شرعی جاری کرنے کا مطالبہ کیا۔ شاہ جہاں نے علماء سے اتفاق کیا۔ لیکن داراشکوہ کی سفارش سے ملّا شاہ کے خلاف قدم نہ اٹھایا[2] یہ نظریات تو ملّا شاہ کے شاہ جہاں کے ابتدائی دورِ حکومت کے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ داراشکوہ کی تخلیقی تصانیف شائع ہوتی رہیں اور اس کے افکار ونظریات پھیلتے رہے اور حکومت کے معاملات میں اس کے اثر ورسوخ میں اضافہ ہوتا رہا۔ اور ملّا شاہ کے اختیارات حکومت کے معاملات میں وسیع تر ہوتے رہے تو شاہ جہاں مراۃ الخیال کے مصنّف نہمتہ خاں لودھی لکھتے ہیں کہ شاہ جہاں کہا کرتے تھے ہندوستان میں دو بادشاہ ہیں ایک شاہ جہاں اور دوسرے ملّا شاہ۔[3] دارا نے

---

[1] رودِ کوثر ص ۴۳۲۔
[2] رودِ کوثر ص ۴۲۹۔
[3] پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ ص ۱۲۹۔

حکومت پر اپنی گرفت بہت مضبوط کر لی تھی اور جب دارا نے "سرّاکبر ۱۰۶۷ھ (اپنشد کا) ترجمہ شائع کیا تو اس کے دیباچہ میں اپنے پیر ملا شاہ کو "اکمل کاملاں زبدۃ عارفاں، استادِ استاداں، پیشوای پیشوایاں۔ موحّد حقائق آگاہ حضرت ملّا شاہ لکھتے ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں پچھلے صفحات میں تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ اس سے مملکت میں کیا اثرات مرتّب ہوتے ہیں اور جلد ہی دارا حکومت پر قبضہ کر لیتا ہے۔ من حاجی بگویم ترا حاجی بگو کے مصداق ملّا شاہ صاحب دارا شکوہ کو بھی کامیاب۔ آفتابا۔ جہانتابہ حل مشکلا۔ صاحبدلا۔ عاقلا اور کاملا لکھا کرتے تھے[۱]

ملّا شاہ صاحب کے جو خیالات اور افکار تھے ان سے صحیح العقیدہ مسلمانوں کو بالکل اتفاق نہیں ہوتا تھا ان سے اختلاف کرتے تھے اور اپنے خیالات۔ نظریات سے اس کی تردید بھی کرتے تھے۔ اس سے ملّا شاہ صاحب بہت ناخوش تھے اس لئے ملّا شاہ صاحب دارا شکوہ صاحب کو مخاطب کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "فقیر تو ایسے بدبخت شریروں کو تنبیہ نہیں کر سکتے۔ لیکن تمہیں اس میں دسترس ہے تمہیں تو ضرور ان کو تنبیہ کرنی چاہیئے۔ تمہاری آشنائی سے ہمیں کیا فائدہ ہو سکتا ہے[۲]" ملّا شاہ صاحب اس طرح دارا شکوہ کو آمادہ کرتے ہیں کہ ان لوگوں کو دبائے جو ان کی طریقت بے شریعت کی مخالفت کرتے ہیں۔

جہاں آرا صاحبیہ میں لکھتی ہے کہ ملّا شاہ کی زبان میں بہت تاثیر تھی۔ کئی غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور اکثر شیعہ حضرات اپنی سابقہ روش چھوڑ کر اہلِ سنّت میں شامل ہو گئے۔ جہاں تک غیر مسلم کا حلقہ بگوش اسلام ہونا ہے تو یہ ایک اچھی اور قابل قدر بات تھی۔ لیکن ہم صرف دلی رام کائستھ کے مسلمان ہونے کا واقعہ لکھتے ہیں۔ کہتے ہیں

---

[۱] فارسی ادب ص ۱۲۸۔
[۲] پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ ص ۱۳۱، ۱۳۵۔
[۳] " " ص ۱۳۲۔

کرولی رام پہلے شاہ جہاں کے عہد میں ایک برسر اقتدار امیر تھا دارا شکوہ اور ملّاشاہ بدخشی کے فیضِ صحبت سے اسے عشقِ الٰہی دامنگیر ہوا اور وہ سب جاہ و مال ترک کر کے ملّاشاہ بدخشی کے ہاتھ پر مرید ہو گیا۔ داستانِ مذہب، کے مصنّف اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

کہ در کشمیر بخدمت ملّاشاہ بدخشی رسیدہ کامیاب شناخت گشت و
بمقتضائے الصوفی لامذہب لہ لقیدِ دیں و آئین بازنہ بستہ بابت و
بت خانہ آشناست و از مسجد بیگانہ نیست۔

ترجمہ:۔ کشمیر میں ملّاشاہ بدخشی کی خدمت میں پہنچ کر کامیاب ہوا اور الصوفی لامذہب لہ (صوفی کا کوئی مذہب نہیں) کے مطابق کسی دین و آئین کی قید میں نہیں بندھا۔ بت سے بت خانہ میں آشنا ہے اور مسجد سے بیگانہ نہیں۔

ملّاشاہ اس قسم کے مومن کی تعریف میں کہتے ہیں۔

مومن نشود تا کہ برابر نشود ٭ با بانگ نماز، بانگ ناقوس فرنگ

مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ برابر نہ ہو جائے۔ نماز کی اذان اور عیسائیوں کے گرجا گھر کی آواز میں (یعنی دونوں کے ساتھ اتفاق کرے۔)

ملّا صاحب اسی قسم کے غیر مسلموں کو مسلمان کرتے تھے اور دارا شکوہ نے نہ صرف اس پر عمل کیا بلکہ دوسرے مذاہب بالخصوص ہندو ویدانتوں کی کتابوں سے حقیقت کی تلاش میں اسلامی تصوّف اور ویدانت میں ہم آہنگی پیدا کی۔ بلکہ ہندویت کے تابع کرنے کی کوشش کی۔ جس سے صحیح الخیال اور صحیح العقیدہ مسلمان اتفاق نہیں کرتے۔

جہاں تک شیعہ حضرات کے سابقہ روش چھوڑ کر اہلِ سنّت میں داخل ہونے کا تعلّق ہے تو شاہ جہان ۱۰۳۷ھ میں خلفاءِ راشدین کا نام جمعہ اور عیدین کے خطبہ میں استعمال کرنے کا

---

[1] رودِ کوثر ص ۴۲۹ تا ۴۳۱۔

حکم دیتا ہے اور اس وقت شاہ جہاں کی مملکت کے اعلیٰ عہدیدار آصف خاں اور مہابت خاں تھے یہ دونوں حضرات شیعہ تھے اور انہوں نے دکن کی دو ریاستوں کو فتح کیا۔ اور یہ بھی خلفاء راشدہ کا نام جمعہ اور عیدین کے خطبہ میں استعمال کرنے میں راضی ہوتے ہیں اور کسی قسم کا اختلاف نہیں کرتے بلکہ اسی واقعہ پر مسلمانوں کی وحدت اور سالمیت کو مجروح کرنے والے انگریزی عہد کے دانشور حضرات شاہ جہاں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس نے سُنّی اسلام کو نافذ کیا۔ اس کے برعکس شاہ جہاں نے شیعہ اور سنّی کو متحد کیا اور ان کو صرف مسلمان سمجھا اور اس عہد میں شیعہ اور سنّی کی کوئی تفریق نہیں تھی اس لیے ملّا شاہ بدخشی کی تبلیغ سے کسی شیعہ کا اپنی سابقہ روش چھوڑنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس لیے کہ اس عہد میں شیعت کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا سب مسلمان تھے۔ البتہ ملّا شاہ بدخشی کے مرید دارا شکوہ اور اس کی کتابوں اور پالیسی سے عیسائی حضرات مطمئن تھے۔ اور اسے اپنے فکر سے بہت قریب پاتے تھے۔ چنانچہ ایک عیسائی سیّاح منوچی اپنے عیسائی قارئین کو یہی باور کراتا ہے وہ دارا ہی کے الفاظ میں اس سے یہ منسوب کرتا ہے کہ محمد مرا می کشد وابن اللہ مرا می بخشد (محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم) مجھے قتل کرتے ہیں اور مریم اور اللہ کے بیٹے مجھ کو بخشتے ہیں[1]

اس طرح ملّا شاہ کی طریقت بے شریعت کی پالیسی سے وہ ہندو اور عیسائی خوش ہوتے ہیں جو اسلام کی انفرادیت اور شریعتِ نبوی کی برتری کو ختم کرنا چاہتے تھے اور دارا شکوہ ان کا مرید اسی فکر و تصوّرات کا علمبردار تھا اس لیے ہندویت اور عیسائیت کے علمبردار حضرات دل و جان سے اس کی مدد کرتے تھے

نوٹ:۔ عنوان نمبر ۱۱۳ "خلفاءِ راشدہ کا احترام" دیکھئے۔

[1] مقدمہ رقعاتِ عالمگیر ص ۳۶۲۔

شیخ احمد سرہندیؒ (مجدد الف ثانی) کے پیروکار:

شیخ احمد سرہندی تو ۱۶۲۴ء میں انتقال کر جاتے ہیں لیکن اپنے پیچھے متبعین و متاثرین کی ایک بہت بڑی تعداد چھوڑ جاتے ہیں ۱۶۰۳ء میں خواجہ باقی باللہؒ کے انتقال کے بعد حضرت شیخ احمد سرہندیؒ ہی تحریک احیاء شریعت کی قیادت کرتے ہیں وہ خواجہ باقی باللہ کی رائے کے مطابق "کثیر العلم اور قوی الارادہ" شخص تھے۔ یہ ان کا عزم اور حوصلہ ہی تھا کہ وہ اکبر کے پوتے خسرو کے مقابلے میں اکبر کے بیٹے جہانگیر کی مدد کے لیے۔ شیخ احمد فرید بخاری کو ہدایت کرتے ہیں اور ان کے نام مسلسل بارہ[۱] خطوط مکتوب نمبر ۴۳ تا ۵۴ لکھتے ہیں جو سب کے سب ایک ہی ترتیب سے جلد اوّل میں ہیں اور ۱۶۰۵ء میں جہانگیر حکمران ہوتا ہے اور الحاد اور اسلام بیزاری کی تحریک کی تیز رفتاری کم ہونا شروع ہوتی ہے۔

شیخ احمد سرہندیؒ۔ ذہانت۔ بصیرت۔ فراست اور عزم و جرأت سے تحریک احیاءِ اسلام اور سنتِ نبوی کی تحریک کو آگے لے کر بڑھتے ہیں۔ لیکن جوں ہی آپ کی تحریک کی رفتار محسوس ہوئی اس کو روکنے کے لیے جہانگیر نے الزامات اور اتہام لگا کر آپ کو ۱۶۱۹ء میں قلعہ گوالیار میں قید کر دیا ــــ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے ابتلاء و آزمائش کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ پیروکاروں اور متاثرین پر خوف، دہشت، لالچ فریب دہی اور احیاءِ اسلام کے مخالفوں کے اقتدار اور غلبہ سے مایوسی کی فضا پیدا کی جاتی ہے۔ لیکن شیخ احمد سرہندیؒ اور ان کے پیروکار مومنانہ عزم و فراست سے حالات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ انہیں حالات میں شیخ احمد سرہندی ۱۶۲۴ء میں انتقال کر جاتے ہیں۔

آپ کا انتقال تحریک احیاء شریعت کے کارکنوں کے لیے ایک حادثہ جانکاہ تھا ــــ اب تو شیخ احمد سرہندیؒ تو نہیں تھے لیکن ان کی کتابیں اور مکتوبات کے ہر سہ دفتر تو موجود تھے جنہوں نے مسلمانوں کے دل و دماغ میں اتّباع شریعت کی خواہش۔ آرزو۔ جذبہ۔ لگن اور غلبہ اسلام کے لیے ایک ولولہ اور تڑپ پیدا کر دی تھی۔ یہ کتابیں۔ رسالے اور حضرت احمد سرہندیؒ کا عمل

موجود تھا۔ وہ کتابیں لوگوں کو گرماتی اور روح میں تڑپ و بے چینی پیدا کرتی تھیں جو لوگوں کے قلب و ذہن دونوں کو اپیل کرتی ہیں۔ اور عمل کے لیے سرگرم کرتی ہیں۔ اسی بیدار۔ فعال اور سرگرم ذہن و فکر کو مطمئن کرنے ہی کے لیے شاہ جہاں ۱۰۳۷ھ مطابق ۱۶۲۸ء سے شریعتِ اسلام کو رفتہ رفتہ نافذ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اسلام کی اعلانیہ مخالفت کرنے والوں کی ہر آواز کو دبا دیتا ہے اور احیاءِ اسلام کی قوتیں اپنے کو مستحکم کرتی آگے بڑھتی ہیں۔ ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی نے شاہ جہاں کے عہد میں "دلائل التجدید" لکھی۔ جس میں حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے دعووں کی تائید کی اور انہیں "مجدد" سے منسوب کیا۔[1] داراشکوہ نے اپنی اوّلین کتاب سفینۃ الاولیاء ۱۰۴۹ھ میں لکھی تو اس میں حضرت شیخ احمد سرہندیؒ پہ الزامات و اتہام کو افتراء و بہتان قرار دیا۔[2] لیکن یہ کتاب غیر محسوس طریقے پر طریقت بے شریعت کی طرف پہلا قدم تھا اس کے بعد ۲۹ر ذی الحجہ ۱۰۴۹ھ کو داراشکوہ ملّا شاہ بدخشی کے ہاتھوں مرید ہوتا ہے اور یکے بعد دیگرے جو تخلیقی کتابیں ۱۰۶۵ھ تک منظرِ عام پر لاتا ہے۔ اس میں شریعت سے انحراف بڑھتا ہی جاتا ہے۔ صحیح الخیال اور صحیح العقیدہ مسلمانوں میں اضطراب، بے چینی بڑھتی جاتی ہے۔ مسلمانوں میں نظریاتی اتحاد اور فکری سالمیت ختم ہو جاتی ہے۔ اتّباعِ سنّتِ نبوی کے مقابلے میں طریقت بے شریعت کے فکر و رجحان کو تقویت ملتی ہے۔ اور شریعتِ نبوی کے مخالف گروہ "ملّا شاہ بدخشی کے مرید داراشکوہ جو خود کو "خدا آگاہ" اور صاحبِ ظاہر و باطن" کہلوانا پسند کرتا ہے۔ اس کی سرپرستی میں ایک تناور اور سایہ دار درخت کی حیثیت حاصل کرتے جاتے ہیں۔ داراشکوہ کے بڑھتے ہوئے نظریات اور سیاسی اثر و اقتدار سے صحیح العقیدہ مسلمان نہ خوش تھے اور نہ ہی مطمئن۔ ان میں اضطراب و بے چینی کی لہر دوڑ رہی تھی۔

داراشکوہ کی آخری تصنیف "مجمع البحرین" کے بعد اس کے حامی دانشور اور

[1] پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ ص ۲۹۲۔

[2] سفینۃ الاولیاء ص ۲۴۷۔

مکالمات بابالال - جوگ بشسٹ - سرِ اکبر (اپنشد کا ترجمہ) شائع کرتے ہیں - ان کتابوں میں شریعتِ اسلام سے کھلم کھلا انحراف کی باتیں کی جاتی ہیں اس سے حامئ اسلام عناصر بہت ہی برہم ہوتے ہیں - دارا کی تخلیقی تصانیف اور جس فکر و نظریات کی وہ سرپرستی کر رہا تھا اور وہ افراد جو اس کے محبوب اور پسندیدہ تھے اس سے بھی عام مسلمانوں نے محسوس کیا کہ دارا تو انہیں کفر و الحاد کی گود میں دھکیل رہا ہے دارا کی حکومت اور سربراہی کے معنی کفر و الحاد یا طریقت بے شریعت کا فروغ ہوگا جدید اصطلاح میں متحدہ قومیت اور سیکولرازم" کی حکومت ہوگی - عام مسلمان یہ دیکھ رہے تھے کہ حکومت کے معاملات میں دارا کے اقتدار سے ملحدوں کے حوصلے کس قدر بڑھ گئے ہیں ہر جگہ ناموسِ اسلام کو سخت خطرہ محسوس ہو رہا تھا - بہار کے زنار پوش قانون گو چھبیلا رام کے سبِّ رسول اور دارا کے محبوب، معزز اور با اقتدار منشی چندر بھان کے خیالات و افکار کا بہت چرچا تھا - ولی عہد حکومت کو اپنی حمایت میں دیکھ کر ہندوؤں کے جتنے حوصلے بھی بڑھتے کم تھے - وہ مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے مجل دے کر اپنے ساتھ ملا کر اگر ہندو نہیں تو کم از کم اسلام سے دور تر اور اس کی محبت سے بے تعلق ضرور کرنا چاہتے تھے[1] ان حالات میں حضرت مجدد کے پیروکار اور متاثرین خاموش نہیں رہ سکتے تھے -

حضرت مجدد نے تو جہانگیر ہی کے عہدِ حکومت میں شیخ فرید بخاری کے نام مکتوب نمبر ۱۶۳ میں کفار کے عزائم اور حوصلوں سے باخبر کر دیا تھا - وہ لکھتے ہیں کہ "اسلام و کفر ایک دوسرے کی ضد ہیں ان دو ضدوں کا جمع ہونا محال ہے - اور ایک کو عزت دینے میں دوسرے کی خواری ہے -

اسلام کی عزت کفر اور کافروں کی خواری ہے -

جس نے اہلِ کفر اور کافروں کی عزت رکھا اس نے اہلِ اسلام کو خوار رکھا -

کمالِ اسلام تو یہ ہے کہ اس دنیاوی غرض سے بھی دور رہیں -

---

[1] رقعاتِ عالمگیری ص ۳۱ا -

رسولؐ کے دشمنوں کے ساتھ ملنا جلنا اور محبت کرنا بڑا گناہ ہے۔ احکامِ شرعی پر عمل اور کفر کی رسموں کو مٹانے کی طاقت معدوم ہو جاتی ہے اور دوستی کا حیا اس کو مانع ہو جاتا ہے۔

ان کا کام اسلام اور اہلِ اسلام پر ٹھٹھہ کرنا ہے۔ ہر وقت اس بات کے منتظر رہتے ہیں۔ کہ اگر قابو پائیں تو مسلمانوں کو ہلاک کر دیں یا سب کو قتل کر دیں یا کفر میں لوٹا دیں۔

اہلِ اسلام کو بھی شرم چاہیئے کہ الحیاءُ من الایمان (حیا ایمان ہے اور مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔

اہلِ کفر کے ساتھ بغض رکھنا اسلام اور دولتِ اسلام کے حاصل ہونے کی علامت ہے۔ ان کی صحبت سے پرہیز کریں[1]

یہ خط محض شیخ فرید ہی کے نام نہیں بلکہ شیخ فرید بخاری جو جہانگیر کے بہت ہی محترم اور جہانگیر کو تخت نشین کرانیکے ایک اہم رکن تھے۔ ان کی معرفت عام مسلمانوں اور احیائے شریعت کے علمبرداروں کے لیے ایک ہدایت و رہنمائی بھی ہے۔ دارا کی حمایت اور سرپرستی میں ہندو نے جن عزائم اور حوصلوں کا اظہار کھلم کھلا کرتے ہیں۔ اس پر عام مسلمان خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔

ابھی تو حضرت مجددؒ کو انتقال کیے ہوئے صرف چونتیس سال ہوئے تھے۔ ان کے اولین مخاطب زندہ تھے جنہوں نے شریعتِ محمدی کی مخالف طاقتوں سے سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔ انہیں عہدے۔ منصب۔ جاگیریں نہیں چاہیئے تھیں۔ وہ تو صرف "شریعتِ محمدی" کا اقتدار چاہتے تھے۔ اس لیے دارا کی حمایت ہندوؤں کے عزائم یا ہندوؤں کے تعاون سے دارا کا یہ حوصلہ کہ حکومت کی باگ ڈور وہ سنبھالے۔ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے پیروکار اور صحیح الخیال اور صحیح العقیدہ مسلمان برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

---

[1] مکتوب نمبر ۱۶۳ جلد اوّل ص ۲۷۵ - ۲۷۹ -

حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کی تحریک احیاءِ سنت سے بہتوں کے سوچنے اور کرنے کے پیمانے بدل گئے تھے۔ اکبر ہی کے عہد میں اس نے اپنی سیاسی مصالح کی بنا پر ہندو اور مسلمان کو فکری طور پر متحد کرنے کی کوشش کی جس سے عام مسلمان اسلامی شعائر سے بیگانہ ہو کر کفر و ضلالت کی طرف مائل ہو گئے۔ ان کی زندگیاں بدعت و شرک اور زندیقیت سے ملوث ہو گئی۔ بعض صوفیائے دین کو بزرگوں کا دین کہہ کر طریقت و معرفت کے نام پر ایسی تعلیم دی تھی جس سے شریعت کے تمام قوانین نظر انداز کر دیے گئے تھے۔

شیخ احمد سرہندیؒ نے علم جہاد بلند کر کے اسلام اور پیروانِ اسلام کی زندگی کو مشرکانہ رسوم۔ ملحدانہ عقائد اور غیر شرعی رجحانات سے پاک و صاف کیا تھا اور ایک بار پھر کتاب و سنت کے احکام کی تجدید کی ان کی تعلیم تھی کہ ہر مسلمان خواہ بادشاہ ہو یا ادنیٰ رعایا عالم ہو یا جاہل یا امیر ہو یا غریب۔ عارف ہو یا سالک اپنے عقائد کو کتاب و سنت کے مطابق صحیح کرے۔ "کتاب و سنت سے جو علوم مستعار ہیں ان میں سے وہی معتبر ہیں جن کو بزرگوں نے سمجھا اور اخذ کیا۔ ورنہ ہر بدعتی اور گمراہ اپنے عقائد فاسدہ کی بنیاد کتاب و سنت ہی پر رکھتا ہے۔ پس قرآن و حدیث سے جو شخص جو معنی سمجھے وہ سب معتبر نہیں۔" اعتقاد صحیح وہی ہے جس کو علماء اہل سنت نے کتاب و سنت و آثار سلف سے سمجھا ہو اگر بالفرض کشف و الہام سے جمہور علماء کے خلاف کسی نص کے معنی معلوم ہوں تو اس کا اعتبار نہیں بلکہ اس سے پناہ مانگنا چاہیئے۔ نجاتِ ابدی اور فلاحِ سرمدی اسی میں ہے کہ ان ہی علماء کا تتبع رہا جائے۔ جنھوں نے صحابہ کرام اور سلفِ صالحین کے سرچشمۂ ہدایت سے فیض اٹھایا ہے۔ بعض عارف شرعی احکام کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے ہیں۔ مگر جو عارف ایسا سمجھتا ہے وہ جاہل ہے۔ عبادت کی جس قدر ضرورت عارفوں کو ہے مبتدیوں کو اس کے دسویں حصہ کی بھی حاجت نہیں

۱ھ بزمِ تیموریہ ص ۲۳۳۔

شریعت کی پابندی کے بغیر اعمال کا احتساب اور قلب کی سلامتی نا ممکن ہے جو شخص باطن کو درست کرتا ہے اور ظاہر کو یونہی چھوڑ دیتا ہے وہ ملحد ہے اگر اس کو کچھ باطنی احوال حاصل ہوں تو اس کے حق میں استدراج ہے۔ احوالِ باطنی کا احکامِ شریعت سے آراستہ ہونا ضروری ہے اگر علومِ لدُنیہ کی مطابقت صریح علوم شرعیہ سے نہیں تو ایسے تمام علوم کو حاصل کرنا الحاد اور بے دینی ہے۔" طریقت سے ہٹ کر جو ریاضتیں اور مجاہدے لوگ کرتے ہیں ان کا کچھ وزن اور اعتبار نہیں۔ ایسی ریاضتیں تو یونان کے فلسفی اور ہندوستان کے برہمن اور جوگی بھی کرتے ہیں۔ لیکن ان کو گمراہی اور خسارہ کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کی ان تعلیمات کو شاہ جہاں نے خود ۱۰۳۷ھ میں نافذ کرنے کی کوشش کی ان اصلاحات سے کفر کی طاقتیں ٹوٹیں اور اسلام کی طاقتیں ابھریں۔ لیکن داراشکوہ کے خیالات و افکار اور اس کے سیاسی عروج سے اکبری عہد کی کفر و ضلالت پھر سر اٹھا رہی تھی۔

ملا محمد شاہ بدخشی طریقت و معرفت کے نام سے ایسے تصوف کی تعلیم دیتے تھے۔ جس سے ملحدانہ عقائد اور غیر شرعی رجحانات کو تقویت حاصل ہو رہی تھی۔ اب شیخ احمد سرہندیؒ کی تعلیمات کا علم اورنگ زیب لے کر اٹھتا ہے۔ اسے خواجہ محمد معصوم کی تائید و حمایت حاصل ہوتی ہے۔

داراشکوہ کے فکر و نظر کو ہندوؤں کی عام حمایت حاصل تھی اور ہم پچھلے صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ ۱۰۶۵ھ سے ہندوؤں کی عام اور خصوصی حمایت حاصل کرنے کے لیے جو جتن داراشکوہ نے کیے تھے اس سے حضرت شیخ احمد سرہندیؒ نے ایک ہندو ہردے رام کے ایک خط کے جواب میں پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ وہ اپنے اس خط کی ابتداء ہی اس شعر سے کرتے ہیں۔

من آنچہ شرط بلاغ است با تو میگویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

ہندویت اور اسلام میں جو بنیادی فرق ہے اور جس طرح دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ان میں رشتہ اتحاد نہیں اس سے اسلام اور ہندویت میں اشتراک اور اتحاد تلاش کرنے والے مایوس اور ناخوش بھی ہو سکتے ہیں لیکن حضرت شیخ احمد سرہندیؒ اسلام کے داعی اور علمبردار تھے اس لئے وہی بات کہی جو حق تھی اور آخر میں اپنی بات اس مصرعہ پر ختم کی۔

بہ بیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا[1]

حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے ان افکار اور اس رجحان کے پیروکار اور علمبردار معاشرے میں موجود تھے اور سرگرم بھی تھے وہ داراشکوہ کے فکر و نظریات کے فروغ کو دیکھ رہے تھے۔ حکومت ان کی سرپرستی کر رہی تھی اور رفتہ رفتہ شریعتِ نبوی کے علمبرداروں کے خلاف ایک متبادل قوت پیدا کر لی تھی اس سے شیخ احمد سرہندیؒ کے پیروکار افسردہ ضرور رہے ہوں گے اس لئے کہ اس سے معاشرہ کی یکجہتی اور سالمیت متاثر ہو رہی تھی۔ لیکن شریعتِ نبوی کی صداقت اور حقانیت پر ان کا ایمان تھا اور یہ ان کا عقیدہ اور جزوِ ایمان بھی تھا کہ آنحضرتؐ ہی کی شریعت میں دنیا کی فلاح و بہبود ہے اور مسلمان کو اسی کو قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرنا چاہیئے پھر ان کے سامنے ایک عملی مثال اور تاریخ بھی تھی۔ کہ اکبر و جہانگیر کے عہد میں (۱۵۵۶ تا ۱۶۲۷ء) عقل فلسفہ "تجربہ" مصلحت اور مفاد ملکی کے تصور کو غلبہ تھا اور شریعتِ نبوی بے بس اور محکوم تھی لیکن حضرت مجددؒ کی تحریروں اور کوششوں سے لوگوں کے نقطہ نظر میں تبدیلی پیدا ہوئی اور سوچنے کے انداز۔ پرکھنے اور جانچنے کے معیار میں فرق آیا اور شریعتِ نبوی ہی معیارِ حق قرار پائی۔ لیکن اب شریعتِ نبوی کے بجائے طریقت بے شریعت کو فروغ دیا جا رہا تھا اور ایک ولی عہدِ مملکت جدید اصطلاح میں سیکولرازم پر مبنی حکومت قائم کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا اس لیے اس کے عزائم اور ارادے

---

[1] مکتوبات نمبر ۱۶۷ جلد اول ص ۲۸۳ - ۲۸۵

کو نہ صرف ناکام بناتا ہے بلکہ مثبت طور پر شریعتِ اسلام کو حکمران بناتا ہے اور اس کے تابع مملکت اور معاشرے کو کرتا ہے۔

شریعت اور اورنگ زیب :

اورنگ زیب، شاہ جہاں کا بیٹا، دارا شکوہ اور جہاں آرا بیگم کا حقیقی بھائی تھا لیکن اسے اپنے بڑے بھائی اور بہن کی طرح ملّا بدخشی کی تحریکِ طریقت بے شریعت کے مقابلے میں شیخ احمد سرہندیؒ کی تحریک احیاءِ شریعتِ نبوی سے دلچسپی تھی۔ اس کے خیال، عمل اور کردار کی بنیاد قرآن پاک اور سنّتِ نبوی پر تھی۔ شہزادگی کے زمانے میں بلخ کی جنگ میں جب نمازِ عصر کا وقت آگیا اور اس وقت عبدالعزیز والیٔ بلخ کی فوج نے ہر طرف سے اورنگ زیب کو گھیر رکھا تھا تو ایسی حالت میں خوف اور مصلحت کو نظر انداز کیا۔ عین کارزار میں لوگوں کے منع کرنے کے باوجود سواری سے اتر کر فرض و سنّت و نفل بے حد اطمینان کے ساتھ میدانِ کارزار میں ادا کئے۔ عبدالعزیز خاں والیٔ بخارا نے جب یہ واقعہ سنا تو اورنگ زیب کی شجاعت کا اندازہ کر کے حیران رہ گیا اور جنگ سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور یہ جملہ زبان سے ادا کیا کہ ایسے شخص سے جنگ کرنا اپنے کو ہلاکت میں گرانا ہے[1]

اورنگ زیب کی یہی جرأت اور عزیمت تھی اور شریعتِ نبوی کی پابندی تھی جس سے وہ دارا شکوہ اور اس کے حامی حضرات کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ اس کی اہلیت، صلاحیت پر اعتراض نہ کر سکتے تھے۔ اس کی عادات واطوار سبھی معاملات میں پسندیدہ طرزِ عمل کا حامل تھا۔ معاملاتِ نظم ونسق میں عدل و انصاف کا قائل تھا۔ اس میں شیعہ و سنّی اور ہندو و مسلمان کی تفریق نہ کرتا۔ بے ایمانی، جانبداری سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ اپنے اعمال و کردار سے بھی

---

[1] ماثرِ عالمگیری۔ ساقی مستعد خاں ص ۳۰۸ جامع عثمانیہ حیدر آباد دکن

شریعتِ نبوی کی برتری ثابت کرنا چاہتا تھا۔ اور شریعت ہی کے نفاذ پر داراشکوہ سے اختلاف تھا۔ دارا کی تخلیق کی ہوئی کتابیں اور اس کے حامی دانشور حضرات جس فلسفۂ فکر کی ترجمانی کرتے تھے۔ اس سے حامیٔ شریعت اسلام اختلاف کرتے تھے اور داراشکوہ کے مقابلے میں اسی کا بھائی اورنگ زیب شریعتِ اسلام کا علمبردار تھا۔ اس لیے اورنگ زیب کو ہندوؤں کی نظر میں گرانے کے لیے طرح طرح کے الزام لگاتے تھے۔ ہندوؤں کی چونکہ عظیم الشّان اکثریت تھی اور ان کو اورنگ زیب سے متنفر کرنے کے لیے یہ پروپگنڈہ کیا جاتا تھا کہ اورنگ زیب ظالم، ستمگر اور ہندو دشمن ہے۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شہزادگی کے زمانے میں نہ تو اس کے پاس راجپوت فوج ہی رکھی گئی اور نہ ہی راجپوت آفیسر اس کے پاس زیادہ تھے۔[۱] اس کے برعکس داراشکوہ ۱۰۶۵ھ بمطابق ۱۶۵۶ء کو بہت سے راجپوت آفیسروں کو مقرر کرواتا ہے۔ مثلاً مہاراجہ جسونت سنگھ اور مہاراجہ جے سنگھ جو اس کے لیے دل و جان سے لڑتے تھے۔ لیکن اورنگ زیب ہندوؤں کا دشمن نہیں تھا وہ شریعتِ اسلام کا حامل تھا جو عدل و انصاف کا سبق دیتی ہے اور اورنگ زیب عدل و انصاف کرتا ہے۔ شہزادگی کے زمانے میں دکن کے انتظامات کے لیے متعیّن تھا تو متعدد ہندو اہلکاروں کے لیے شاہ جہاں کے پاس سفارش کی۔ دکن کی دیوانی کے لیے ایک لائق افسر کی ضرورت ہوئی تو اورنگ زیب نے رادکرن نام کے ایک راجپوت افسر کی سفارش کی لیکن شاہ جہاں نے اسے نامنظور کیا۔ اسی طرح دوسرے ہندو افسر نرسنگھ داس۔ جہیش داس راٹھور کی ترقی کے لیے سفارش کرتا ہے۔ دکن ہی میں ایک ہندو افسر مرجاتا ہے تو اس کی جائیداد کی وراثت کے لیے متعلق راجہ سنگرام زمیندار اور دوسرے ہندو افسروں سے مشورہ کرتا ہے اور ان کی رائے کے مطابق سفارش کرتا ہے۔ رائچور کی زمینداری کے متعلق جھگڑا ہوتا ہے۔ تو

[۱] مقدماتِ عالمگیری ص ۱۸۔

اس کے اصل حقدار حیات سنگھ کی حمایت کرتا تھا[1]

اورنگ زیب کا یہی عدل و انصاف تھا جس سے عام ہندو اس سے خوش اور مطمئن تھے اور وہ لائق ہندوؤں پر اعتماد کرتا تھا، اور انہیں اہم ترین کام بھی سپرد کرتا تھا۔ جب دارا شکوہ مہاراجہ جسونت سنگھ کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج اورنگ زیب کا راستہ روکنے کے لیے بھیجتا ہے تو اس کے ساتھ بہت سے راجپوت سردار تھے مثلاً مکند سنگھ بارہ۔ رتن سنگھ راٹھور۔ ارجن کور۔ دیال سنگھ وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت صلح صفائی اور امن کے پیغام دے کر کب کلس نامی برہمن کو ہی مہاراجہ کے پاس بھیجتا ہے۔ یہ برہمن بھاشا کا مشہور شاعر تھا اور بڑا زبان آور تھا[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کو ہندوؤں سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اسے دارا شکوہ کے آدمیوں نے بدنام کیا تھا اس نے تو ایک برہمن کب کلس پر امن و صلح کی سفارت کے لیے اعتماد کیا۔ لیکن اس کے باوجود ہندو دشمن کے طور پر بدنام کیا جاتا ہے۔

اورنگ زیب ایسے تمام علماء و مشائخ کے ساتھ جو شریعت کی پابندی کرتے تھے بڑا والہانہ لگاؤ رکھتا تھا۔ دکن کی صوبہ داری کے زمانے میں وہ حضرت عبداللطیف برہان پوری کی خدمت میں پہنچا اور ان کی خانقاہ کے لیے کچھ گاؤں پیش کیے۔ لیکن انہیں اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر کامل اعتماد تھا۔ انہوں نے گاؤں قبول کرنے سے انکار کیا اور یہ شعر پڑھا۔

شاہ مارا دہ دہد منت نہد　　رازق مارزق بے منت دہد

ترجمہ:۔ بادشاہ مجھ کو دیہات دیتا ہے اور احسان رکھتا ہے۔ ہمارا رزق دینے والا رزق بغیر احسان کے دیتا ہے۔

---

[1] مقدماتِ عالمگیری ۲۶۴-۲۶۵

[2] خافی خاں حصہ سوم ص ۳۲۔

اورنگ زیب اس شعر کو سن کر متأثر ہوا مگر اس نے عرض کیا کہ ہم فقرا اور اہل اللہ کی خدمت خیرِ دنیوی اور برکتِ اخروی کے لیے کرتے ہیں۔ گاؤں پیش کر کے احسان کرنا مقصود نہیں اس جواب پر حضرت عبداللطیف نے فرمایا کہ اگر خیر و برکت حاصل کرنا ہے تو گوشہ نشینوں اور متوکلوں کے لیے وظائف مقرر کرو، مظلوموں کو ظالموں سے بچاؤ۔ کمزوروں کو ان کے حقوق دو وغیرہ وغیرہ اورنگ زیب نے ان باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا اور اس نصیحت پر عمل کرنے کی کوشش کی[1] بادشاہت کے زمانے میں اورنگ زیب نے حضرت عبداللطیف سے بہت ہی نیازمندانہ تعلقات رکھے حضرت عبداللطیف نے اورنگ زیب کو جو نصیحت کی تھی اس کا اثر مملکت کی پالیسی پر ہوتا ہے۔

ایک بزرگ شیخ برہان، برہانپور میں تھے۔ شیخ برہان بادشاہ اور امراء سے ملنا اپنے مسلک کے خلاف سمجھتے تھے اس لیے اورنگ زیب بھیس بدل کر ان کی مجلس میں شریک ہوا۔ ایک نووارد کو دیکھ کر شیخ برہان نے نام پوچھا۔ اورنگ زیب نے جب اپنا نام بتایا تو وہ اس کی طرف مخاطب نہیں ہوئے اور نہ اور لوگوں کی طرح اس کو تبرک دیا۔ اورنگ زیب دوسرے دن پھر ان کی خانقاہ میں پہنچا۔ شیخ برہان نے اپنی آزردگی کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہا کہ یہ مکان تم کو پسند ہے۔ تو لے لو ہم کہیں اور چلے جائیں گے مگر تیسرے دن اورنگ زیب مؤدبانہ ان کے پاس کھڑا ہو گیا اور عرض کی کہ دارا نے شریعت کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ اگر مجھ کو حکومت ملی تو دینِ نبوی کے احکام کے ساتھ رعیت پروری بھی کروں گا۔ آپ باطنی توجہ فرمائیں۔ شیخ برہان نے فوراً کہا کہ ہم جیسے فقیروں کی دعا سے کیا ہوتا ہے۔ تم بادشاہ ہو۔ نیکی۔ عدل پروری، رعیت نوازی کی نیت سے دعا کرو ہم بھی دعا کے لیے

---

[1] خافی خاں حصہ سوم ص ۷۷۔ بزمِ تیموریہ ص ۲۵۳، مقدماتِ عالمگیری ص ۱۳۲

ہاتھ اٹھاتے ہیں"، اس کے ساتھ اورنگ زیب شیخ نظام الدین کے ساتھ اٹھاتے ہیں اور شیخ نظام نے اورنگ زیب سے کہا کہ بادشاہی مبارک ہو[۱]

اولیاء اللہ کی بے رخی سے اورنگ زیب کبھی دل برداشتہ ہوتا۔ ملا قطب الدین سے کئی بار ملنے کی خواہش کی مگر ہر بار ملا صاحب نے اس سے ملنے سے انکار کیا[۲] ملا صاحب نے ملنے سے اس لیے انکار کیا کہ ان کی کوئی ذاتی غرض اور خواہش نہ تھی رہا شریعت کی برتری اور حاکمیت کا مسئلہ اس کی خواہش اور آرزو رکھتے تھے اس کے لیے دعائیں اور کوشش دونوں کرتے تھے۔

شیخ بایزید نے ایک روز جامع مسجد میں تمام لوگوں کے سامنے عالمگیر سے پوچھا کہ لڑکیوں میں سے بعض نا کتخدا کیوں ہیں؟ یہ پوچھ کر تلقین کی خاطر ایک وعظ کیا۔ عالمگیر ان کی نصیحتوں کو خاموش ہو کر سنتا رہا۔ میر تقی واعظ ملتانی کو اس نے اس لیے پسند کیا کہ وہ شرعی امور میں حق گوئی سے کام لیتے تھے وہ حضرت میر نصر الدین ہروی کے صلاح و تقویٰ اور عارفانہ فضیلت سے متاثر ہوا اس نے ان کی خدمت میں کچھ گاؤں پیش کیے۔ مگر انہوں نے جاگیر قبول کرنا پسند نہیں کیا[۳]

دارا کے ظلم اور زیادتیوں کے ازالہ کے لیے جمادی الاولیٰ ۱۰۶۸ھ میں برہان پور سے روانہ ہوتے ہوئے شیخ برہان سے ملاقات کی خواہش کی۔ ملاقات کے لیے پیغام بھجوایا لیکن شیخ نے اجازت نہیں دی آخر بڑے اصرار اور کوشش کے بعد ملاقات کی اجازت دی۔ شیخ کے ایک خاص مقرب شیخ نظام کے ساتھ دیدار کے لیے گیا اور ان سے مدعا عرض کی اور فاتحہ اور دعا کی درخواست کی۔ شیخ نے جواب میں فرمایا

۱؎ خافی خاں حصہ سوم ۷۶۔ بزم تیموریہ ۲۵۴۔

۲؎

۳؎ خافی خاں ۵۵۲، ۵۵۸، ۵۶۴ و بزم تیموریہ ۲۵۵

"تم بادشاہ ہو۔ تمہارے لیے ہم فقیروں کی دعاؤں اور فاتحہ سے کیا ملے گا۔ ہاں تم عدل و انصاف اور رعیت پروری کے مقصد سے دعا مانگو ہم بھی تمہارے ساتھ دعا کے لیے ہاتھ اٹھالیں گے۔ دعاؤں اور فاتحہ کے بعد شیخ نے نصیحت کے طور پر چند کلمے کہے اور تبرک وغیرہ دے کر رخصت کیا۔[1]

دارا اور اورنگ زیب میں ایک بنیادی فرق یہ تھا کہ دارا ... اپنے خودساختہ من بھاتا اسلام کا علمبردار تھا اسے بزرگانِ دین، اقتدار پرست مشائخ مفاد پرست کارکنانِ حکومت کی حمایت حاصل تھی اس کے برخلاف اورنگ زیب کو اپنے عمل و کردار کی بدولت و شریعتِ نبوی کے علمبرداروں کی حمایت حاصل تھی جو دنیاوی مفاد اور ذاتی غرض سے پاک تھے وہ بے غرض اورنگ زیب کی حمایت کرتے تھے تاکہ شریعتِ نبوی غالب ہو اس لیے کہ دنیا کی فلاح و بہبود ی شریعتِ نبوی کے اتباع اور نفاذ میں ہے۔

داراشکوہ اور اورنگ زیب صلبی حیثیت سے ایک ہی ماں اور باپ کے بیٹے ہیں اُن میں لسانی۔ لونی۔ شیعہ و سنی اور معاشی کوئی اختلاف نہیں تھا۔ ایک ہی باپ دونوں کی تعلیم و تربیت کرتا ہے اور دونوں انتظامی عہدیدار کی حیثیت سے تربیت پاتے ہیں۔ لیکن دونوں کے طرزِ فکر رجحان اور پسند و ناپسند میں ابتداء ہی سے فرق نظر آتا ہے۔ داراشکوہ اپنے ہی عہد کے میاں میرؒ کے طرزِ فکر کو پسند کرتا ہے اور ان کے خلیفہ ملا محمد شاہ بدخشی کا مرید ہو کر انہیں کی سرپرستی میں آگے بڑھتا ہے اس کے برعکس اورنگ زیب شیخ احمد سرہندیؒ کی تحریک احیاءِ شریعت سے متاثر ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ اس کی زندگی میں انقلاب آتا ہے اور وہ اپنی انتظامی۔ حربی اہلیت و صلاحیت کو بڑھاتا ہے۔ تاکہ وہ شریعتِ نبوی کے عَلم کو بلند کر سکے۔

---

[1] خافی خاں حصہ سوم ص ۳۰۔

حق و باطل کی جنگ:

دارا صوفی مشرب الحاد کا علمبردار تھا اور کفر و اسلام کو توام قرار دے چکا تھا اس کے نظریات۔ فکر و فلسفہ سے لوگ واقف ہو چکے تھے۔ لیکن شاہ جہاں زندہ تھا اس لیے لوگ خاموش تھے کہ یکایک ۷ ذی الحجہ ۱۰۶۷ھ کو شاہ جہاں بیمار ہوا اور اس کی بیماری شدت اختیار کر گئی دارا شکوہ ولیعہد سلطنت تھا اس نے سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی اور بھائیوں کے جو نمائندے دربار میں تھے ان سے اس بات کا مچلکہ لیا کہ وہ دربار کی کوئی بات لکھ کر نہ بھیجیں۔ بنگال احمد آباد۔ دکن کے راستوں کی ناکہ بندی اور قاصدوں اور مسافروں کی آمد و رفت بند کرا دی[1] اورنگ زیب کے وکیل عیسیٰ بیگ کو دارا شکوہ نے بند کر دیا اور مال اسباب اور مکان ضبط کر لیا۔ اس سے صحیح الخیال مسلمان خوش اور مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے انتشار۔ فساد۔ قانون شکنی پیدا ہونا لازمی تھا۔ مؤرخین اس واقعہ کو شاہ جہاں کے بیٹوں کی یا دارا شکوہ و اُسکے بھائیوں کی تخت نشینی کی جنگ کہتے ہیں۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ حق و باطل کفر و اسلام کی جنگ تھی۔ یہ ایمان و الحاد کا تصادم تھا۔ صحیح شریعت اور عاصیانہ طریقت کی لڑائی تھی۔ اس جنگ کا مقصد یہ نہ تھا کہ دارا تخت حکومت کا مالک ہو کر رہے گا۔ یا اورنگ زیب بلکہ غایت یہ تھی کہ اسلام ایک مرتبہ پھر پاک و ہند میں حکمران رہے گا یا اس الحاد کی مہلک گرفت میں چلا جائے گا جس کی بنیاد اکبر نے نہ صرف رکھی تھی بلکہ اس کی آبیاری بھی کی تھی اور اس کی سرپرستی میں ایک تن آور درخت بھی قائم ہو گیا اس عہد کے نظریاتی، فکری اور تصوراتی رجحانات کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ صحیح العقیدہ مسلمان دارا اور اس کے خیالات و افکار سے بیزار تھے۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کو کفر و الحاد کی چوکھٹ پر منہ کے بل گرا رہا تھا۔

---

[1] خافی خاں حصہ سوم ص ۲۳-۲۶۔

ہر مسلمان کی دلی خواہش تھی کہ الحاد کی بڑھتی ہوئی تحریک کو روکا جائے۔ دارا کے تینوں بھائی شجاع۔ اورنگ زیب۔ دارا جو ایک ہی ماں باپ کی اولاد تھے اور خونی رشتہ سے حقیقی بھائی اور عقیدہ کے اعتبار سے ماں کی طرف سے شیعہ اور باپ کی طرف سے سنی مسلک کے حامل تھے وہ سب اپنے برادرِ بزرگ دارا شکوہ کے الحاد و بے دینی پر متفق تھے وہ دارا شکوہ کے متعلق "ملحد" "بے دین" "دشمنِ دینِ مبین" "رنگے از مسلمانی نداشت" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اس لیے یہ شاہ جہاں کے بیٹوں کی یا بھائیوں کی جنگ نہ تھی۔ بلکہ اسلام اور کفر کی جنگ تھی ایمان و الحاد کا تصادم تھا۔ صحیح شریعت و عامیانہ طریقت کی لڑائی تھی اس جنگ کا یہ مقصد نہ تھا کہ دارا تختِ حکومت کا مالک ہو گا یا کوئی اور بھائی بلکہ غایت وجہ یہ تھی کہ اسلام غالب رہے گا یا مغلوب، الحاد و منافقت کا دور دورہ رہے گا یا صاف ستھری اور بے لاگ شریعتِ نبوی حاکم رہے گی او ملا شاہ کے مرید دارا شکوہ کی طریقت بے شریعت کا دور دورہ ہو گا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو غلبہ حاصل ہو گا اس لئے تینوں بھائیوں نے یہ محسوس یہ کیا کہ اگر کوئی چیز اسلامی آبادی کو ان کی طرف متوجہ کر سکتی ہے تو وہ ان کی اسلامی دعوت ہے جو وہ ملک کو دارا کے ملحدانہ خیالات سے نجات دلانے کے متعلق دیں گے۔ دارا بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے تینوں بھائی اس کے خلاف متحد اور ہم خیال ہیں اس لیے ابتدائی اقدامات کے بعد سب سے پہلے اپنے سے چھوٹے اور اورنگ زیب سے بڑے بھائی شہزادہ محمد شجاع کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ شہزادہ شجاع بنگال میں شاہ جہاں کی طرف سے صوبہ دار تھا۔ اسے جب اپنے نمائندے کی طرف سے کچھ نہ خبر ملی۔ تو اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اور ایک بھاری لشکر لے کر پٹنہ پہنچ گیا۔ دارا نے (تین مہینے کے اندر) ۱۴ ربیع الاول ۱۰۶۸ھ کو شجاع کے لیے راجہ جے سنگھ اور دوسرے چند افراد کے ساتھ ایک فوج روانہ کی جس کی کمان اپنے لڑکے سلیمان شکوہ کو دی بنارس کے قریب راجہ نے شجاع کو شکست دی

اور اس کے تمام ساز و سامان پر قبضہ کر لیا۔ شجاع تمیدان جنگ سے بھاگ کر بنگال میں پناہ لی اور سارا علاقہ دارا شکوہ کے قبضہ میں آگیا۔ شجاع کے جو آدمی میدانِ جنگ میں قید کیے گئے تھے۔ انہیں راجہ نے اکبر آباد روانہ کر دیا۔ دارا شکوہ نے ان سب کو شہر میں گشت کرایا اور ان میں سے بعض کو قتل کر دیا اور بعضوں کے ہاتھ کٹوا دیے۔

مراد جو دارا شکوہ کا سب سے چھوٹا بھائی تھا اور شاہ جہاں کی طرف سے گجرات کا صوبیدار تھا اس کو جب اپنے وکیل سے کوئی اطلاع نہ ملی تو اس نے بھی احمد آباد میں اپنے نام کا سکہ[نوٹ] و خطبہ جاری کر دیا اور سُورت کی بندرگاہ کا محاصرہ کر لیا اور نقب لگا کر قلعہ کی برج اور فصیل اُڑا دی اور وہاں کے تاجروں سے پندرہ لاکھ روپے وصول کیے[1] اس طرح مراد نے بھی اپنی آزادی کا اعلان کر دیا دوسرے الفاظ میں دارا شکوہ کے خلاف عملِ بغاوت کا قدم اٹھایا۔

دونوں بھائیوں کے برعکس اورنگ زیب بیجا پور کے محاصرہ میں مصروف تھا شاہ جہاں کی بیماری کی وجہ سے دارالحکومت کے حالات دگرگوں تھے۔ دارا شکوہ اس وقت اورنگ زیب کے ہمراہ جو بڑے بڑے فوج دار امیر بیجا پور کی تسخیر پر مامور تھے ان کو دربار میں طلب کرتا ہے اس سے اورنگ زیب ایک مشکل میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس سے بیجا پور کی مہم نامکمل رہ جاتی ہے۔ اور اورنگ زیب کو والیٔ بیجا پور سے صلح کرنی پڑتی ہے۔ اسی اثناء میں معلوم ہوا کہ دارالخلافہ میں اس کے وکیل عیسیٰ بیگ کو قید کر دیا گیا اور اس کا گھر بار ضبط کر لیا گیا۔ بنگال اور گجرات سے شجاع اور مراد کے اقدامات کی اطلاع مل چکی تھی۔ لیکن اورنگ زیب

---

[1] خافی خاں حصہ سوم ص ۲۳-۲۵-۲۶

نوٹ سکہ و خُطبہ جاری کرنا خود مختاری کی علامت ہے۔

[2] خافی خاں حصہ سوم ص ۴۲

صبر و تحمل سے حالات کا جائزہ لے رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اپنی فوجوں کو تیاری کر رہا تھا۔

دارا شکوہ اورنگ زیب کا راستہ روکنے کے لیے مہاراجہ جسونت سنگھ کو ایک بڑی فوج اور توپ خانہ کے ساتھ دکن روانہ کرتا ہے اور پورے صوبہ مالوا کو اپنی جاگیر میں شامل کر لیتا ہے اور اس صوبہ کے تمام تعلقہ جات کی آمدنی اپنے مقرر کردہ امراء کو تنخواہ میں دے دی تاکہ یہ امراء خزانہ کے لالچ میں ایک دوسرے کے معاون و مددگار بن کر فوج جمع کرنے اور جنگ کی تیاریوں میں دل و جان سے اسکے ساتھ دیں ۔ دارا کی سیاسی اور حربی پیش قدمیوں کو اورنگ زیب دیکھ رہا تھا اس وقت تک اس نے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جو مراد اور شجاع اٹھا چکے تھے البتہ مراد کو ایک خط میں لکھا "برادر شکوہ کی زیادتیوں اور بے انصافیوں کے ردِ عمل میں دوسرے بھائی جو کچھ سوچ رہے تھے اور جو کچھ کرنا چاہتے تھے وہ بالکل حق بجانب اور بجا ہے مجھے بھی اپنا شریک کار اور مددگار سمجھیں مگر چونکہ والد بزرگوار ابھی بہ قید حیات ہیں اس لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ دونوں بھائی والد محترم کی خدمت میں حاضری کا ارادہ کریں اور ایک دوسرے کے اتفاق سے اس بے دین کی خیرہ سری کا تدارک کریں جو بادۂ غرور اور نخوت خود آرائی میں مست ہو رہا ہے اگر تقدیر یاوری کرے تو حضرت ولی نعمت (شاہ جہاں) کا دیدار کر لیں اور فتنہ و فساد کا قلع قمع کر کے اس بھائی (مراد) کیلئے حضور سے معافی طلب کر لیں جو حالتِ اضطرار میں سرزد ہو گیا ہے[1]

ایک فوج کے ساتھ مراد کو دریائے نربدا پر آنے کی دعوت دی اور خود بھی دکن سے فوج کے ہمراہ روانہ ہوتا ہے اور ۲۵ جمادی الاول ۱۰۶۸ھ کو برہان پور پہنچتا ہے۔

برہان پور پہنچ کر اورنگ زیب نے شہر کے ایک مشہور با اثر مذہبی رہنما شیخ برہان سے ملنے کی خواہش کی لیکن شیخ ملنے کی اجازت نہیں دیتے آخر بڑے اصرار اور

---

[1] خافی خاں حصہ سوم ص ۳۹۔

کوشش کے بعد ملاقات ہوتی ہے۔ اورنگ زیب نے اپنے ارادے اور عزائم شیخ کو بتلائے اور فاتحہ اور دعا کی درخواست کی۔ شیخ نے جواب میں فرمایا۔ تم بادشاہ ہو تمہارے لیے ہم فقیروں کی دعا و فاتحہ سے کیا ملے گا تم عدل وانصاف اور رعیت پروری کے قصد سے دعا مانگو ہم بھی تمہارے ساتھ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں گے۔ شیخ اپنی بزرگی کی بنا پر مدد کا وعدہ نہیں کرتے۔ بلکہ ایک طرف تو اورنگ زیب کے سامنے یہ مسئلہ رکھتے ہیں کہ تم بادشاہ ہو تم کو ہم فقیروں کی دعا سے کیا ملے گا۔ یعنی تم ایک بااختیار و بااقتدار بادشاہ ہو اور اس کے برعکس ہم فقیر اور محتاج ہیں۔ ہماری محض دعا و فاتحہ سے کیا ملے گا اس لیے اگر تم عدل وانصاف اور رعیت پروری کے قصد سے دعا مانگتے ہو تو ہم بھی تمہارے ساتھ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں اس طرح اورنگ زیب، شیخ برہان کے ساتھ عدل وانصاف اور رعیت پروری کا وعدہ کرتا ہے اور اسلامی طریقے پر فاتحہ کے ساتھ دعا بھی مانگتا ہے اس سے شیخ برہان خوش ہوتے ہیں اور چند مشورے اور کلمے ادا کرتے ہیں اور تبرک وغیرہ بھی دیتے ہیں اس طرح عہد و پیمان کے بعد حمایت اور تائید کرتے ہیں۔ یہ حمایت اور تائید رعایا پروری اور عدل وانصاف پر ہوتی ہے اس پر تائید و حمایت کرنے والے خطابات انعام و اکرام طلب نہیں کرتے[۱]

اورنگ زیب جمادی الاولیٰ ۸ ۱۰۶ھ (۷ ذی الحجہ ۱۰۶۷ھ شاہ جہاں کی بیماری راستوں کی ناکہ بندی اور سفرا کی گرفتاری) یعنی شاہ جہاں کی بیماری کے پانچ ماہ بعد بیجاپور سے برہان پور پہنچتا ہے اور یہاں ایک ماہ تک قیام کرتا ہے اور دربار کی خبریں بہم پہنچتا ہے اور طے شدہ پروگرام کے مطابق ۲۰ رجب ۱۰۶۸ھ کو مراد اور اورنگ زیب دیبال پور میں ملاقات کرتے ہیں اور آگے بڑھنے سے پہلے امن و آشتی اور صلح و صفائی کا راستہ اختیار کرتے ہیں[۲]

---

[۱] خافی خاں حصہ سوم ص ۳۰-۳۲-

مہاراجہ جسونت سنگھ جس کو دارا نے ایک بڑی فوج دے کر اورنگ زیب کا راستہ روکنے کے لیے بھیجا تھا۔ اورنگ زیب کب کلس برہمن کو جو بیاں کا ایک مشہور شاعر اور بڑا زبان آور آدمی تھا، اس کو جسونت سنگھ کے پاس بھیجتا ہے اور پیغام دیتا ہے کہ وہ ہم لوگ (اورنگ زیب و مراد) صرف قبلہ والد کی عیادت کی غرض سے جا رہے ہیں آپ سدِّ راہ نہ ہوں۔ جیسے مخالفت اور لڑائی کا کوئی ارادہ نہیں ؟ مناسب یہ ہے کہ تم بھی ہمارے ہم رکاب خدمتِ والا میں چلے چلو یا راستہ چھوڑ کر اپنے وطن چلے جاؤ اور بندگانِ خدا کی خوں ریزی کا باعث نہ ہو۔ یہ شرائط اور وعدہ ایسے تھے جس کو اگر راجہ مان لیتا تو نہ جنگ ہوتی اور نہ ہی خون خرابہ لیکن راجہ جسونت سنگھ اورنگ زیب کی ان شرائط کو تسلیم نہیں کرتا۔ اب اورنگ زیب کے لیے امن وامان کا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا اب اس پر جنگ ٹھونسی جا رہی تھی۔ اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا کیونکہ دارا شکوہ عملی طور پر حکومت پر قابض ہو چکا تھا۔ اور جسونت سنگھ کی قیادت میں راجپوتوں کا نظری فکری اور حربی تعاون حاصل ہو چکا تھا اس لیے اورنگ زیب کی پیش کش قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا چنانچہ جسونت سنگھ قبول نہیں کرتا۔ جسونت سنگھ نے اپنی فوجوں کو آراستہ کیا اور اورنگ زیب کیلئے اسکے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ کہ وہ بھی اپنے تحفظ کے لیے فوج کو تیار کرے اور مقابلہ کے لیے تیار ہو جائے۔

جسونت سنگھ اور اورنگ زیب کی فوجوں میں ۲۲ رجب کو جمعہ کے دن ۱۰۶۸ھ میں زبردست جنگ کا آغاز ہوتا ہے دونوں طرف کے سپاہی اپنے اپنے مقصد اور نظریات پر پختہ ایمان رکھتے تھے۔ دل وجان سے لڑ رہے تھے۔ راجپوت بڑی دلیری اور جانفشانی دکھا رہے تھے۔ خصوصیت سے خون خوار مکند سنگھ بارہ رتن سنگھ راٹھور۔ ارجن گور۔ دیال سنگھ جھالہ اور دوسرے جاں نثار اور جاں باز راجپوت سپاہی "رام رام" کہتے ہوئے گھوڑے دوڑاتے، جان پر کھیلتے پروانہ وار جنگ کی بھڑکتی آگ میں بے خطر کود رہے تھے اور بپھر بپھر کر توپ خانہ

پر حملے کر رہے تھے ان کے پے در پے جان توڑ حملوں سے اورنگ زیب کے توپ خانہ کا نظم بگڑ گیا۔ لیکن اورنگ زیب کے حامی سپاہی جاں نثاری کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے مرشد قلی خاں پوری جاں نثاری کے ساتھ ڈٹا رہا اور ذوالفقار خاں ہاتھی سے نیچے کود کر اپنے چند دلیر جاں نثاروں کے ساتھ پیادہ ہو کر آگے بڑھا اور مردانگی کے جوہر دکھانے لگا۔ زخمی ہو جانے کے بعد وہ برابر راجپوتوں کے مقابلے میں آہنی دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن راجپوت سپاہی پیہم حملے کر رہے تھے اور ان کا زور ٹوٹتا نہیں تھا اورنگ زیب راجپوتوں کی ثابت قدمی اور بہادری کا خود مشاہدہ کر رہا تھا۔ جب معاملات بہت ہی نازک دیکھے تو خود اپنے جنگی ہاتھی کو لیکر علم بردارانِ اسلام کی کمک کے لیے آگے بڑھا۔ اورنگ زیب کی پیش قدمی سے اس کے سپاہیوں کے حوصلے بڑھے اور تھوڑی ہی دیر میں راجپوتوں کو زبردست شکست ہوئی اور ہزارہا افراد قتل ہوئے لیکن راجپوت بہر حال راجپوت تھے اس زبردست دباؤ کے باوجود ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہیں ہوئے اور پامردی سے مقابلہ کرتے رہے۔

شہزادہ مراد بھی اپنے فوج کے ساتھ مہاراجہ جسونت سنگھ کی فوج پر حملہ آور ہوا۔ یہاں بھی راجپوت سرداروں نے سخت لڑائی لڑی۔ سردار دیبی سنگھ۔ رہسوجی مالوجی بڑی دلیری و مردانگی سے مراد پر حملے کرتے رہے۔ مگر ان کے متعدد سردار مارے گئے اس سے ان کے حواس باختہ ہو گئے ادھر اورنگ زیب کے دلیرانہ حملے سے مکند سنگھ۔ سبحان سنگھ سسودیہ۔ رتن سنگھ راٹھور۔ ارجن سنگھ۔ دیال داس اور موہن سنگھ یارہ یکے بعد دیگرے مارے گئے اور راجپوتوں کی جمعیت میں بڑی سخت افراتفری مچ گئی۔ راجپوتوں نے دیکھا کہ ان کے بہادر سردار اورنگ زیب کی تلوار کا لقمہ بن رہے تھے۔ چنانچہ ان کے حوصلے و عزائم پست ہونے لگے اس سے مہاراجہ جسونت سنگھ کے دل میں ایسا خوف پیدا ہوا کہ راجپوتوں کی آن کو خیر باد کہہ کر اس نے معرکہ کارزار سے فرار ہو کر اپنی جان بچانے کی فکر کی اور اپنے ہمراہیوں کے طعنہ سے بے پرواہ ہو کر پیشانی پر بدنامی کا داغ لگا کر میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا اور سیدھے

اپنے وطن کی راہ لی۔ جسونت سنگھ کے بھاگتے ہی قاسم خاں اور دوسرے شاہی امراء کے قدم اُکھڑ گئے اور وہ سب داراشکوہ کی فوج کے سردار جسونت سنگھ کے نقشِ قدم پر جدھر منہ اٹھا فرار ہو گئے اس لئے اورنگ زیب کو فتح ہوئی اور فتح کے شادیانے بجائے گئے اور غنیم کا سارا مال واسباب توپ خانے۔ خزانہ اور ہاتھی قبضہ میں آ گئے۔ اس جنگ میں ہزارہا افراد قتل ہوئے اور بہت سے راجپوت سردار مارے گئے۔ اس طرح داراشکوہ کو پہلی ہزیمت دیکھنی پڑی اس کے مقابلے میں اورنگ زیب کے صرف مرشد قلی خاں کام آئے اور کوئی کام نہیں آیا اور جو لوگ زخمی ہوئے ان کے علاج معالجہ کا انتظام کیا۔ لوگوں نے فتح کی مبارک باد دی[۱]

اورنگ زیب جنگ میں کامیابی کے بعد انتظامات سے فارغ ہو کر ۲۷ رجب ۱۰۶۸ھ کو دارالفتح اجین سے کوچ کر کے آگرے کی طرف روانہ ہوتا ہے اور پہلی رمضان المبارک کو اس کا لشکر دریائے چنبل کو عبور کرتا ہے اور خود اورنگ زیب کی سواری دوسرے دن دریا کو عبور کرتی ہے۔ یہاں داراشکوہ نے گھاٹ پر کسی قسم کی ناکہ بندی نہیں کی تھی اس لیے بغیر کسی مزاحمت کے دریا عبور کر لیا۔ اب شاہ جہاں بھی قدرے صحت یاب ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے۔؟

جسونت سنگھ کی ہزیمت کی خبر سے داراشکوہ بدحواس ہو گیا اس نے بڑی لجاجت اور سماجت سے شاہ جہاں کو آگرے واپس بلایا حالانکہ آگرے کی آب و ہوا اس کے موافق

---

[۱] خافی خاں حصہ سوم ص ۳۳ تا ۳۱۔

نوٹ:۔ راجہ جسونت سنگھ میدانِ جنگ سے فرار ہو کر اپنے وطن چلا گیا مگر وہاں اس کی جان عذاب میں تھی۔ کیونکہ بعض عورتیں خاص طور سے راجپوت عورتیں مردوں سے کچھ زیادہ ہی غیرت مند ہوتی ہیں اس لیے وہ عزت کے لیے آگ میں جل جانے سے بھی نہیں ڈرتیں جسونت سنگھ جب گھر پہنچا تو اس کی بڑی بیوی جو راجہ چھتر سال کی لڑکی تھی۔ شوہر کو بُرا بھلا کہنے لگی۔ یہاں تک کہ اس نے اس کا بستر چھوڑ دیا اور ہمیشہ وہ اسے طعنہ دیتی رہتی۔ خافی خاں حصہ سوم ص ۶۱۔ ۶۲۔

ہی نہیں تھی اور خود ساٹھ ہزار فوج کے ساتھ اورنگ زیب کے مقابلہ کے لیے نکلا۔ تو شاہ جہاں نے بارہا نہایت اصرار کے ساتھ داراشکوہ کو سمجھایا کہ تمہارا جانا خلافِ مصلحت ہے۔ میں خود اس فتنہ کو جاکر فرو کرتا ہوں چنانچہ حکم دیا کہ پیش خیمہ باہر نصب کیا جائے مگر داراشکوہ نے کسی طرح نہ جانے دیا۔[1]

داراشکوہ کا اپنے باپ کے ساتھ یہ سلوک کسی طرح اخلاقی بنیاد پر حق بجانب نہیں تھا اور نہ ہی حکمتِ امن وصلح کے موافق تھا۔ وہ تو اپنے سیاسی اقدامات سے ایک عرصہ سے اخلاق وعادات کی دھجیاں تار تار کر رہا تھا۔ وہ ولیعہدِ سلطنت، شاہِ بلند اقبال، ۶۰ ہزار کے منصب کا عہدیدار۔ ملّا شاہ بدخشی کا مرید اور ان کے پیر کا سوانح نگار اور بادشاہِ ظاہر و باطن تھا،" وہ شاہ جہاں کی رائے اور مشورے کو قبول نہیں کرتا اور ۱۶ شعبان ۱۰۶۸ھ کو داراشکوہ کی فوجیں دھول پور میں چھاؤنی ڈال دیتی ہیں اور چنبل کے گھاٹ کی ناکہ بندی کر دیتی ہیں۔ داراشکوہ شہر سے باہر نکل کر اپنے لڑکے سلیمان شکوہ کا انتظار کرتا ہے۔ جو شجاع کو شکست دے کر آرہا تھا لیکن اس کے آنے میں دیر ہو رہی تھی وہ مزید انتظار کرنا مناسب نہیں سمجھتا ——— اور دونوں بھائیوں (اورنگ زیب اور مراد) کی فوج کے مقابلہ کے لیے ۲ رمضان المبارک ۱۰۶۸ھ کو سموگڑھ کے میدان میں خود آتا ہے۔ گھاٹ کا راستہ بند کرنے کے لیے فوج روانہ کرتا ہے۔ لیکن اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ اورنگ زیب کی فوجیں پہلے ہی دریا عبور کر لیتی ہیں۔ ناچار داراشکوہ اپنی فوجیں۔ مثلاً توپ خانہ کی تیاری، مست جنگی ہاتھیوں کی تربیت اور فوج کی صف بندی میں مشغول ہو جاتا ہے۔

اس جنگ سے قبل دھرمادت میں اورنگ زیب اور مراد کے مقابلے میں داراشکوہ کی طرف سے مہاراجہ جسونت سنگھ اور دوسرے امرائے مملکت تھے جنہوں نے اورنگ زیب کی پیش کش قبول نہ کی اور جنگ کی اور شکست کھائی اور میدان جنگ سے فرار اختیار کیا۔

[1] خافی خاں حصہ سوم ص ۴۳ تا ۴۴۔

اب سموگڑھ کے میدانِ جنگ میں اورنگ زیب اور مراد کے مقابلے میں ان کا بڑا بھائی ہے۔ ان میں کوئی خونی۔ نسلی یا معاشی نظریات کا اختلاف نہیں ہے۔ اگر اختلاف ہے تو نظریہ اور اسلام کی تعبیر کا ہے جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں تفصیل سے کیا جا چکا ہے۔ اس جنگ میں دو حقیقی بھائی ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہیں دونوں کی حمایت لوگ کرتے ہیں تو وہ بھی اپنی اپنی پسند اور نظریہ کے مطابق عمل کرتے ہیں دارا شکوہ کی فوج میں جو لوگ ساتھ ہیں اور اس کے لیے دل و جان سے لڑتے ہیں وہ محض دارا شکوہ کی ذات ہی نہیں بلکہ دارا شکوہ کے نظریات کی بھی حمایت کرتے ہیں اور اس کو دل و جان سے چاہتے ہیں۔ یہی حال اورنگ زیب کا ہے اس کی ذات سے صحیح العقیدہ مسلمانوں کو اسلام کے غلبہ کی توقّع ہوتی ہے اس لیے مسلمان کسی طمع، لالچ کے بغیر اس کی مدد کرتے ہیں اور اس کے ساتھ اپنی جانیں نثار کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں اس طرح یہ محض دو بھائیوں کی جنگ نہیں بلکہ صحیح معنوں میں حق و باطل کی جنگ ہوتی ہے۔

دارا اپنی فوج کی صف بندی کیلئے اور دوسرے دن فوج کے معائنہ کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ تو دیکھتا ہے کہ اس کا عظیم الشّان لشکر اور بے شمار مست ہاتھی دو کوس کے وسیع علاقہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس دن بڑی سخت گرمی تھی ماہِ خوردار (جون کے لگ بھگ کا سورج بڑی تیزی سے چمک رہا تھا۔ ہوا بڑی گرم بلکہ شعلہ بار تھی۔ پانی کی کمی اور دھوپ غضب ڈھا رہی تھی۔ خاص طور پر جو لوگ زرہ بکتر پہنے فولاد میں غرق تھے۔ وہ لوہے کی گرمی سے اُبل اُبل گئے اور کئی ایک تو اس حدّت سے جاں بحق ہو گئے[1]

دارا اپنی فوج کی کثرت تعداد اور سازوسامان سے مطمئن تھا اور اپنے پیر ملّا شاہ بدخشانی کی دعائیں اس کے ساتھ تھیں (رہا دنیا کا سفر سو اس کے انجام ہونے میں کس کو کلام ہے جس کو

---

[1] خافی خاں حصہ سوم ص۔۴۰۔

وجودِ اعظم کا یقین حاصل ہو گا۔ یقیناً اس کے اعتبار کا لشکر بھی شکست کھائے گا۔ فتح و نصرت عنقریب اللہ کی طرف سے ہو گی۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے مجازی کاموں میں بھی بامراد کرے گا۔ پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ ص ۱۳۲)۔ اسے فتح و نصرت کا یقین تھا اس لیے وہ خود اپنے باپ کی رائے قبول نہیں کرتا اور میدانِ جنگ کے لیے عجلت کرتا ہے۔

اس کے برعکس اس کا بھائی اورنگ زیب بھی اسی دن جنگ کے لیے تیار ہو گیا لیکن لڑائی میں پہل نہیں کرتا اس لیے گولہ کی مار تک کے فاصلہ پر ٹھہر کر دشمن کے جنگ چھیڑنے کا انتظار کرتا ہے۔ عصر اور مغرب کی نماز کے بعد اسی جگہ قیام کرنے کا حکم دیا اور پوری فوج کو ہدایت کر دی کہ رات پوری ہوشیاری اور خبرداری سے بسر کی جائے۔ اورنگ زیب اور اس کے حامی اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے مطمئن تھے۔ ماہِ رمضان المبارک گرمی کی شدت اور فوج اور ساز و سامان کی کثرت سے ہراساں نہیں تھے بلکہ انہیں یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی ضرور مدد کرے گا۔ وہ اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے آئے ہیں اور اس کے برخلاف دارا اپنے ذات اور اپنے پسندیدہ طرزِ فکر کے لیے آیا ہے اس لیے نہ وہ ہراساں ہوتے ہیں اور نہ مرعوب بلکہ اطمینان کے ساتھ دارا کے اقدام کا انتظار کرتے ہیں۔

اورنگ زیب نے دوسرے دن جب صبح ہوئی تو اپنی فوج کی صف آرائی کی توپ خانہ کو وہ پیکر ہاتھی ترتیب دیے۔ دشمن کے مقابلے میں تعداد کم تھی۔ مگر عزیمت، شجاعت مردانگی میں ان کا کوئی مقابل نہیں تھا ان کا قائد اورنگ زیب تھا جسکو کثرتِ تعداد کی پروا نہیں تھی وہ عزم و جرأت کا پیکر تھا۔ اسے اللہ تعالیٰ اور شریعتِ محمدی پر کامل اعتماد تھا۔

دوسرے روز دارا شکوہ نے بھی پوری تیاری کر رکھی آتش بار توپ خانہ جنگی ہاتھیوں کے جلو میں آگے آگے حرکت کر رہا تھا۔ اس دن ستر اسی ہزار کی فوج دارا شکوہ کے ہم رکاب تھی وہ بڑی آن بان سے قلبِ لشکر میں جلوہ گر تھا۔ فوج کی کثرت اور اس کی آن بان

سے دارا مطمئن تھا۔ جنگ کا آغاز دونوں طرف کے توپ خانہ سے ہوا۔ توپیں آگ اگلنے لگیں۔ گولے برسنے لگے۔ ساتھ ہی جنگجو بہادر تیر اور نیزے لے کر بڑھے۔ دونوں طرف سے ہزار ہا تیر اڑتے ہوئے ادھر ادھر پہنچے اور ہزار ہا افراد کام آئے۔ میدانِ جنگ خون سے لالہ زار ہو گیا۔ سپہر شکوہ (پسر دارا شکوہ) نے اورنگ زیب پر زبردست حملہ کیا اور اس کی فوج میں افراتفری پھیل گئی مگر عین اس وقت عالمگیری توپ خانہ سے زبردست گولہ باری شروع ہوئی اور اس کی فوج اس دلیری سے لڑی کہ دارا کے فوجیوں کی ہمت ٹوٹ گئی اور سپہر شکوہ کو میدان چھوڑنا پڑا۔

دارا شکوہ کو جب سپہر شکوہ کی شکست کی خبر ملی تو فوراً اپنی فوج کے ساتھ اورنگ زیب کے مقابل آ گیا۔ لیکن اورنگ زیب کے توپ خانے نے ایسے زبردست گولے برسائے کہ دارا شکوہ مقابلہ میں ٹھہر نہ سکا اور خود اپنا رُخ مراد بخش کی فوج کی طرف موڑ دیا۔ دونوں طرف سے تیر برسنے لگے اور ایک قیامت سی برپا ہونے لگی۔ اور ہیتوں کے قدم اکھڑ گئے۔ قریب تھا کہ مراد کے ہاتھی کا منہ پھر جائے، اسی موقعہ پر راجہ رام سنگھ جس کی بہادری کی راجپوتوں میں بڑی شہرت تھی۔ سر پہ مرواریہ کا بیش قیمت عمامہ باندھے زعفرانی لباس پہنے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ دلیری کی ڈینگ مارتا مراد بخش کی سواری کے قریب پہنچا اور گستاخی اور بے باکی کے ساتھ کہا۔ "تو دارا شکوہ کے مقابلے میں بادشاہی کی ہوس کر رہا ہے"۔ یہ کہہ کر ایک برچھی مراد کی طرف پھینکی اور مہابت کو ڈپٹ کر کہا کہ ہاتھی کو بٹھا۔ مراد نے اس حملہ کو روک لیا اور پھر ایسا تیر مارا کہ وہ گھوڑے پر الٹ گیا اور اس کے ہمراہ جو راجپوت تھے ان میں سے بیشتر مراد کے ہاتھی کے پاؤں کے نیچے کچلے گئے اور زمین خون سے سرخ ہو گئی۔ اسی اثناء میں راجپوت بُری طرح مردانہ وار ایک ہجوم کر کے اورنگ زیب کی طرف بڑھے۔ راجہ روپ راٹھور جوشِ شجاعت میں گھوڑے سے پیادہ ہو گیا اور ہتھیلی پہ جان رکھ کر برہنہ تلوار لہراتے ہوئے قلبِ لشکر کی صفوں کو چیرتا ہوا اورنگ زیب کی سواری کے ہاتھی تک پہنچ گیا اور عماری کی رسیوں کو کاٹنے کے لیے وار کیا۔ لیکن اورنگ زیب کے سپاہیوں نے

اس کے حملہ کو ناکام کیا۔ اور اسے پارہ پارہ کر دیا۔

دارا کے راجپوت سپاہیوں نے جس جرأت اور دلیری سے مقابلہ کیا وہ میدانِ جنگ میں ان کارناموں سے ظاہر ہے۔ لیکن اورنگ زیب کے لشکریوں نے بھی بڑی بہادری اور ہوشمندی سے مقابلہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دارا کے نامور جرنیل رستم خاں۔ راجہ ستر سال۔ دارا شکوہ کا دیوان وزیر خاں۔ ناہر خاں۔ دلیر کا بھائی یوسف خاں موت کے گھاٹ اتر گئے اور رام سنگھ۔ بھیم سنگھ اور راجہ شیورام سخت زخمی ہوئے۔ دارا شکوہ نے جب اپنے ان بڑے سرداروں کو مقتول اور زخمی دیکھا تو سراسیمہ ہو گیا اس کے حواس اڑ گئے اور ہاتھ پیر پھول گئے اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ اسی اثناء میں اس کے ہاتھی کی عماری پر ایک آتش فشان بان آکر لگا اور وہ گھبرا کر ہاتھی سے نیچے اتر گیا اور ایسا گھبرایا اور بدحواس ہوا کہ جوتا تک پہننے کا ہوش نہ رہا۔ ننگے پاؤں بلا کسی ہتھیار کے دوڑ کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس کے اس بے موقع اضطراب اور سواری کی تبدیلی کو جب لوگوں نے دیکھا تو سب کا جی چھوٹ گیا اور سب فرار کی سوچنے لگے۔ اس وقت دارا شکوہ کا ایک مصاحب اس کی کمر پر ترکش کو باندھ رہا تھا۔ ایک گولہ اڑتا ہوا آیا جس کی ضرب سے اس مصاحب کا سیدھا ہاتھ صاف اڑ گیا اور اس نے اسی وقت جان دے دی۔ بس پھر کیا تھا۔ اطراف میں جو ہوا خواہ تھے سراسیمگی کے عالم میں ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس بھگدڑ کو دیکھ کر دارا شکوہ کے رہے سہے حواس بھی جاتے رہے اور اس نے سلطنت کے مقابلہ میں جان کی حفاظت کو ضروری جانا۔ سپہر شکوہ نے بھی باپ کی تقلید کی اور دونوں باپ بیٹے گنتی کے چند ساتھیوں کے ہمراہ اکبر آباد کی طرف فرار ہو گئے۔[1]

اس کامیابی سے اورنگ زیب کی فوج میں فتح کے شادیانے بجنے لگے۔ مبارکباد کے

---

[1] خافی خاں حصہ سوم صہ ۳۵-۷

نعرے بلند ہوئے۔ اورنگ زیب اور اس کے حامیوں نے اس کو نصر من اللہ و فتح قریب سے تعبیر کیا۔ کہ ماہ رجب کی ۲۲ کو دھرمادت کے میدان میں جسونت سنگھ کو اور ایک ماہ سے بھی کم وقفہ میں ماہ رمضان کے پہلے ہی ہفتہ عشرۂ رحمت میں دارا شکوہ کو سموگڑھ کے میدان میں شکست ہوئی اور وہ فرار ہونے پر مجبور ہوا۔

قریں شد بہم ایں دو فتح غریب   کہ نصر من اللہ و فتح قریب

اورنگ زیب اس کامیابی کو اپنی شجاعت اور اپنے ساز و سامان کی برتری پر محمول نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اپنی اس ساری کامیابی اور سرخروئی کو اللہ تعالیٰ کی اعانت سمجھتا ہے اس لیے وہ ہاتھی سے نیچے اترتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں دو رکعت نمازِ شکرانہ پڑھتا ہے۔ اس کے بعد دارا شکوہ کے خیمہ کی طرف جاتا ہے اور اسی میں قیام کرتا ہے اور امراء کے نذرانے وتحسین و آفریں قبول کرتا ہے[1] مآثرِ عالمگیری کے مؤلف کے بیان کے مطابق حریف کے سردارانِ لشکر اور افسرانِ فوج جس کثرت سے اس جنگ میں کام آئے اس کی نظیر دنیا کی کسی جنگ میں نہیں ملتی[2]

اورنگ زیب سموگڑھ کی کامیابی کے بعد پدرِ بزرگوار کو ایک تفصیلی خط لکھتا ہے اور اپنی آمد، مہاراجہ جسونت سنگھ کی گوشمالی اور دارا شکوہ سے شدید جنگ اور ہزیمت اور اس کے فرار ہونے کا تذکرہ کرتا ہے اور جو کچھ اس نے کیا ہے وہ کہتا ہے کہ وہ مدافعت کے لیے مجبور ہو گیا تھا۔

۱۰ رمضان المبارک کو سموگڈھ سے کوچ کیا اور اکبر آباد کے قریب چھاؤنی قائم کی۔ اسی اثنا میں شاہ جہاں کی طرف سے تسلی آمیز خط آیا دوسرے دن بڑی بہن نواب قدسیہ بادشاہ بیگم (جہاں آرا بیگم) شاہ جہاں کے اشارہ سے بھائی سے ملنے آئی۔ اس نے بھائی کو محبت کے ساتھ بطورِ نصیحت چند ملائم اور ناملائم باتیں کہیں۔

---

[1] خافی خاں حصہ سوم ص ۲۹ تا ۴۷

[2] مآثرِ عالمگیری ص ۵۔

عالمگیر کا لقب:

جہاں آرا بیگم شاہ جہاں کے اشارے سے بھائی (اورنگ زیب) کے پاس آتی ہیں۔ اور اسے چند ملائم اور ناملائم باتیں سناتی ہیں اور اورنگ زیب سے خلافِ مرضی جواب پا کر واپس چلی جاتی ہیں۔ اورنگ زیب نے بھی اپنے زخم اور گھاؤ دکھائے ہوں گے کہ کس طرح اس کا عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا تھا اور یہ زخم ہرے ہی تھے۔ داراشکوہ کی شکایت کی ہوگی کہ کس طرح عین محاصرۂ بیجاپور میں شاہی فوج واپس بلالی جاتی ہے اور بیجاپور مہم نامکمل رہ جاتی ہے، دارالخلافہ کی خبریں بند کر دی جاتی ہیں۔ کس طرح دکن کے راستوں کی ناکہ بندی کر دی۔ قاصدوں اور مسافروں کی آمد و رفت بند کر دی اور اس کے وکیل کو نظر بند کر دیا اور گھر کا سامان لوٹ لیا۔ مہاراجہ جسونت سنگھ نے کوئی مصالحانہ پیش کش قبول نہیں کی۔ جنگ ٹھونس دی اور آخر میں سموگڈھ میں دارا نے جو کچھ کیا اس کی مدافعت کا ذکر اورنگ زیب نے کیا ہوگا اور جہاں آرا بیگم کو یہ باتیں ناگوار گذری ہوں گی۔ کیونکہ یہ باتیں ان کے خونی اور روحانی بھائی (داراشکوہ) کے خلاف تھیں جو ان کا چھوٹا خونی بھائی کہہ رہا تھا۔ پیری رشتہ (پیر سے منسلک رشتہ) ایسا رشتہ ہے جہاں سمجھ، شعور کو دخل نہیں ہوتا وہاں اندھی عقیدت ہوتی ہے جو عقل و شعور سے بالاتر ہوتی ہے۔ اس لیے اورنگ زیب کی باتیں خلافِ مرضی پا کر واپس چلی جاتی ہیں۔ لیکن ان کی واپسی کے بعد شاہ جہاں کی طرف سے ایک اور شفقت آمیز نامہ آتا ہے۔ جس میں ضروری نصیحتیں درج ہوتی ہیں۔ خط کے ساتھ ایک بڑی قیمتی تلوار جس کا نام "عالمگیر" تھا شاہ جہاں نے بھیجی۔ کہتے ہیں کہ تیموری خاندان میں اس سے اچھی تلوار نہیں دیکھی گئی تھی۔ شاہ جہاں ایک خاص معتمد کے ذریعہ زبانی پیغامات بھی کہلواتے تھے۔ اورنگ زیب نے ان سب باتوں کو قبول کیا۔ لوگوں نے "عالمگیر" نامی تلوار کو اچھا شگون قرار دیا اور اس مژدۂ غیبی کی رعایت سے اورنگ زیب نے "عالمگیر" کا لقب اختیار کیا اب وہ "عالمگیر" کے لقب سے مشہور ہوا جو اس کے باپ نے سموگڑھ کی جنگ کی کامیابی کے

بعد دیا تھا[1]

اورنگ زیب سے جب بادشاہ بیگم (جہاں آرا بیگم) مرضی کے خلاف جواب پا کر بادشاہ (شاہ جہاں) کے پاس جاتی ہے تو شاہ جہاں اس کے بعد اورنگ زیب کو عالمگیر خاں نامی تلوار پیش کرتا ہے جس کو اورنگ زیب قبول کرتا ہے یہ سب واقعات ۱۰ رمضان المبارک کے بعد کے ہیں، عالمگیری تلوار محض تالیفِ قلب کے لیے معلوم ہوتی ہے اس کے بعد اندرونی طور پر کچھ حالات ایسے بدلتے ہیں کہ اورنگ زیب کو اپنے باپ شاہ جہاں کو نظر بند یا قید کرنا پڑتا ہے اور یہ بات اورنگ زیب کے خلاف ایک الزام کی حیثیت سے پیش کی جاتی ہے۔

شاہجہاں کی قید اور اسلام:

شریعتِ اسلام کے مخالفین اور الحاد کے علمبردار براہ راست تو اسلام پر حملہ نہیں کر سکتے اس لئے نہایت جذباتی انداز سے اسلام کے بہت ہی ہمدرد اور علمبردار بن کر اورنگ زیب پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ دیکھئے یہ کیسا گستاخ، بے ادب نافرمان تھا کہ اس نے اپنے بوڑھے باپ شاہ جہاں کو ۶۸ سال کی عمر میں تخت سے محروم کر کے قید کر دیا۔ اور بوڑھا باپ آٹھ سال تک یعنی اپنی وفات تک قید رہا۔ لیکن یہ بہت ہی سطحی نقطہ نظر ہے۔ تاریخی واقعہ کو تاریخ سے غیر جذباتی انداز سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جہاں کی بیماری ۷، ذی الحجہ ۱۰۶۷ھ سے دارا شکوہ قانونی طور (DE - JURE) نہیں بلکہ عملی طور (DE-FACTO) پر دربارِ حکومت پر قابض ہو گیا تھا اور اس وقت سے لے کر ۱۰ رمضان المبارک ۱۰۶۸ھ کے تاریخی واقعات کا ہم گذشتہ صفحات میں تذکرہ کر چکے ہیں۔ سموگڑھ میں دارا شکوہ کو شکست ہوئی اور باپ سے ملے بغیر راہِ فرار اختیار کی، دارا شکوہ شاہ جہاں کی زندگی میں دستوری و آئینی خلاف ورزی مستقل کرتا رہا۔

---

[1] خافی خاں حصہ سوم ص ۴۸۔

وہ شاہ جہاں کی ہدایت اور مشورے کی پرواہ نہیں کرتا اس سے اس کے دو بھائی شجاع اور دارا تو باقاعدہ خود مختاری کا اعلان کر دیتے ہیں اور اپنے نام کا خطبہ وسکہ بھی جاری کرتے ہیں۔ لیکن اورنگ زیب شروع سے آخر تک شاہ جہاں کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ سموگڑھ کی جنگ کے بعد تمام واقعات شاہ جہاں کو لکھتا ہے اور کہتا ہے کہ جو کچھ اس نے کیا ہے مدافعت کے لیے کیا ہے اس کو شاہ جہاں تسلیم کرتا ہے اور ۱۰ رمضان المبارک کو "عالمگیر" نام تلوار پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد باپ بیٹے میں خط و کتابت اور ملاقات کی کوشش ہوتی ہے۔ لیکن ناکام رہتی ہے۔ سموگڑھ کی جنگ کے بعد داراشکوہ کی دستوری و آئینی پوزیشن سب سے کمزور تھی۔ کیونکہ شاہ جہاں زندہ اور صحت یاب ہو چکا تھا۔ لیکن داراشکوہ اسے عضوِ معطّل بنا چکا تھا مگر شاہ جہاں اس سے نجات پانے کے لیے جدوجہد نہیں کرتا۔ اس کے دو بیٹے شجاع اور مراد خود مختاری کا اعلان کر چکے تھے۔ اس کے برخلاف اورنگ زیب نے اب تک جو کچھ کیا وہ صرف اپنی مدافعت کے لیے کیا اس نے اپنی اہلیت، صلاحیت، ذہانت، فراست، تدبّر۔ جرأت، عزیمت اور اسلام کے معاملہ میں اپنے قول اور عمل دونوں سے اخلاص کا ثبوت پیش کیا خود شاہ جہاں "عالمگیر" نام کی تلوار پیش کر کے اس کی تصدیق کر دیتا ہے لیکن شریعتِ نبوی کے خلاف ۱۰ رمضان المبارک سے سازش کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جس میں شاہ جہاں آلہ کار بنتا ہے۔ صحیح العقیدہ مسلمانوں نے شریعتِ اسلام کے خلاف سازش کو تو روزِ اوّل ہی سمجھ لیا تھا۔ جب مسلمانوں نے ملّا شاہ بدخشی کے نظریات اور افکار کے بارے میں شاہ جہاں سے شکایت کی تھی اور شاہ جہاں نے بھی اس کو تسلیم کیا۔ لیکن داراشکوہ کی مداخلت سے باز پرس نہیں کی تھی (تفصیل کے لیے دیکھئے نمبر شمارہ ۱۴۶ ملّا شاہ بدخشی سے شاہ جہاں کی ملاقات) اب تک داراشکوہ نے جو کچھ کیا اور شاہ جہاں خاموش رہا سب کو معلوم تھا۔ اب شاہ جہاں کو آزاد چھوڑنا شریعتِ اسلام کے خلاف سازش کی اجازت دینا تھا۔ اسی اثناء میں (یعنی ۱۰ رمضان المبارک

۱۰۶۸ھ تا ۱۷ رمضان المبارک ۱۰۶۸ھ) سیاست نے ایسا رخ اختیار کیا۔ کہ اورنگ زیب عالمگیر کو یقین ہو گیا کہ شاہ جہاں کا میلانِ طبع اب بھی دارا شکوہ کی طرف ہے تو اس نے باپ سے ملاقات کا ارادہ فسخ کر دیا اور اپنے بیٹے شاہزادہ معظم کو مامور کیا کہ وہ قلعہ میں بادشاہ شاہ جہاں کی خدمت میں جائے اور معذرت آمیز پیغام پہنچائے اور نذرانہ پیش کرے اور پھر نظر بندی کی اطلاع دے دے اور بادشاہ کے پاس لوگوں کی آمد و رفت کو بالکل مسدود کر دے۔ چنانچہ محمد سلطان نے یہ فریضہ ۱۷ رمضان المبارک ۱۰۶۸ھ کو انجام دیا[1]

اورنگ زیب نے شاہ جہاں کی نظر بندی کا کام اس حسن خوبی، سیاسی فراست اور دانش مندی سے انجام دیا — جس کی مثال نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اس نے بندگانِ خدا کو خون ریزی سے بچایا۔ امن و آشتی سے شاہ جہاں کو قید کر کے فتنہ و فساد کی اصل جڑ کی طرف متوجہ ہوا۔ اورنگ زیب کا یہ کام ایسا قابل قدر ہے کہ اس پہ تحسین و آفرین پیش کرنے کو طبیعت چاہتی ہے خود اس کے باپ شاہ جہاں نے جہانگیر کی نافرمانی کی تھی اور "بے دولت" کا خطاب پایا تھا اور اس کے دادا جہانگیر نے اپنے باپ اکبر کے خلاف بغاوت کی تھی اور اس کے محبوب مورخ ابوالفضل کو مروایا تھا۔ لیکن اورنگ زیب بغاوت نہیں کرتا بلکہ دارا نے جب اقتدار غصب کر لیا تھا تو اس کے خلاف مدافعت کی اور شاہجہان سے "عالمگیر" نامی تلوار انعام میں پائی۔ لیکن اس کے بعد جب بھی صورت حال کو بگڑتے دیکھا اور اسلام کے لیے شاہ جہاں کی نظر بندی لازمی سمجھی تو بھی ادب و شائستگی و شرافت سے نظر بندی کے لیے اطلاع دی۔

[1] خافی خاں حصہ سوم ص ۴۸ تا ۵۰۔

نوٹ:- ۱۷ رمضان کی تاریخ اسلام میں "حق اور باطل" کی تاریخ میں بہت اہم ہے اسی تاریخ کو جنگِ بدر ہوئی۔ باطل نے حق کو دبانے کی کوشش کی لیکن حق کو کامیابی ہوئی اور پھر کامیابی ہوتی چلی گئی یہی حال اورنگ زیب کے ساتھ ہوا۔ شاہ جہاں کی مدد اور تعاون سے دارا شکوہ ظلم کرتا رہا آخر کار دارا شکوہ ناکام ہوا اور ۱۷ رمضان المبارک کو شاہ جہاں قید ہوا اور آزادی سے محروم ہوا۔

داراشکوہ کا تعاقب اور مراد بخش کی گرفتاری :

۱۷ رمضان المبارک ۱۰۶۸ھ کو شاہ جہاں کی نظر بندی کے بعد عالمگیر کی آئینی اور دستوری پوزیشن کچھ بہتر ہو جاتی ہے۔ شاہ جہاں کی کمزوری یا چشم پوشی یا نیم رضامندی یا کچھ اور رہو اس سے ۷، ذی الحجہ ۱۰۶۷ھ سے لے کر ۱۲ رمضان المبارک ۱۰۶۸ھ تک حالات دگرگوں ہوتے رہے۔ شاہ جہاں اب بھی زندہ تھا اور آئینی حکمران (DE-JHRE) تھا۔ لیکن اس سے اصلاح کی توقع نظر نہیں آتی تھی ان دگرگوں حالات کی اصلاح کیلئے اورنگ زیب ۱۷ رمضان المبارک کو شاہ جہاں کو نظر بند اور اس کے بعد کچھ انتظامی اقدامات کرتا ہے اور رمضان کی آخری تاریخ کو بہادر خاں کو داراشکوہ کے تعاقب کے لیے روانہ کرتا ہے۔ داراشکوہ فتنہ وفساد کی اصل جڑ تھا۔ اسے سموگڑھ میں شکست ہوتی ہے وہ وہاں سے فرار ہو کر آگرے آتا ہے اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ لاہور روانہ ہوتا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے کچھ اور واقعات قابلِ ذکر ہیں۔

مراد بخش اور اورنگ زیب میں تعلقات بہت اچھے تھے اس نے بڑی دلیری سے سموگڑھ میں جنگ کی تھی اور اس میں زخمی ہوا تھا اورنگ زیب نے اس کا علاج کرایا اور اس کا سر بھی شفقت سے زانو پر رکھا۔

۱۲ رمضان المبارک کو مراد بخش کو ۳۶ لاکھ روپے اور دو سو تیس[۲۳۰] قیمتی گھوڑے تحفے کے طور پر دیئے[۱]۔ لیکن اورنگ زیب کے خلاف سازشوں کا ایک نیا دروازہ کھلا اس میں مراد بخش کو بھی آلہ کار بنانے کی کوشش شروع ہوئی۔ اورنگ زیب کے خلاف بدگمان کرنے کے لیے کچھ لوگوں نے اُسے باور کرانے کی کوشش شروع کی۔ کہ دو بادشاہ ایک اقلیم میں نہیں رہ سکتے" اور اس بات کو تقویت دینے کے لیے

---

[۱] خافی خاں سوم ص ۲۶، ۳۱، ۴۶-۵۰، ۵۵-

اور بہت سی باتیں کہتے پھر سفید داڑھی والے ایک معمر شخص نے عرض کیا میرے خواب بڑے سچے ہوتے ہیں اور ان کی تعبیر ہمیشہ درست ہوتی ہے۔ میں نے عالم رویا میں بارہا جو کچھ مشاہدہ کیا ہے وہ عہد و پیمان پر ندامت و شرمندگی اٹھانے کی طرف دلالت کرتا ہے، مراد بخش ایک سادہ لوح، عجلت پسند، سریع الغضب، شخص تھا۔ جیسا کہ اس نے گجرات میں اپنے سکّہ اور خطبہ جاری کرنے۔ قلعہ سورت کی فصیلوں کو اڑانے اور تاجروں کو لوٹنے کے سلسلہ میں کیا تھا اور اپنے دیوان اور مشیر علی نقی کو جو دیانت دار اور منتظم آدمی تھا ، ذرا سے قصور پر بغیر تحقیق کے قتل کر دیا تھا۔ اس سے اورنگ زیب کو خطرہ ہوا کہ کہیں وہ مفسدوں اور شر پسندوں کا آلہ کار نہ بن جائے اور فتنہ و فساد کا باعث نہ بنے اس لیے ۴ شوال ۱۰۶۸ھ کو اسے بھی حسنِ تدبیر سے گرفتار کر لیا اور اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی اس طرح اورنگ زیب سازش کے آلہ کار بننے والوں کے خطرہ سے محفوظ ہو گیا اب اس کی ساری توجّہ داراشکوہ کے تعاقب اور شجاع کی طرف منعطف ہوتی ہے۔

عالمگیر کی تخت نشینی اور شریعت کی حاکمیّت کا اعلان :

پہلی ذی قعدہ ۱۰۶۸ھ یوم جمعہ کے بعد "اورنگ زیب عالمگیر" کا جشنِ تخت نشینی منعقد ہوتا ہے۔ اس موقع پر خطبہ و سکّہ کا اجراء نہیں ہوتا۔ صرف خوشی کے شادیانے بجائے جاتے ہیں اور مبارکباد دی جاتی ہے۔ سلاطین اور امرائے نامدار نذرانے گزارتے ہیں۔ سیّد عبدالرشید (ٹھٹوی) تخت نشینی کی تاریخ قرآن پاک کی آیت اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم سے نکالتے ہیں اس کو عالمگیر نے بہت پسند کیا۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی کو شریعت کے علمبردار افراد شریعت کی حاکمیّت قرار دیتے ہیں[۲] اورنگ زیب عالمگیر حکمران تھا۔ لیکن وہ قرآن پاک

[۱] خافی خان حصہ سوم ص ۵۰ تا ۵۵۔

[۲] مآثر عالمگیری ص ۶ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن

اور سنّت رسول کے تابع تھا اس نے شریعتِ نبوی ہی کی روشنی میں حکومت کا نظم و نسق چلایا۔ یہ ایک بے مثل اور بے نظیر تاریخ ہے۔ کلام پاک کی ایک آیت جو دنیا کے فلسفۂ سیاست میں قرآنی فلسفۂ سیاست کی ایک برتر اور اعلیٰ تصویر پیش کرتی ہے جس کی رو سے اللہ اور رسول اللہ اور اس حاکم کی جو اللہ اور رسول کی اطاعت کے تابع ہو اس کی اطاعت لازمی ہے۔ اس طرح کسی فردِ مطلق العنان کی اطاعت کی اجازت نہیں۔ آمریت کی گنجائش نہیں۔ عوام کی حاکمیت کی اجازت نہیں "عقل، فلسفہ، مصلحتِ ملکی اور "مفاد" کی اطاعت اور محکومیت کی گنجائش نہیں۔ اطاعت ہے تو صرف اس فرد کی جو اللہ اور رسول کی اطاعت کے ساتھ حکومت کرے۔ اورنگ زیب نے جس فلسفہ و سیاست پر اپنی حکومت قائم کی اس میں شریعت کو فوقیت اور برتری حاصل ہوئی اور وہ خود شریعت کے تابع اور محکوم رہا۔ ایک دوسرے شاعر نے اس موقع پر تاریخی شعر کہے۔

محی الدّین و مصطفیٰ حافظِ تو ۔۔۔ صاحب سیفی و مرتضیٰؓ حافظِ تو

تو حافظِ شرع و حافظِ تو شارع ۔۔۔ تو حافظِ قرآن و خدا حافظ تو

ترجمہ:۔ دین کا زندہ کرنے والا اور مصطفیٰ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) تیری حفاظت کرے۔ تو صاحب سیف ہے اور مرتضیٰ تیری حفاظت کرنے والے۔

تو شرع کی حفاظت کرنے والا۔ اور شارع تیری حفاظت کرنے والے تو قرآن کا حافظ اور خدا تیرا حافظ۔

ل جمعہ کے دن کو اسلامی نقطہ نگاہ سے "سید الایام" کہتے ہیں اور جمعہ کی نماز کو بہت ہی اہمیت دی گئی اور کلام پاک میں سورہ جمعہ" ایک سورۃ ہے جس سے اس کی فضیلت اور تقدیس ظاہر ہوتی ہے۔

نوٹ:۔ دنیا میں اصل دو ہی قسم کے نظامِ حکومت ہیں ایک تو وہ جس میں شریعت حاکم ہوتی ہے جس کی شیخ احمد سرہندی (۱۵۶۴ء-۱۶۲۴ء) اتباعِ سنّتِ نبوی۔ ترویج شریعت (باقی برصفحہ آئندہ)

اس قطعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر سے مسلمانوں کو قرآن کی برتری اور شریعتِ نبوی کی سربلندی اور نفاذ کی کس قدر توقع تھی اورنگ زیب کی اب آئینی اور دستوری پوزیشن مضبوط ہو جاتی ہے۔

داراشکوہ اور شجاع کا تعاقب:

اورنگ زیب ایک طرف تو داراشکوہ کے تعاقب میں لاہور سے ملتان۔ بھکر تک اُسکا پیچھا کر رہا ہے اسی زمانے میں یہ اطلاع ملی کہ محمد شجاع بنگال سے ایک بڑی فوج لے کر مشرقی ہند کی طرف بڑھ رہا ہے اس نے شجاع کی سرکوبی ضروری سمجھتے ہوئے دارا کا تعاقب چھوڑ کر ۱۲ محرم ۱۰۶۹ھ کو دارالخلافہ کی طرف واپسی کا حکم دیا اور کوچ بہ کوچ لاہور پہنچا اور قلعۂ لاہور میں داخل ہوا اور آخری محرم میں لاہور سے روانہ ہوا اور صرف چند دنوں میں یعنی ۴ ربیع الاول کو قلعہ شاہ جہاں آباد میں داخل ہوا۔ یہاں اطلاع ملی۔ کہ شجاع بنارس پہنچ گیا ہے۔ یہاں کا قلعہ دار داراشکوہ کا آدمی رام داس تھا اس نے دارا کے اشارے پر قلعہ کو شجاع کے آدمیوں کے سپرد کر دیا۔ اسی طرح چنیا پور اور الہ آباد

(سابقہ نوٹ) نفاذِ شریعت۔ استیلاءِ اسلام اور انہدامِ کفر کے نام سے اپنے مکتوب میں ایک ذہنی اور فکری انقلاب لاتے ہیں اور ان کے انتقال کے ۴۳ سال کے بعد " عالمگیر " اسی فکر پر اپنی حکومت کی بنیاد رکھتا ہے۔ دوسرے اکبر نے اپنی حکومت مصلحت، مفاد۔ تجربہ۔ عقل اور فلسفہ پر چلانے کی کوشش کی ، اسے ہندوؤں۔ عیسائیوں۔ مجوسیوں کی حمایت حاصل رہی لیکن مسلمان مطمئن نہیں رہے اور اس فکر کے خلاف جدوجہد کرتے رہے اور آخر کار عالمگیر کے زمانے میں کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

(نوٹ صفحہ ہذا) شجاع کے خلاف پہلے داراشکوہ اپنے لڑکے سلیمان شکوہ کو روانہ کرتا ہے اور وہ شجاع کو شکست بھی دیتا ہے۔ لیکن جب اورنگ زیب داراشکوہ کو سموگڑھ میں شکست دیتا ہے اور یکم ذی قعدہ ۱۰۶۸ھ کو شریعت کی حاکمیت کا اعلان کرتا ہے (باقی بر صفحہ آئندہ)

کے قلعہ دار بھی شجاع سے مل گئے اور قلعہ اس کے حوالہ کر دیا اور ۷، ربیع الاول کو شجاع بنارس پہنچتا ہے اور بنارس میں صرافوں سے قرض کے نام پر زبردستی تین لاکھ روپیہ وصول کرتا ہے اور بنارس سے مقابلہ کے لیے نکلتا ہے اور جون پور کا حاکم شجاع سے مل جاتا ہے۔ عالمگیر نے راستہ میں سید بدیع الدین عرف شاہ مدار کے مزار کی زیارت کی اور درگاہ کے لیے دس ہزار روپیہ کا نذرانہ دیا اور وہاں سے کوچ کیا اور کھجوہ (موجودہ الہ آباد کے قریب ایک مقام) کے قریب منزل کی اور فوج بندی کا حکم دیا۔ بڑے بڑے نامور جنرل اور راجے میدانِ جنگ میں اورنگ زیب کے ساتھ تھے اس میں راجہ جسونت سنگھ دوسرے راجاؤں کے ساتھ میمنہ پر تھا دائیں بائیں بہادر خاں۔ داؤد خاں راجہ سبھا سنگھ اور کنور رام سنگھ اور دوسرے بہادر سردار امراء متعین تھے۔ شجاع نے بھی اپنی فوج کی صف بندی کی اس کے ساتھ تجربہ کار اور ہیبت سے بہادر امیر بھی تھے۔ ۱۷، ربیع الثانی ۱۰۶۹ھ کو عالمگیر بادشاہ حملہ کے ارادے سے نکلا تو بڑی تمکنت اور وقار کے ساتھ ہاتھی پر سوار ہوا اور نہایت اطمینان و آہستگی سے کوچ عمل میں آیا تاکہ فوج کی تنظیم و ترتیب برقرار رہے۔ سہ پہر کو دشمن کی فوج سے نصف کوس کے فاصلہ پر پڑاؤ ڈال دیا۔ شجاع کی فوج پر بادشاہی لشکر کا ایسا رعب پڑا کہ اس نے پہل کرنے اور حملہ کرنے کی جرأت نہیں کی اس دن دونوں طرف سے بس گولہ باری

(نوٹ صفحہ سابق) تو دارا شکوہ، شجاع کی اورنگ زیب کے خلاف حمایت کرتا ہے اسی پالیسی کے تحت دارا شکوہ کے قلعہ دار بنارس، چنیا پور، الہ آباد اور جون پور کے حاکم شجاع سے مل جاتے ہیں اور اورنگ زیب عالمگیر سے جنگ کرتے ہیں۔

۵؎ جسونت سنگھ نے دھرمادت کی جنگ میں شکست کے بعد اپنے وطن جودھپور جا کر دم لیا۔ یہاں اس کی بزدلی پر بہت لعن طعن ہوئی اس کی بیوی نے اس کا بستر چھوڑ دیا وہ اس صورت حال سے پریشان تھا۔ تنگ آکر وطن سے نکل پڑا اور جرائم کی معافی کیلیے ایک عریضہ بادشاہ کے پاس بھجوایا اور خدمت شاہی میں حاضر ہو گیا عالمگیر نے معافی منظور کی اور اس کا منصب بحال کر دیا۔ البتہ سواروں کی تعداد کم کر دی یہ اورنگ زیب کا اپنے دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک تھا۔ خافی خاں سوم ص ۶۱ - ۶۲۔

رہی دونوں طرف سے کوئی حملہ نہیں کیا گیا۔ وہ رات دونوں لشکروں نے بڑی احتیاط کے ساتھ بسر کی۔ شجاع کی فوجیں بالکل عالمگیر کے لشکر کے سامنے تھیں۔ رات بھر اس نے لشکر کی نگہداشت اور نگرانی میں بسر کی اور اورنگ زیب عالمگیر نے یہ وقت اپنے چھوٹے سے خیمہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اوراد و وظائف میں گزارا اور اللہ تعالیٰ سے فتح وظفر کی دعائیں کرتے رہے۔

عالمگیر کی اسلامی حکومت کے خلاف مہاراجہ جسونت سنگھ کی سازش اور غداری

مہاراجہ جسونت سنگھ دھرمادت کی جنگ میں داراشکوہ کی طرف سے اورنگ زیب کے خلاف لڑ چکا تھا۔ لیکن شکست کھائی اور اس کے بعد فرار ہو چکا تھا۔ اس بزدلی پر اسے راجپوت لعن طعن کرتے اور اس کی بڑی بیوی شوہر کو برا بھلا کہتی اور اس کا بستر بھی چھوڑ دیا۔ اس سے جسونت سنگھ تنگ آگیا اور وطن چھوڑ کر نکلا۔ اس نے اورنگ زیب سے اپنے جرائم کی معافی کے لیے ایک عریضہ بھجوایا اور اس کے حضور حاضر ہو گیا اور نگ زیب کی یہ اعلیٰ ظرفی اور وسیع القلبی تھی کہ اس نے جسونت سنگھ کی خطاؤں کو معاف کر دیا اور اس کے اعزاز و منصب کو بحال کر دیا صرف سواروں کی تعداد کم کر دی۔ اب یہ جسونت سنگھ کا کام تھا کہ وہ اپنی وفاداری کا ثبوت دے اورنگ زیب نے جسونت سنگھ کے ساتھ کوئی تادیبی یا انتقامی کارروائی نہیں کی بلکہ جسونت سنگھ پر پورا اعتماد کیا۔ عالمگیر نے شجاع کی جنگ میں راجہ جسونت سنگھ کو دوسرے راجاؤں کے ساتھ میمنہ پر متعین کیا لیکن اس کے دل میں نفاق بھرا ہوا تھا وہ اورنگ زیب عالمگیر کی اسلامی حکومت کے برعکس داراشکوہ کے طرز حکومت کا حامی تھا۔ جس کی بنیاد منافقت پر تھی۔ وہ مصلحت اور حکمت کے طور پر اورنگ زیب کے پاس جرم کی معافی مانگ کر حاضر ہوا۔ لیکن اس کے دل و دماغ میں اسلام کے

لہ خافی خاں حصہ سوم ص ۶۷۔

خلاف بغض بھرا ہوا تھا اس نے دیکھا کہ یہ موقع ہے کہ اورنگ زیب کے لشکر کو تباہ کر دیا جائے۔ اس سے ایک طرف تو اورنگ زیب کی فوج تباہ ہو گی جس سے شجاع اور دارا کو قوت ملے گی اور عالمگیر کی اسلامی حکومت جڑ پکڑنے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گی۔ اس نے جب چار پانچ گھڑی رات رہ گئی تو جسونت سنگھ نے دوسرے راجپوت سرداروں کے ساتھ شب خون مارا۔ اس میں اسے رام سنگھ راٹھور، مہداس (مہیش داس) اور بہت سے راجپوت سرداروں کی حمایت حاصل تھی جو وفاداری کے بہانہ جمع ہو گئے تھے۔ راجپوتوں نے اپنے پروگرام کے مطابق عالمگیر کی فوج میں لوٹ مار شروع کر دی۔ جس نے بھی مزاحمت کی، راجپوتوں نے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان راجپوتوں کی دست برد سے لشکر کا کوئی بھی چھوٹا بڑا خیمہ نہیں بچ سکا۔ تمام خزانہ اور توشک خانہ کو بُری طرح لوٹ لیا۔ اکثر آدمیوں کے مال و ناموس کو پامال کر دیا ان کی دست درازیاں خود عالمگیر کے خزانۂ خاص اور کارخانوں تک پہنچ چکی تھیں اور وہ شاہی اصطبل کے جانوروں تک کو لوٹنے پر آ گئے تھے۔ خیمہ شاہی کے اطراف و اکناف میں کوئی خیمہ ان کی لوٹ مار سے محفوظ نہیں رہا تھا۔

اورنگ زیب عالمگیر کے لشکر میں اس اچانک حملہ سے بڑا انتشار اور افراتفری پیدا ہو گئی۔ بہت سے لوگ بے حوصلہ ہو کر حملہ آوروں کے ساتھ ہی لشکر سے نکل گئے۔ کچھ لوگ دشمن کے لشکر میں جا نکلے اور مارے گئے۔ بڑے بڑے نامی امیر اپنے خیموں، مال و اسباب اور اہل و عیال کی خبر لینے کے لیے رکاب شاہی سے نکل بھاگے۔ لیکن اورنگ زیب کے پائے استقلال میں کوئی فرق نہ آیا۔ بربادی، ہنگامہ آرائی۔ لوٹ کھسوٹ کے باوجود اس کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہیں آئی۔ اورنگ زیب عالمگیر کو جب جسونت سنگھ کی اس حرکت کی اطلاع ملی تو وہ عمداً ہاتھی کی سواری چھوڑ کر تختِ رواں پر سوار ہو گیا۔ تاکہ لوگوں پر (بادشاہ) اس کی ثابت قدمی کا اثر ہو اور وہ اپنی جگہ نہ چھوڑیں۔ اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ وہ لوگ جو گھوڑوں پر سوار ہو چکے ہیں۔ ان کو روک لیں۔ کسی کو اپنی جگہ سے حرکت کرنے نہ دیں اور جو

حکم کی خلاف ورزی کرے۔ ذلّت سے اس کی باگ کھینچتے ہوئے سامنے لاکر حاضر کر دیں۔

یہ بہت ہی نازک اور روح فرسا گھڑی تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر کی اسلامی حکومت کی تباہی کیلئے جسونت سنگھ نے وہ بھرپور قدم اٹھایا تھا اس اقدام میں اگر کامیاب ہوجاتا تو تاریخ کا دھارا بدل جاتا۔ ابھی شاہ جہاں زندہ تھا لیکن قلعہ میں نظر بند تھا اور بہتوں کی توقعات کا مرکز تھا۔ دارا شکوہ بھی زندہ تھا۔ اور اورنگ زیب سے قسمت آزمائی کے لیے اپنی قوتوں کو مجتمع کر رہا تھا اور اس کے اشارے پر ہی اس کے قلعہ دار شاہ شجاع کو قلعوں کی کنجیاں حوالے کر رہے تھے تاکہ شاہ شجاع اورنگ زیب کا ڈٹ کر مقابلہ کرے۔ اورنگ زیب کی شکست ریخت پر ملّا شاہ قادری اور ان کے مریدین ضرور دست بدعا رہے ہوں گے تاکہ ان کا مرید دارا شکوہ بادشاہ "ظاہر و باطن" کامیاب ہو ان سب کے لیے جسونت سنگھ اور اس کے حامی راجپوت سرداروں سے بہت توقعات رہی ہوں گی اور کمزور طبیعت کے حامل بعض مسلمان اور اسلام پسند حضرات نے یہ سوچا ہوگا کہ جسونت سنگھ جب چند ماہ قبل جنگِ دھرمادت میں لڑ چکا تھا۔ شکست کھائی تھی اور میدان جنگ سے فرار ہو چکا اور اپنے بیوی کے لعن وطعن کا نشانہ بنا تھا تو اس کو کیوں اورنگ زیب نے معافی دی اور اپنی فوج میں نہ صرف شریک کیا بلکہ اہم پوزیشن پر متعیّن کیا۔ اور اس کی اس حرکت سے مضطرب۔ پریشان اور ہراساں ہوئے ہوں گے۔ لیکن اورنگ زیب قطعی ہراساں نہیں ہوتا۔ اس کو جس وقت یہ اطلاع ملی نماز تہجّد کا وقت تھا اور وہ مصلّٰی پر اللہ کے سامنے سربسجود تھا اور اس نے کہا کہ یہ راجپوت کے شایانِ شان نہیں ہے (ایں شایانِ شانِ راجپوت یاں نیست) منتخب اللباب کے مصنف خانی خاں نظام الملک اس واقعہ پر تبصرہ (جسونت سنگھ کی بغاوت) کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ عالمگیر کا ہی ظرف اور حوصلہ تھا کہ اس قیامت کے ہنگامہ میں وہ سنجیدگی اور وقار کی چٹان بنا ہوا اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس کے رویّہ میں تغیّر اور سراسیمگی کا ذرا سا بھی شائبہ نہیں دکھائی دیا

بلکہ وہ احکامات نافذ کرتے اور تدبیریں کرتے ہوئے نہایت خوش دلی اور بشاشت نظر آرہا تھا۔ کم حوصلہ لوگوں کی طرح نہ تو اس نے بے دماغی کا مظاہرہ کیا اور نہ غیظ و غضب ظاہر کیا۔ نہ اس کی زبان سے کوئی تند و تلخ فقرہ نکلا بلکہ نہایت اطمینان مگر بڑے تحکمانہ انداز میں وہ انتشار کو دور کرنے اور پراگندہ جمعیت کو اکٹھا کرنے میں مصروف رہا۔ اس کی جگہ دوسرا کوئی ہوتا تو نامعلوم بدحواسی میں کیا کچھ کر گزرتا۔[1]

جسونت سنگھ کے اس واقعہ پر اورنگ زیب عالمگیر جس انداز میں تبصرہ کرتا ہے اس سے اعتماد، جرأت اور فراست ظاہر ہوتی ہے اور اس کے الفاظ نہایت ہی قابل قدر اور ہمت افزا ہیں وہ کہتا ہے "اللہ کا شکر ہے اس ذریعہ سے دوست، دشمن اور موافق و ناموافق کی پہچان ہوگئی اور اس کسوٹی پر ہر ایک کا کھرا کھوٹا معلوم ہوگیا اس لیے ہم اس واقعہ کو عطیۂ الٰہی تصوّر کرتے ہیں اور وسیلۂ کامرانی سمجھتے ہیں اور جو کوتاہ اندیش منافق اس واقعہ کو غنیم کا غلبہ تصوّر کرکے اس کے لشکر میں چلے گئے وہ اس کا انجام بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔[2]

یہ محض ایک مفروضہ ہی نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے۔ اسلام کے خلاف بہت سی بے سروپا باتیں کہی جاتی ہیں اور جن لوگوں نے اسلام کو سربلند کرنے کا نام لیا اور اپنے قول و فعل میں مطابقت پیدا کی وہ اپنوں اور غیروں کی مخالفت اور تنقید کا نشانہ بنے۔ خود اورنگ زیب ہندو دشمن مشہور تھا اور آج بھی اس کی شہرت ہندو دشمن ہی کی حیثیت سے ہے۔ لیکن اورنگ زیب ہندو دشمن نہیں تھا۔ بلکہ انصاف، حق و صداقت کا علمبردار تھا۔ جس کا جامع نام اسلام ہے۔

جسونت سنگھ کا واقعہ اسلام، سنّتِ نبوی کے خلاف ایک سازش تھی۔ اورنگ زیب اس کو معاف کرتا ہے اور اعتماد کرتا ہے۔ یہ اس کی اعلیٰ ظرفی تھی لیکن جسونت سنگھ نے

---

[1] خافی خاں حصہ سوم ص ۶۴ تا ۶۷-۶۲-۶۵-۶۷

[2] خافی خاں حصہ سوم ص ۶۹۔

سازش کی۔ بغاوت کی تو یہ اس کا ظرف تھا اور اورنگ زیب کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی کوشش کی۔ لیکن اورنگ زیب نے مومنانہ عزم و جرأت سے حالات کا مقابلہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی مدد کی اور جسونت سنگھ اپنے عزائم میں ناکام رہا۔ اور تاریخ میں اپنے آپ کو بے وفا کہلایا۔ اور اورنگ زیب کو حکومت ملی اور اس نے اسلام کے مطابق حکومت کے نظم و نسق کو چلانے کی کوشش کی۔

عالمگیر اور شجاع کی جنگ اور عالمگیر کا نمازِ شکرانہ ادا کرنا:

جسونت سنگھ کی باغیانہ حرکت کو کنٹرول کرنے کے بعد اورنگ زیب شجاع کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کے عقیدتمند امراء اور سردار سب جمع ہوتے ہیں اور بقیہ فوج کو منظم کرتے ہیں۔ عالمگیر نہایت ہی وقار اور اطمینان سے ہاتھی پر سوار ہوتا ہے۔ اس کے چہرہ مہرہ اور بشرے سے قطعاً پتہ نہیں چلتا کہ رات کے واقعہ (جسونت سنگھ کی بغاوت) کا کوئی اثر اس کے دل پر ہے۔ شجاع نے بھی اپنی فوج کو از سرِ نو ترتیب دیا۔ بھائی ——— (اورنگ زیب) کے لشکر سے بھاگ کر آنے والوں کی وجہ سے اس کی قوت میں کافی اضافہ ہو گیا اس نے از سرِ نو صف بندی کی اور اپنے لیے قلبِ لشکر میں جگہ سنبھالی۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں آئیں اور خوفناک لڑائی شروع ہوئی۔ خوفناک آوازوں سے زمین لرزنے لگی۔ بزدلوں کے دل چھوٹ گئے۔ مگر بہادروں کا ولولہ و شجاعت بڑھ گیا کہ اسی اثناء میں شجاع کے لشکر میں ایک گولہ پھٹا جس سے ہاتھی پر بیٹھا ہوا فیل بان اور ایک اردلی کا پاؤں صاف اڑ گیا۔ اس حادثہ سے شجاع کے لشکر میں سراسیمگی پھیل گئی۔ اور اس کے بعد تیر اندازی کا سلسلہ شروع ہوا اور اس کثرت سے تیر چلے کہ معلوم ہوتا تھا کہ تیروں کی بارش ہو رہی ہے۔ اسی موقع پر شجاع کے لشکر سے سیّد عالم بارہ تیس مست ہاتھی لے کر نکلے اور بادشاہی میسرہ پر حملہ کر دیا۔ خوفناک ہاتھیوں اور سادات کے زبردست حملہ سے بادشاہی فوج کا بایاں بازو پسپا ہونے لگا۔

اور اکثر لوگ بھاگ کھڑے ہوئے اور بڑی افرانفری پیدا ہوئی دشمن کے اس غلبہ اور میسرہ کی ہزیمت کا اثر قلبِ لشکر پہ بھی پڑا یہاں تک کہ بادشاہ کی رکاب میں دو ہزار سے زیادہ سوار نہیں رہے۔ شجاع اور اس کے معاونین اس صورتِ حال سے بہت خوش اور اپنی فتح یقینی سمجھتے تھے اور ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگے اور ایک بھرپور حملہ پوری قوت سے اورنگ زیب کی فوج پہ کر دیا۔ لیکن عالمگیر بڑی ثابت قدمی اور بہادری کے ساتھ اپنی جگہ ڈٹ گیا اور اپنے آدمیوں کا حوصلہ بڑھاتا رہا اور خود تیر و کمان لے کر شجاع کے لشکر پہ تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔

اورنگ زیب کی اس جراتِ مندانہ پیش قدمی سے لوگوں کے حوصلے بڑھے اور وہ اس کی مدد کے لیے پہنچ گئے۔ ان میں سے ہر ایک نے معدودے چند ساتھیوں کی مدد سے دشمن کی اس یلغار کو روک لیا اور عالمگیر نے اپنے ہاتھی آگے بڑھا کر دشمن پہ حملہ کر دیا عالمگیر کو میدانِ کارزار میں مردانہ وار بڑھتے دیکھ کر بھاگتے ہوؤں کے پاؤں جم گئے بزدلوں کی غیرت جوش مارنے لگی اور لوگ پلٹ کر اپنے بادشاہ کی سواری کے اردگرد پروانہ وار جمع ہونے لگے اور جان توڑ کر دشمن پہ حملہ کرنے لگے عالمگیر کی اس دلیری اور جرأت کو دیکھ کر شجاع اور اس کے ساتھی مرعوب ہو گئے اور اس کی فوج میں افراتفری مچ گئی۔ ساداتِ بارہ کا بھی زور ٹوٹ گیا اور ان کی پیش قدمی بھی رک گئی ہے۔ تیس مست جنگی ہاتھی اپنے حملوں سے بڑی تباہی مچا رہے تھے مگر عالمگیر کی عزیمت اور استقامت کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک انچ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹا بلکہ اس نے اپنے ہاتھی کے پاؤں میں زنجیریں ڈلوا دیں اور ایک محافظ سپاہی کو حکم دیا کہ بندوق کا فائر کر کے سید عالم کے فیل بان کو گرا دے۔ اس نے ایسا زبردست نشانہ لگا کر بندوق چلائی کہ فیل بان جو آنکس مار مار کر اس خوفناک ہاتھی کو عالمگیر کی طرف دوڑا رہا تھا۔ گولی کھا کر نیچے گر پڑا۔ عالمگیر کا ایک نہاوت حلدی سے اس ہاتھی کے سر پہ سوار ہو گیا اور اسے اپنے قابو میں کر لیا دوسرے دو ہاتھیوں کے فیل بانوں نے جب یہ منظر دیکھا تو قلبِ لشکر سے ہٹ کر دائیں بازو کی طرف رخ کر لیا۔ اسی اثناء میں عالمگیر کے میمنہ پہ شجاع کے آدمیوں نے حملہ

کر دیا۔ اور زبردست جنگ شروع ہو گئی۔ یہاں اسلام خاں کی سواری کا ایک ہاتھی ضرب کھا کر بھاگا اور اس کے ساتھ فوج کا ایک بڑا حصہ بھی بھاگ کھڑا ہوا۔ اور اکثر سپاہی بھی مائل بہ فرار نظر آرہے تھے۔ میمنہ کی پسپائی سے لوگوں کی ہمتیں پست ہو رہی تھی۔ عالمگیر اس وقت بھی ہمت سے ڈٹا رہا اور اپنے لوگوں کو پامردی سے میدان میں جمع رہنے کے پیام بھجوائے اور انہیں کمک بھجوانے کی توقع دلائی۔ اسی دوران شجاع کے توپ خانہ کا کمانڈر زخم لگتے ہی فوت ہو گیا اور اس کا لڑکا بھی زخم کھا کر گھوڑے سے گر گیا۔ اس سے عالمگیر کی فوج پر شجاع کی فوج کا زور نسبتاً کم ہو گیا۔ اور عالمگیر کی فوج کے سرداروں کے حوصلے بڑھ گئے ... سے دشمن کی فوج پر حملہ کیا اور اس حملہ میں شجاع کی فوج بہترین آدمی اور دو تین سردار اور کثرت سے سپاہی مارے گئے اس سے شجاع نے جو خود فوج کی کمان کر رہا تھا۔ میدانِ جنگ سے ہٹ گیا اور باپ کی پناہ میں چلا گیا اور عالمگیر کے آدمیوں نے شجاع کے قلب پر حملہ کر دیا۔ اس وقت شجاع کے آدمیوں کی ہمتیں پست ہو گئیں مکرّم خاں صفوی شجاع کے لشکر سے جدا ہو کر عالمگیر کے پاس پناہ طلب کی اور اس کے ساتھ ہی اور بہت سے سردار شجاع کی فوج سے الگ ہو کر عالمگیر کی فوج میں آشامل ہوئے۔ ان سرداروں کے آنے کے بعد شجاع کا لشکر پسپا اور منتشر ہونے لگا۔ اور کچھ ہی دیر بعد شجاع بھی میدانِ جنگ سے فرار ہوا اور ہر طرف مبارکباد کا ایک شور ہوا۔ اور فتح کے شادیانے بجنے لگے۔ عالمگیر کی فوج نے بڑھ کر شجاع کی لشکر گاہ پر حملہ کر دیا خزانہ۔ ہاتھی۔ گھوڑے۔ شاہی ساز و سامان سب کچھ لوٹ لیا۔ عام لوٹ مار کے علاوہ کثیر تعداد میں توپیں۔ ایک سو پندرہ ہاتھی۔ کچھ خزانہ اور جواہرات بحقِ سرکار ضبط کیے اس کامیابی پر عالمگیر ہاتھی سے اترا۔ شکرانہ کی نماز پڑھی۔ امراء نے مشورہ دیا کہ شجاع کو فرار کا موقع نہ دیا جائے اور اس کا تعاقب جاری رکھا جائے۔ اس لیے شہزادہ محمد سلطان کو شجاع کے تعاقب کے لیے روانہ کیا۔ اس مقام پر عالمگیر ایک ہفتہ قیام کرتا ہے۔ امراء کو مناصب اور انعام دیتا ہے اور مختلف انتظامات کرتا

ہے۔جب عالمگیر فتح و کامیابی کے بعد کھجوہ سے واپس ہوتا ہے تو شہزادہ کی کمک کے لیے چند سرداروں کے ساتھ توپ خانہ بھی روانہ کرتا ہے[1]

دارا شکوہ سے آخری جنگ، عالمگیر کی کامیابی:

شجاع کی شکست اور فرار کے بعد عالمگیر اب دوبارہ دارا شکوہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے عالمگیر دارا شکوہ کا تعاقب محرم ۱۰۶۹ھ میں چھوڑ کر شجاع کی طرف گیا تھا۔ اب دوبارہ دارا شکوہ کی طرف آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس تین ہزار سے زیادہ لشکر نہیں رہ گیا تھا وہ اس لشکر کو لے کر ملتان سے بھکر روانہ ہوا۔ ساز و سامان بار بردار نہ ملنے کی وجہ سے بھکر کے قلعہ میں چھوڑا اور خود دشوار گزار راستہ طے کرتا ہوا دریائے سندھ کے کنارے سیوستان کی سرحد پر پہنچا اور یہیں سے احمد آباد کا رخ کیا، عالمگیر کے آدمی شیخ میر بھی پیچھے لگے رہے۔ لیکن راستہ کی مشکلات سے ان کا بھی حال پتلا ہو گیا تھا۔ اس کی اطلاع جب بادشاہ کو ہوئی تو ان کو واپسی کا حکم صادر ہوا۔ اکبر آباد میں اطلاع ملی کہ دارا شکوہ کچھ کے علاقہ سے ہوتا ہوا صوبہ احمد آباد میں پہنچ گیا ہے اور تین چار ہزار سوار اس نے فراہم کر لیے ہیں۔ راستہ میں فوج داروں اور زمینداروں کو اپنا مددگار بنانے اور فوج جمع کرنے میں مصروف رہا ۔ کچھ کا زمیندار اس کا مطیع ہو گیا اور اپنی لڑکی بھی سپہر شکوہ سے منسوب کر دی دارا شکوہ جب احمد آباد پہنچا تو احمد آباد کے صوبہ دار نے دارا شکوہ کا استقبال کیا اور ملاقات کے بعد ضروری سامان فراہم کیے اور دارا شکوہ نے ایک فوج فراہم کی ۔ بندرگاہ سورت۔ کھنبائیت۔ بھروچ اور دوسرے پرگنوں سے اپنے لیے آدمیوں کو اکٹھا کیا۔ ان علاقوں سے ایک ماہ سات دن میں بیس ہزار سوار فراہم کر لئے۔ بیجاپور اور حیدرآباد کے حکام کے نام بھی اس نے نقد اور فوج بطور کمک بھجوانے کے لیے خطوط لکھے اور دکن جانے اور جسونت سنگھ سے ربط قائم کرنے کی تجویز میں سوچتا رہا اس اثناء

---

[1] خافی خاں حصہ سوم ص ۶۱-۶۳-۶۵-۶۸تا ۷۳-

ہیں اسے بادشاہی فوج سے راجہ جسونت سنگھ کے فرار ہونے اور شجاع کے غالب ہونے کی غلط خبر ملی علاوہ ازیں جسونت سنگھ کا لکھا ہوا خط بھی آیا جس میں اس نے اشارتاً دارا شکوہ کو بلایا تھا۔ چنانچہ دارا شکوہ یکم جمادی الاخری کو ایک آراستہ فوج اور ایک بڑا توپ خانہ لے کر جس میں بندرگاہ سورت سے منگائی ہوئی تیس چالیس توپیں تھیں احمد آباد سے نکلا۔ ہر منزل پہ اسے راجہ جسونت سنگھ کے خطوط ملتے جاتے تھے۔ جن میں ایسی باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ جن سے اس کی ہمت بندھ گئی تھی۔

عالمگیر کو دارا کی سیاسی چالوں اور فوجی انتظامات کی خبریں ملتی رہیں۔ اس نے اجمیر آنے کا فیصلہ کیا۔ راجہ جے سنگھ جو دارا شکوہ کے مقابلہ میں عالمگیر کا زیادہ حامی تھا اس نے بادشاہ کو یہ مشورہ دیا کہ جسونت سنگھ کو معافی نامہ، منصب اور مہاراجہ کے خطاب کی بحالی کا فرمان عطا کیا جائے جس کی وہ اس کے لیے سفارش کر رہا تھا اور یہ توقع دلا رہا تھا کہ اس سے جسونت سنگھ دارا شکوہ کی حمایت نہیں کرے گا۔ چنانچہ جے سنگھ نے جسونت سنگھ کو اپنی طرف سے یقین دلایا اور تیز رفتار قاصدوں سے خط اس کے ہاتھ پہنچا دیئے۔ اسی اثنا میں اجمیر کا صوبہ دار دارا شکوہ کے جودھپور پہنچنے کی خبر سن کر دربار میں حاضر ہو گیا اور بادشاہ نے راجہ جسونت سنگھ کی گوشمالی کے لیے جو مہم روانہ کی تھی بہ تقاضائے مصلحت یہ مہم موقوف کر دی ان سیاسی اقدامات کے بعد بادشاہ نے فوج بندی کا حکم دیا۔ ہراول پہ جے سنگھ اور دوسرے بہادروں کو مامور کیا اور دوسرے جاں نثار اور بہادر امرا نے مختلف جگہوں پہ متعین کیا۔ اور حکم دیا کہ دشمن کے مقابل پہنچنے تک دوران سواری میں فوج کی یہی ترتیب قائم رہے اس میں سرِ مو فرق نہ آنے پائے۔

اب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے آ رہی تھیں۔ راجہ جسونت سنگھ ایک آراستہ فوج کے ساتھ جودھپور سے دارا شکوہ کے استقبال کے لیے نکل چکا تھا اور بیس کوس کا فاصلہ بھی طے کر چکا تھا۔ لیکن اسی اثنا میں راجہ جے سنگھ اور دوسرے خیر خواہوں کے خفیہ خطوط جسونت سنگھ کو ملے تو اس نے ان خطوط کو

راز میں رکھا اور اپنا ارادہ بدل دیا اور اپنے مقام پر واپس چلا گیا۔ جب اس امر کی خبر دارا شکوہ کو ملی تو وہ بہت پریشان ہوا اور اسے خوشامدانہ خطوط لکھے مگر اس مراسلت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ جس سے دارا شکوہ کو بہت ملال ہوا۔ تاہم وہ جودھپور سے بیس کوس پر پہنچ گیا تھا۔ کچھ عرصہ وہاں ٹھہرا رہا اور اپنی سرکار کے ایک معتمد آدمی دلے چند کو جو راجہ سے ربط ضبط رکھتا تھا۔ ایلچی بنا کر بھیجا اور ایفائے عہد کے لیے بڑی لجاجت کا اظہار کیا اس نے ٹالنے کا جواب دیا کہ میں اپنے قول پر قائم ہوں مگر فی الحال میرا آنا خلافِ مصلحت ہے۔ بہتر یہ ہے۔ کہ دارا شکوہ اجمیر جا کر ٹھہر جائیں اور دوسرے راجپوتوں کو پیغام بھیج کر اپنے پاس طلب کر لیں۔ جب دو تین سربرآوردہ راجپوت ان کے پاس جمع ہو جائیں گے تو میں خود ان کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ یہ مایوس کن جواب دے کر اس نے دلے چند کو اپنے پاس سے رخصت کر دیا۔ دارا شکوہ جسونت سنگھ کے اس جواب سے بدحواس ہو گیا اس نے دوبارہ دیتے چند کو راجہ کے پاس بھیجا اور اسے بڑے سبز باغ دکھائے مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور اسے یقین ہو گیا کہ راجہ ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے اور اپنی بات سے پھر گیا ہے۔ اس دوران میں دارا شکوہ کو یہ معلوم ہو گیا کہ عالمگیر کی طرف سے معافی کا فرمان جسونت سنگھ کو مل گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود دارا شکوہ اپنے لڑکے سپہر شکوہ کو جسونت سنگھ کے پاس روانہ کرتا ہے۔ سپہر شکوہ نے جسونت سنگھ کو رام کرنے کی بڑی کوشش کی بڑی عاجزی اور خوشامد کی اور وعدہ وعید کر کے اسے ایفائے عہد پر آمادہ کرنا چاہا مگر اس نے سُنی ان سُنی کر دی آخر وہ بھی دلے چند کی طرح مایوس و ناکام واپس آ گیا۔ جسونت سنگھ نے دارا شکوہ کے لیے اورنگ زیب کے خلاف اپنی مصلحت کے لیے جنگ لڑی تھی۔ لیکن ناکام ہوا اور فرار ہوا۔ پھر معافی مانگ کر اور وفاداری کا وعدہ کر کے منصب بحال کرایا اور عین میدانِ جنگ میں بغاوت کی اور سازش کی لیکن عالمگیر نے جرأت اور شجاعت سے اس کی سازش کو ناکام کیا۔ جے سنگھ جو اسی کا ہم مذہب اور ساتھی تھا۔ اور

دارا شکوہ کا ملازم تھا اور اس نے بھی عالمگیر سے جنگ کی تھی لیکن وہ اورنگ زیب سے شکست کے بعد اس کی شجاعت، دلیری سے متاثر ہوا اور اس کی شریعتِ نبوی کی سیاست پر اطاعت اختیار کی اور اس نے جسونت سنگھ کو بھی اس پر راضی کیا اور اس کے لیے عالمگیر سے سفارش کی اور عالمگیر نے ایک وفادار ہندو راجپوت کی سفارش کو قبول کیا اور جسونت سنگھ کے عہدے، منصب کی بحالی کی اس کے بعد جسونت سنگھ دارا شکوہ سے منحرف ہو گیا۔ جسونت سنگھ کے انحراف سے دارا شکوہ کی ہمتیں پست ہو گئیں اور عالمگیر کی قوت میں اضافہ ہوا۔ مؤرخین عالمگیر پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ ہندو دشمن تھا لیکن وہ ہندو دشمن نہیں تھا اور نہ ہی انتقامی سیاست پر یقین رکھتا تھا وہ اسلام کی اس سیاست پر یقین رکھتا تھا۔ جس میں شریعتِ نبوی حاکم ہو اور خود حکمران اس کے تابع اور محکوم ہو اور یہی مسلمانوں کی آرزو اور خواہش تھی اس لیے جسونت سنگھ کو معاف کیا اور موقع دیا کہ وہ اپنے عہد و پیمان کو پورا کرے۔

دارا شکوہ کی تمام امیدیں جسونت سنگھ سے ختم ہو گئیں اور اب وہ عالمِ مایوسی میں مبتلا ہوا اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ اب وہ کیا کرے اسی اثناء اسے یہ خبر ملی کہ عالمگیر اس کے قریب جنگ کے لیے پہنچ گیا ہے۔ دارا شکوہ کے لیے اب کوئی چارہ نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ جنگ کرے۔ چنانچہ جنگ کے لیے تیار ہو گیا۔ کھلے میدان میں جنگ کرنا اپنے لیے مناسب نہیں سمجھا اس لیے اجمیر کے نواحی کوہستان میں مورچہ بنایا اور اپنے کو محصور کر لیا۔ راستوں میں پتھر کی اور گارے کی دیواریں کھڑی کر کے راستے بند کر دیئے۔ توپیں نصب کرائیں اور مورچوں پر بندوقچیوں کو متعین کر دیا۔ اس کے بعد اپنے معتمدین، جاں نثاروں اور ماہرین جن کی بہادری، شجاعت اور وفاداری پر بھروسہ تھا ان کو مختلف جگہوں پر متعین کیا اور تمام مورچوں پر ضرورت کا سامان پہنچانے کے لیے ایک جمعیت مقرر کی اور ان کو ہدایت کی کہ وہ سرداروں اور سپاہیوں کو بے کار اور معطل بیٹھنے نہ دیں۔

عالمگیر اجمیر سے تین کوس کے فاصلہ پر تھا اس نے دارا شکوہ سے نصف

کوہ پر مورچہ باندھنے کا حکم دیا۔ جہاں سے گولہ دشمن کی فوج پر آسانی سے پہنچ سکتا تھا۔ اس نے بھی اپنے بہادر، فنِ حرب کے ماہرین اور جاں نثاروں کو مختلف مورچوں پر متعیّن کیا۔ بہادر افسروں نے ایسی تمام جگہوں پر جہاں مورچے لگائے جا سکتے تھے قبضہ کر لیا۔ اور وہاں سے دشمن پر گولہ باری شروع کر دی۔

ہر ایک امیر دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ تین دن تک بڑی بہادری سے جنگ کی اور اس عرصہ میں لحہ بھر کے لیے آرام نہیں کیا۔ امیرالامراء نے اپنے مورچے آگے بڑھانے کے لیے پورا زور لگایا اور پے در پے سخت حملے کر کے دارا شکوہ کے محصورین کو بہت تنگ کیا۔ مگر محصورین پہاڑوں کے قلب میں مضبوط مورچہ بندی کر کے بیٹھے رہے اس لیے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ بلکہ دارا شکوہ کے لشکر کے اکثر آدمی مورچوں سے باہر نکل آتے اور عالمگیر کے مورچوں پر حملہ کر کے آدمیوں اور جانوروں کو تلف یا زخمی کر کے پہاڑوں کی پناہ میں چلے جاتے تھے۔ پہاڑوں پر سے توپ کا جو گولہ بھی آتا تھا۔ وہ خالی نہیں جاتا تھا۔ اس کی لپیٹ میں کوئی نہ کوئی جان ضرور ضائع ہوتی تھی۔ اور ادھر عالمگیر کی طرف سے جو گولے پہاڑی کی طرف پھینکے جائے وہ چٹانوں اور مورچہ بند دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ آتے تھے۔ جنگ کی اس صورت حال کو دیکھ کر چوتھی شب عالمگیر نے اپنے مخلص جاں نثار امیروں اور افسروں کو طلب کیا اور ایک سخت یورش کرنے کی ترغیب اور تاکید کی۔

عالمگیر کی اس ترغیب اور تاکید پر جس امیر نے سب سے پہلے لبیک کہا وہ ایک ہندو زمیندار راجہ راج روپ تھا۔ اس کے ہمراہی کوہ نوردی اور شیر بائی میں ضرب المثل تھے اس نے اپنے پیادوں کو پہاڑ کے ایک حصہ پر جو "بھاڑی" کے نام سے مشہور تھا روانہ کیا۔ محصور فوج کو بھی ادھر سے حملہ کا اندیشہ تھا اس لیے انہوں نے اس طرف کافی توپیں اور بندوقیں لگا رکھی تھیں۔ جو مسلسل باڑھ پر باڑھ چلائے جا رہی تھیں۔ راجہ روپ کے کوہ نورد سپاہی ہتھیلی پر جان

لیئے شدید آتش باری کے مقابل آگے بڑھتے رہے جو بھی گر جاتا وہ اس کی لاش کو اوپر چڑھنے کے لیے زینہ بنا لیتے۔ بہر حال بڑی سعی و جہد کے بعد وہ پہاڑی کے اوپر پہنچ گئے اور وہاں راجہ روپ کا جھنڈا نصب کر دیا۔ خود راجہ اپنے جانبازوں کے پیچھے چلا آرہا تھا اس وقت راجہ کی فوج کے مقابلہ پہ دارا شکوہ کے ایک ہزار جنگجو نکل آئے تھے۔ راجہ نے اس شدید گولہ باری میں پیش قدمی کی اور گھوڑوں سے اتر کر دارا شکوہ کے سپاہیوں پر حملہ کر دیا۔

راجہ راج روپ کی جرأت کو دیکھ کر دلیر خاں بھی اپنے جانبازوں اور بہادروں کو لے کر پہاڑی پہ چڑھنے کی کوشش کی اور گولہ باری سنگ باری میں بہادری سے جان لڑاتے ہوئے وہ بھی دائیں سمت سے پہاڑی پہ پہنچ گیا۔ دیکھا دیکھی بائیں طرف سے شیخ میر بھی اپنے ہمراہیوں کے ساتھ پہاڑی پہ جا پہنچا۔ دوسری طرف راجہ جے سنگھ دارا شکوہ کے راجپوتوں سے خوب جم کر لڑا تھا۔ امیر الامراء توپ خانہ کی فوج کے ساتھ بائیں جانب اور اسد خاں وغیرہ دائیں بازو پر اپنے اپنے لشکر کے ذریعے آرائی کرنے لگے اس طرح اورنگ زیب عالمگیر کے ہمت اور غیرت دلانے پر تمام آدمیوں نے جان نثاری اور بہادری کے جوہر دکھائے مگر پہل راجہ راج روپ کے آدمیوں نے کی اور آخر میں شیخ میر اور دلیر خاں افغان کی جاں بازی نے بڑا کام کیا۔ ان کے مقابلہ میں دارا شکوہ کے آدمیوں شہنواز خاں اور فیروز میواتی کے مورچوں سے مسلسل گولہ باری ہو رہی تھی اور بندوق کی گولیاں اولوں کی طرح برس رہی تھیں۔ ان دونوں امیروں کے بہت سے آدمی اس معرکہ میں کام آگئے تھے۔

دارا شکوہ خود پہاڑی کی بلندی پہ کھڑا ہوا جنگ کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو ہزیمت کھاتا ہوا دیکھ کر بڑی ترغیب دی اور ان کو غیرت بھی دلائی اور محصورین نے حصار سے باہر نکل کر بڑی بہادری اور دلیری سے جنگ بھی کی۔ لیکن شہنواز خاں مارا گیا۔ اس سے دارا کی ہمتیں اور پست ہو گئیں اور بدحواس ہو گیا۔

اورنگ زیب عالمگیر کے فتح پانے کی خبریں دونوں طرف گرم تھیں اس وقت شیخ میر

بڑی جانفشانی سے جنگ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ مخالف سمت سے بندوق کی ایک گولی آکران کے سینہ پر لگی عماری میں ان کے پیچھے ان کا خدمت گار سید ہاشم بیٹھا تھا۔اس سے شیخ میر نے کہا "لو میں چلا مگر میرے کمر پٹہ کو پکڑ کر مجھے اسی طرح سیدھا بیٹھائے رکھو۔بس ہماری فتح ہونے والی ہے۔فتح کے آثار صاف نظر آرہے ہیں ایسا نہ ہو کہ ہمراہی میری ہلاکت سے واقف ہو کر ہمت چھوڑ دیں اور جنگ سے ہاتھ روک لیں اور دشمن بھی واقف ہو کر دلیری سے آگے بڑھنے لگے۔

شیخ میر کی اس جاں نثاری کی وجہ محض عہدہ اور دولت نہیں ہو سکتی بلکہ اورنگ زیب عالمگیر سے اسے احیاءِ سنّتِ نبوی اور شریعتِ اسلام کے نفاذ اور غلبہ کا مقصد مشترک رہا ہوگا۔اورنگ زیب عالمگیر اس کی اس جاں نثاری سے بہت متأثر ہوا اور اس کی اس عقیدت کے طفیل بادشاہ نے اس کے وطن کے آدمیوں کا ہمیشہ بہت خیال رکھا۔

دارا شکوہ نے جب شہنواز خاں کو مرتے اور اورنگ زیب کی فوج کے نشانوں کو پہاڑی پر لہراتے ہوئے دیکھا تو اسے اپنی شکست کا یقین ہو گیا اب وہ سپہر شکوہ۔فیروز میواتی اور حرم کی عورتوں کو لے کر وہاں سے فرار ہوتا ہے[۱]۔ اس کے ساتھ ان دو آدمیوں کے علاوہ کوئی اور نامی گرامی آدمی نہیں تھا۔بہر حال دارا شکوہ کے فرار ہوتے ہی ہزیمت خوردہ لشکر کے اکثر لوگ اپنا مال و اسباب اور اہل و عیال چھوڑ کر بھاگ گئے۔کچھ لوگ اپنے مال و عیال اور عزّت و ناموس کے لٹنے پر ماتم کرتے رہے اور بعض لٹے پٹے زخمی حالت میں اس کوہستان میں حیران و سرگردان نکل گئے۔خلاصہ یہ کہ دارا شکوہ کا سارا لشکر تباہ اور برباد ہو گیا۔

دارا کے چند امراء تو میدانِ جنگ میں مارے گئے اب دارا کے فرار کے بعد بعض امراء اورنگ زیب عالمگیر کے پاس حاضر ہو گئے۔عالمگیر نے انہیں معاف کر دیا اور انہیں اپنی عنایتوں سے نوازا۔اس طرح دارا شکوہ کو مکمل شکست ہوئی اور اورنگ زیب عالمگیر کو مکمل فتح ہوئی۔

---

[۱] خافی خاں حصہ سوم ص ٧٦-٧٨ تا ٨٣-